READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM



ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
مدیر اعلیٰ: معراج رسول

جلد 46 • شمارہ 06 جون 2016 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) dpgroup@hotmail.com

CPNE MEMBER APNS

محفلِ شعر و سخن
124 قارئین

آپ کے ہاتھوں بھی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

نیلی کہانی
127 نعمان اسحاق

بے بہار و بے کیف لمحات میں رعنائیوں کا
ہجوم اور حسرت بھری آنکھوں کا احوال

ماروی
150 محی الدین نواب

ایک جیسی کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ محبت کی
عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دلربا سلسلہ

قرض
197 ڈاکٹر ساجد امجد

”رزق حلال عین عبادت ہے“
اس نصیحت سے فرار ہونے والوں کا احوال

شاہ عبدالرحمن پاک
213 ضیا تسنیم بلگرامی

علم کی پیاس بجھانے کے لیے نگر نگر
پھرنے والے ایک ولی کی تلاش کا قصہ

غم گسار
225 سلیم انور

اجنبی محبتوں اور
ہمدردیوں کا بے مثال انداز

مات
234 عمر عبداللہ

محبتوں کی سرزمین پر صحرا صحرا
بھٹکنے والے ایک آبلہ پا کی روداد الم

کترنیں
* ادارہ

دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکلے
اقتباسات، مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

دکن سے ایک خط

جون ایلیا

برادر عزیز! دعائیں۔

میں اس وقت حیدر آباد دکن کے ایک روزنامے کے دفتر میں بیٹھا ہوں اور دنیا کی بدبخت زبان اردو کے بارے میں گفتگو جاری ہے۔ قلی قطب شاہ، غواصی، ولی اور سراج اورنگ آبادی کی سرزمین میں اردو کے مستقبل کے بارے میں گفتگو جاری ہے۔ کیا یہ ایک سنجیدہ صورتِ حال ہے یا ایک غیر سنجیدہ صورتِ حال ہے؟ میں سوچ رہا ہوں۔ ہندوستان میں آزادی کے چند سال بعد سے جو کچھ ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ اردو اور مستقبل کا باہمی رشتہ کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا ہے۔ شمال میں اردو کی حالت بہت زبوں ہے۔ اس کا کوئی علاقہ متعین نہیں ہے۔ ہریانہ، دلی اور اتر پردیش جو اس کے گھر تھے، وہ اس کے گھر نہیں رہے۔

بہار میں اردو کی صورت کسی حد تک پُرامیدانہ ہے۔ شمال میں صرف بہار ہی کے اردو والوں نے اردو کے سلسلے میں حساس اور باشعور ہونے کا ثبوت دیا ہے لیکن شمال میں جو کچھ ہوا ہے وہ بہت زیادہ دل شکن ہے اور وہ یہ ہے کہ شمال میں اردو کو اب صرف مسلمانوں کی زبان سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال یہ غنیمت ہے کہ یہ بات واضح انداز میں کہی نہیں جاتی۔ وہاں اب بھی اردو والے اسے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان قرار دیتے ہیں۔ وہاں کیا بلکہ مشاعرے تو سارے ہندوستان ہی میں بے حد مقبول ہیں۔ اب بھی ہندو اور مسلمان لڑکے اور لڑکیاں اردو شعروں ہی کے ذریعے اظہارِ محبت کرتے ہیں لیکن یہ شعر دیوناگری میں لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی نئی نسل عربی دعائیں بھی دیوناگری میں لکھ کر یاد کرتی ہے۔ اردو کا جادوگر شاعر غالب، ہندوستان میں سنسکرت، بنگالی، ہندی، گجراتی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کے شاعروں سے کہیں زیادہ مقبول و محبوب ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے کہا تھا کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ ایک وید مقدس اور دوسری دیوانِ غالب۔ بجنوری نے عجب الہامی جملہ کہا تھا۔ مجھے اعداد و شمار کے ماہرین نے جو بات بتائی وہ یہ ہے کہ سال میں جو کتابیں سب سے زیادہ فروخت ہوتی ہیں، وہ یہی دو کتابیں ہیں۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ بات غالب کے دیوناگری ایڈیشن کے بارے میں کہی جا رہی ہے۔ یہ کتنی خوش کن حقیقت ہے مگر کتنی مضحکہ خیز۔ مضحکہ خیز یوں کہ اب غالب عام طور پر غالب کے نام سے نہیں "گالب" کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں اس لیے کہ دیوناگری رسم الخط اور لہجہ غالب کے "غین" کو سہارنے کی سکت نہیں رکھتا۔ غزل "گجل" ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ ہے اردو رسم الخط کا المیہ اور اس کی بے رواجی کا دلچسپ نتیجہ۔

ہریانے، دلی اور اتر پردیش کے اردو والے اردو رسم الخط کے حق میں جتنے بے حس، بلکہ بے ضمیر ثابت ہوئے ہیں، اس پر ان علاقوں کی ہر پختہ دیوار سے سر ٹکرایا جانا چاہیے۔ یہ ہے وہ گفتگو جو ہم اردو کے چوتھے تاریخی گھر حیدر آباد دکن سے شائع ہونے والے ہندوستان کے سب سے بڑے روزنامے کے دفتر میں بیٹھے ہوئے کر رہے ہیں۔

یہاں کی صورتِ حال یعنی جنوبی ہند کی صورتِ حال شمال کے مقابلے میں نمایاں طور پر مختلف ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا، شمال میں اردو کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان کہا جاتا ہے جو ایک ناقابلِ تردید نظری صداقت ہے۔ جنوبی ہند میں بھی اردو کو کسی ایک مذہب کے ماننے والوں سے مخصوص نہیں کیا جاتا۔ یہاں بھی اس کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان کہا جاتا ہے مگر اس موقع پر جو بات قابلِ ذکر ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کے اردو والے عملی حقیقت کو زیادہ قابلِ توجہ سمجھتے ہیں۔ یہاں اردو والوں سے وہ مسلمان مراد ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے بلکہ تامل، تلگو یا ملیالم ہے۔ ان لوگوں نے اردو کو اختیاری زبان کے طور پر قبول کر لیا ہے اور وہ اسے اپنی عزیز ترین متاع سمجھتے ہیں۔ چنانچہ یہاں اردو رسم الخط اور اردو تعلیم کی بنیاد شمالی ہند کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط ہے۔ اب سے کئی صدی پہلے ہندوستان میں "دکن" اردو کا سب سے بڑا تخلیقی اور تعلیمی مرکز تھا اور اردو وہاں کی سرکاری زبان تھی۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۴۸ء تک ریاست حیدر آباد کی علمی، تعلیمی اور سرکاری زبان اردو ہی رہی۔ اب بھی یہاں اسے صرف بول چال کی زبان کی حیثیت نہیں بلکہ قابلِ ذکر حد تک علمی، تعلیمی اور تخلیقی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔

شمال میں اردو صرف بول چال کی زبان بنتی جا رہی ہے اور ہے یوں کہ اردو اب بھی سارے ہندوستان کی مشترکہ بولی ہے۔ بس یہ ہے کہ اسے اردو کے بجائے ہندی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بہرحال جنوب میں اسے باقاعدہ ایک زبان کی حیثیت حاصل ہے اس لیے کہ وہاں کے اردو والوں نے اپنے احساس، تاثر اور عقلیت کی ایک تاریخی حقیقت کو دریافت کر لیا ہے اور وہ حقیقت ان کے خیال میں یہ ہے کہ ہماری مادری زبانیں ہیں اور اردو ہمارے نفسیاتی، فکری اور اعلیٰ تہذیبی تشخص کی زبان ہے۔

میں نہیں جانتا کہ وہ جس حقیقت تک پہنچے ہیں، غیر جانب دار تاریخ اس حقیقت سے کتنی مناسبت اور مطابقت رکھتی ہے یا اس کے حق میں کتنی سازگار ہے لیکن جنوب کے یہ "اردو والے" اپنے طور پر جس حقیقت تک پہنچے ہیں، وہ یہی ہے۔ جنوب کے "اردو والوں" کی اس دریافت کی نفسیاتی، فکری، تہذیبی اور جذباتی قدر و قیمت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ہمیں جنوب کے اس گروہ کی تاریخ کا گہرا جائزہ لینا پڑے گا۔ جن ماہرین نے اس تاریخ کا گہرا جائزہ لیا ہے، ان کے نزدیک اس گروہ کی یہ دریافت پوری طرح قابلِ فہم ہے اور اس کا محض جذباتیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اردو زبان پہلے علاؤالدین خلجی اور پھر محمد تغلق کے عہد میں دلی سے دکن گئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہاں اردو نثر اور شاعری کا ظہور ہوا۔ خاص طور پر دکن شاعری کا پہلا عظیم الشان مرکز قرار پایا پھر اردو شاعری ولی دکنی کے دیوان کے ذریعے دلی کے گلی کوچوں میں پھیل گئی اور پھر سارے شمالی ہند اور وسطی ہند وغیرہ میں۔ اب اردو زبان دوبارہ دکن میں اپنی پرانی بنیادوں کو استوار کر رہی ہے۔

عزیز قارئین
السلام علیکم!

جون 2016 کا شمارہ آپ کے ذوق کی نذر ہے۔ دن، مہینے، سال لگتا ہے کہ اب تو بس کیلنڈر کے ہندسوں تک ہی بدلتے ہیں جبکہ بوجھل دل، ماؤف دماغ، مشکل حالات، ناکافی وسائل اور کافی سے زیادہ مسائل کا انبار اپنی جگہ جوں کا توں موجود ہے جس کا برسوں سے احساس دلایا جارہا ہے اور شاید برسوں تک یہ گردان جاری رہے مگر تا حال بدلاؤ کی کوئی صورت...... نظر نہیں آتی۔ اب دیکھیے یہ سال بھی آدھا گزر گیا جبکہ سیاستدانوں اور نعروں، وعدوں پر عوام کو جھوٹی تسلیاں دینے والوں کے نزدیک یہ سال تو ابھی آدھا باقی ہے جو شاید ان کی نظر میں انقلاب کے لیے کافی بھی ہے۔ اب دیکھیے انقلاب کے نام پر ملک کی لوٹی ہوئی دولت جو غیر ممالک کے خزانوں میں اضافے کا سبب بنادی گئی ہے کب ملک میں لوٹ کر آتی ہے اور آتی بھی ہے کہ...... پل پل بدلتے بیانات کی روشنی میں اب عوام بھی سیاسی شعور کے سہارے بہت کچھ سمجھ لیتے ہیں خیر...... ملک میں سیاسی اور معاشی سطح پر کوئی بدلاؤ آئے یا نہ آئے موسم تو اپنے تیور بدل رہا ہے۔ گزشتہ برس گرمی کی شدید لہر اور کے الیکٹرک کی بے حسی کے طفیل کتنی قیمتی جانیں باری ہار گئیں...... اس برس بھی گرمی کا قہر، حکمرانوں کی سرد مہری اور متعلقہ اداروں کی بے پروائی کے سبب ذکر و عبادت کے آنے والے مہینے مسلمانوں کا بڑا امتحان لینے والے ہیں شاید۔ ابھی سے شیڈول کے مطابق لائٹ کی عدم فراہمی تو اپنی جگہ اٹل ہے ہی جبکہ بونس میں رات رات بھر کی لائٹ کا عذاب الگ مقدر کردیا گیا ہے اور بھاری بھر کم بلوں کا مذاق بھی جاری ہے۔ ایسے میں دن بھر گرم دوپہروں میں محنت مزدوری کرنے والے راتوں کو جاگ کر پھر اگلے دن کے لیے نکل پڑنے پر مجبور ہیں۔ طالب علموں پر نا اہلی کا الزام دھر کران کے جھنجلائے ہوئے ذہنوں اور عروج پر پہنچی ہوئی بدمزاجی اور چڑچڑے پن سے بھلا ملک کی کونسی ترقی کا راز وابستہ ہوسکتا ہے۔ ذرا جلسے جلوس میں اپنی مقبولیت کے گراف کو بڑھانے کا مقابلہ کرنے والے سیاسی بحران اور بھونچال میں کمی کرنے اور معاشی ثمرات میں عوام کا حصہ دینے کا مقابلہ بھی تو کر دیکھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ صرف بادل گرجنے سے پھلواری نہیں ہوتی بلکہ ہریالی اور خوش حالی کے لیے بادل کو برسنا بھی پڑتا ہے۔ کیا ستم ہے کہ میرے ملک کے منافع خور بیوپاری سارا سال آس لگا کر بیٹھتے ہیں کہ کب اسلامی تہوار آئے اور کب سال بھر کی کسر پوری کرتے ہوئے ہوش ربا مہنگائی کے ہاتھوں مظلوم عوام کی چمڑی ادھیڑی جائے...... تو جناب ماہ شعبان اور پھر رمضان المبارک آیا ہی چاہتے ہیں گویا ”اب آئے دن بہار کے“ تو جناب صاحب اقتدار اور با اختیار حلقے کے سائے تلے جی بھر کے بہار کے مزے لوٹنے کی کوشش کیجیے۔ یا الٰہی کوئی ایسا کرشمہ ہوجائے کہ ہمارے ملک میں سچ مچ بہار آجائے جس کے ثمرات سے ہر طبقہ فیض یاب ہوسکے۔ (آمین) اور اس دعا کے ساتھ ہی چلتے ہیں اپنی پھلواری کی جانب۔

❋ **مونا رضوان کا تعاون کورنگی کراچی سے** ”ادارے کی کاوشوں کی بدولت مئی کا شمارہ بروقت مل گیا۔ سرورق کی حسینہ جانے کن سوچوں میں گم ہے...... شاید پاکستان کی صورت حال پر افسردہ ہے۔ ہونا بھی چاہیے۔ موجودہ حال کوئی اتنا خوشحال نہیں ہے کہ انسان بے فکری سے دو وقت کی روٹی بھی کھا سکے۔ خیر یہ دکھ بھری داستان تو چلتی رہے گی کہ شاید ارباب اختیار کو کچھ ہوش آجائے۔ اداریے میں آپ کے قلم کی روانی سیدھی دل پر اثر کرتی ہے۔ بے شک ملک کی دولت...... ملک کے کام نہ آئے تو پھر کس کام کی اور واقعی ہمارا تعلیمی نظام جس قدر تباہی کا شکار ہے شاید ہی دنیا میں کوئی نظام اتنا ناقص ہو۔ بہر حال محفل کی رونق دیکھ کر دل کو کچھ سرشاری حاصل ہوئی۔ سب کے بے لاگ تبصرے اور پُر فکر باتیں مجھے بے حد اچھی لگتی ہیں۔ میں بہت شوق سے اس محفل سے محظوظ ہوتی ہوں۔ ویسے تو یہ میرا تیسرا خط ہے جو کہ شاید اس بار بھی نہ شائع ہو۔ (ارے نہیں نہیں...... ہر بار ایسا نہیں ہوگا خوش آمدید۔ بس جگہ کی قلت کی وجہ سے مجبوراً ایسا ہو جاتا ہے) سسپنس پڑھنے کی تین وجوہات ہیں جن کی وجہ سے میں یہ شمارہ ضرور خریدتی ہوں اور یہی اس کی انفرادیت بھی ہے پہلی بات اس کے تاریخی صفحات، دوسری بات اس میں تصوف کے حوالے سے معلومات اور تیسری بات اس کے آخری صفحات پر بہت جامع اور معاشرتی مسائل کو اجاگر کرتی کوئی بھی خوب صورت تحریر میری جان ہے۔ بالخصوص مجھے آخری صفحات پر ناہید سلطانہ اختر اور طاہر جاوید مغل کی تحریریں پسند ہیں جبکہ طاہر جی نے تو شاید اب قسم کھالی ہے، آخری صفحات پر نہ لکھنے کی (او ہو ایسا نہیں ہے بھئی...... بس مصروفیت میں وقت نہیں مل پاتا...... ویسے چھوٹی کہانیوں میں شمولیت ہوتی رہتی ہے۔ جیسے کہ اس بار بھی طاہر جاوید کا نام فہرست میں شامل ہے) اس کے علاوہ کاشف زبیر اور محی الدین نواب (مرحوم) کی تو بات ہی الگ تھی۔ اللہ دونوں کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ اس بار بہشت زار تاریخی کہانی کچھ انفرادی ٹاپک پر لکھی گئی ہے۔ کافی دلچسپ لگی اور مزید واقعات کا انتظار ہے۔ آخری صفحات پر سلیم فاروقی نے سزائے موت کافی مزیدار کہانی لکھی ہے۔ سچ بات ہے یہاں کسی کو نیکی کا صلہ نہیں ملتا۔ کوئی اچھا کام کرنا چاہے، اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے والے اپنے ہی لوگ ہوتے ہیں۔ تنویر ریاض نے کفارہ میں اچھا سبق دیا لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ ایسے گناہ کرنے سے پہلے ہی ہوش کے ناخن لے لیے جائیں مگر...... افسوس اتنی عقل کہاں ہے کسی کے پاس۔ ماروی اور شیش محل تو اپنی اسی رفتار سے دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اسما جی اب تو جولیٹ کو فاروق سے ملوادیں یا فاروق کو ہی دور سے اس کا دیدار

کرادیں۔ آپ تو فاروق کو اور دور کرتی جارہی ہیں۔ باقی کردار بھی اپنی جگہ فٹ ہیں۔ البتہ ماروی میں اب کچھ اوور ہوتا جارہا ہے جو ہضم مشکل سے ہورہا ہے۔ اتنی آسانی سے اگر طاقت کسی کو مل جاتی تو آج اپنے ملک کے یہ حالات تو نہ ہوتے نا۔ محفل شعر وسخن میں ہر شعر دل کو چھو لیتا ہے۔ مزہ آجاتا ہے پڑھ کر۔ باذوق قارئین کا انتخاب بھی بہت لاجواب ہوتا ہے۔ سلیم انور کی لاعلمی بھی کافی متاثر کن رہی۔ مرزا امجد بیگ نے دارالعمل کو بہت بامعنی پیرائے میں تحریر کیا۔ منظر امام کی ایک بڑی کہانی نے بہت متاثر کیا۔ سچ ہے مقدر کی تحریر میں جو دم ہوتا ہے، وہ کسی تحریر میں نہیں مل سکتا۔ جو کچھ بھی وہ کررہے تھے ان کی کہانی گویا کہ بڑھتی جارہی تھی۔ بالآخر ایک بڑی کہانی مکمل ہوگئی۔ مجموعی طور پر مئی کا شمارہ بہت معیاری اور دلچسپ رہا۔“ (اب تو آپ خوش ہیں نا...... تیسری بار مایوسی نہیں ہوگی۔ تبصرہ کافی جاندار تھا)

❀ طاہرہ گلزار، پشاور سے محفل کی زینت بنی ہیں ”سسپنس کا نام میرے فیورٹ کلر ریڈ کلر سے جگمگا رہا تھا۔ یہ کلر میرے اسٹار کا بھی ہے۔ میری پیدائش 14 اپریل ہے۔ اس بار تو عمر کی فنتشی ماری پتا نہیں اور کتنی زندگی ہوگی۔ (اللہ آپ کو لمبی عمر عطا فرمائے، آمین) سرورق کی حسینہ میرے بیچارے بھائیوں کے دل پر تیر چلا رہی تھی۔ گرمی کے ہاتھوں پنکھے کے آگے کھڑی ہو کے بالوں کو ہوا میں اڑاتی ہوئی گرمی کا احساس دلا رہی تھی۔ یہ بھی شکر ہے کہ اس وقت بجلی موجود تھی۔ فہرست میں اس بار کاشف زبیر بھائی کا نام نظر نہیں آیا تو احساس ہوا کہ دنیا تو زندہ لوگوں کی ہے اور تواب انکل اور کاشف بھائی دنیا چھوڑ کے اپنی اصل منزل کی طرف چلے گئے ہیں۔ ایک دن ہم نے بھی جانا ہے۔ واہ اس بار تو جون ایلیا صاحب نے میرے اندر کے موسم کو بھی آشکار کیا۔ واقعی ہم انسان کتنے ظالم ہیں، ہم نے محبت کو نفرت سے بدل دیا ہے۔ دل سے پیار محبت نکال کے اس میں حسد، کینہ اور خود غرضی بھر دی ہیں۔ ہم دنیا میں ایسے کھوئے ہیں کہ یہ بھول گئے ہیں کہ یہ دنیا تو ایک سرائے ہے ہماری اصل منزل نہیں۔ کاش ہم دل سے کینہ اور حسد نکال کے ایک بار پھر محبت اور پیار بھر کے اپنی زندگی سنوار لیں اور اشرف المخلوقات ہونے پہ فخر کرسکیں۔ سسپنس ہر مہینے ہمیں کتنی سبق آموز کہانیاں دیتا ہے۔ ہم ان سے اچھی اچھی باتیں، اچھے اعمال کرنا اور دوسروں کے ساتھ سکون سے رہنا کیوں نہیں سیکھتے۔ آگے بڑھے تو معراج انکل کی دل سوز باتیں حسبِ عادت پڑھ کے اپنا خون جلایا۔ انکل کے قلم سے ہمیشہ ایسے نادر اور قیمتی الفاظ نکلتے ہیں لیکن ہم بے حس اور ظالم حکمرانوں کے ہاتھوں پھنس کے ان کی قدر و قیمت بھول گئے ہیں۔ چلتی ہوں اپنے دوستوں کی محفل میں کچھ کھٹی میٹھی اور دل جلی باتیں سننے۔ پہلے نمبر پہ زرین آفریدی آئی ہیں مبارکاں۔ کافی اچھا اور شاندار تبصرہ رہا...... دوسرے نمبر پر بھائی وارث اپنا خوب صورت تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ صادق معاویہ تبصرہ مختصر لیکن لاجواب۔ رمضان پاشا بھائی اتنا مختصر تبصرہ کیا، اب الفاظ میں بھی کنجوسی ہاہاہا...... ویلکم سہیل شہزاد اللہ آپ پر رحم کرے، بچے یہ عمر جیل جانے کی نہیں زندگی کو بھرپور طریقے سے گزارنے کی عمر ہے۔ رانا حبیب الرحمٰن بھی اس بار ناراض نظر نہ آئے لیکن ناراضی کی وجہ پھر بھی گول کرگئے شکریہ ہمیں یاد رکھنے کا۔ محمد خواجہ بھائی سن کر اچھا لگا کہ اب آپ کی آنکھ کا آپریشن ٹھیک رہا۔ بہت ہی پیارا اور شاندار تبصرہ...... میرے شہر پشاور کے ایس زیڈ آفریدی بھی مختصر لیکن اچھا تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ رانا بشیر احمد ایاز ویلکم جناب ہماری محفل سسپنس میں۔ مرحا گل بھی اپنے میٹھے انداز کے ساتھ ایک بار پھر حاضر تھیں۔ ویلکم تحریم شاہ ڈیئر! پہلی دفعہ اتنا شاندار اور تفصیلی تبصرہ مبارک ہو، اب آتی رہو۔ ادریس احمد خان بھائی بھی بھرپور تفصیلی تبصرہ لے کر حاضر تھے...... محمد قدرت اللہ نیازی .... شاندار، دلچسپ اور تفصیلی تبصرہ لے کر حاضر تھے لیکن کچھ وہی صنفِ نازک پہ تنقید کرنے سے بھی پیچھے نہ رہے۔ آخر میں بہت ہی پیارے اور نفیس دوست روی کا تبصرہ رہا۔ جناب اب آپ ذرا حسینہ سرورق پر کم دھیان دیں ورنہ اگر آپ کی منگیتر کو پتا چلا تو اچھا نہیں ہوگا، ویسے منگنی مبارک ہو۔ حسبِ عادت پہلے شیش محل جو اسما قادری کا شاہکار ناول ہے، ربن کا جولیٹ کی خیر خیریت معلوم کرنا اچھا لگا لیکن ہما اور فاروق کا ساتھ اچھا نہیں لگا۔ بمبئی میں اب ثریا کی شادی ہورہی ہے۔ پلیز اسما جی اب فاروق کو واپس بمبئی لائیں۔ یہ کیا کہ جولیٹ کی محبت پہ اب تو بلاؤں کا قبضہ ہو اور فاروق صاحب بھی اپنی مردانہ جبلت کے ہاتھوں باقیوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن رہے ہیں...... اپنے فیورٹ رائٹر محی الدین نواب انکل کی تحریر ماروی بہت زبردست جارہی ہے۔ انکل حسبِ عادت اینڈ میں پھر قاری کو دھچکا پہنچا گئے۔ اس بار ضیا تسنیم بلگرامی حضرت سفیان ثوری پر تحریر لاکر ہماری روح جان کو معطر کرگئی۔ ضیا تسنیم ...... کو اللہ اس کا اجر عطا کرے آمین ...... سلیم انور کی مغربی مختصر تحریر لاعلمی بس اچھی تھی، زیادہ متاثر نہیں کیا...... ثمر عباس کی مغربی تحریر آخری خواہش بہت اچھی تحریر۔ انسان اور انسانی فطرت ہے ہی ایسی...... اس بار تو منظر امام صاحب نے اپنی پچھلی تمام کہانیوں کی سردار کہانی تحریر کی۔ ایک بڑی کہانی واقعی مسافر صاحب تو انسانیت کے ایک بڑے رائٹر نکلے۔ ایسے انوکھے موضوع پر لکھنا ان ہی کا کمال ہے۔ بابر نعیم کی تحریر بھوت بہت ہی زبردست کہانی جس میں ایک ناول نگار اپنے ناول پر حقیقی تنقید جاننے کے لیے ایک کم مشہور ناول نگار کو مجبور کرتا ہے اور آخر وہ ناول نگار قتل ہوجاتا ہے۔ اس بار تو الیاس سیتاپوری بہشت زار میں ہلاکو خان کی داستان لائے۔ مکمل تبصرہ اگلی قسط کے بعد کرسکوں گی۔ مختلف کترنیں بھی اچھی رہیں، خاص کر احسان سحر کی لیکن رضوان تنولی کے مراسلوں کو بہت مس کیا۔ اشعار بھی بہت معیاری تھے۔ خاص کر صادق معاویہ سعیدی، محمد قدرت اللہ نیازی، محمد خواجہ، مرحا گل، معراج محبوب عباسی اور جنید احمد ملک کے...... ادارے سے ایک التجا کہ طاہر جاوید مغل اور ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب سے آخری صفحات کے لیے کہانی لکھوائیں اور ضیا تسنیم بلگرامی سے تمام پیغمبروں کا سلسلہ لکھوایا جائے یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخری نبی حضرت محمد ﷺ تک۔ اس بار بھی سسپنس کی تمام کہانیاں بہت اعلیٰ اور معیاری ہیں۔ ساتھ ہی اپنے پرانے تبصرہ نگاروں کو بہت مس کررہی ہوں۔ دوستو! واپس آجاؤ۔ ان دوستوں میں خاص کر رضوان تنولی، جاوید بلوچ، ہمایوں سعید، قمر تقی اور شیر علی خان اینڈ نازک مزاج بھائی آغا فرید احمد خان آف سکھر، این ایس آر مدثر، ماہا ایمان، مقصود الحسن طاہر وغیرہ۔“ (آپ کا بھرپور تبصرہ بے حد لطف دے گیا۔ بہت شکریہ رسالے سے محبت اور وابستگی کا۔ یہ سلسلہ یونہی قائم رہنا چاہیے)

مرزا طاہر الدین بیگ، میرپور خاص سے تشریف لائے ہیں "آپ نے اداریہ کیا خوب لکھا ہے بہرحال دھرنوں کے اس شور سے نکل کر ہم تو چلے اپنی پیاری محفل میں جہاں نہ کوئی دھرنا ہے اور نہ ہی کوئی ورنہ۔ زرین آفریدی اپنے زبردست تبصرے کے ساتھ اول نمبر پر بہت دلچسپ تبصرے کے ساتھ کہ آخر یہ مایوس قوم کہاں جائے۔ آپ کے تبصرے واقعی کلاسک ہوتے ہیں۔ قوم بے چاری کے لیے..... فیض صاحب نے کیا خوب کہہ دیا تھا کہ

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

صفدر معاویہ صاحب اور طاہرہ گلزار صاحبہ دونوں کے تبصرے شاہکار تبصرے تھے۔ الیاس صاحب نے ہلاکو خان پر خوب صورت تحریر لکھی۔ اب دیکھیں شیخ کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر چلنے والے ہلاکو کو قتل کرتے ہیں یا خود قتل ہو جاتے ہیں۔ مرزا امجد صاحب کی ایک اور زبردست کاوش، ملزم اپنے انجام کو پہنچے۔ آخری خواہش ثمر عباس صاحب نے اچھی کہانی کا انتخاب کیا اور انجام خوب رہا۔ بھوت کے بعد سزائے موت ایک ایسی کہانی جو حالات حاضرہ سے ملتی جلتی ہے۔ آج کل ایسا بہت کچھ ہو رہا ہے مگر جہاں شیطان ہیں وہاں ارسلان جیسے جانباز بھی ہیں جنہیں سیلوٹ کرنے کو دل چاہتا ہے۔ مقدور بازی گر ہمت اور استقلال کی کہانی خوب صورت پلاٹ اتنے ہی دلکش انداز سے محمد علیم اقبال نے لکھا۔ منظر امام صاحب نے اس دفعہ کمال کر دکھایا ایک بڑی کہانی جسے منظر امام ہی لکھ سکتے ہیں۔ ایک بڑی ہی انوکھی اور منفرد کہانی جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ مسافر گریٹ نہیں ہے منظر صاحب بلکہ یو آر گریٹ۔"

محمد صفدر معاویہ، خانیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں "مئی کا سسپنس 15 کو مسرور بس کراچی میں ملا۔ کچھ دوران سفر ٹرین میں پڑھا اور کچھ گھر پہنچ کر۔ سرورق کو ایک دوشیزہ اور دو آنکھوں سے مزین کیا گیا۔ محترم جون ایلیا کے راکھ یا دھواں میں سمائی حقیقت کو پڑھتے ہوئے آپ کے اداریہ تک پہنچے، جہاں پر پاناما لیکس کی سرگرمی سر چڑھ کر بول رہی تھی۔ وہیں پر آپ نے تعلیم کے حوالے سے بھی حکومت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ تعلیم انسانی زندگی کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اس کے بغیر زندگی نامکمل ہے۔ تعلیم چاہے دین کی ہو یا دنیا کی دونوں لازم ہیں۔ دوستوں کی محفل میں زرین آفریدی زبردست تبصرے کے ساتھ محفل پر چھا گئیں۔ صدارت دیاں ڈھیر مبارکاں۔ وارث علی کا بھی بہترین تبصرہ صادق معاویہ سعیدی بھائی اصل میں کوئی بھی شخص پسند نہیں کرتا کہ وہ جرم کی راہ پر چلے لیکن معاشرے کی ناانصافی ایسے کردار پیدا کرتی ہے۔ محمد خواجہ کا بہت ہی نائس تبصرہ۔ ایس زیڈ آفریدی، رانا بشیر احمد ایاز سسپنس میں ویلکم۔ الیاس سیتا پوری کی ہشت زار کچھ پلے نہیں بیٹھی۔ کردار بھی الجھے الجھے سے ہیں۔ تنویر ریاض کی کفارہ میں مانیک نے خوب کفارہ ادا کیا، اپنا کے بیٹے کو بچا کر۔ شیش محل میں اس دفعہ ایک اور لڑکی قربان ہو گئی۔ فاروق میاں پر خدا خیر کرے۔ اب چاند بانو اور جمال میں بھی ٹھن گئی۔ سلیم انور کی لاعلمی میں ٹیڈ ویز کو ایک لفظ کے ہیر پھیر نے پھنسوا دیا۔ مرزا امجد بیگ، وارالعمل کی صورت میں ایک اور کامیابی مقدر بنی۔ ثمر عباس کی آخری خواہش بھی عمدہ رہی۔ محفل شعر و سخن بھی اعلیٰ اشعار سے مزین رہی۔ منظر امام کی بڑی کہانی بہت عمدہ تحریر تھی۔ واقعی بہت مشکل ہوتا ہے کسی کے بچوں کو اٹھا کے پالنا۔ ماروی پڑھی، حاجی تو بہت ہائی اسپیڈ نکلا۔ دشمنوں کو خوب پچھاڑ رہا ہے۔ مراد اور ہمزاد، دشمنوں کی چالیں ناکام کرنے میں مصروف رہے۔ محمد علیم اقبال کے قلم سے مقدور بازی گر لڑکی کی ہمت اور حوصلے کی داد دینی پڑے گی۔ حضرت سفیان ثوری ایک ولی کامل کے بارے میں جان کر اچھا لگا، نیک لوگوں کے وسیلے تو دنیا میں رحمتیں ہیں۔ بابر نعیم کی بھوت بھی عمدہ رہی۔ انسان اپنے فائدے کے لیے کسی کو بھی قربانی کا بکرا بنا سکتا ہے۔ یہ دنیا ہے ہی ایسی۔ سلیم فاروقی کی سزائے موت دشمن ہماری صفوں میں گھس گیا ہمارا ہی روپ دھار کر، کچھ غدار بک گئے جو ہمارے اپنے تھے اور روپے پیسے کو پیارے ہو گئے جیسے کامریڈ اور چودھری جیسے غاصب لوگ تو وہیں ارسلان جیسے وطن پرست جانثار بھی موجود ہیں جو پاک سرزمین کے لیے تن من دھن سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ بوہڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر تبصرہ لکھ رہا ہوں۔ گندم کا سیزن ہے اس لیے تبصرہ تھوڑا لیٹ ہو گیا۔"

(بڑی بات ہے کہ آپ لوگ اپنے قیمتی وقت سے بھی کچھ نہ کچھ توجہ پرچے کے لیے بھی نکال لیتے ہیں)

رضوانہ قریشی، راولپنڈی سے تبصرہ کر رہی ہیں "اپنا خط رسالے میں دیکھ کر بہت حیرانگی اور بے انتہا خوشی ہوئی۔ زرین آفریدی اور طاہرہ گلزار نے مختصر تعریف کر کے بھی کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ صادق معاویہ سعیدی کے جملے نے میری محنت اور محبت کو بلندی پر پہنچا دیا۔ آپ نے ٹھیک کہا ہم جیسے دیوانوں نے اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے دنیا کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ورنہ آج دنیا ویران ہوتی۔ نہ آپ جیسے پڑھنے، لکھنے والے شوقین ہوتے اور نہ مجھے اتنا اچھا جملہ دیکھنے کو ملتا۔ آپ نے تو مجھے J.D.P. کا سب سے بڑا فین بنا دیا ہے۔ محمد صفدر معاویہ رسول فیملی کی محبت کو آپ نے میری ایک بہترین کوشش قرار دیا ہے۔ میرے خط کو تو ایک بہت بڑا اعزاز مل گیا ہے کہ ایک فوجی بھائی نے میرے خط کو ایک بہترین سند قرار دیا ہے۔ مدیرہ اعلیٰ کے ایک جملے (سر آنکھوں پر) نے میرے خط کو کرسی صدارت پر بٹھا دیا۔ سب خط کے لیے مہینہ انتظار کرتے ہیں مجھے ایک ہی مہینے میں 5 تحفے خط کی صورت میں مل گئے۔ آپ سب کی تعریف نے میرے خط کو 5 چاند لگا دیے ہیں۔ شعر نذر ہے

سب نے بھیجا ہے مجھے خط میں محبت کا خراج
خط میں جابجا ستارے سے نظر آتے ہیں

ہمارے سسپنس کا نام ہی ایسا ہے، سب کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ تاریخی اور اسلامی کہانی لکھنے والوں کا جواب نہیں۔ پڑھتے ہوئے بھی لگتا ہے کچھ رہ گیا ہے۔ صفدر حیات کی کہانی لاجواب ہوتی ہے کیا یہ حقیقی کردار ہے؟ تاریخ عالم کے ہم سب بہت شوقین ہیں، یہ سلسلہ رہنا چاہیے۔ اس مہینے 2

فین زیادہ مشہور ہوئے ہیں۔ میں نے فین کے جملے کو فیس بک پر اس طرح بھیجا ہے (گھر والے سمجھتے نہیں یہ J.D.P. کے رسالے نہیں میری دنیا ہیں)۔" (آپ کی محبتوں، عنایتوں کا بہت شکریہ)

❁ رانا بشیر احمد ایاز، ناظم آباد، کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "سرورق پر نگاہ دوڑائی تو ایک عدد حسینہ دلنواز ہمیں انتہائی حیران کن نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ٹائٹل گرل سے جان چھڑا کر آگے بڑھے جہاں انشائیہ میں جون ایلیا راکھ کا دھواں اڑاتے نظر آئے۔ اس راکھ کے دھوئیں سے کھانستے ہوئے سیدھا اپنی محفل میں پہنچے جہاں پر اس دفعہ بھی کرسیٔ صدارت پر صنفِ نازک کا قبضہ برقرار تھا۔ بہت بہت مبارک زرین آفریدی فرام حیدرآباد۔ دوسرے نمبر پر وارث علی ملاح بھی خوب چھائے رہے۔ اپنا خط دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ تحریم شاہ صاحب کے نواب صاحب کے بارے میں جذبات پڑھ کر بہت اچھا لگا کیونکہ میرے جذبات بھی ان سے بہت ملتے ہیں۔ سسپنس صرف نواب صاحب کی تحاریر پڑھ کر لینا شروع کیا تھا۔ خیر آج تم تو کل ہماری باری ہے اور آج کل بلکہ کافی عرصہ دراز سے ایک پرانی تبصرہ نگار ماہا ایمان فرام حافظ آباد محفل سے غیر حاضر ہیں۔ ماہا جی ہم نے آپ کی طویل غیر حاضری نوٹ کر لی ہے لہٰذا فوراً ہی اپنی اس محفلِ دوستاں میں حاضری لگوائیں۔ بہشت زار، الیاس سیتاپوری کا زبردست انداز بیاں۔ چنگیز خان کی نسل اور ہلاکو خان کی ظلم و بربریت سے لے کر شیخ الجبال کی بہشت تک کا منظر گویا سب آنکھوں کے سامنے حقیقت میں ڈھل گیا ہو۔ اگلی قسط کا بے صبری سے انتظار جاری ہے۔ شیش محل میں اب ہملا بھابیہ بھی فاروق پر فریفتہ ہوگئی ہے اور چاند بانو بھی شملہ آکر اس سے ملنے کو بیتاب ہوگئی ہے۔ ہملا اور چاند بانو کا آپس میں مقابلہ اچھا لگا۔ دوسری طرف جوزفین کے ماضی سے آہستہ آہستہ پردے اٹھتے جا رہے ہیں۔ کہانی کے کردار اب واضح ہونے شروع ہوگئے ہیں۔ دارالعمل، مرزا امجد بیگ اس دفعہ پھر اپنے موکل کے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئے۔ ماروی کی تعریف کرنا گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ منظر امام ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی چھا گئے۔ کاغذ پر بڑی کہانی تو کوئی بھی لکھ سکتا ہے مگر لوگوں کے دلوں پہ کہانی لکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ بھوت، معذور بازی گر، لاعلمی، کفارہ اور آخری خواہش بس مناسب تھیں۔ محفل شعر و سخن میں محمد عرسند موجٹ کا ملتان سے شعر اور ناظم آباد کراچی سے سعد شمسی کا انتخاب بہت زبردست رہا۔ حضرت سفیان ثوری کی ایمان افروز داستان پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔ اینڈ میں سلیم فاروقی کی سزائے موت پڑھ کر سخت بوریت ہوئی۔ سلیم فاروقی صاحب کا ہر ہیرو پتا نہیں کیوں اتنا جذباتی ہوتا ہے کہ آٹھ دس قتل تو وہ اپنا تعارف کرواتے ہوئے کر دیتا ہے۔ قتل و غارت اس کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ اس دفعہ کا شمارہ مجموعی طور پر کافی اچھا رہا۔" (مختصر اور جامع تبصرہ کافی دلکش رہا)

❁ ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے چلے آرہے ہیں "سرورق ہمیشہ کی طرح خوب صورت، انشائیہ بھی حسبِ حال تھا۔ اداریہ بھی دورِ حاضر کی فسوں کاری سے مزین تھا اور موجودہ اور آئندہ حالات پر تبصرہ افسوس ہم تبصرہ ہی کر سکتے ہیں۔ بگاڑنا بنانا تو اقتدار کے بائیں ہاتھوں کا کھیل ہے ہم عوام تو محض تماشائی ہیں۔ ناموں کی محفل میں زرین آفریدی سرفہرست مبارکباد۔ دیگر نئے و پرانے دوستوں کے بھرپور تبصرے بھی جگمگا رہے تھے۔ اختر حسین صاحب کے سانحہ ارتحال پر تعزیت اللہ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ عبدالجبار رومی، طاہرہ گلزار، محمد صفدر معاویہ اچھا انداز لیے تبصرہ کر رہے تھے۔ اندرونی صفحات پر سب سے پہلے تاریخ کے رمزشناس الیاس سیتاپوری کی بہشت زار پڑھی، جس میں تاتاری چنگیز خان کے بیٹے ہلاکو خان کے حالات و واقعات سے پردہ اٹھایا گیا۔ کہانی ابھی مکمل نہیں ہوئی جاری ہے۔ کفارہ میں مانیک نے ضمیر کی پکار پر بڑا اچھا کیا جو ایسا کفارے کے طور پر کیا۔ اس کے بعد اسما قادری کی شیش محل پڑھی۔ تحریر کا سحر آخر تک اپنے اثر میں رکھتا ہے۔ تحریر کے آخری الفاظ تک قاری کی نظر نہیں اٹھتی۔ بہت اچھے انداز میں چل رہی ہے۔ لاعلمی میں صرف ایک نا محسوس نکتے پر نگاہ مرکوز کرتے ہوئے لیفٹیننٹ فلپ نے مجرم کو پابند سلاسل کر دیا جس پر کسی دوسرے پولیس والے کی نظر نہیں گئی۔ ہر مجرم جرم کے بعد ایسے نشان ضرور چھوڑ جاتا ہے جس سے اس کو جیل کی سلاخوں تک پہنچنا پڑتا ہے مگر اس نکتے کو سمجھنے والی آنکھ چاہیے۔ آخری خواہش بھی بہتر تحریر تھی۔ محفل شعر و سخن میں خوب صورت اور معیاری اشعار نے پُرلطف کیا۔ منظر امام کی ایک بڑی کہانی نے بہت متاثر کیا۔ معذور بازیگر نے بھی بہت اثر کیا۔ عزم اور ہمت سے کام لے کر لڑکی نے اتنے بڑے بڑے معرکے سر کیے۔ اپنی غیر معمولی ہمت اور عزم مسلسل سے کام لے کر۔ حضرت سفیان ثوری بہت پائے کے ولی کامل تھے۔ ان کے علم کی شمع سے سیکڑوں پروانہ علم مستفیض ہوئے۔ بھوت بھی اچھی لگی۔ آخری صفحات کی کہانی سزائے موت بہترین کہانی تھی۔" (متناسب تبصرے کے ساتھ حاضری اچھی لگی)

❁ احمد خان توحیدی، پاکستان اسٹیل، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں "شمارہ مئی 18 اپریل کو ملا۔ حسینہ ٹائٹل نشیلی آنکھوں اور کان کی جیولری کی نمائش کرتے کسی کی منتظر نظر آئی۔ انشائیہ جون ایلیا، راکھ یا دھواں۔ جون ایلیا اور معراج رسول اپنے سوال و فرمان کا خود ہی آخر میں رازداری سے جواب بھی دیتے ہیں۔ اداریہ، مدیرِ اعلیٰ صاحب، تعلیم تجارت بن گئی ہے۔ بچوں سے زیادہ اسکول بن گئے۔ نیک نیتی سے قومی فرض کی ادائیگی میں ہی ہمارا ضمیر مطمئن و پُرسکون ہوگا۔ نجکاری ہو یا سرکاری، زیورِ تعلیم سے غریب بچوں کو آراستہ کرنے سے ہی نئی نسل فرض نبھائے گی۔ (بہت اچھی بات کہی) محفل خطوط، جنوری سے بوجہ معروفیت اپریل تک ساتھیوں کی محفل میں شرکت نہ کر سکا۔ تو کسی نے نہ پوچھا۔ مر کھپ گئے یا زندہ ہیں۔ پھر بھی شکریہ (ارے نہیں بھئی...... بس خاموشی سے انتظار ضرور کیا تھا) زرین آفریدی، کرسیٔ صدارت پر اچھے جامع تبصرے کے ساتھ جلوہ افروز۔ مبارکاں جی۔ سب ساتھیوں کے حق میں ووٹ بیگ صاحب اور ملک صفدر حیات کی ایسی کہانی ضرور ہونی چاہیے جس میں سو فیصد حق پر ہونے کے باوجود ناکامی ہوتی ہو تاکہ پتا چلے، پہلے بھی آج کی طرح تک مکا تھا یا نہیں؟ طاہرہ گلزار، صفدر معاویہ، تمنا ناز، روحی انصاری، قدرت اللہ نیازی، صادق معاویہ اچھے تبصرے ہیں۔ پھر ماروی کی طرف کھونڈی لے کر دوڑے۔ مراد جن بھوت ہے یا کچھ بھی شادی کا بندھن آسمانوں کا فیصلہ ہے۔ محبوب و مراد اب اپنی بیویوں کی ماں کی ممتا کی تکمیل کریں۔ سیتاپوری صاحب کی تاریخی بہشت زار دوسری قسط کے منتظر ہیں۔ شیش محل ہر بار حیران کن واقعات، خوب جاری ہے۔ بیگ صاحب دارالعمل،

جب یاسمین نے جمال شاہ کی وائف سے اتوار یا پیر کے روز بات کی، دو لاکھ کیش کا ذکر کیا تو ذہن اسی وقت قاتل جمال شاہ کی طرف چلا گیا تھا۔ دوسرے کے لیے گڑھا کھودو تو خود ہی گرتے ہیں۔ محفل شعرو سخن معراج محبوب، جاوید ابراہیم، مرحا گل، ممتاز ادریس، سعد شمسی، دانش عمیر اچھے اشعار ہیں۔"

⊠ غلام یٰسین نوناری، چوک سرور شہید سے حاضر محفل ہیں "اس ماہ سسپنس خلافِ معمول کافی لیٹ ملا۔ یعنی 16 کے بجائے 22 کو سرورق منفرد انداز میں بہترین رنگوں سے بنایا گیا۔ لڑکی کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت اور ہلکے خوف کی آمیزش نے متاثر کیا۔ راکھ یا دھواں، جون ایلیا کا وہی مخصوص کاٹ دار انداز، بہت کچھ سمجھا گیا۔ خطوط کی سدابہار محفل میں زرین آفریدی کو صدارتی عہدے پر براجمان پایا۔ بہت ہی عمدہ اندازِ تحریر۔ ویلڈن۔ وارث علی ملاح کی وزارت خوب رہی۔ سہیل شہزاد، موسٹ ویلکم! اللہ آپ کو جیل سے جلد رہائی نصیب کرے۔ رانا بشیر احمد، جی آیاں نوں۔ پہلی بار لکھ دیا تو اب مستقل لکھتے رہنا۔ یہ محفل ہے دل والوں کی۔ منذر معاویہ کا خوب صورت انداز دل کو بھا گیا۔ طاہرہ گلزار سسٹر نے پشاور سے حاضری دی۔ بہت اچھا لگا۔ ہمیشہ کی طرح بے لاگ تبصرہ۔ ادریس احمد خان! آپ ہر ماہ مستقل مزاجی سے خط لکھتے ہیں اور شائع بھی ہو جاتا ہے۔ تبصرہ پسند آیا۔ قدرت اللہ نیازی! زبردست تبصرہ۔ الفاظ کا خوب صورت استعمال کیا۔ آپ مستقل کے ادیب بن سکتے ہیں۔ حمنا ناز، سسپنس معیاری ڈائجسٹ ہے اور اسے پڑھنے والے بھی معیاری لوگ ہیں۔ آپ کی آمد خوشگوار رہی۔ اب بات ہو جائے کہانیوں پہ۔ حسبِ معمول ماروی سے آغاز کیا۔ ہمزاد کے بعد اب مراد کا بیٹا عابد علی منگی، مجوب بن کر سامنے آگیا۔ اس کی آمد نے ماروی کو افق پہ پہنچا دیا ہے۔ دس برس کا عابی یہودیوں کی لاشیں گراتا جا رہا ہے۔ ماروی کی یہ قسط دو بار پڑھ چکا ہوں اور ابھی بھی دل مانگے اور کے مصداق شاید تیسری بار بھی پڑھ ڈالوں۔ ماروی کے بعد شیش محل پڑھی۔ اس قسط میں کچھ خاص مزہ نہیں آیا۔ ایک بڑی کہانی، زبردست۔ یہ اپنے منظر امام بھی کیا خوب لکھتے ہیں۔ مسافر ایک ایسا کردار تھا جو دنیا کی سب سے بڑی کہانی لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی لکھی ہوئی تمام کہانیاں بچکانہ طرز پر تھیں۔ پھر اس نے ایک بڑی کہانی لکھی۔ آخری صفحات پر سلیم فاروقی کی آمد نے خوش کر دیا۔ بہشت زار، لاعلمی اور آخری خواہش بہترین تھیں۔" (تبصرے کا شکریہ)

⊠ عبدالجبار رومی انصاری، لاہور سے تشریف لائے ہیں "پراسرار ہوا کے جھونکے نے دوشیزہ کو بھی پراسرار بنا دیا کہ جون ایلیا کی محبت بھری صدا سنائی دی جو گنگنا رہی تھی کہ محبت موسم بدل دیتی ہے لیکن اگر اپنے اندر کی آواز سنی جائے، تب۔ ورنہ خالی خولی محبت اور اس کے دعوے جھوٹ کی بنیاد پر بیڑا غرق کر دیتے ہیں اور اس کی واضح مثال پاکستان کی عوام کے ساتھ حکمرانوں، سیاست دانوں کی جھوٹی محبت اور جھوٹے وعدوں کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی اور وقت نے ایک دفعہ پانامہ لیکس کی صورت میں خطرے کی گھنٹی بجا ہی دی ہے۔ خطوط کی محفل کی زینت جو مبارک باد کی مستحق ہیں، وہ ہیں سندھ جو ناری زرین آفریدی، بہت اچھا تبصرہ لکھا ہے۔ مرحا گل بھی اداس اداس نظر آئیں۔ جی بالکل جو دنیا میں آیا ہے اس نے واپس بھی جانا ہے اور ہم صبر ہی کر سکتے ہیں۔ حنا عروج کا مجھے بھی پتا نہیں چل سکا بہرحال یمنیٰ احمد سے دلی تعزیت ہے۔ اللہ آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ حمنا ناز کشمیر جنتِ نظیر سے آپ نے بھی محفل کو چار چاند لگا دیے، برتھ ڈے کی مبارک ہو۔ اس دفعہ نئے تبصرہ نگاروں کی شمولیت بہت اچھی لگی۔ "سب نوں جی آیاں نوں" بہشت زار میں شیخ الجبال کا کردار دہشت گردوں کے سرپرستِ اعلیٰ جیسا ہے۔ اب دیکھتے ہیں جبار اور اسد کو دوبارہ کیسی جنت ملتی ہے۔ باقی الیاس سیتاپوری نے کہانی میں کمال کی دلچسپی پیدا کی ہے اور کمال تو اسما قادری بھی کر رہی ہیں جو زندگی کی رعنائیوں سے بھرپور تحریر دے رہی ہیں۔ شیش محل میں انہوں نے چاند بانو اور ہما کو ایک دوسری کے مقابل کھڑا کر دیا اور شیش محل کا شہزادہ فاروق تو سب کے ساتھ پورا انصاف کر رہا ہے۔ دیکھتے ہیں آگے چل کر کیا ہوتا ہے؟ اور مشکل حالات سے دوچار جوزفین کی ڈائری بھی ورق پلٹ رہی ہے۔ منظر امام کی پُرفکر تحریر ایک بڑی کہانی نے اینڈ پہ چونکا دیا۔ مسافر واقعی گریٹ تھا جس نے اپنی کہانی دلوں پر لکھ ڈالی۔ بابر نعیم کی کہانی میں بھوت تو نظر نہیں آیا لیکن اینڈریو کے ناول نگار ہیریسن کو قتل کرنے سے اس کے ذہن میں ہیریسن کا بھوت وہم کی صورت میں بیٹھ گیا جس سے وہ کوئی کتاب نہیں لکھ سکا۔ ارسلان کو بچانے کے لیے لڑکیوں نے جان دی اور ارسلان سزائے موت بن کر وطن دشمنوں سے نبرد آزما رہا جو وطن دشمنوں کے لیے دہشت گرد اور محب وطن کے لیے سرفروش ہیرو تھا جو بالآخر اپنا فرض پورا کر چکا تھا۔ رمشا کو بھی ذہانت کی داد دینی پڑے گی۔ سلیم فاروقی نے سسپنس سے بھرپور کہانی دی۔ بہت اچھی لگی۔ قلبی آواز کا نام یقین ہے، لاٹھی ٹیک کر دنیا بھر میں سفر کرنے سے دشوار چیز موت ہے اور اللہ کے ولیوں کے اقوال رائگاں نہیں ہوتے۔ حضرت ابوسفیان ثوریؒ جن کی حکمت سے بھرپور باتیں لوگوں کو حیران کر دیتی تھیں۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی اثر انگیز تحریر جو ان کی ہر تحریر کی طرح دلوں پر نقش چھوڑ جاتی ہے بہت اچھی لگی۔ بدطینت، اجمل شاہ آخر کب تک چھپتا پھرتا؟ یاسمین شوکت کے فلیٹ کا معاملہ نمٹانے کے بعد کہانی میں تشنگی باقی رہ گئی تھی، جو مرزا امجد بیگ صاحب نے شوکت کا کیس لے کر شاہ جی کو دارالعمل میں گھسیٹ لائے اور کہانی کو مکمل کر دیا۔ زبردست...... محفل شعرو سخن میں اس بار رعنا رضوی، محمود الٰہی اور محمد خواجہ، کورنگی کا انتخاب اچھا لگا۔"

⊠ انجم کمال، کراچی سے حاضر محفل ہیں۔ "والدین اس دنیا میں اولاد کے لیے سایہ دار درخت کے مانند ہیں جن کا نعم البدل کوئی رشتہ ہو ہی نہیں سکتا۔ جو اولاد کو ہر خوشی، ہر سہولت دینے کے لیے اپنی تمام عمر... تگ و دو میں گزار دیتے ہیں ان آنکھوں میں اولاد کی خوشیوں کے خواب جگمگاتے رہتے ہیں۔ غرضیکہ والدین نہ ہوں یا ان میں سے کوئی ایک بھی نہ ہو تو ان کی کمی تاعمر رہتی ہے۔ پچھلے ماہ اطہر حسین کے والد خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اللہ انہیں اعلیٰ درجات عطا فرمائے، آمین۔ کہانیوں میں شیش محل پڑھی۔ کہانی کا پھیلاؤ سست رفتاری سے سہی مگر دلچسپ انداز میں ہو رہا ہے۔ اسما قادری صاحبہ کی کہانی پر گرفت مضبوط نظر آتی ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ جوزفین کی ڈائری میں آگے کیا کیا انکشافات ہوتے ہیں اور جولیٹ ان کی روشنی میں آگے

کیا لائحہ عمل ترتیب دیتی ہے۔ ادھر فاروق کا مرض ٹھیک ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ کہانی میں ایکشن اور تھرل کی کمی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ اقساط میں دونوں چیزوں کی کمی دور کردی جائے گی۔ ماروی میں کہانی اچانک بدل گئی ہے۔ ہم زاد کے ہاں عجوبہ بچے کی پیدائش نے کہانی کو بدل کے رکھ دیا ہے۔ عابد علی منگی نامی بچے میں حیرت انگیز خصوصیات ہیں اور یہودی اس بچے کو حاصل کرنے کے لیے سازشوں میں مصروف ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عابی آگے چل کر کیسے دشمنوں کے چھکے چھڑاتا ہے۔ بہشت زار کہانی انتہائی دلچسپی کی حامل ہے اور پڑھ کر نہایت مزہ آرہا ہے۔ دیکھیے آگے مصنوعی جنت کے راز سے کس طرح پردہ اٹھتا ہے۔ سزائے موت سلیم فاروقی کی انتہائی تیز رفتار کہانی تھی۔ پتا ہی نہ چلا کب شروع ہوئی اور کب ختم ہوئی۔ بہرحال کہانی میں حب الوطنی کے جذبے کو اجاگر کیا گیا۔ ایک بڑی کہانی منظر امام کی انتہائی اچھی کہانی تھی۔ منظر صاحب واقعی دلوں کو چھو لینے والی کہانی لکھتے ہیں۔ ان کی تحریر میں اثر ہوتا ہے۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر انتہائی اثر انگیز اور روح پرور تھی۔ مرزا امجد بیگ کی دارالعمل بھی ٹھیک تھی۔ زیادہ مزہ نہ دے سکی۔ یہ ہماری اپنی رائے ہے۔ ضروری نہیں سب اس سے اتفاق رکھیں۔ باقی چھوٹی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں۔"

※ ناہید یوسف، اسلام آباد سے خوشی کا اظہار کررہی ہیں "زندگی میں پہلی بار کسی رسالے کو ہاتھ لگایا۔ وہ اس طرح کہ ایک کام سے باہر جانا ہوا، کچھ سامان خریدا۔ واپسی میں ایک بک اسٹال پر نظر پڑی۔ نہ جانے کیا ہوا کہ قدم خود بخود اٹھتے چلے گئے۔ وہاں نظر ٹھہری تو سسپنس پر۔ پتا نہیں کیوں ٹائٹل کو دیکھ کر عجیب سا احساس ہوا۔ پھر کیا تھا، زندگی میں پہلی بار ڈائجسٹ خرید کر ورلڈ ریکارڈ قائم کرلیا۔ اب گھر آئی تو سوچا کبھی ڈائجسٹ پڑھا ہی نہیں۔ کس ٹائم پڑھوں، سو گھر کے کام نمٹا کے دوپہر میں سکون سے بیٹھی اور پڑھنا شروع کیا۔ سب سے پہلے تو فہرست دیکھی، اس کے بعد انشائیہ۔ کیا خوب لکھا ہے جون ایلیا صاحب نے، مزہ آگیا۔ پھر دیکھا تو حیران رہ گئے۔ بھئی مختلف قارئین کے خطوط بھی شائع ہوئے تھے۔ بڑی دلچسپی سے تمام افراد کے خطوط پڑھ ڈالے اور یقین جانیے ہمیں لگا کہ تمام افراد ایک فیملی ہوں اور بالکل گھر جیسی محفل سجی ہو۔ بہت خوشی ہوئی۔ ہم نے بھی سوچا کاش ہم بھی اس محفل کا حصہ ہوں۔ اسی کاش کو یقین میں بدلنے کے لیے کاغذ قلم اٹھایا اور لکھنے بیٹھ گئے۔ پھر کیا تھا۔ الفاظ کی آمد خود بخود شروع ہوگئی اور ہم حیران رہ گئے کہ کبھی کسی کو خط نہیں لکھا مگر پھر بھی خط لکھ رہے ہیں۔ (آپ کے سسپنس سے تعارف اور محفل میں شرکت پر ہم بھی حیران ہیں...... بہرحال پہلی بار شریک ہوئیں۔ خوش آمدید) خیر یہ تو تھی ہماری آمد کی کہانی۔ اب ذرا آپ کے بہترین رسالے کی خصوصیات کا بھی ذکر ہوجائے۔ سب سے پہلے بہشت زار کا مطالعہ کیا۔ واقعی پڑھ کر اس میں کھو گئے۔ بہت زبردست کہانی ہے۔ اس کے بعد شیش محل پڑھی۔ حالانکہ کئی اقساط چھوٹ چکی ہیں تاہم خلاصہ دیکھ کر پہلے کہانی کو ذہن میں بٹھایا اور پڑھنا شروع۔ کہانی بہتر ہے مگر اس میں وہ بات نہیں کہ پڑھنے والا اس کے سحر میں کھو جائے۔ شیش محل پڑھ کے ہم سو گئے اور پھر رات کو ہمیں جاگ کر اٹھے۔ کیونکہ ہمارا پلان تھا کہ جب سب سو جائیں گے تو پھر رسالے کا مطالعہ کریں گے۔ خیر رات 12 بجے رسالے کو دوبارہ کھولا۔ فہرست پر نگاہ دوڑائی اور قرعہ فال ماروی کے نام نکلا۔ واہ بھئی واہ۔ زبردست کہانی ہے۔ کہانی میں ایکشن بھی ہے اور نت نئی چیزیں۔ مزہ آگیا پڑھ کے۔ پھر ہم ایک کپ چائے بنا کر لائے اور چھوٹی کہانیوں کا مطالعہ شروع کیا۔ جس میں ہمیں منظر امام کی کہانی بہت اچھی لگی۔ ساری نیند بھی بھاگ گئی... ٹائم دیکھا تو تین بج رہے تھے اور ہمیں صبح جلدی اٹھنا تھا، سو باقی کا کل پر چھوڑ دیا۔ دوسرے دن بھی ہم نے رات کو پڑھنے کا پلان بنایا اور ایک بار پھر وہی عمل دہراتے ہوئے 12 بجے اپنے کمرے میں آکر ورق گردانی شروع کردی۔ اب ہمارے سامنے تین کہانیاں تھیں۔ سوچا پہلے کسے پڑھیں سو حضرت سفیان ثوریؒ کے ایمان افروز واقعات پڑھے۔ دل میں طمانیت پھیل گئی۔ اس کے بعد مرزا امجد بیگ کی دارالعمل اور سلیم فاروقی کی سزائے موت پڑھی۔ دونوں کہانیاں اچھی تھیں تاہم سلیم فاروقی کی کہانی میں قتل و غارت گری زیادہ دکھائی گئی۔ خیر رسالہ پڑھ کے دل خوش ہوگیا اور ہم نے تہیہ کرلیا کہ آئندہ پابندی سے رسالہ خریدیں گے اور خاص بات یہ کہ ہم بور نہیں ہوئے، کہانیوں نے ہمیں اپنے حصار میں لیے رکھا۔"

※ ایم عمران جونانی، رنچھوڑ لائن کراچی سے تبصرہ کررہے ہیں "الیاس سیتاپوری کی بہشت زار نے آنکھوں کے پردے ہٹا دیے۔ ایک طرف خواہش کے مارے اندھے لوگ، دوسری طرف وہ مفاد پرست جو انہیں فدائی بنا کر اپنا الو سیدھا کررہے ہیں۔ دوسری قسط کا انتظار رہے گا۔ سلیم فاروقی کی سزائے موت میں فکشن کا مسالا کچھ زیادہ ہی تیز تھا خاص کر آخر میں کافی غیر فطری انداز میں کہانی کو سمیٹا گیا۔ کہانی کی اٹھان، منظر نگاری اور پلاٹ پسند آیا۔ تنویر ریاض نے ترجمے کے لیے بڑی خوب صورت کہانی کا انتخاب کیا اور ان کے ترجمے کی روانی کے تو ہم پہلے ہی معترف ہیں۔ مائیک نے بڑی بے جگری سے لفافہ واپس کرکے ساتھ گناہ دھونے کی کوشش کی اور اینا کے لیے اپنے دل میں چھپی محبت کا ثبوت دیا۔ کہانی وہ جاندار ہوتی ہے جس کا آغاز ہو، درمیان ہو اور انجام ہو۔ بابر نعیم کی بھوت کے آخر میں لکھے یہ الفاظ اسی کہانی پر صادق آتے ہیں، دل خوش کردیا، بہت خوب۔ شیش محل کی یہ قسط پہلے سے بھی اوپر کی چیز ہے، کہانی دلچسپ انداز میں رواں ہو تو منظر نگاری اور دیگر تفصیلات کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے، پہلے چرچ کی سیر اس کے بعد شملہ کے بازار میں خریداری کے ساتھ ساتھ جوزفین کی سوانح اور پھر آخر میں بملا، چاند بانو اور فاروق کا ٹکراؤ، مزہ آگیا۔ عزم وہمت، بلند حوصلے اور زندگی سے بھرپور تحریر معذور بازیگر جینے کا حوصلہ دے رہی ہے۔ آج ہمارے ہاں نوے فیصد لوگوں کو اسمٰعیل کا زندگی نامہ بار بار پڑھنے کی ضرورت ہے۔ ویلڈن علیم اقبال صاحب۔ عام طور پر اولیائے کرام اور صوفیا کے حالات بیان کرتے ہوئے مبالغہ آرائی سے کام لیا جاتا ہے۔ من گھڑت روایات طوالت کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں لیکن ضیا صاحب کا خاصہ ہے کہ متعلق علیہ قسم کے حالات و واقعات قدرے اختصار کے ساتھ جامع پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ امجد بیگ سیریز نے اس ماہ بھی اپنے نام کی لاج رکھی، جس سادگی کے ساتھ حقیقی رنگ میں سب کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ثمر عباس کی آخری خواہش مجھے بالکل پسند نہیں آئی۔ ایک عجیب سی مغربی کہانی کے ترجمے کے لیے کافی قیمتی صفحات ضائع کیے گئے۔ یہ جگہ کسی خوب صورت تحریر کو دی جاتی تو اچھا ہوتا۔ منظر امام

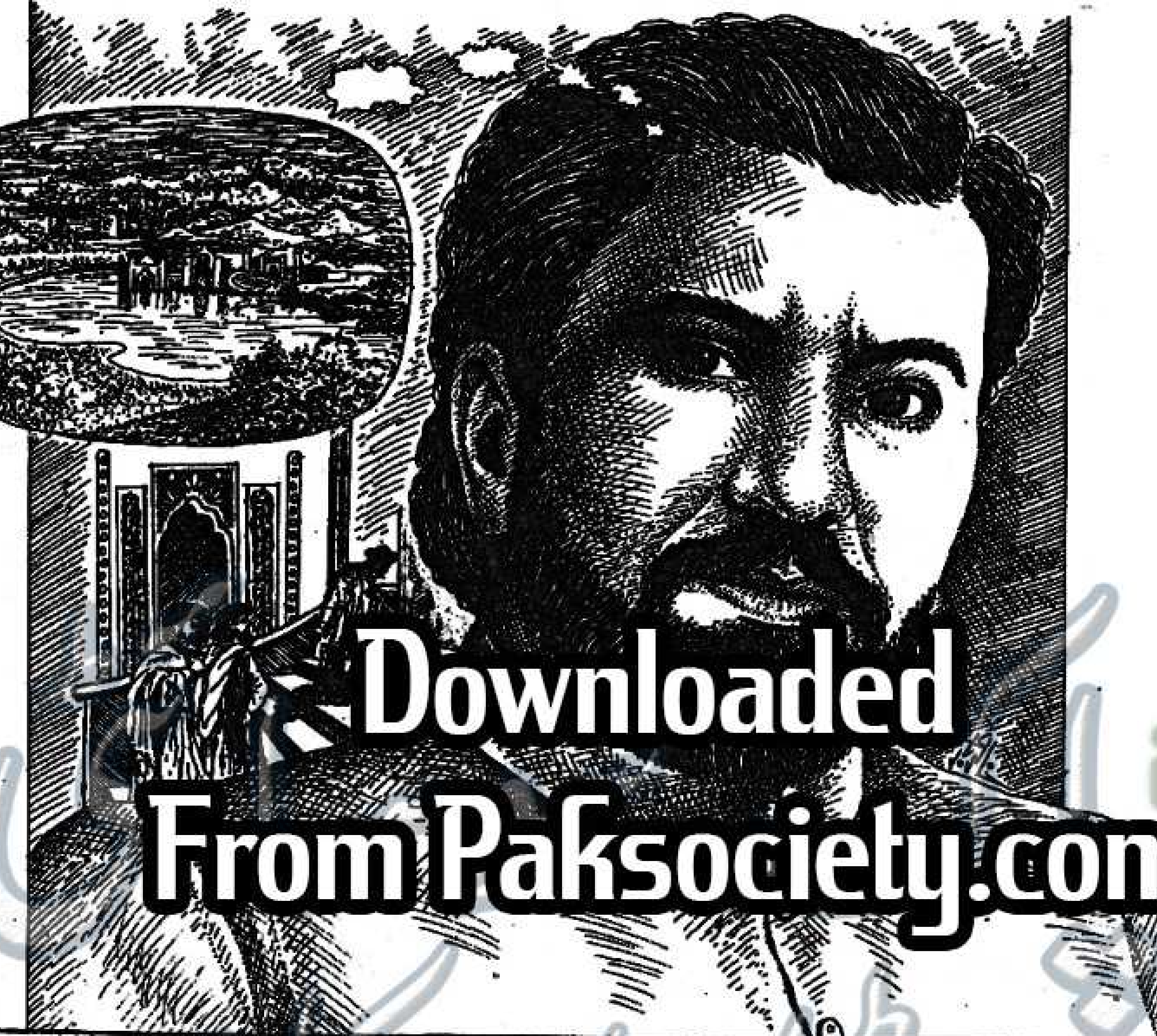
صاحب آپ تو واقعی بڑی کہانی لکھنے لگے ہیں، بالکل اچھوتا رنگ ہے۔ پہلے روٹیاں بھی اسی طرح گہری چھاپ چھوڑ گئی تھی۔ محفل شعروسخن میں قدرت نیازی، ایم خواجہ، مرحا گل، احمد علی، ولید عباسی، جنید احمد ملک، ریاض بٹ اور عابد جہانگیر کا انتخاب دل کو چھو گیا۔ شمارے کا دل آپ کے خط ہیں۔ ٹھیک کہا آپ نے اس محفل میں 'دھرنا' نہیں لیکن 'ورنہ' بہت سے ہیں۔ بھائی وارث علی! اچھا ہے نا آپ اکیلے ہی پورے شہر کی طرف سے چھائے ہوئے ہیں۔ سہیل شہزاد، رانا احمد اور دوسرے تمام اسیر بھائیوں کو مالک، عافیت کے ساتھ رہائی دے۔ مرحا گل اا اپنے آفس والے چھٹی دیں تو ادارے کے دفتر چکر لگا ئیں نا، حالانکہ پڑتا ہمارے راستے میں ہے۔ قدرت نیازی نے بڑا بھرپور تبصرہ کیا۔ دوستوں سے نوک جھونک کا انداز بہترین ہے۔ حمنا شاہ خوش آمدید سالگرہ مبارک۔ رومی انصاری سچ کہا آپ نے ربن دادا کا کردار واقعی زبردست ہے۔ آخر اس کے جد امجد مغل دادا (بازیگر) کسی سے کم تھے کیا۔ ویسے زرین آفریدی، رانا حبیب، مرحا گل، فیاض ایوب، تحریم شاہ، ایم خواجہ، طاہرہ گلزار، رانا بشیر اور صفدر معاویہ کے تبصرے بہت بہت پسند آئے۔'' (اتنی خوب صورت تبصرہ نگاری کا شکریہ)

⊠ ثنا صادق کی کراچی سے آمد ''ویسے تو زمانۂ طالب علمی میں بہت سے ڈائجسٹ پڑھے تاہم شادی کے بعد مصروفیت کے باعث مطالعہ کم ہو گیا مگر پھر بھی جاری رہا۔ ہاں سسپنس پڑھنے کا اتفاق یوں ہوا کہ ہمارے شوہر صاحب سسپنس پڑھتے ہیں۔ یہ ان کا معمول ہے کہ آفس سے آنے کے بعد آرام اور رات کا کھانا کھا کر وہ روز تھوڑی دیر سہی مگر سسپنس پڑھتے ضرور ہیں۔ ایک دن ہم بھی ان کی غیر موجودگی میں سسپنس لے کر بیٹھ گئے اور یقین جانیے کہ پڑھتے ہی چلے گئے یہاں تک کہ ہمارے شوہر صاحب آفس سے آگئے۔ بہت اچھا رسالہ ہے۔ محی الدین نواب کی تو ہم نے بہت دھوم سنی تھی تاہم جب ان کی کہانی پڑھی تو اندازہ ہو گیا کہ یہ دھوم ایسے ہی نہیں تھی۔ بہت تیز رفتار کہانی جاری ہے سسپنس میں۔ ماروی کے تمام کردار اپنی اپنی جگہ نگینے کی طرح فٹ ہیں۔ خاص کر مراد اور ہم زاد اور راب عابی۔ جس کے کمالات اور.... خصوصیات واقعی حیرت انگیز ہیں۔ کہانی آگے چل کر انتہائی دلچسپ ہونے والی ہے۔ اب دیکھیں آگے کیا ہوگا۔ اس کے بعد دوسری سلسلے وار کہانی شیش محل پڑھی۔ کہانی تو اچھی ہے مگر جملوں کی طوالت کہانی کی تیز رفتاری پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ اسما قادری اچھا لکھتی ہیں۔ چھوٹی کہانیوں میں لاعلمی اور تحویر ریاض کی کفارہ بہت اچھی لگیں۔ اس کے علاوہ ثمر عباس کی آخری خواہش اور علیم اقبال کی معذور بازی گر بھی زبردست تھیں۔ ہاں منظر امام صاحب کی ایک بڑی کہانی بہت شاندار تھی جس میں مسافر نامی کہانی کار کی کہانیاں تو شائع نہ ہو سکیں مگر اس نے لاوارث بچوں کی کفالت کر کے ایک شاہکار کہانی لوگوں کے دلوں پر تحریر کر دی۔ واقعی یہ ایک بڑی کہانی تھی۔ سلیم فاروقی صاحب کی سزائے موت بھی بہتر تھی جس میں حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ارسلان نے جرم کرنے والوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا اور خود ہمیشہ کے لیے ہیرو بن گیا۔ مرزا امجد بیگ کی دارالعمل میں بیگ صاحب نے نہایت ذہانت سے قتل کے جرم میں قید ایک بے گناہ کو آزاد کروایا۔ امید ہے کہ میرا پہلا خط شاملِ اشاعت ہوگا۔ ویسے تو ہمیں لکھنا نہیں آتا مگر ہم اتنا برا بھی نہیں لکھتے۔ تمام قارئین محفل کو ہماری طرف سے ڈھیر ساری دعائیں۔ اللہ سسپنس کو ترقی دے۔''

⊠ جنید احمد ملک، گلستان جوہر، کراچی سے محفل میں شریک ہیں ''سسپنس کا بہت پرانا قاری ہوں، اس سے پہلے بھی خط لکھ چکا ہوں مگر بلیک لسٹ میں صرف نام ہی شائع ہوا، لیکن اس مرتبہ پھر اس امید کے ساتھ خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ شاید محفل میں شریک ہو جاؤں۔ سسپنس ہاتھوں میں آتے ہی سب سے پہلے ایک نظر فہرست پر ڈالی اور اس کے بعد جون ایلیا جیسے صاحب نظر کی محفل میں شرکت کرنے پہنچ گئے۔ 'راکھ اور دھواں' کے عنوان سے لکھا گیا انشائیہ ہر دفعہ کی طرح ایک پُر فکر تحریر تھی۔ اس کے بعد ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر میں حضرت سفیان ثوریؒ کی حیات پر جاننے کا موقع ملا۔ بے شک سسپنس میں صوفیائے کرام کی حالاتِ زندگی پر شائع ہونے والا یہ سلسلہ بے حد معلوماتی اور ایمان کو تازہ کرنے والا ہے۔ الیاس سیتا پوری بھی تاریخی کہانی میں بہشت زار کا پہلا حصہ لے کر آئے۔ بے حد معلوماتی اور دلچسپ سلسلہ ہے۔ وہ مفاد پرست لوگ جو اپنے مفاد کی خاطر سیدھے سادے لوگوں کو فدائی بنا کر اپنا الو سیدھا کر رہے ہیں۔ ایک عمدہ تحریر جس کی دوسری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ شیش محل جو اسما قادری کی بہترین شاہکار تحریر ہے اس مرتبہ بھی پوری کہانی میں شروع سے آخر تک نظریں ہٹانے کو دل نہ چاہا اور جب کہانی ختم ہوئی تو ایسا لگا کہ کاش کہانی کے چند صفحات اور ہوتے۔ ربن دادا کا کردار بہت پاورفل ہے۔ اس کے بعد خطوط کی محفل میں پہنچے اور اداریہ سے مستفید ہوئے، واقعی اداریہ میں کی گئی باتیں دل پر اثر کر گئیں اور کچھ دیر تک گم صم بیٹھا رہا (ارے بھئی کیوں...... کیا گم ہو گیا تھا؟) پھر آگے بڑھا اور محفل میں شریک دوستوں کے خوب صورت تبصرے پڑھ کر اداسی کافی حد تک کم ہو گئی لیکن پھر اپنا خط شائع نہ ہونے اور بلیک لسٹ میں نام شائع ہونے پر کچھ مایوسی ہوئی بہرحال 'ہے جذبہ جنوں تو ہمت نہ ہار' کے مصداق پھر خط لکھ رہا ہوں (شاباش مشق جاری رکھیے)۔ محفل شعروسخن میں شامل اشعار کا معیار عمدہ ہے۔ تمام اشعار بہت پسند آئے۔ ماروی بھی بہت اچھی جا رہی ہے کہانی پڑھتے ہوئے نواب محی الدین صاحب بہت یاد آئے، اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ سسپنس میں کاشف زبیر کی کہانی شامل نہ دیکھ کر ایک تشنگی کا احساس ہوا۔ اللہ ان کی بھی مغفرت فرمائے اور حنا عروج جو اکثر اپنی بیماری کے دوران بھی محفل میں شریک ہوتی رہی ہیں...... اللہ انہیں بھی جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے (آمین) کوٹیشن تمام ہی بہترین تھیں۔ باقی کہانیاں ابھی نہیں پڑھیں اس لیے ان پر تبصرہ نہیں کر سکا۔'' (یہ تو کوئی بات نہ ہوئی...... بہرحال سسپنس سے آپ کی محبت کا شکریہ)

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

حمیرا اقبال، کوٹری۔ آسیہ جہانگیر، ملتان۔ وسیم احمد، راولپنڈی۔ ذوہیب احمد ملک، کراچی۔ نعیم احمد، سکھر۔ جبران احمد ملک، حیدرآباد۔ زریان سلطان، رنچھوڑ لائن، کراچی۔ عاصم خان، کراچی۔ مدیحہ افتخار، بہاولپور۔ شمشاد اختر، اسلام آباد۔ صبا سحر، نواب شاہ۔ عمران احمد، چنیوٹ۔ اویس کمال، حیدرآباد۔ صنم جاوید، ایبٹ آباد۔



بہشتِ زار

الیاس سیتاپوری

منگول قلعه الموت کا رخ کرتے ہیں... تاریخِ اسلام کے زبردست لوگ جو فدائی کہلاتے تھے اور جن سے بڑی بڑی طاقتیں خوفزدہ رہتی تھیں، ان کی داستان ... جن سے نہ تو مسلمان محفوظ تھے، نہ عیسائی... ان کی بہشتِ ارضی میں جنت کی آسائشیں اور نعمتیں یکجا کردی گئی تھیں۔ ایک لائق ترین انسان نے اپنی استطاعت، ذوق اور وسائل کو بروئے کار لاکر ایک ایسا نظام اور سامان مہیا کرکے اس کی مدد سے انسانی نفسیات کو اپنی مرضی کے مطابق موڑا اور کام میں لیا ..... لیکن اس طلسم کو متمدن دنیا کی کوئی طاقت بھی نہ تو دبا سکی اور نہ ان کا مقابلہ کرسکی ان تمام معاملات کو وحشی جبلت کے چالاک اور ذہین منگولوں نے صفحہ ارض پر داستان پارینہ کی صورت رقم کردیا۔ تاریخ کا عجیب وغریب دور، ماضی کے انوکھے اور حیرت انگیز لوگوں کی کہانی

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات



اس بار جبار اور اسد نے صوفی کا روپ بھرا۔ انہوں نے اپنے بوسیدہ لباس کو بوسیدہ کمبل میں چھپا کر نیہ کا رخ کیا، انہیں معلوم تھا کہ ہلاکو خان اور اس کے فوجی سردار تارک الدنیا لوگوں کو نہیں چھیڑتے۔ ان کے دل ودماغ پر ایک ہی نشہ طاری تھا...... بہشت زار میں دوبارہ داخلہ اور ذتوبیہ اور دوسری حوروں سے ملاقات۔

دونوں کوہستانی سلسلوں سے نکل کر ایک میدان میں داخل ہوئے۔ یہاں کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ان دونوں نے اپنے اردگرد سرسبز زمینیں دیکھیں، پرندوں کی چہکاریں سنیں اور پھولوں کی ملی جلی خوشبوئیں محسوس کیں۔ انہوں نے گھڑسواروں کو گرد و غبار کے بگولوں میں اٹا اور چھپا ہوا بھاگتے دیکھا۔ نیہ کے میدان تک پہنچتے پہنچتے ان دونوں نے صوفی کی حیثیت سے اچھا خاصا تعارف حاصل کر لیا تھا۔ جہاں بھی ٹھہرے لوگوں نے ان کے ہاتھ چومے اور خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ انہوں نے ہلاکو خان کے لشکر میں داخل ہونے سے پہلے ہی یہ منصوبہ بنالیا تھا کہ انہیں ہلاکو سے دور دور رہنا ہے اور مسلمان تاجروں، دین داروں اور عالموں میں اپنا ایک مقام بنانا ہے، پھر جب وہ کچھ عرصہ وہاں رہ کر اپنا اعتماد قائم کرلیں گے تو ایک دن ہلاکو خان کو سرِراہ کہیں روک کر اپنی ایک درخواست اس کی خدمت میں پیش کریں گے اور جب اس درخواست کو وہ کسی سے پڑھوا کر سن رہا ہوگا تو جبار اور اسد ایک ساتھ حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دیں گے۔

ہلاکو کے لشکر میں مسلمان کاریگروں کی بڑی بہتات تھی۔ یہ لوگ اسلحہ تیار کرتے تھے۔ تلواریں، شمشیریں، خنجر، پیش قبض، تیر کمان، نیزے۔ یہ لوگ معمولی پڑھے لکھے، خوش اعتقاد اور سادہ لوح تھے۔ جبار اور اسد کو معلوم تھا کہ ان کا تصوف انہی لوگوں میں مقبول ہوسکتا تھا۔

یہ دونوں اپنی وضع قطع سے تارک الدنیا نظر آتے تھے۔ انہوں نے ایک جگہ دھونکنی سے بھٹی کی آگ کو تیز ہوتے دیکھا۔ اس تیز آگ میں لوہا پگھلایا اور مختلف شکلوں میں ڈھالا جارہا تھا۔ یہ دونوں اس منظر کو دیکھنے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ لوہار ایک ہاتھ سے دھونکنی چلا رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے ایک چمٹے کے ذریعے لوہا پکڑ رکھا تھا پھر جب وہ لوہا گرم ہوگیا تو اسے آگ میں سے نکال کر ایک نوجوان کے ذریعے اس پر گھن لگوانے شروع کر دیے۔

لوہار نے کام کرتے کرتے اچانک ان درویشوں کو جو دیکھا تو کام چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ ”آؤ اللہ والو! میری خوش قسمتی جو آپ دونوں میرے پاس کھڑے ہوئے۔“

جبار نے جواب دیا۔ ”حداد! تو اپنا کام جاری رکھ، واللہ ہم تیرے کام سے عبرت اور نصیحت پکڑ رہے تھے۔“

لوہار نے خوشامدانہ انداز میں پوچھا۔ ”اللہ والو! وہ کس طرح؟ مجھ کم عقل کو بھی کوئی نصیحت کیجیے۔“

جبار نے جواب دیا۔ ”جب لوہا آگ میں تپ کر لال ہوجاتا ہے تو اس سے جو چاہو بنالو۔ اسی طرح جب انسان عبادت اور ریاضت کی بھٹی سے تپ کر نکلتا ہے تو پھر یہ جو چاہے بن سکتا ہے۔“

لوہار اس تشبیہ اور مثال سے بہت خوش ہوا، بولا۔ ”بابا لوگ! آپ ٹھہرے کہاں ہیں؟“

اس بار اسد نے جواب دیا۔ ”بابا! ٹھکانے تو دنیاداروں کے ہوتے ہیں۔ ہم تارک الدنیا، خانہ بدوش لوگ، جہاں رات ہوئی وہیں بسرام کیا۔“

لوہار کام بند کر چکا تھا۔ گھن چلانے والا نوجوان بھی چپ چاپ بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔

جبار نے کہا۔ ”کیا تو اپنے کام سے مطمئن ہے؟“

لوہار نے جواب دیا۔ ”بالکل نہیں، قطعی نہیں۔“

جبار نے کہا۔ ”تب پھر تجھے کیا کہیں؟ استغنا ہی ایک ایسی چیز ہے جو ہر کسی کے پاس نہیں ہوتی۔ یہ جس کے پاس ہوتی ہے، اسے دوسروں سے بڑا کر دیتی ہے۔“ پھر پوچھا۔ ”بابا تیرا نام کیا ہے؟“

لوہار نے جواب دیا۔ ”بابا! مجھے تو لوگ نور احمد حداد کہتے ہیں۔“

جبار نے کہا۔ ”بہت خوب، بہت خوب۔“

اس کے بعد لوہار دونوں کی خوشامدیں کر کے اپنے خیمے میں لے گیا۔ اس خیمے میں لوہار کا چھوٹا سا خاندان بھی رہتا تھا۔ اس کی بیوی اور دو بچے۔ اس کی بیوی اس دوران اپنے خیمے کی صفائی ستھرائی میں مشغول رہی اور نور احمد حداد ان دونوں کو لیے باہر کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد انہیں خیمے میں داخلے کی اجازت دی گئی۔ حداد کی بیوی یہ جان کر بہت خوش ہوئی کہ اس کے خیمے میں دو اللہ والے آئے ہوئے ہیں۔ دونوں نمازیں بڑی پابندی سے پڑھتے تھے اور رہبانیت کی فضیلتیں بیان کرتے رہتے تھے۔

حداد اپنے خیمے میں بیٹھا گپ شپ میں مصروف تھا کہ ایک صاحب اجازت لے کر اندر داخل ہوئے اور دونوں کی طرف گھورتے ہوئے بولے۔ ”نور احمد! کیا یہی تیرے وہ مہمان ہیں جن کی شہرت تیزی سے پھیلتی جارہی ہے؟“

نوراحمد نے فخریہ جواب دیا۔ ''کیا یہ مہمان میرے نہیں، تیرے ہیں۔ یہ کیسا سوال کر رہا ہے تو؟''

آنے والے نے کہا۔ ''بابا! اگر یہ دونوں واقعی خدا رسیدہ ہیں تو ان سے میرا ایک کام کرا دے۔''

نوراحمد نے پوچھا۔ ''کون سا کام؟''

اس نے نوراحمد کے کان میں کچھ کہا جس پر نوراحمد قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ بولا۔ ''کیا کام لایا ہے تو! تو نے تو کمال کر دیا۔ بھئی خوب۔''

اس شخص نے کہا۔ ''اگر میرا یہ کام نہ ہو سکا تو میں خودکشی کر کے مرجاؤں گا۔''

نوراحمد نے ہنس کر کہا۔ ''تو یہ بات ہے، یہاں تک پہنچ گئی وہ بات۔''

جبار ان دونوں کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا، پوچھا۔ ''کیا کام ہے اس شخص کا؟''

نوراحمد نے جواب دیا۔ ''ایک لڑکی پر دل آ گیا ہے، وہ کسی اور کو چاہتی ہے۔ بس یہ چاہتا ہے کہ اس لڑکی کو اس سے محبت ہو جائے۔''

جبار نے ذرا سا سکوت اختیار کیا، اس کے بعد بولا۔ ''کام تو ہو جائے گا اس کا لیکن اس میں ذرا وقت لگے گا۔ میں اس شخص کے لیے بطور خاص دعا کروں گا اور مجھے یہ یقین ہے کہ میری دعا رائگاں نہیں جائے گی۔''

اب نوجوان جبار سے براہِ راست مخاطب ہو گیا۔ ''درویش بابا! میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

جبار نے نوجوان کو تسلی دی۔ ''تو مطمئن رہ، میں تیرے لیے دعا کروں گا۔ اللہ میری دعاؤں میں تاثیر دے۔''

چنانچہ رات کو عشا کی نماز کے بعد جبار مصلے پر گر گیا اور رو رو کر اس نوجوان کے لیے دعائیں کرنے لگا اور یہ دعا اس وقت تک جاری رہی جب تک دل کو سکون نہ محسوس ہونے لگا۔ نوراحمد ایک کونے میں کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا، آخر میں پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ دعا کی؟ کیا بتایا تیرے خواب نے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا لیکن دعا کے دوران میں جس سکون سے دوچار ہوا ہوں، اس کے پیشِ نظر کہہ سکتا ہوں کہ اس نوجوان کا کام ہو جائے گا۔''

نوراحمد حداد کچھ کہنا چاہتا تھا مگر نہیں کہہ پا رہا تھا۔

اسد نے جبار کے کان میں کہا۔ ''جبار! اگر تمہاری بات درست نکلی تو جانتے ہو کیا ہوگا؟''

جبار نے پوچھا۔ ''کیا ہوگا؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''ہوگا یہ کہ تمہاری شہرت ہلاکو خان کے کانوں تک پہنچ جائے گی اور وہ پھر دونوں کو فوراً ہی طلب کرلے گا اور اس بار ہمیں جو سزا ملے گی اس دربار سے، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔''

جبار نے پوچھا۔ ''پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہمیں گمنام رہنا چاہیے، گمنامی میں فائدے زیادہ ہیں نقصان کم۔''

جبار نے کہا۔ ''تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہم دونوں یہاں کے لوگوں سے زیادہ میل جول نہ رکھیں۔''

اسد نے جواب دیا۔ ''میری ناچیز رائے تو یہی ہے۔''

جبار نے اسد کے اس مشورے پر بہت غور کیا اور آخرکار اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے خود کو زیادہ شہرت نہیں دینی چاہیے۔

اسد نے کہا۔ ''دیکھو جبار بھائی! اول تو ہمارا اس لشکر میں دوبارہ آنا خالی از خطرہ نہیں ہے پھر......''

اس نے ابھی بات مکمل نہیں کی تھی کہ نوراحمد نے پوچھا۔ ''درویشو! اگر تم دونوں اجازت دو تو میں تم دونوں سے تھوڑا سا کاروبار بھی کرنا چاہتا ہوں۔''

جبار نے پوچھا۔ ''کون سا کاروبار؟ کیسا کاروبار؟''

نور محمد حداد نے جواب دیا۔ ''بزرگو! انسانوں میں ایک بھی ایسا نہیں ملے گا جو کسی مطلب اور لالچ کے بغیر کسی کا کوئی کام کر دے۔ بابا! میں نے تم دونوں کو درویشی میں گم پا کر یہ سوچا ہے کہ جو لوگ تمہارے پاس آئیں جائیں میں ان سے کچھ کاروبار کرلوں، کچھ حاصل کرلوں۔ اس طرح تم دونوں کی شہرت بڑھے گی اور میں کچھ کما لوں گا۔''

جبار کو اس کی بات ماننے میں کچھ تامل تھا مگر اسد نے اس کی بات مان لی، بولا۔ ''بھائی جبار! حداد کی بات مان لو۔ اگر ہماری ذات سے اس کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے تو ضرور پہنچنا چاہیے۔ میری بھی یہی رائے ہے۔''

جبار خود کو بے لوث درویش کہلانا پسند کرتا تھا۔ اس لیے اسد کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ حداد کسی کام سے باہر چلا گیا تو اسد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی، بولا۔ ''بھائی جبار! میری بات سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہم دونوں کی شہرت ہلاکو خان تک پہنچے اور وہ ہمیں ایک بار پھر اپنے دربار میں طلب کرلے اور پھر جلاد کو حکم دے کہ ہم دونوں کو قتل کر دیا جائے۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''لیکن اس طرح تو ہماری

شہرت ہلاکو خان تک ضرور پہنچ جائے گی۔"
اسد نے جلدی سے جواب دیا۔ "یہی شہرت پہنچے گی نا کہ ہم دونوں درویش ہیں اور لوگوں کو ترکِ دنیا کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس شہرت کے پس منظر میں جب ہمیں ہلاکو خان اپنے دربار میں طلب کرے گا تو شاید درویش ہونے کی وجہ سے ہماری تلاشی نہ لی جائے اور ہم اپنے زہریلے خنجروں سمیت ہلاکو خان تک پہنچ کر اس کا کام تمام کر دیں۔"
جبار اسد کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوا، بولا۔ "بہرحال جو کچھ بھی کرو، خوب سوچ سمجھ کر کرو۔ ایسا نہ ہو کہ ہم بلاوجہ ہلاکت میں پڑ جائیں۔"

☆☆☆

نور محمد حداد نے ان دونوں کو خوب مشہور کر دیا۔ حاضریاں دینے والوں کا ہجوم رہنے لگا۔ یہ لوگ آتے اور نہایت ادب سے ان کی بارگاہ میں بیٹھ جاتے۔ دونوں کو بولنے کا طریقہ خوب آتا تھا۔ انہوں نے لوگوں کو ہمہ اوست کا مطلب سمجھایا۔ کسی نے ان سے پوچھا۔ "یہ تصوف میں ہمہ اوست کا کیا مطلب ہوتا ہے؟"
جبار نے جواب دیا۔ "یہاں، یعنی کائنات میں خدا کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔"
ایک ارادت مند نے پوچھا۔ "اور یہ زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، اجرامِ فلکی، اشیائے فرشی، انسان، جانور، سبزہ، باغات، پہاڑ، سمندر...... یہ سب کیا ہیں؟ کیا یہ بھی خدا ہیں؟"
جبار نے جواب دیا۔ "میرے پاس تیرے سوال کا بہترین جواب ہے لیکن جواب سے پہلے میں ایک سوال کروں گا۔"
ارادت مند نے کہا۔ "آپ کیجیے سوال، میں تیار ہوں۔"
جبار نے پوچھا۔ "تیرا نام کیا ہے؟"
اس نے جواب دیا۔ "منصور۔"
جبار نے پوچھا۔ "تیرے پورے ایک وجود کا نام منصور رکھا گیا ہے نا؟ یعنی تو آدمی ہے، انسان۔"
اس نے جواب دیا۔ "ہاں مگر اس سوال سے آپ کا مطلب؟"
جبار نے کہا۔ "حالانکہ تیرے وجود میں مختلف ناموں کی بے شمار چیزیں موجود ہیں۔ ہاتھ، پاؤں، سر، آنکھ، ناک، کان، بال، ناخن، گوشت، کھال، خون، رگیں، شریانیں، دماغ، دل، جگر وغیرہ ان سب کے مجموعے کا نام انسان یا عرفِ عام میں منصور ہے۔ اس مجموعے کی اکائی کا نام ہے انسان، اسی طرح کائنات کی اکائی کا نام ہے خدا۔ یہاں جو کچھ بھی ہے، خدا کے سوا کچھ بھی نہیں۔"
ہر طرف سے واہ واہ سبحان اللہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ لوگوں نے آپس میں سرگوشیاں شروع کر دیں۔ ایک نے کہا۔ "آدمی نہایت عالم و فاضل معلوم ہوتا ہے۔"
دوسرے نے کہا۔ "محض عالم و فاضل ہی نہیں، علومِ باطنی سے بھی بہرہ ور معلوم ہوتا ہے۔"
ایک شخص نے پوچھا۔ "آپ انسان کو مجبور سمجھتے ہیں یا اپنے افعال پر قادر۔"
جبار نے جواب دیا۔ "یہ قادر زیادہ ہے، مجبور کم۔"
اس شخص نے کہا۔ "حضرت ذرا وضاحت سے بیان فرما دیجیے۔"
جبار نے جواب دیا۔ "اگر تجھ پر چھت گر جائے تو تو کس کو برا بھلا کہے گا؟ کیا چھت کو برا بھلا کہہ سکتا ہے تو؟"
اس شخص نے جواب دیا۔ "کسی کو بھی نہیں، چھت کو برا بھلا اس لیے نہیں کہوں گا کہ وہ بے اختیار، مجبور اور بے جان شے ہوتی ہے۔"
جبار نے پوچھا۔ "اور اگر کوئی شخص تجھے پتھر کھینچ مارے تو؟"
اس شخص نے جواب دیا۔ "تو میں مارنے والے کو پکڑ لوں گا اور اس سے پوچھوں گا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟"
جبار نے مسکرا کر پوچھا۔ "شاید تو انسان سے ایسا سلوک اس لیے کرے گا کہ تو انسان کو مجبور نہیں سمجھتا۔"
وہ شخص لاجواب ہو گیا۔ ایک بار پھر حاضرین نے سبحان اللہ، جزاک اللہ، واہ واہ، کی آوازیں بلند کیں۔ غرض اسی طرح ان سے طرح طرح کے سوالات کیے گئے اور انہوں نے ہر سوال کا ایسا ہی جواب دے کر سب کو خاموش کر دیا۔
ہلاکو خان کے لشکر میں ان کا شہرہ ہر طرف پھیل گیا۔ لشکر کے مسلمان تاجر اور دست کار ان دونوں کے گرد پروانوں کی طرح منڈلانے لگے۔ ان آنے والوں میں وہ تاجر بھی شامل تھا جس کے پاس جبار غلام رہ چکا تھا لیکن اب غلام جبار اور درویش جبار میں بڑا فرق ہو چکا تھا۔ اب جبار کے روبرو بیٹھنے والوں کی نظریں نیچی رہتیں اور انہیں زیادہ باتیں نہیں کرنے دی جاتیں۔ اسی طرح دونوں درویش بھی بلاضرورت بولنے سے پرہیز کرتے تھے اور چونکہ اس لشکر میں جبار کا آقا تاجر موجود تھا اس لیے جبار ہر نئے آنے والوں میں اس تاجر کی تلاش کرتا رہتا چنانچہ جب اس تاجر کی شکل نظر آئی تو جبار نے اسد کو حکم دیا۔ "اس شخص سے تو باتیں

کرے گا۔اس سے میں نہیں بولوں گا۔"

اس تاجر کو اسد کے حوالے کردیا گیا۔تاجر ڈرا سہا، مؤدبانہ ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔

جبار نے اسد سے کہا۔"اسد! یہ شخص جو تیرے سامنے ایک گوشے میں منہ لٹکائے بیٹھا ہے، اندر تخلیہ میں چل، میں اس کی بابت چند ایسی باتیں تجھے بتاؤں گا کہ جب تو ان کے حوالے سے اس شخص سے باتیں کرے گا تو یہ تیرا بندۂ بے دام ہوجائے گا۔"

اسد نے تاجر پر ایک اچٹتی سرسری نظر ڈالی اور جبار کے ساتھ اندر چلا گیا۔ ان دونوں کے ہٹتے ہی ارادت مندوں میں تہلکہ مچ گیا۔ وہ اس وہم میں مبتلا ہوگئے کہ آنے والوں میں کوئی نہ کوئی ایسا گناہ گار اور نامراد شخص ضرور موجود ہے جس کی موجودگی ان دونوں درویشوں کو گراں گزری ہے۔

اندر، جبار نے اسد کو سمجھایا۔"یہ شخص جو تیرے سامنے منہ لٹکائے بیٹھا تھا، ایک مشہور تاجر ہے۔ میں اس کا غلام رہ چکا ہوں اور جنت میں ذوبیہ نامی جس دوشیزہ سے ملاقات ہوچکی ہے، وہ بھی اس کی کنیز تھی۔ میری اور ذوبیہ کی گمشدگی سے اس تاجر کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ میرا خیال ہے اس وقت یہ ہم دونوں ہی کی بابت کچھ پوچھے گا۔ اگر تو چاہے تو اس آگہی اور شعور کی روشنی میں اس سے بات چیت کر، یہ تیرا مطیع وفرماں بردار ہوجائے گا۔"

اسد مسکرایا اور جبار کو اندر چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ وہاں پہنچتے ہی اسد نے اعلان کیا۔"لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ ہم دونوں اس وقت اندر کیوں چلے گئے تھے؟"

حاضرین نے پوچھا۔"آپ دونوں اندر کیوں چلے گئے تھے، ہمیں نہیں معلوم۔"

اسد نے جواب دیا۔"ہمیں ازروئے کشف یہ معلوم ہوا ہے کہ تم میں ایک شخص ایسا بھی موجود ہے جو تاجر ہے اور اس نے اپنے سامانِ تجارت میں دو گراں مایہ چیزیں رکھ چھوڑی تھیں۔ ایک تو نوجوان غلام جبار اور دوسری خوب صورت کنیز ذوبیہ۔ مجھے کشف سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ان دونوں کا اللہ کے ہاں بڑا مرتبہ تھا اور اللہ نے ان دونوں کو اس تاجر کے چنگل سے نکلوا دیا۔ اب وہ گناہ گار تاجر میرے پاس اس لیے آیا ہے کہ میں اس معاملے میں اس کی مدد کروں۔"

تاجر نے یہ اعلان سنا تو ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔

اسد نے اپنے ارادت مندوں سے کہا۔"شاید یہی وہ تاجر ہے جس کا میں ابھی ابھی ذکر کرچکا ہوں۔ اس کو میرے پاس لاؤ۔"

لوگوں نے اس شخص کو پکڑ کر اسد کے روبرو پہنچا دیا۔

اسد نے اس کو تسلیاں دیں اور سمجھانے لگا۔"مت رو اے گناہ گار انسان! ہم میں کون ہے جو گناہ گار نہیں ہے۔ اپنے گناہوں پر آنسو بہا دینا اور گناہوں کا احساس کرکے شرمندہ ہوجانا۔ خدا کو انسان کی یہ خوبیاں بہت پسند ہیں۔ پہلے یہ بتا کہ میں نے تیری بابت جو کچھ بتایا ہے وہ کہاں تک درست ہے؟"

تاجر نے روتے ہوئے جواب دیا۔"پیرومرشد! آپ نے جو کچھ فرمایا اس کا ایک ایک لفظ ایک ایک حرف درست ہے۔ میں تو آپ کے کشف اور ولایت کا دل وجان سے قائل ہوگیا۔"

اسد نے کہا۔"اللہ اپنے گناہ گار بندوں سے بھی اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی...... مگر یہ تو بتا کہ تُو اس وقت میرے پاس آیا کیوں ہے؟"

تاجر نے جواب دیا۔"پیرومرشد! آپ نے بالکل سچ فرمایا، میں پریشان ہوں کہ آخر میرا غلام جبار کہاں چلا گیا؟ میری ذوبیہ کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا، کچھ پتا نہیں چلتا۔"

اسد نے کہا۔"تاجر خوش ہوجا کہ تیری دونوں چیزیں خوش وخرم ہیں اور وہ تیرے حق میں دعائیں کرتی رہتی ہیں۔"

تاجر نے حیرت سے پوچھا۔"کیا سچ؟"

اسد نے جواب دیا۔"میں تجھ سے جھوٹ کیوں بولوں گا؟"

تاجر ایک بار پھر سہم گیا، بولا۔"غلطی ہوئی، معاف کردیجیے۔ جب آپ کو کشف ہوجاتا ہے تو میں، آپ یا کسی اور کی بابت کیا سوچ سکتا ہوں۔"

اسد نے جواب دیا۔"خوش قسمت تاجر! تُو ذوبیہ اور جبار کو ان کے حال پر چھوڑ دے کیونکہ مشیتِ ایزدی بھی یہی تھی۔ ہاں میں کشف سے یہ بھی معلوم کرچکا ہوں کہ خدا تجھ کو اس کا شاندار اجر دے گا۔"

تاجر کے چہرے پر رونق آگئی، بولا۔"میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ مجھ کو آپ جیسا ولی کامل مل گیا۔ آپ مل گئے بس یہی کافی ہے۔ میں اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کروں کم ہے۔"

اسد نے تاجر کو دو کھجوریں دیں۔"لے انہیں رکھ لے، تو انہیں اپنی دولت میں رکھ دے گا تو وہ کبھی کم نہیں ہوگی۔ ان میں بڑی ہی برکت ہے۔"

تاجر نے دونوں کھجوریں چوم کر آنکھوں سے لگائیں اور پھر انہیں جیب میں رکھ لیا۔ اس واقعے نے ان دونوں کو اور مشہور کر دیا۔ تاجر کے چلے جانے کے بعد اسد جبار کے پاس چلا گیا اور دونوں آپس میں باتیں کر کے خوب ہنسے۔ شام کے وقت ان دونوں کی قیام گاہ پر چند منگولوں نے حاضریاں دیں۔ ان کے ساتھ وہ تاجر بھی آیا تھا۔ وہ اسد کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے کہا۔ ''پیرو مرشد! یہ لوگ آپ دونوں کو لینے آئے ہیں۔''

اسد نے بے نیازی اور بے پروائی سے جواب دیا۔ ''بھائی لوگو! تم سب جانتے ہو کہ ہم یہاں کسی لالچ یا مطلب سے نہیں آئے ہیں۔ بس خدا نے ہمیں یہاں پہنچنے کا حکم دیا، ہم دونوں بھاگے چلے آئے۔''

ایک منگول نے مکروہ ہنسی ہنس کر کہا۔ ''اب ہم تم دونوں کو حکم دیتے ہیں کہ ہمارے ساتھ چلو۔''

اسد نے تاجر کی طرف دیکھتے ہوئے منگولوں کی طرف اشارہ کیا، پوچھا۔ ''تیرے ساتھ یہ کون لوگ ہیں؟''

تاجر نے جواب دیا۔ ''پیرو مرشد! یہ منگول ہیں، یہ انہی کا تو لشکر ہے جس میں ہم سب رہ رہے ہیں۔''

ایک منگول نے تاجر سے پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہا ہے؟ اس کی باتوں کا مطلب ہمیں بھی سمجھا۔''

تاجر نے جواب دیا۔ ''یہ شخص آپ کی بابت کہہ رہا ہے کہ منگول جدھر بھی جائیں گے، اللہ کی مشیت ان کے ساتھ سفر کرے گی۔ مطلب یہ کہ انہیں ہر جگہ کامیابی حاصل ہوگی۔''

منگول نے ایک بار پھر حکم دیا۔ ''ان سے کہو ہمارے ساتھ چلیں کیونکہ ہلاکو خان کا حکم ہے کہ ہم ان دونوں کی بابت زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر کے ہلاکو خان کو پہنچائیں۔''

تاجر نے درخواست کی۔ ''جناب والا! یہ اللہ والے لوگ ہیں، انہیں یہیں حداد کے پاس رہنے دیں کیونکہ اگر انہیں چھیڑا گیا تو اندیشہ ہے کہ خدا ناراض ہو جائے اور آپ لوگوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچ جائے۔''

منگول نے جواب دیا۔ ''میں ہلاکو خان کے حکم کا تابع ہوں۔ میں انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور انہیں اپنے پاس رکھوں گا اور دیکھوں گا کہ یہ کتنے اللہ والے ہیں۔''

تاجر نے عرض کیا۔ ''اگر آپ موقع دیں تو میں ہلاکو خان سے ان کی بابت بات کر سکتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ میری بات ضرور مان لیں گے۔''

منگول نے جواب دیا۔ ''میں ان دونوں کو ہر حال میں اپنے پاس رکھوں گا۔ تو اگر چاہے تو ہلاکو خان کے پاس چلا جا اور ان دونوں کی بابت تو جو حکم لائے گا، میں اس پر عمل کروں گا۔''

نور محمد حداد اور دوسرے ارادت مند ان کی باتیں سن رہے تھے۔ انہیں ان منگولوں پر غصہ آ رہا تھا مگر بھی مجبور اور بے بس تھے۔ نور محمد حداد نے ان دونوں کی سفارش کی۔ ''میں آپ لوگوں کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ یہ دونوں بے غرض، بے لوث اللہ والے ہیں۔ آپ لوگ ان پر رحم فرمائیں، اللہ آپ پر رحم کرے گا۔ ورنہ آپ کی قسمت برہم ہو جائے گی۔ زمین شق ہو جائے گی اور آسمان ٹوٹ گرے گا۔''

منگول حداد کی باتوں پر ہنسنے لگا، پوچھا۔ ''کون سا آسمان ٹوٹ گرے گا؟ نیلا جادوانی آسمان؟ ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ہمارے ساتھ ہے اور اس نے ہر جگہ ہمارا ساتھ دیا ہے۔''

نور محمد حداد نے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ بولا۔ ''صاحبان! میں آپ لوگوں کے لیے ہتھیار تیار کرتا ہوں، تیر بناتا ہوں، تلواریں، خنجر تیار کرتا ہوں۔ میں نے آپ کی قوم کی خدمت کی ہے کیا آپ لوگ میری اتنی سی بات نہیں مانیں گے کہ ان دونوں بزرگوں کو یہیں میرے پاس رہنے دیں اور آپ کو جو کچھ بھی معلوم کرنا ہو، یہیں رہتے ہوئے معلوم کر لیں۔''

منگول نے جواب دیا۔ ''میں مجبور ہوں۔'' پھر ان دونوں کو حکم دیا۔ ''تم دونوں اسی وقت میرے ساتھ چلو۔''

اسد نے حاضرین کو سمجھایا۔ ''آپ لوگ یہ سمجھ کر چپ ہو جائیں کہ اللہ کی مشیت یہی ہے کہ ہم اس منگول کے ساتھ چلے جائیں۔ جب تک اللہ ہم سے راضی ہے، ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔'' پھر منگول سے کہا۔ ''ہم دونوں اسی وقت تیرے ساتھ چلنے کو تیار ہیں۔''

ان دونوں کے پاس اپنا سامان ہی کتنا تھا، کچھ بھی نہیں۔ سواری کے لیے دو گھوڑے پیش کر دیے گئے۔ یہ دونوں ان پر سوار ہو گئے۔ منگول ان کے آگے آگے چلے اور دونوں درویش ان کے پیچھے پیچھے۔ ان کے ارادت مند اشک بار آنکھوں سے انہیں جاتے دیکھتے رہے۔

منگول سوار انہیں خیموں کے درمیان سے گزارتے ہوئے ایک سطح مرتفع پر لے گئے۔ یہ جگہ منگول سرداروں کے لیے مختص تھی اور یہیں سب سے الگ تھلگ ہلاکو خان کا

خیمہ تھا۔ وہ دونوں یہاں پہلے بھی آ چکے تھے لیکن ہلاکو خان کا خیمہ یہاں سے دور اور نسبتاً زیادہ بلندی پر تھا۔ خیموں کے درجنوں میں تھے۔ خیموں سے دھواں اٹھ رہا تھا کیونکہ کھانا تیار کیا جا رہا تھا۔ منگول ان دونوں کو ایک کشادہ خیمے میں لے گئے۔ یہاں ان دونوں کو ٹھہرا دیا گیا...... اور انہیں بتایا گیا۔ ''خبردار! بھاگنے کی کوشش نہ کرنا اور اس وقت تک یہیں رہنا جب تک کہ تمہیں یہاں سے جانے کی اجازت نہ مل جائے۔''

جبار نے پوچھا۔ ''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ہم درویشوں کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا جا رہا ہے؟''

منگول نے جواب دیا۔ ''ہمیں شبہ ہے کہ یہاں شیخ الجبال کے آدمی بھیس بدل بدل کر اس لیے آ رہے ہیں کہ وہ کسی طرح موقع پا کر ہلاکو خان کو قتل کر دیں۔ اس لیے ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہر نئے آنے والے کی خوب اچھی طرح تحقیق اور تفتیش کی جائے۔''

جبار اور اسد ذرا بھی نہیں گھبرائے۔ جبار نے جواب دیا۔ ''ہم اس وقت تک یہاں رہنے کو تیار ہیں جب تک کہ تم لوگوں کی تشفی نہیں ہو جاتی۔ ہم تارک الدنیا لوگ دنیاداری میں مبتلا لوگوں کو سچی اور سیدھی راہ دکھانے آئے ہیں۔ تم منگولوں کو یہ بتانے آئے ہیں کہ اتر دکھن اور پورب پچھم کی یلغاروں سے تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا اور اگر بالفرض محال تمہیں کچھ ملا بھی تو جلد یا بہ دیر تم خود یا تمہاری اولاد اس کو گنوا دے گی اس لیے تمہیں جو کچھ مل گیا ہے، اس پر قناعت کر لو اور مزید کی جستجو سے باز آ جاؤ۔''

منگول نے ہنس کر جواب دیا۔ ''ابھی تو چند دن تم آرام کر لو، پھر باتیں بھی ہو جائیں گی اور اس وقت یا تو تم ہماری باتوں کا اثر قبول کر کے دنیادار بن جاؤ گے یا پھر ہم دنیا ترک کر دیں گے۔''

منگول انہیں خیمے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ جبار اور اسد نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے چھرے زمین میں گاڑ دیے اور اس جگہ بستر بچھا کر آرام کرنے لگے۔ منگول اس دن غائب رہا۔ وہ دونوں اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے رہے۔ رات کو آیا تو بڑی عجلت میں اس نے آتے ہی ان دونوں کو یہ خبر سنائی کہ ہلاکو خان کو معلوم ہو چکا ہے کہ دو باطنی اس کو قتل کرنے کے لیے لشکر میں داخل ہو چکے ہیں۔

اسد نے جواب دیا۔ ''اگر یہ خبر درست ہے تو ان دونوں باطنیوں کا پتا چلانا ہمارا فرضِ اولین ہوگا۔''

منگول نے کہا۔ ''اگر تم دونوں اس میں کامیاب ہو گئے تو یہ میرا ذمہ کہ تم دونوں کو ہیرے جواہرات میں تلوا دوں گا۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''ہم تارک الدنیا لوگ ہیرے جواہرات سے بھاگتے ہیں اس لیے آئندہ ہمیں ان کی لالچ نہ دی جائے۔''

منگول نے پوچھا۔ ''تم دونوں کے پاس چھری یا خنجر وغیرہ بھی ہے یا نہیں؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''ہم درویشوں کا چھری خنجر سے کیا کام؟''

منگول نے اس کے باوجود ان دونوں کی تلاشی لی اور کچھ نہ پا کر خوشی کا اظہار کیا۔

منگولوں کو دکھانے اور مرعوب کرنے کی خاطر دونوں نے رات بھر نمازیں پڑھیں اور توبہ و استغفار کرتے رہے اور جب صبح ہوئی تو پتا چلا کہ جبار اور اسد کے ارادت مند یہاں بھی پہنچ چکے ہیں۔ ان میں وہ تاجر بھی موجود تھا جو کبھی جبار کا آقا رہ چکا تھا۔ جبار نے اسد کو اشارہ کیا کہ تاجر کو وہی سنبھالے بقیہ کو میں خود ہی سنبھال لوں گا۔ چنانچہ جب اسد نے تاجر کو اپنے پاس بلایا تو تاجر نے کہا۔ ''میاں جی! آپ سے تو میں پہلے بھی مل چکا ہوں، اب میں آپ کے دوست اور رفیق سے ملنا چاہتا ہوں۔''

اسد نے جواب دیا۔ ''میں کب منع کرتا ہوں کہ اس سے نہ ملیں لیکن وہ آج آپ سے نہیں ملے گا۔ یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں، اس لیے آپ آج اس سے نہ ملیں تو اچھا ہے۔''

تاجر نے اسد کی بات مان لی اور وہ جبار سے ملاقات کی ضد سے باز آ گیا۔ یہاں نور محمد حداد بھی آیا اور وہ ان دونوں کے قدموں میں بیٹھ کر دیر تک آنسو بہاتا رہا۔

منگول ان مناظر کو دیکھتا رہا...... وہ حیران تھا کہ اسد اور جبار کے ارادت مند دونوں کی کتنی عزت کرتے ہیں۔ وہ دن بھر یہ تماشا دیکھتا رہا اور غور کرتا رہا اور جب رات کو سناٹا ہو گیا اور وہ دونوں تنہا رہ گئے تو منگول نے پوچھا۔ ''میں تم دونوں سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔''

اسد نے جواب دیا۔ ''پوچھو، میں جواب دوں گا۔''

منگول نے پوچھا۔ ''یہ لوگ تم دونوں کی اتنی عزت کیوں کرتے ہیں؟ حالانکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم دونوں نہتے ہو تمہارے پاس ایک بھی ہتھیار نہیں، پھر یہ لوگ تم نہتوں کی کیوں عزت کرتے ہیں؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''صرف اس لیے کہ ہم دونوں

نے دنیا کو چھوڑ دیا ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ دنیا کو چھوڑ دینا بڑی بہادری کی بات ہے۔“

منگول نے جواب دیا۔ ”نہیں، صرف یہ بات نہیں، اس کے علاوہ بھی کوئی بات ضرور ہے۔“

جبار نے کہا۔ ”اس کے علاوہ کوئی بات نہیں، اگر تم چاہو تو ہمارے ساتھ تجربہ کر کے دیکھ لو۔“

منگول ہنسنے لگا۔ ”کیا تم دونوں یہ سمجھ رہے ہو کہ میں اتنا بےوقوف ہو گیا ہوں جو خواہ مخواہ محض تمہارے کہنے پر دنیا چھوڑ دوں گا؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں ایسا نہیں سمجھتے۔“

منگول نے پھر کہا۔ ”لیکن میں تم دونوں کی عزت وتکریم دیکھ کر ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اتنی عزت تو ہم اپنے خانزادے ہلاکو خان کی بھی نہیں کرتے۔“

جب منگول باتیں کر کے چلا گیا تو جبار نے اپنی تشویش ظاہر کی، بولا۔ ”اسد! ایسا لگتا ہے شاید ہم دونوں اس بار بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکیں۔“

اسد نے جواب دیا۔ ”اگر میں ناکام رہا تو میں بدرجہ مجبوری اس منگول کو قتل کر دوں گا کیونکہ......“

لیکن جبار نے اسے روکا۔ ”اسد! ایسا ہرگز نہ کرنا کیونکہ ہلاکو خان اپنے ایک آدمی کے عوض ہمارے ہزاروں آدمیوں کو قتل کرا دے گا۔“

دونوں کچھ دیر اسی قسم کی بحث میں الجھے رہے۔ دونوں ہی کے دل ودماغ ان حالات میں صحیح کام نہیں کر رہے تھے۔ چوتھے دن حالات نے ایک نیا موڑ لیا اور ان دونوں کے سروں پر قضائے مبرم لہرانے لگی۔ ہلاکو خان منگول سردار کی تحقیق وتفتیش سے مایوس ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے منگول سردار سے صاف صاف کہہ دیا کہ چونکہ ان دونوں کی طاقت عام آدمیوں سے کہیں زیادہ ہے اس لیے ان پر تعینات بھی خاص آدمی ہی کیے جائیں گے۔

منگول سردار نے عاجزی سے عرض کیا۔ ”چھوٹے خان! آپ یقین فرمائیں کہ میں نے اپنی جانب سے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ دونوں دنیا چھوڑ چکے ہیں اس لیے یہ لوگ ان کی بہت زیادہ عزت کرتے ہیں۔“

ہلاکو خان نے ان دونوں کے پاس خود تو حاضری نہیں دی مگر چند ایسے سردار بھیج دیے جنہیں ہلاکو خان پہلے بھی ان دونوں کی خدمت میں رکھ چکا تھا۔

جب یہ لوگ ان دونوں کے پاس پہنچے تو دونوں ہی نے اپنی زندگی سے مایوس ہو کر کلمۂ شہادت پڑھنا شروع کر دیا۔ اسد نے زمین کھود کر خنجر نکال لیا، بولا۔ ”دوست! موت ہمارے سروں پر کھڑی مسکرا رہی ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم اسے گلے لگا لیں۔“

جبار نے ایک بار پھر اسد کو منع کیا، بولا۔ ”ایسا نہ کر...... کیونکہ ایسا کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔“

اسد نے جواب دیا۔ ”میں ایسا ضرور کروں گا کیونکہ اگر میں ایسا نہیں کروں گا، تب بھی ہلاک کر دیا جاؤں گا۔“

جبار کی سمجھ میں اسد کی بات آ رہی تھی مگر وہ ہلاکو خان کے علاوہ کسی کو قتل کرنا فضول سمجھ رہا تھا، بولا۔ ”بہرحال میں یہ کوشش کروں گا کہ اب بھی کسی طرح ہلاکو خان کے پاس پہنچ کر اسے ہلاک کر کے خودکشی کر لوں۔“

جبار نے بھی خنجر نکال لیا اور اسد سے کہا۔ ”بات ہمت کی ہے۔ آ...... ہم دونوں خیمے کو چاک کر کے پیچھے سے فرار ہو جائیں اور ہلاکو خان تک پہنچنے کی کوشش کریں۔“

دونوں نے خیمے کا پچھلا حصہ چاک کر دیا اور فرار ہو گئے۔ وہ خیموں کی آڑ میں تیزی سے ہلاکو خان کے خیمے کی طرف بڑھے۔ اس وقت انہیں کسی بات کا بھی ہوش نہ تھا۔ وہ پتھروں اور جھاڑیوں میں چھپتے چھپاتے ہلاکو خان کے خیمے کے قریب پہنچ گئے۔ اسی وقت انہیں سامنے سے وہ تاجر آتا دکھائی دیا۔ تاجر کو دیکھ کر دونوں ٹھٹک گئے لیکن تاجر نے انہیں دیکھ لیا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ان دونوں کو روک لیا اور جلدی جلدی چل کر ان کے قریب پہنچ گیا۔

جبار نے اپنا چہرہ کمبل میں چھپا لیا۔

تاجر نے پوچھا۔ ”یہ آپ دونوں کہاں جا رہے ہیں؟“

اسد نے جواب دیا۔ ”پناہ کی تلاش میں...... کیونکہ منگولوں نے ہمارا سکھ چین لوٹ لیا ہے اور ہم یکسوئی سے یادِ الٰہی بھی نہیں کر سکتے۔“

تاجر نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”مگر تم دونوں تو ہلاکو خان کی طرف جا رہے ہو۔ کیا وہاں سکون مل جائے گا؟ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ بات کچھ اور ہے۔“

اسد نے جواب دیا۔ ”بات یہی ہے......“

تاجر نے جبار سے پوچھا۔ ”آپ کیوں خاموش ہیں؟ آپ ہی بتائیے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟“

جبار نے آواز بدل کر جواب دیا۔ ”مہربان تاجر! آپ ہماری مدد کریں اور کسی طرح یہاں سے نکل جانے میں ہمیں مدد دیں۔“

تاجر نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک خیمے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”ادھر آؤ میرے ساتھ۔ شاید اس خیمے میں تمہیں

پناہ مل جائے۔"

دونوں تاجر کے پیچھے ہولیے۔ تاجر نے اجازت لیے بغیر ہی پردہ اٹھایا اور اندر داخل ہوگیا۔ دونوں نے تاجر کی تقلید کی اور اندر داخل ہوگئے۔ خیمے کے اندر افراتفری مچ گئی اور کچھ بے چینی سی پیدا ہوگئی۔ ایک دیوقامت منگول نے تاجر کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے دوست! خیریت تو ہے؟"

تاجر نے ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دوست! تم نے مجھے دوست کہا ہے۔ یہ دونوں تارک الدنیا درویش ہیں۔ دن رات اللہ اللہ کرنا اور مخلوق کی بہتری اور بھلائی کی دعائیں مانگنا ہی ان کا مشغلہ، ان کا عمل ہے۔ یہ اس لشکر میں اس لیے آئے تھے کہ ہلاکو خان کی فتح مندی کی دعائیں مانگیں مگر چند حاسدوں نے ان کی مخالفت شروع کردی اور کسی نہ کسی طرح ہلاکو خان سے ان کی گرفتاری اور قتل کا فرمان حاصل کرلیا۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی طرح ان دونوں بے گناہوں کو قتل ہونے سے بچالیا جائے اور کچھ نہیں۔"

دیوقامت منگول نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ بات وہ نہیں جو تم نے بیان کی ہے۔ جس وقت ہلاکو خان نے ان دونوں کی گرفتاری کا فرمان جاری کیا تھا میں دربار ہی میں موجود تھا اور حقیقتاً وہ گرفتاری کا بھی فرمان نہیں تھا بلکہ چند ایسے سرداروں کو ان دونوں کے پاس بھیجا گیا تھا جو مردم شناسی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ہلاکو خان ان کی مدد سے ان دونوں کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہے۔"

تاجر نے پُرامید لہجے میں کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو بھی ان دونوں درویشوں کو یہاں سے نکل جانے کی سہولت اور مدد دی جائے اور انہیں منع کردیا جائے کہ یہ دونوں آئندہ اس خطرناک ماحول میں نہ آئیں۔"

منگول سردار نے جواب دیا۔ "چھوٹے خان کو خطرہ تھا کہ شیخ الجبال کے آدمی دھوکے سے اس کو ہلاک نہ کردیں۔ جب یہ دونوں درویش یہاں سے چلے جائیں گے تو چھوٹے خان کا اندیشہ بھی دور ہوجائے گا اور اسے ان دونوں کے چلے جانے پر نہ تو اعتراض ہوگا اور نہ ہی افسوس، اس لیے میں ان دونوں کو اپنی نگرانی میں سرزمینِ نیہ سے نکلوا دوں گا۔"

تاجر نے ان دونوں سے پوچھا۔ "آپ دونوں کیا چاہتے ہیں؟"

اسد نے جواب دیا۔ "گوکہ ہمیں معلوم ہے کہ ہلاکو خان ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکے گا مگر محض اس لیے کہ ہماری وجہ سے کسی اور کو پریشانی نہ اٹھانا پڑے ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔"

تاجر نے جبار سے پوچھا۔ "آپ بھی تو کچھ کہیے۔"

جبار نے آواز بدل کر جواب دیا۔ "میرا بھی وہی جواب ہے، جو میرے ساتھی کا ہے۔"

تاجر نے منگول سردار سے کہا۔ "اب آپ ان دونوں کو اس لشکر سے نکلوا دیجیے۔"

اسد نے نہایت عاجزی سے عرض کیا۔ "منگول سردار! آپ نہایت ہوشیار اور بردبار انسان ہیں۔ ہم اللہ والے لوگ ان لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوتے ہیں جو اللہ کے نوازے ہوئے ہوتے ہیں۔ آپ منگولوں میں معزز سردار ہیں اگر آپ ہم دونوں کو اپنی نگرانی میں نیہ کے باہر چھوڑ آئیں گے تو یہ ہمارے لیے باعثِ عزت بات ہوگی۔"

منگول سردار نے تعجب سے پوچھا۔ "یعنی میں...... تم دونوں کو میں نیہ سے باہر چھوڑ آؤں؟"

اسد نے جواب دیا۔ "ہاں آپ، کم از کم میری تو یہی خواہش ہے۔"

تاجر نے منگول سردار سے درخواست کی۔ "چلیے جاودانی آسمان کی خاطر آپ ان کی درخواست قبول کرلیجیے۔"

منگول سردار کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا، آخر بولا۔ "میں نے تیری درخواست قبول کی۔ چلو، میں تم دونوں کے ساتھ چلتا ہوں۔"

تاجر نے کہا۔ "اور میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلوں گا۔"

راستے میں تاجر نے ان دونوں سے پوچھا۔ "اب میں آپ دونوں سے ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں، چونکہ آپ دونوں صاحبِ کشف ہیں اس لیے مجھے یقین ہے کہ آپ میری بات کا جو جواب دیں گے، وہ درست ہوگا۔"

اسد نے کہا۔ "کر سوال، جواب ملے گا اور اللہ نے چاہا تو تیرے سوال کا بالکل درست جواب ملے گا۔"

تاجر نے عرض کیا۔ "جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں، میرا ایک غلام جبار اور ایک کنیز ذوبیہ مجھ سے جدا ہوگئے ہیں۔ ان دونوں کی گمشدگی سے مجھے بڑا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ کیا یہ نقصان فائدے میں بدل سکتا ہے؟"

اسد اور جبار دونوں ہی مراقبے میں چلے گئے اور کچھ دیر بعد اسد نے جواب دیا۔ "ذوبیہ مرکر جنت میں جاچکی

ہے اور تیرا غلام جبار تجھ سے بہت جلد ملنے والا ہے۔"

جبار نے جواب دیا۔ "میرا کشف بھی مجھے یہی بتا رہا ہے کہ جبار تجھ سے عنقریب ملنے والا ہے۔"

تاجر نے خوشی میں کہا۔ "درویشو! اگر تمہاری یہ بات درست نکلی تو میں تم دونوں کو سونے کے کنگن پہناؤں گا۔"

منگول سردار ان تینوں پر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ جب یہ لوگ چنگیزی لشکر سے نکل کر کچی پگڈنڈی پر پہنچے تو اسد نے اپنے آس پاس دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بڑی سنسان جگہ ہے۔ خدا کے لیے کسی ایسی جگہ لے چلیے جہاں سے ہم لوگ اپنی مرضی کا راستہ اختیار کریں۔"

تاجر نے کہا۔ "آپ دونوں سے میں ایک بات اور معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

اسد نے جواب دیا۔ "ضرور معلوم کریں، اس کا بھی جواب دیا جائے گا۔"

تاجر نے پوچھا۔ "جلد یا بہ دیر باطنیوں اور منگولوں کی جنگ ضرور ہوگی یا یہ محض کوئی وہم ہے؟"

دونوں ایک بار پھر مراقبے میں داخل ہو گئے، کچھ دیر بعد اسد نے جواب دیا۔ "جناب والا! دونوں میں جنگ ناگزیر ہے لیکن ان میں جیت اس کی ہوگی جو غافل نہیں ہے، ہوشیار ہے۔"

تاجر نے اصرار کیا۔ "حضرت! میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ دونوں میں سے جیت کس کی ہوگی؟"

اسد نے جواب دیا۔ "منگولوں کی، چھوٹے خان کی۔"

منگول سردار مسکرانے لگا۔ تاجر نے ان دونوں کو الوداع کہا اور ایک پگڈنڈی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ دونوں اس پگڈنڈی پر سیدھے چلے جائیں۔ تقریباً نصف فرلانگ بعد ایک باغ ملے گا، اس باغ کے دوسری طرف آبادی ہے، وہاں سے جہاں جانا ہو آبادی والوں سے معلوم کر لینا اور ان کی بتائی ہوئی راہ پر چل کر جہاں چاہو چلے جانا۔"

اسد نے جبار کو مسکرا کر دیکھا اور منگول سردار سے پوچھا۔ "منگول سردار! آپ تو ہلاکو خان کے معتمدِ خاص ہیں نا؟"

منگول سردار نے حیرت سے کہا۔ "ہاں لیکن یہ بات تجھے کس طرح معلوم ہوئی؟"

اسد نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "اب اس بات کو جانے دو منگول سردار! جو ہو گیا ہو گیا۔ گیا وقت واپس نہیں آتا۔"

تاجر نے پوچھا۔ "کیا مطلب؟ ہم آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھے۔"

اسد نے جواب دیا۔ "جب ہم اپنی بات کا مطلب سمجھائیں گے تو آپ بہ آسانی سمجھ جائیں گے۔"

جبار نے پوچھا۔ "دوستو! یہاں سے منگولوں کا لشکر کتنے فاصلے پر ہے؟"

منگول سردار نے جواب دیا۔ "تقریباً چوتھائی فرسخ۔"

جبار نے اسد کو اور اسد نے جبار کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور اسد نے تاجر سے کہا۔ "کیا تم دونوں کو ہماری پیش گوئیوں کی صداقت پر یقین ہے؟"

تاجر نے جواب دیا۔ "بالکل ہے۔"

منگول سرداران کی باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسد نے کہا۔ "رحم دل تاجر! کیا تجھ کو راستے میں یہ بشارت نہیں دی گئی تھی کہ تیرا گمشدہ غلام جبار تجھے مل جائے گا۔ سو وہ بشارت پوری ہوئی، تیرا غلام جبار تیرے روبرو ہے۔ آنکھیں کھول اور اس کو پہچاننے کی کوشش کر۔"

اس کے بعد جبار نے اپنے چہرے پر سے کمبل ہٹا دیا اور اپنا چہرہ تاجر کے قریب کر دیا۔ اسد نے کہا۔ "تاجر ذرا پہچان تو سہی۔ یہی تو تیرا وہ غلام ہے جس کی گمشدگی کا غم تیری روح کو کھائے جا رہا تھا۔"

تاجر نے جبار کو پہچان لیا، بولا۔ "ارے یہ تو..... مگر یہ تو؟ کیا مطلب؟"

منگول سردار بھی جبار کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

اسد نے کہا۔ "تم دونوں اس نوجوان کو اچھی طرح دیکھ لو۔ کہیں اس کے پہچاننے میں کسی قسم کی غلطی نہ ہو جائے۔ اس دوران میں اپنا کام کرتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے اسد نے اپنے کرتے کے اندر سے زہریلی چھری نکالی اور منگول سردار کے پیٹ میں اتار دی اور اس کو اِدھر اُدھر گھما کر چھوڑ دیا۔ منگول سردار چیخ کر ڈھیر ہو گیا۔

تاجر نے یہ روح فرسا منظر دیکھا تو اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ وہ...... یہ کیا کر دیا او کمبخت، کہتا ہوا منگول سردار کی طرف جھپٹا تو جبار کی زہریلی چھری تاجر کے پیٹ میں اتر گئی۔ زخمی تاجر کے پیٹ سے خون کا فوارہ چھوٹا تو جبار اس میں نہا گیا۔

تڑپتے سسکتے منگول سے اسد نے کہا۔ "میں مارنا تو ہلاکو خان ہی کو چاہتا تھا مگر وہاں تک رسائی ناممکن ہوتی جا رہی تھی اور مجھے ہلاکو کے ایک معتمد سردار کو قتل کر دینا پڑا۔"

جبار نے تاجر کو مخاطب کیا۔ "اور میں نے تجھ کو اس

لیے قتل کر دیا کہ تُو اگر چاہتا تو ذوبیہ کو میرے حوالے کر دیتا اور آج میں سکھ چین کی زندگی گزار رہا ہوتا۔"

ان دونوں نے دونوں مقتولوں کو خاک و خون میں لتا کر اپنے گھوڑوں کو پگڈنڈی پر بھگانا شروع کر دیا۔ وہ جلد از جلد منگولوں کے لشکر سے بہت دور نکل جانا چاہتے تھے تاکہ ان کا پیچھا کرنے والے انہیں پکڑ نہ سکیں۔

وہ دو دن اور دو راتیں مسلسل سفر کرتے رہے اور آخر کار ایک پہاڑی سلسلے کے سامنے پہنچ گئے۔ ان دونوں کے سامنے پیچیدہ ترین ابھرتے ڈوبتے پہاڑی سلسلوں کا ایک جنگل سا نظر آرہا تھا۔ یہ درّہ آگے پیچھے حدِ نظر تک طویل سلسلوں والی پہاڑیاں تھیں۔ ان میں داخل ہو کر آگے بڑھنا دشوار ہی نہیں، ناممکن تھا۔ جبار نے ان گھمبیر پہاڑی سلسلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے ہم دونوں کو گھوڑوں سمیت یہیں کہیں چھپ جانا چاہیے۔"

اسد کو بھی یہ جگہ بہت پسند آئی، بولا۔ "ہاں، اگر منگول ہمارے تعاقب میں یہاں تک آ بھی جائیں تو ہمیں پکڑ نہیں سکیں گے کیونکہ یہاں کی پُرپیچ پہاڑیاں اور غار ہمیں اس طرح چھپا لیں گے کہ کھوجی بس ڈھونڈتے ہی رہ جائیں گے۔"

دونوں ان سلسلوں میں گھس گئے اور کافی دیر تک ان میں بھٹکتے رہے۔ وہ ان میں زیادہ اندر تک چلے جانا چاہتے تھے لیکن پہاڑی چٹانوں کی رکاوٹیں انہیں قدم قدم پر روک رہی تھیں۔

دونوں کافی اندر تک چلے جانے کے بعد ایک درّے میں داخل ہو گئے۔ اس درّے کے دونوں طرف عمودی پہاڑیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں اور سامنے تقریباً دو ڈھائی کوس دور قطار اندر قطار پہاڑیوں کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ یہ سرسبز و شاداب پہاڑیاں بڑی دلفریب تھیں۔ اسد نے کہا۔ "میرا خیال ہے ہمیں اس شاداب سلسلے میں کہیں روپوش ہو جانا چاہیے۔"

جبار نے کہا۔ "اس میں ہم دونوں چھپ تو بہ آسانی جائیں گے لیکن یہاں بیٹھ کر ہمیں یہ فیصلہ بھی تو کرنا ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"

اسد نے جواب دیا۔ "ہم کچھ دن ستانے کے بعد شیخ الجبال خورشاہ کے پاس واپس چلیں گے اور انہیں بتائیں گے کہ ہلاکو خان کو قتل کرنا ناممکن ہے۔ ہاں اس کے ایک معتمد کو ہم نے قتل کر دیا ہے۔"

جبار نے بتایا۔ "ہمارا یہ جواب شیخ الجبال کو خوش نہیں کر سکے گا کیونکہ ان کا حکم ہے کہ ہم زندہ یا مردہ ہلاکو خان کو لے جا کر ان کے قدموں میں ڈال دیں۔ اس سے کمتر کسی بات کو وہ مانیں گے ہی نہیں۔"

اسد نے سرد آہ بھری۔ "لیکن افسوس کہ ہلاکو خان کو دھوکے سے نہیں قتل کیا جا سکتا۔"

جبار نے جواب دیا۔ "مجھ کو تو بس یہی فکر کھائے جا رہی ہے کہ میں جنت کو دوبارہ کیسے حاصل کر سکوں گا۔"

اسد نے کہا۔ "جہاد کے ذریعے۔ شیخ الجبال کے احکام کی تعمیل اور اس راہ میں مر جانا بس یہی راستہ ہے جنت کا۔ ہمیں ایک بار پھر ہلاکو کو قتل کرنے کے لیے اس کے لشکر میں جانا ہوگا۔"

جبار بڑی تکان محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اپنا گھوڑا سبزہ زار پر چھوڑ دیا اور خود ایک کھوہ کی طرف چل دیا اور اسد سے کہا۔ "آؤ ہم دونوں چل کر اس کھوہ میں آرام کریں اور ایک نیند لے کر تازہ دم ہو کر دوسرا منصوبہ بنائیں۔"

اسد نے بھی گھوڑے کو سبزہ زار پر چھوڑ دیا اور جبار کے ساتھ کھوہ میں گھس گیا۔ ان دونوں کو اس کھوہ میں سانپ بچھوؤں کا ڈر محسوس ہو رہا تھا لیکن پھر نیند اس خوف پر غالب آگئی۔

جب وہ سوئے تھے، سورج ان کے سر پر چمک رہا تھا لیکن جب جاگے تو سورج مغرب میں پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ انہیں بھوک لگ رہی تھی۔ یہاں کہیں دور دور تک کوئی آبادی بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ آخر ان دونوں نے درختوں کی پتیاں چاب چاب کر دل بہلایا۔

اسد نے کہا۔ "ہمیں آج کی رات یہیں گزارنا پڑے گی۔ اس کے بعد کسی ایسی جگہ پہنچ جائیں گے جہاں کھانے پینے کا سامان مل جائے کیونکہ پتیاں مستقل طور پر نہیں چابی جا سکتیں۔"

دونوں نے وہ رات وہیں گزار دی اور دوسرے دن صبح ان دونوں نے اپنے اپنے گھوڑوں کو ایک بہت بڑی کھوہ میں کھڑا کر دیا اور وہیں خود بھی روپوش ہو گئے۔

اچانک جبار کو کسی قسم کی آہٹیں سنائی دینے لگیں۔ ان دونوں نے آہٹوں کو بغور سنا اور یہ محسوس کر لیا کہ باتیں کرنے والے انہی کی طرف بڑھے چلے آرہے ہیں۔ اسد نے جبار سے کہا۔ "دوست! میں نہیں جانتا کہ یہ کون لوگ ہیں اور ادھر کیوں آرہے ہیں۔ بہرحال یہ طے ہے کہ یہ لوگ منگول نہیں ہیں۔ یہ کوئی اور ہی لوگ ہیں۔"

جبار نے اسد کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

اسد نے کہا۔ ”یہ تو بڑی زیادتی ہو رہی ہے ہم دونوں پر۔ ہم میں کوئی تو......“

جبار نے جواب دیا۔ ”اسد! شکوہ شکایت فضول ہیں، آنے والے کہیں قریب آچکے ہیں۔ اب ہم دونوں کو بھی چپ ہو جانا چاہیے۔“

دونوں ہی چپ ہو کر اس غار کے منہ میں بیٹھ گئے اور یہاں سے آنے والوں کا نظارہ کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد کسی چٹان کے پیچھے سے ایک لڑکا دو آدمیوں کے درمیان میں نمودار ہوا۔ لڑکے کی عمر بہ مشکل تیرہ چودہ سال کی رہی ہوگی۔

اسد نے آہستہ سے پوچھا۔ ”یہ کیا تماشا ہے؟ یہ کون لوگ ہیں؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں کون لوگ ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ ان سے کچھ مدد لی جا سکتی ہے اور کھانے پینے کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔“

وہ دونوں گھاس پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے، وہ کس قسم کی اور کون سی باتیں کر رہے تھے۔ آواز تو آرہی تھی مگر لفظوں کی ادائیگی نہیں سمجھ میں آرہی تھی۔

وہ دونوں کچھ دیر تو باتیں کرتے رہے مگر پھر وہ تیسرے کو وہیں چھوڑ کر کہیں غائب ہو گئے۔

کافی دیر بعد اسد نے جبار سے پوچھا۔ ”کیوں، کیا خیال ہے ہم دونوں اس نوجوان سے ملیں اور اس سے پوچھیں کہ تو کون ہے اور وہ دونوں کون تھے؟ جو تجھے اس ویرانے میں چھوڑ کر چلے گئے۔“

جبار نے کہا۔ ”جلدی نہ کر، ورنہ کام بگڑ جائے گا۔ ہمیں خوب سوچ سمجھ کر اس کے پاس جانا ہوگا۔“

وہ دیر تک اسی شش و پنج میں رہے کہ وہ اس نوجوان کے پاس جائیں یا نہ جائیں۔ ان کی قسمت نے یاوری کی اور وہ نوجوان خود ہی ان دونوں کی طرف آنے لگا۔ اسد اور جبار اپنی اپنی سانسیں روک کر کھڑے ہو گئے۔ نوجوان سادہ لوح اور دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔ اسد کو ان دونوں کی فکر تھی جو اس نوجوان کو چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے۔ جبار کا خیال تھا کہ اس نوجوان کو دھوکے اور اچانک حملے سے قابو میں کر لیا جائے اور پھر اسے کھینچ کر کھوہ میں لے آیا جائے اور اس سے اس کی بابت معلوم کیا جائے۔

جبار نے اپنے اس خیال کا اظہار بھی کر دیا۔ ”اسد! کسی طرح اس نوجوان کو کھوہ میں کھینچ لاؤ پھر یہیں اس کی بابت بات کر لی جائے۔“

دانش مند

ایک دانش مند آدھ سیر تیل لینے کے لیے کٹورا لے کر گیا۔ کٹورا چھوٹا تھا بھر گیا تو دکاندار نے کہا۔

”باقی کس چیز میں ڈالوں؟“

تو دانش مند نے کٹورا اوندھا کر کے کہا۔

”ادھر پیندے کے حلقے میں ڈال دو۔“

پینداوپر کر کے گھر گیا تو ماں نے کہا۔ ”بیٹے میں نے آدھ سیر تیل لانے کو کہا تھا۔ بس اتنا سا لائے ہو۔“ اس دانش مند نے اسے بھی الٹا کر کے کہا۔

”ادھر بھی تو ہے۔“

مرسلہ۔ محمد انعام، لودھراں

اسد اور جبار نے دیکھا، اب وہ نوجوان ان دونوں کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اسد نے اچانک چھلانگ لگا کر اس نوجوان کو دبوچ لیا اور اس کو کھینچ کر کھوہ میں لے گیا۔

جبار نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا لیکن نوجوان چلّایا نہیں۔ وہ ان دونوں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا لیکن خوف کا کہیں شائبہ تک نہیں پایا جاتا تھا۔ نوجوان کے کپڑے اتنے بوسیدہ تھے کہ جبار اور اسد کی کھینچا تانی کی تاب نہ لا سکے۔ جگہ جگہ سے پھٹ گئے۔

کھوہ میں کسی قدر اندھیرا تھا اور یہاں کسی کی شکل صاف نظر نہیں آرہی تھی۔

جبار نے منہ پر سے ہاتھ ہٹانے سے پہلے کہا۔ ”نوجوان! اگر تو نے شور کیا تو ہم تجھے قتل کر دیں گے۔“

اسد نے بھی دھمکی دی۔ ”ہاں یہی میں بھی کہوں گا۔ خبردار! جو شور کیا۔“

جبار نے اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا لیا اور کہا۔ ”ہاں اب بتا کہ تو کون ہے؟ اور تیرے دونوں ساتھی کون تھے، وہ کہاں چلے گئے؟“

نوجوان نے پوچھا۔ ”اور یہی میں بھی جاننا چاہتا ہوں کہ تم دونوں کون ہو؟ حالانکہ شکل اور وضع قطع سے تم دونوں درویش معلوم ہو رہے ہو۔“

جبار نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں درویش ہیں اور اس کھوہ میں بیٹھ کر عبادت کرتے ہیں۔ تو یہاں کدھر سے اور

کیوں آگیا؟ ہم دونوں یہی جاننا چاہتے ہیں۔"

نوجوان کو جیسے ان کی باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا، ایک بار پھر پوچھا۔ "آپ دونوں ہیں کون؟"

جبار نے جواب دیا۔ "کہہ جو دیا ایک بار کہ ہم درویش ہیں۔"

نوجوان نے کہا۔ "اور میں ایک پریشان حال دیہاتی ہوں۔ روزی کی تلاش میں نکلا تھا کہ جنت پہنچا دیا گیا، وہیں سے چلا آرہا ہوں اس وقت، مزہ آگیا جنت میں۔"

اسد اور جبار کی دلچسپیاں بڑھ گئیں۔ اسد نے پوچھا۔ "تو تو اس وقت جنت سے چلا آرہا ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "ہاں ہاں، میں جنت کی سیر کر کے واپس آرہا ہوں۔"

جبار نے پوچھا۔ "تو نے جنت کی سیر خوابوں میں کی یا خیالوں میں؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "میں نے جنت کی سیر نہ تو خوابوں میں کی نہ خیالوں میں۔ میں نے جیتے جاگتے اپنے ہوش وحواس میں جنت کی سیر کی ہے۔"

اسد نے پوچھا۔ "تو اپنے ہوش وحواس میں بھی ہے یا نہیں؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "بزرگو! میں دیہاتی ضرور ہوں لیکن بے وقوف نہیں ہوں۔ میں نے جس جنت کی سیر کی ہے اگر میں چاہوں تو تم دونوں کو بھی وہاں پہنچا سکتا ہوں۔"

جبار کا حیرت سے منہ کھل گیا۔ "تو ہمیں بھی وہاں پہنچا سکتا ہے یعنی تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ تو جس جنت کی بات کر رہا ہے تجھے اس جنت کا پتا معلوم ہے اور وہ جنت اسی دنیا میں یہیں کہیں موجود ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "ہاں ہاں، میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کا وہی مطلب ہے۔ جو آپ دونوں سمجھ رہے ہیں، وہ جنت یہیں دنیا میں یہیں پہاڑوں میں موجود ہے۔ میں نے کہہ جو دیا کہ وہیں سے واپس آرہا ہوں۔"

جبار نے پوچھا۔ "اور وہ دونوں کون تھے جو تجھے لے کر آئے تھے؟"

نوجوان بہت خوش تھا، بولا۔ "وہی دونوں تو مجھے جنت تک لے گئے تھے اور پھر وہی دونوں مجھے وہاں سے واپس لے آئے۔"

اسد نے پوچھا۔ "پھر وہ دونوں چلے کہاں گئے؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "اپنے گھر۔ دو دن بعد وہ دونوں اس جگہ مجھ سے ملنے آئیں گے اور مجھ کو شیخ الجبال کی خدمت میں لے جائیں گے جہاں میں شیخ کی خوشنودی پر اپنی جان قربان کر دوں گا۔ میں اگر چاہوں تو شیخ کی مرضی اور خوشنودی حاصل کیے بغیر جنت میں واپس چلا جاؤں، مجھے جنت کا راستہ معلوم ہو گیا ہے۔ میں وہاں تک مشکل ہی سے سہی مگر دوبارہ ضرور پہنچ سکتا ہوں۔"

جبار نے کہا۔ "نوجوان! تو تو بڑی مزے دار باتیں کرتا ہے اگر تو پسند کرے تو یہیں ہمارے ساتھ رہ۔"

نوجوان ہنسنے لگا۔ "میں تم درویشوں کے پاس کیوں رہوں؟ مجھے درویش تھوڑی بننا ہے۔ میں دو چار ایسے دلیر نوجوان تلاش کروں گا جو جنت تک پہنچنے میں میری مدد کریں۔"

اسد اور جبار نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور اسد نے نوجوان کو پیشکش کر دی۔ "اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ جنت یہیں کہیں موجود ہے تو ہم دونوں تیرا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ ہم تیرے ساتھ جنت بھی چلیں گے۔ تو ہمارے ساتھ رہ اور مل جل کر منصوبہ بنا۔"

نوجوان نے ان دونوں کا مذاق اڑایا۔ "تم دونوں اپنی زندگی کیوں برباد کرتے ہو۔ اللہ سے لو لگائے زندگی گزار رہے ہو تو یہی کرتے رہو۔ جنت کے چکر میں اپنی زندگیاں برباد مت کرو۔"

جبار نے نوجوان کو اپنے پاس ہی روک لیا اور اسے نصیحتیں کرنے لگا۔ "نوجوان! میں نے تیری ساری باتیں غور سے سن لیں اور ابھی ابھی کچھ دیر پہلے تک میں تجھ کو سنکی اور دیوانہ سمجھنے لگا تھا۔ لیکن اب میرا خیال بدل چکا ہے۔ تو ہمارے ساتھ رہ اور ہمیں بھی اپنی مذکورہ جنت میں لے چل۔"

نوجوان ان دونوں پر ہنس رہا تھا، بولا۔ "تم دونوں دین دار تارک الدنیا ہو، جنت کا ذکر سن کر منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ جگہ ہی ایسی ہے۔ اگر تم دونوں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لو تو مجھے یقین ہے کہ وہیں کے ہو رہو۔ قسم خدا کی، کیا جگہ ہے۔ خوب صورت نوجوان لڑکیاں، شہد اور دودھ کے نکے، خوش الحان رنگ برنگے طیور، دلکش مناظر، بس کیا بیان کروں۔ میرے پاس جنت کی خوبیاں بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔"

جنت کی تعریف اور تفصیل سے ان دونوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ یہ اس جنت کی باتیں تھیں، جو ان کی دیکھی ہوئی تھی۔

اسد اور جبار نے اس نوجوان کی دل جوئی شروع کر دی لیکن انہیں اب بھی یہ یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ جنت یہیں کہیں ہے۔ ان کے دلوں میں اب بھی یہی شبہ جاگزیں

تھا کہ نوجوان جنت کے نشے کی ترنگ میں اس قسم کی باتیں کر رہا ہے ورنہ اسے جنت کا راستہ یاد نہیں ہوگا۔ ان دونوں کے پاس تھا ہی کیا جس سے وہ اس نوجوان کی خاطر مدارات کرتے، بس زبانی ہی باتیں بناتے رہے۔ ان کی اس حالت کو نوجوان نے بھی سمجھ لیا، بولا۔ ”تم دونوں میری کیا خاطر کرو گے، اگر تم چاہو تو میں تمہاری خاطر مدارات کر سکتا ہوں کیونکہ میں غریب اور پریشان حال سہی لیکن میرا ایک گھر ہے، گاؤں ہے، خاندان ہے عزیز و اقارب ہیں۔ میں ان میں چلا جاؤں گا تو وہ بچھ جائیں گے۔ تم دونوں میرے ساتھ چلو پھر کوئی منصوبہ بنائیں گے۔“

اسد نے پوچھا۔ ”تیرا گاؤں یہاں سے کتنی دور ہے؟“

نوجوان نے جواب دیا۔ ”زیادہ دور نہیں ہے۔ ان پہاڑی سلسلوں کے باہر ایک باغ ہے۔ اس باغ کے دوسری طرف میرا گاؤں ہے۔ ان دونوں نے وہیں سے مجھے جنت میں پہنچایا تھا۔“

جبار اور اسد کو منگولوں کا دھڑکا لگا ہوا تھا، وہ باہر نہیں جانا چاہتے تھے۔ جبار نے جواب دیا۔ ”نوجوان! ہم دونوں اس عزلت نشینی کے عادی ہو چکے ہیں، آبادی میں اپنا دل نہیں لگے گا۔ اس لیے تو خود اپنے گاؤں چلا جا اور وہاں عزیزوں رشتے داروں سے مل کر واپس آجا، ہم یہیں تیرا انتظار کریں گے اور تیرے ساتھ تیری مذکورہ جنت میں ضرور جائیں گے۔“

نوجوان قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ ”پھر وہی جنت کا ذکر...... اس کا ذکر ہر حال میں کرتے رہنا۔ مگر تم بھی کیا کرو جنت ہے ہی ایسی چیز اسی کے لیے تو لوگ عبادت کرتے ہیں، دنیا چھوڑتے ہیں اور تم دونوں نے بھی اسی کی خاطر ترک دنیا کیا ہے۔ خیر میں تو اپنے عزیزوں میں ضرور واپس جاؤں گا مگر تمہارے پاس واپس بھی ضرور آؤں گا کیونکہ میں جنت میں ایک بار جاؤں گا، مجھے وہاں تک پہنچنے کے لیے چند آدمیوں کی مدد درکار ہے کیونکہ وہاں تک اکیلے نہیں پہنچا جا سکتا۔ راستہ دشوار اور خطرناک ہے اور پھر زادِ راہ...... میں اپنے گاؤں اسی لیے جاؤں گا کہ زادِ راہ کا انتظام کر آؤں۔“

اسد اور جبار کے اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ اس نوجوان کو جانے دیں کیونکہ جدا ہو جانے والا پھر واپس آئے گا بھی یا نہیں۔ یہ مشتبہ بات تھی اور یہ دونوں منگولوں کے خوف سے باہر بھی نہیں نکل سکتے تھے۔

آخر جبار نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ نوجوان پر اعتبار کرے گا اور اس کی واپسی کا اسی جگہ انتظار کرے گا لیکن وہ گاؤں واپس جانے سے پہلے یہ بتاتا جائے کہ اس نے جنت کا راستہ دیکھا کس طرح؟

نوجوان کو ہنسنے کی بڑی عادت تھی، وہ زور زور سے ہنسنے لگا، بولا۔ ”بزرگو! ان دونوں نے مجھ کو سیدھا سادہ سمجھ رکھا تھا کیونکہ میں صورت شکل سے لگتا بھی ایسا ہی ہوں۔ بس یہی ان کی غلطی تھی اور وہ مار کھا گئے۔“

وہ برابر ہنسے جا رہا تھا۔ ہنستے ہنستے اس کا برا حال ہو گیا اور اس ہنسی میں بھی بولے جا رہا تھا۔ ”شاید میں اپنی شکل صورت سے بے وقوف ہی نظر آتا ہوں۔ جو پہلی بار مجھے دیکھتا ہے، احمق ہی سمجھ لیتا ہے۔ بس اسی بات سے میں فائدہ اٹھا گیا۔ ان دونوں نے پہلی بار تو کچھ پلا کر جنت پہنچا دیا لیکن جب یہی عمل دوبارہ دہرانے کی کوشش کی گئی تو میں نے دھوکا دے دیا۔ جنت میں جس لڑکی نے مجھے پینے کے لیے مشروب دیا تھا، میں نے بظاہر تو اسے پی لیا تھا مگر لڑکی کی نظریں بچا کر اسے پھینک دیا تھا اور مدہوش ہو کر گر گیا تھا۔“ پھر وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”مگر مدہوشی کی اداکاری کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ میں نے جتنی پریشانی اس اداکاری میں اٹھائی ہے بس کیا بیان کروں۔ کئی بار تو ایسا لگا گویا میری اداکاری کا بھانڈا پھوٹ جائے گا اور میں پکڑا جاؤں گا لیکن ایسا نہیں ہوا اور میں مدہوشی میں یہاں تک آنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے وہ راستہ کس طرح یاد کیا یا یاد رکھا ہے، کیا بیان کروں۔ مجھے اس سلسلے میں بڑی دشواریاں رہیں، بڑی پریشانیاں اٹھانا پڑیں لیکن میں کامیاب ہو گیا۔ پُرخطر اور پیچیدہ راستے کو عالمِ مدہوشی میں یاد رکھنا کوئی معمولی کام ہے؟“

اب تو ان دونوں کو اس نوجوان کی باتوں پر یقین کرنا پڑا۔

جبار نے پوچھا۔ ”اگر تو اپنے گاؤں جائے گا تو واپسی کب تک ہوگی؟“

نوجوان نے جواب دیا۔ ”واپسی میں کم از کم دو دن ضرور لگ جائیں گے لیکن میں واپس ضرور آؤں گا کیونکہ مجھے جنت میں دوبارہ جانا ہے اور وہاں تک اکیلا نہیں جایا جا سکتا۔ دو تین آدمیوں کا ساتھ چلنا بہت ضروری ہے۔“

اسد نے اپنا سر پکڑ لیا، جبار سے پوچھا۔ ”کیا میں اس نوجوان کی باتوں پر یقین کر لوں؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”میرا بھی وہی خیال ہے جو تیرا۔ میرا سر بھی پھٹا جا رہا ہے اور دل ڈوبا جا رہا ہے۔ یقین

نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں، یہ نوجوان سچا ہے۔ میں اس کی واپسی کا منتظر رہوں گا۔"

نوجوان غیر معمولی حس کا تھا، اس نے پوچھا۔ "تم دونوں میرے ساتھ میرے گاؤں چلو۔ کیا ساتھ چلنے میں تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

جبار نے جواب دیا۔ "اعتراض تو کوئی نہیں لیکن ہم دونوں تم سے یہیں اسی جگہ ملنا چاہتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم دونوں کچھ عرصہ فوج میں رہ چکے ہیں اور وہاں کی زندگی اور خون خرابے سے بیزار ہو کر اس کھوہ میں آئے ہیں۔ ہو سکتا ہے پہاڑی سلسلوں کے باہر لوگ ہمیں تلاش کرتے پھر رہے ہوں۔ بس ان کی نظروں سے اوجھل رہنے کے لیے ہم دونوں یہاں رہنا چاہتے ہیں۔"

نوجوان نے ان دونوں کے ساز و سامان کا اندازہ لگانے کی جستجو میں اِدھر اُدھر دیکھا اور جب وہاں کچھ نظر نہیں آیا تو پوچھا۔ "تمہارا سامان کہاں ہے؟"

اسد نے جواب دیا۔ "ہمارے پاس کوئی سامان نہیں۔ ہم دونوں فوجی بھگوڑے ہیں۔"

نوجوان ایک بار پھر ہنسنے لگا۔ "تم درویش ہو، تارک دنیا ہو اور فوجی بھگوڑے ہو اور کیا کیا ہو، یہ بھی بتا دو۔"

جبار نے جواب دیا۔ "بس اور کچھ نہیں۔"

نوجوان نے پوچھا۔ "یہاں تم دونوں کے کھانے پینے کا کیا انتظام ہے؟"

اسد نے جواب دیا۔ "کچھ بھی نہیں، بس درختوں کی چھال اور پتیوں پر گزر اوقات ہو رہی ہے۔"

نوجوان نے قہقہہ مار کر پوچھا۔ "تو اسی پر تم دونوں مجھے اپنا مہمان بنانا چاہتے تھے، خوب۔"

وہ نوجوان ان دونوں سے اور زیادہ گھل مل گیا۔ اس نے ایک بار پھر ان دونوں کو جنت کی خیالی سیر کرائی اور اس کا نہایت اضطراب اور شوق سے ذکر کرتا رہا۔ اسد اور جبار بھی جنت کا ذکر نہایت شوق اور بے قراری سے سنتے رہے۔

جبار نے کہا۔ "اب جبکہ تیری اپنے گاؤں روانگی لازمی ہو گئی ہے اور یہ بھی طے ہے کہ تو ہمارے پاس بھی ضرور آئے گا تو جانے سے پہلے اپنا نام تو بتاتا جا۔"

نوجوان نے جواب دیا۔ "میرا نام حسن ہے، میں آبائی کاشت کار ہوں۔"

اسد نے پوچھا۔ "تو جنت میں پہنچا کس طرح؟ یہ تو تو نے بتایا ہی نہیں؟"

حسن نے جواب دیا۔ "یہ بھی بڑے مزے کی کہانی ہے۔" پھر وہ کچھ سوچنے لگا۔ کافی سوچ بچار کے بعد بولا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنی کہانی کو کہاں سے شروع کروں۔ مختصراً بات اتنی سی ہے کہ میں اپنے کھیتوں پر کام کرنے کے دوران اپنے علاقے کے ایک تاجر کی لڑکی پر عاشق ہو گیا تھا۔ تاجر غیر معمولی مال دار اور صاحب حیثیت ہے۔ اس کی لڑکی روشنک بھی مجھ سے پیار کرتی ہے، اس کا باپ کہتا ہے کہ میں اپنی بیٹی سے تیری شادی اس شرط پر کر سکتا ہوں کہ تو کاشت کاری چھوڑ کر تاجر بن جا۔ میں تاجر کس طرح بن سکتا ہوں؟ کیونکہ اس کے لیے غیر معمولی مال و زر کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے بڑی دماغ سوزی کی اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ آخر ایک دن جب میں ایک درخت کے نیچے اس کی جڑ میں تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا اس پر غور کر رہا تھا تو میری ملاقات اچانک ان دونوں سے ہو گئی۔ یہ دونوں بھی اسی درخت کے نیچے اس طرح آن بیٹھے، گویا وہ مسافر تھے اور ستانے کے لیے اس درخت کے نیچے آ گئے تھے۔ پھر ان دونوں نے میری فکرمندی اور غمگینی کا مجھ سے سبب دریافت کیا۔ ان کے لہجے اور ان کی پرسش میں اتنی اپنائیت اور نرمی تھی کہ میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ وہ دونوں میری داستان سن کر ہنسنے لگے، بولے۔ "یہ کون سا مشکل کام ہے۔ ہم دونوں تجھے تاجر بنا دیں گے فکر نہ کر۔" اس وقت میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ وہ مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہیں لیکن اب کچھ کچھ سمجھ میں آ چکی ہے۔"

اسد اور جبار کو نوجوان حسن کی کہانی میں اپنی کہانی نظر آ رہی تھی۔ جبار نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

حسن نے بتایا۔ "پھر وہ ایک دن مجھے کوئی مشروب پلا کر اپنی جنت میں لے گئے۔ وہاں حسین لڑکیوں اور عورتوں کی فراوانی تھی۔ وہاں دودھ اور شہد نلوں سے آتا تھا۔ وہاں کے چپے چپے میں ایک سحر ہے۔ وہاں میں تین دن رہا اور ان تین دنوں میں مجھے اپنی محبوبہ بالکل یاد نہ آئی کیونکہ جنت میں مجھے سب کچھ بہ آسانی حاصل ہو گیا تھا۔ لڑکیاں مجھے باور کراتی رہیں کہ میں جنت میں ہوں لیکن میں اس وقت شک و شبے میں پڑ گیا جب اچانک میرے سر میں درد اٹھا اور مجھے زکام ہو گیا۔ میں نے سوچا، کیا جنت میں بیماریاں ہو سکتی ہیں؟ دل اور دماغ دونوں ہی اس بات کو نہیں مان رہے تھے۔ پھر میں نے یہ جاننے کے لیے کہ میں یہ سب کچھ خواب میں تو نہیں دیکھ رہا ہوں، اپنے بازو پر زور سے چٹکی بھری اور میں تکلیف سے تلملا گیا۔ اس کے بعد میں

نے اپنی کلائی کی پشت پر دانت گاڑ دیے اور کاٹ کر خون نکال لیا۔ ہر تجربہ مجھے یہی بتاتا رہا کہ جنت میں دنیا جیسی ساری باتیں ہو رہی ہیں۔ یہاں تک کہ میں سوتا بھی رہا، جاگتا بھی رہا۔ لڑکیوں نے مجھے جو مشروب بھی پلایا، میں نے چالاکی سے کم سے کم پی کر بقیہ کو ضائع کر دیا۔ پھر وہ مجھے میری بناوٹی مدہوشی میں اٹھا کر جنت سے نکال لائے اور میں مسلسل مدہوشی کی اداکاری کرتا رہا۔ انہوں نے یہاں مجھے چھوڑ دیا اور ہوش میں آنے پر انہوں نے مجھے بتایا کہ میں تین دن تک اس جنت میں رہا ہوں۔ میں نے اپنا شوق ظاہر کیا کہ میں وہاں دوبارہ جانا چاہتا ہوں تو انہوں نے بتایا کہ پہلے میں شیخ الجبال کے پاس جاؤں، اس سے ملوں اور اس کی خوشنودی حاصل کروں کیونکہ یہ جنت شیخ الجبال کی خوشنودی کے بغیر نہیں مل سکتی۔ اب وہ دو تین دن بعد میرے پاس دوبارہ آئیں گے اور مجھ کو شیخ الجبال کے پاس لے جائیں گے اور میں شیخ کی مشیت اور خواہش پر خود کو قربان کر کے جنت میں دوبارہ داخل ہو جاؤں گا۔"

اتنا کہہ کر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

جبار نے پوچھا۔ "تو کیا تو ان دونوں کے ساتھ شیخ الجبال کی خدمت میں جائے گا؟"

اس نے جواب دیا۔ "اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے کہہ جو دیا کہ میں نے جنت کا راستہ اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا ہے۔ میں وہاں شیخ الجبال کی مرضی کے بغیر بھی داخل ہو سکتا ہوں۔"

اسد کو اس کی داستان پر کچھ کچھ اور جبار کو پورا پورا یقین آچکا تھا۔ جبار نے کہا۔ "اگر تیری روداد سچی ہے تو میں تیرا ساتھ دوں گا لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ تو مجھے ایک بار جنت تک پہنچا دے۔"

اسد نے گھبرا کر پوچھا۔ "اور میں...... میرا کیا بنے گا؟ کیا مجھے چھوڑ دو گے؟"

جبار نے جواب دیا۔ "نہیں، میں تجھ کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا۔ کیونکہ اگر حسن کی باتیں سچی ہیں تو ہم دونوں بھی نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے بے وقوف بنائے گئے ہیں اور ہمیں اس طلسم کو کھولنا پڑے گا۔ جادو کے تانے بانے کو توڑنا پڑے گا۔"

نوجوان حسن نے پوچھا۔ "کیا تم بھی وہاں رہ آئے ہو؟"

جبار نے جواب دیا۔ "ہاں، ہم دونوں بھی اس دھوکے کی جنت کی سیر کر آئے ہیں اور اب شیخ الجبال کی مشیت اور خواہش پر خود کو قربان کر کے جنت کی بازیافت کے لیے آوارہ و سرگرداں پھر رہے ہیں۔"

نوجوان حسن زور زور سے ہنسنے لگا۔ "یعنی کہ تم دونوں ہی بے وقوف بنتے رہے ہو، خوب۔"

تینوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جبار اور اسد کو ایک اذیت سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا۔ یقین اور بے یقینی کے درمیان معلق۔ جیسے پھانسی کا پھندا ان کے گلے میں پڑ چکا ہو اور ان کے پاؤں کی انگلیاں زمین پر ٹکی ہوئی ہوں اور ایڑی زمین سے اٹھ چکی ہو۔

نوجوان حسن نے ان دونوں کو سمجھایا۔ "بزرگو! تم اس وقت تک میری بات پر یقین نہ کرنا جب تک کہ میں تمہیں شیخ کی جنت میں پہنچا نہ دوں۔ میں خود ذہنی الجھن میں پڑ گیا ہوں۔ میں تو کہیں کا بھی نہیں رہ گیا۔ اپنی محبوبہ کو حاصل کرنا اپنے بس کی بات نہیں رہی اور جنت کا بھرم بھی گیا۔"

دونوں کی زندگی اور اس کے مقصد کا ڈھچر ہی بدل چکا تھا۔ اسد اور جبار نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ایک بار حسن کے ساتھ جنت تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ اگر یہ باتیں سچ نکلیں تو وہ دونوں مل جل کر ایک ایسا قدم اٹھائیں گے جس سے شیخ الجبال اور اس کے کارندوں کو اپنے کیے کا مزہ چکھنا پڑے۔

☆☆☆

حسن ان دونوں کو اپنے گاؤں لے گیا اور کئی دن تک انہیں مہمان بنائے رکھا۔ یہاں ان دونوں کی جان سولی پر لٹکی رہی کیونکہ ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہا کہ ہلاکو خان کے بھیڑیے بو سونگھتے ہوئے ان کے پاس پہنچنے ہی والے ہیں لیکن انہیں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آیا جو مشکوک یا مشتبہ ہوتا۔ ان تینوں کو جب بھی موقع ملتا، تنہائی میں بیٹھ کر بہشت کی باتیں کرتے رہتے، وہاں تک پہنچنے کے منصوبے بناتے رہتے۔

تیسرے دن وہ دونوں آدمی حسن کو لینے پہنچ گئے جو اسے جنت ارضی کی سیر کرا کے واپس لائے تھے۔ یہ دونوں حسن کو شیخ الجبال کی خدمت میں لے جانا چاہتے تھے لیکن حسن نے بہانہ بنایا کہ وہ دو ہفتوں کے لیے نیشاپور جا رہا ہے کیونکہ وہاں اس کے ماموں کی حالت بہت خراب ہے اور انہوں نے اپنے بھانجے حسن کو فوراً بلوایا ہے۔ دونوں آدمی تین ہفتے بعد دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

اب تینوں کے لیے راستہ صاف ہو چکا تھا۔ انہوں نے چنے اور ستو کی وافر مقدار اپنے ساتھ لی اور اس کوہستانی سلسلے کی طرف چل پڑے جہاں کی چٹانوں میں سے گزر کر بہشت زار کو راستہ جاتا تھا۔

جبار کو ایک خطرہ بار بار پریشان کر رہا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ حسن ان دونوں کو جس راستے سے بہشت زار لے جائے گا، اس راستے میں شیخ الجبال کے آدمی بھی مل سکتے ہیں اور وہ اگر ان تینوں کو دیکھ لیں گے تو قیامت کھڑی ہو جائے گی اور ان تینوں کی جانیں خطرے میں پڑ جائیں گی۔ جبار نے اپنے دونوں ساتھیوں کو اس خطرے سے آگاہ کیا۔ حسن کو شاید اچانک اس خطرے کا علم ہوا تھا، بولا۔ ”بزرگو! میں نے تو اس پر غور ہی نہیں کیا تھا، بات تو سچی ہے۔“

اسد ذرا زیادہ جذباتی تھا، بولا۔ ”اگر شیخ کے آدمی راستے میں مل بھی گئے تو میں انہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دوں گا۔“

جبار نے کہا۔ ”اسد! جذباتی بننے سے کام نہیں چلے گا، میں نے جو کچھ کہا اس پر سنجیدگی سے غور کرو۔“

اسد نے جواب دیا۔ ”میں نے سنجیدگی سے بس ایک ہی فیصلہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ اگر حسن کی بات سچ نکلی تو میں شیخ کی اس بہشت کو تہس نہس کر کے رکھ دوں گا، میں اس فریب کو برداشت نہیں کر سکتا۔“

جبار نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اسد! تجھ کو ہم دونوں سے وعدہ کرنا ہو گا کہ تو جو کچھ بھی کرے گا، ہم سے مشورے کے بعد کرے گا۔ اگر تو نے من مانی کی تو ہم سب خطرے میں پڑ جائیں گے اور دل کی دل ہی میں رہ جائے گی۔ شیخ اور اس کے آدمی ہمیں چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دیں گے۔“

اسد نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ”پھر ہم سے یہ دھوکا یہ فریب کیوں کیا گیا؟ کیا میں انہیں اس فریب کی سزا بھی نہ دوں؟“

جبار نے کہا۔ ”میں یہ کب کہتا ہوں کہ شیخ اور اس کے کارندوں کو ان کے کیے کی سزا نہ ملے؟ ملے اور ضرور ملے مگر ایسا نہ ہو کہ اسے سزا بھی نہ ملے اور اس کے گرگے ہم تینوں کو اپنی راہ سے ہٹا کر دنیا کے سیدھے سادے نوجوانوں کو یوں ہی فریب دیتے رہیں اور شیخ کی مشیت اور خواہش پر قتلِ عام ہوتا رہے۔“

اسد کا دل بھر آیا۔ ”سخت دھوکا کیا گیا ہے ہم سے۔ میں اس وقت تک مضطرب اور بے چین رہوں گا جب تک کہ میں ان بدمعاشوں کو کیفرِ کردار تک نہیں پہنچاؤں گا۔“

وہ تینوں کوہستانی سلسلوں میں داخل ہونے کے بعد آگے بڑھنے لگے۔ حسن آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان نشانیوں اور علامتوں کو تلاش کر رہا تھا جنہیں اس کے حافظے نے محفوظ کر لیا تھا۔ وہ کئی کھوہ اور چٹانوں کو عبور کرنے کے بعد ایک کھلے ہوئے مسطح سبزہ زار تک پہنچ گئے۔

حسن نے کہا۔ ”بزرگو! اس چٹان پر خون کا نشان ضرور ہونا چاہیے کیونکہ اس جگہ علامت اور یادگار کے طور پر میں نے اپنی چھنگلیوں کو دانتوں سے کاٹ کر اس چٹان پر خون کے قطرے ٹپکائے تھے اور خون کا دھبا اتنی جلدی آسانی سے نہیں مٹا کرتا۔“ ان تینوں میں سے حسن نے خون کا دھبا تلاش کر لیا۔ یہ دھبا اب سیاہ پڑ چکا تھا۔

دونوں اس دھبے کو دیکھ کر کچھ پریشان بھی ہوئے اور خوش بھی۔ کیونکہ اس دھبے نے حسن کے اعتماد کو بحال کر دیا تھا۔ یہ تینوں اس جگہ کچھ دیر کے لیے رکے اور کھایا پیا بھی۔ اس کے بعد دم لیے بغیر ہی یہ تینوں آگے کے لیے چل پڑے۔ حسن جیسے بو سونگھ کر آگے بڑھ رہا تھا۔

ایک جگہ اس نے کان کھڑے کیے اور کسی قسم کی آہٹوں پر دھیان دینے لگا۔ وہ کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ حسن نے جوشِ مسرت سے کہا۔ ”کیا تم دونوں بھی وہی آواز سن رہے ہو جو میرے کان سن رہے ہیں؟“

دونوں نے ہر طرف سے توجہ ہٹا کر کچھ سننے کی کوشش کی۔

جبار نے کہا۔ ”مجھے تو کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی ہے۔ معلوم نہیں تو کس آواز کی بات کر رہا تھا۔ اگر یہی حال رہا تو میں بہشت تک پہنچتے پہنچتے پاگل ہو جاؤں گا۔“

اسد نے کہا۔ ”میں خود حیران ہوں کہ یہ کس آواز کی بات کر رہا ہے۔“

حسن نے اسد کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”خدا کے لیے چپ ہو جاؤ اور اس آواز کو سنو جو میں کیا، ہر کان سن سکتا ہے۔“

جبار اور اسد نے ایک بار پھر دونوں کانوں کی سماعتوں کو اس طرف متوجہ کر دیا، جدھر سے حسن کے بقول کچھ آوازیں آ رہی تھیں۔

جبار نے حسن کا گلا پکڑ لیا، بولا۔ ”سچ سچ بتا تو ہم دونوں کو کسی سازش کے تحت تو اندر نہیں لیے جا رہا؟“

حسن نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا چھڑانے کی کوشش کی اور اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے کھانستے ہوئے کہا۔ ”میرا گلا چھوڑ دے بھائی۔ یہ کیا کر رہا ہے۔ میرا گلا چھوڑ، میں وہ آواز تم دونوں کو سنوا دوں گا۔“

جبار نے اس کا گلا چھوڑ دیا۔ حسن نے ایک طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں ادھر میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں وہ چشمہ دکھاؤں جس کی آواز میں نے بہت دور سے

سن لی تھی۔"

جبار اور اسد نے اس بار چشمے کے بہنے کی آواز سننے کی کوشش جو کی تو وہ آواز صاف سنائی دینے لگی۔ جبار شرمندہ ہو گیا، بولا۔ "لیکن اس آواز کے سننے یا نہ سننے سے تیرا کیا فائدہ یا نقصان ہوا؟"

حسن نے جواب دیا۔ "اس چشمے کے پاس سے وہ راستہ گزرتا ہے جو مجھے بہشت کی طرف لے جائے گا۔"

یہ تینوں چشمے کے پاس پہنچ کر کچھ دیر کے لیے رک گئے اور چشمے کے پانی سے ستو گھول کر پیا۔ جبار اور اسد ہر طرف دور دور تک نظریں دوڑا کر جائزہ لے رہے تھے۔ اس سنسان جگہ پر پرندوں کے علاوہ انسان نام کی کوئی چیز بھی موجود نہ تھی۔ درختوں پر پرندے چہچہا رہے تھے اور وہ ادھر سے اڑ کر ادھر اور ادھر سے اڑ کر ادھر بیٹھنے کے عمل میں مشغول تھے۔

یہ تینوں چشمے کے قریب پہنچ کر کچھ دیر کے لیے رک گئے۔ حسن نے کہا۔ "یہاں میں نے ایک چٹان ایسی دیکھی تھی جو شاید اوپر سے لڑھک کر نیچے آ گئی تھی اور وہ ایک دوسری چٹان پر ترچھی رکی ہوئی تھی۔"

ان تینوں کو اس چٹان کو تلاش کرنے میں دشواری نہیں پیش آئی، بڑی آسانی سے پالی۔ یہ چشمے کے داہنی طرف دور ہی سے صاف نظر آ رہی تھی۔ حسن نے اس چٹان کو دیکھتے ہی شور مچایا۔ "وہ رہی چٹان، میں اسی چٹان کی بات کر رہا تھا۔"

جبار نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "چیخ مت! کوئی آس پاس کہیں موجود ہوا تو وہ ہمیں نقصان پہنچا دے گا اور ہمارا یہ منصوبہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔"

حسن نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور پوچھا۔ "کیا واقعی ہم تینوں کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے؟"

اسد نے جھنجلا کر کہا۔ "کوئی ہے تو نہیں، ہو سکتا ہے۔"

حسن نے ہنس کر کہا۔ "توبہ ہے بزرگو! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔"

ترچھی چٹان کے پیچھے ایک کھوہ تھی۔ حسن نے ان دونوں کو اسی کھوہ میں داخل کر دیا۔ خود ذرا سی دیر کے لیے باہر رہا جیسے وہ اس بات پر غور کر رہا تھا کہ وہ کھوہ یہی ہے یا کوئی اور...... اطمینان کر لینے کے بعد وہ بھی کھوہ میں داخل ہو گیا۔

جبار نے چلتے چلتے پوچھا۔ "ابھی ہمیں کتنا اور چلنا ہوگا؟"

حسن نے جواب دیا۔ "آج تو بہشت تک پہنچنے کا خیال ہی نکال دو اپنے دل سے۔ کل سہ پہر تک شاید ہم اپنی منزل تک پہنچ ہی جائیں۔"

اس تاریک کھوہ میں تینوں تقریباً آدھ گھنٹا چلتے رہے۔ اس کے بعد انہیں روشنی دکھائی دینے لگی اور جب وہ کھوہ کے باہر نکلے، تو سورج ان کی پشت پر ذرا نیچے چمک رہا تھا۔ اس دوران انہیں ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی تک پہنچنے کے لیے ایک پل صراط جیسے پتھر پر سے گزرنا پڑا۔ یہ پتھر دو پہاڑیوں کے درمیان پھنس کر پل سا بن گیا تھا۔ حسن نے کہا۔ "اس پتھر پر سے گزرتے وقت نیچے ہرگز نہ دیکھنا ورنہ سہم کر نیچے گر جاؤ گے۔ ہزاروں ہاتھ نیچے۔"

دونوں نے حسن کی بات نہیں مانی اور اس پر سے گزرتے ہوئے نیچے دیکھنے لگے اور دونوں ہی کو اپنے جسم میں سنسناہٹ، سر میں گرانی اور دل میں خوف سا محسوس ہوا۔ وہ بڑی پھرتی اور چستی سے دوسری پہاڑی پر پہنچ گئے۔

اس پہاڑی پر چلتے چلتے حسن نے رک کر کہا۔ "جب وہ دونوں مجھ کو اس طرف سے لے کر گزرے تھے تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے کسی ندی کا ذکر کیا تھا، پہاڑی ندی کا۔ ان دونوں نے مجھے ایک طرف رکھ کر اوپر سے کسی ندی کا نظارہ کیا تھا۔"

اس کے بعد وہ ایک طرف پہاڑی پر چڑھنے لگا، بولا۔ "شاید یہ تھی وہ جگہ۔"

حسن نے پہاڑی پر سے نیچے جھانک کر دیکھا اور وہیں سے شور کرنے لگا۔ "وہ رہی پہاڑی ندی۔ میں نے دیکھ لی...... میں نے تلاش کر لی۔"

جبار اور اسد دوڑ کر اس کے پاس پہنچ گئے اور جبار نے ایک بار پھر اس کو جھڑک دیا۔ "احمق انسان! تو کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی کر کے رہے گا۔"

حسن نے اپنے منہ پر خود ہی ہاتھ رکھ لیا۔ شرمندہ ہو کر بولا۔ "افوہ! میں پھر چوک گیا۔ میں بار بار غلطی کر رہا ہوں، اللہ مجھ پر رحم کرے، آئندہ احتیاط کروں گا۔"

جبار اور اسد نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ نشیب کی وادی میں ایک ندی بل کھاتی ہوئی کہیں غائب ہو گئی تھی۔ جبار کی تیز نظروں نے ندی کے کنارے کچھ اور بھی دیکھ لیا۔ اس نے ندی کے اس پار دوسرے کنارے پر ایک متحرک لکیر دیکھی، بولا۔ "کیا تم دونوں بھی ندی کے دوسرے کنارے پر سیاہ سی متحرک لکیر دیکھ رہے ہو یا نہیں؟"

اسد اور حسن نے اس سیاہ لکیر کو دیکھنے کی کوشش کی اور

جب دیکھ چکے تو حسن نے بلند آواز میں کہا۔ ''خوب! یہ لکیر حرکت کررہی ہے۔ کمال ہے مگر یہ ہے کیا چیز؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''یہ انسان ہیں، جو کہیں جارہے ہیں۔ میں تو انہیں دیکھ کر ڈر گیا ہوں کیونکہ اگر انسان وہاں نیچے وادی میں موجود ہیں تو یہاں کہیں بھی ہوسکتے ہیں۔''

اسد نے کہا۔ ''اگر وہ یہاں کہیں موجود ہوں گے تو اللہ نے چاہا تو حسن انہیں ہماری موجودگی کی اطلاع دے دے گا اور وہ لوگ ہمیں ٹھکانے لگا کر یوں ہی سیاہ لکیر کی شکل میں رفوچکر ہوجائیں گے۔''

حسن نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میری توبہ، میں خاموش رہوں گا۔''

یہاں سے یہ تینوں بہت زیادہ محتاط اور ہوشیار ہوکر آگے بڑھے۔ ایک جگہ انہوں نے سبزے کو روندا ہوا دیکھا۔ جبار نے روندے ہوئے سبزے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''دوستو! ہوشیار، آگے کوئی خطرہ موجود ہے۔ یہ دیکھو ادھر، اس پر سے کوئی گزرا ہے۔ وہ آگے کہیں موجود ہوگا۔''

اسد اور حسن نے بھی روندے ہوئے سبزے کو دیکھا اور چوکڑی بھول گئے۔

جبار روندے ہوئے سبزے پر چلتا ہوا ایک پہاڑی چٹان پر پہنچ گیا۔ چٹان کئی جگہ سے چٹخی ہوئی تھی اور اس کی ایک دراڑ اتنی کشادہ اور نمایاں تھی کہ اس میں سے دو آدمی ایک ساتھ گزر سکتے تھے۔ جبار نے آہستہ سے کہا۔ ''دیکھو، اس دراڑ میں سے نہایت ہوشیاری اور احتیاط سے گزرنا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دراڑ کے دوسری طرف کوئی موجود ہو اور ہم لاعلمی میں اچانک اس کے سر پر پہنچ جائیں۔''

حسن نے جواب دیا۔ ''بزرگو! اگر اجازت دو تو میں لیٹ کر اس دراڑ کو عبور کروں۔''

اسد نے حسن کی گدی پکڑ کر پیچھے کردیا، بولا۔ ''نہیں، آگے اور پہلے میں جاؤں گا۔''

جبار نے کہا۔ ''لیکن اگر تم دونوں میرا کہنا مانو تو پہلے مجھے جانے دو۔ میں ادھر جاکر یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہاں کوئی پہلے ہی سے موجود ہے یا نہیں۔ اس کے بعد تم دونوں کو آنے دوں گا۔''

دونوں نے جبار کی بات مان لی۔ جبار دراڑ کے پاس کھڑے ہوکر کچھ دیر سوچتا رہا، پھر نیچے سے چھوٹے چھوٹے چند پتھر اٹھا کر دونوں سے کہا۔ ''تم دونوں آڑ میں ہوجاؤ تاکہ اگر دوسری طرف سے ادھر کوئی جھانکے تو تم اسے نظر نہ آؤ۔''

دونوں نے جبار کا کہنا مان لیا اور ایک طرف چھپ گئے۔ خود جبار بھی ایک طرف دبک گیا اور وہیں سے اس نے چند پتھر دراڑ کی دوسری طرف پھینکے اور پھر ان کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

کافی دیر تک انتظار کے باوجود جب کوئی جواب نہ ملا تو جبار نے ان دونوں کو سرگوشی میں مطلع کیا۔ ''دوستو! دوسری طرف اگر کوئی ہوگا تو بھی وہ دراڑ کے قریب نہیں ہوگا۔ کہیں دور ہوسکتا ہے کیونکہ اگر کوئی قریب ہی موجود ہوتا تو میرے پتھروں کے جواب اور جستجو میں ادھر ضرور آتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اب ہم تینوں کسی خطرے کے بغیر نہایت احتیاط سے اس دراڑ کو عبور کرسکتے ہیں۔''

یہ کہہ کر جبار آہستہ سے دوسری طرف اتر گیا۔ اس کے بعد اسد اور حسن بھی دوسری طرف پہنچ گئے۔ ان دونوں نے ایک بار پھر متجسسانہ نظروں سے وہاں کا جائزہ لیا لیکن اس میں جبار شامل نہیں تھا۔ وہ شکاری کتوں کی طرح ادھر ادھر کچھ دیکھتا ہوا اور سونگھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

ایک جگہ سبزے پر جلی ہوئی گھاس اور اس کے پاس ہی کچھ راکھ پڑی ہوئی تھی۔ جبار نے ان دونوں کی توجہ ادھر مبذول کرائی اور کہا۔ ''میں پھر یہی کہوں گا کہ وہ لوگ یہیں کہیں موجود ہیں۔ یہ جلی ہوئی گھاس اور راکھ کا ڈھیر اس بات کی علامت ہیں کہ یہاں کہیں کچھ اور لوگ بھی موجود ہیں۔ ہمیں ان سے نہایت ہوشیار اور چوکنا رہنا ہوگا۔''

حسن نے کہا۔ ''اپنی بڑی مصیبت ہے، بہشت تک پہنچتے پہنچتے کتنے ہی انسان کام آتے ہوں گے۔''

جبار نے چڑ کر جواب دیا۔ ''حسن! تو اپنے کام سے کام رکھ۔ فضول باتوں میں دھیان نہ لگا۔''

حسن چپ ہوگیا۔ اسد نے دور دوسری پہاڑی کے اردگرد سانپ کی طرح لپٹا ہوا راستہ دیکھ لیا، بولا۔ ''دوستو! وہ رہا راستہ...... میرا خیال ہے اس راستے پر اس وقت بھی کوئی نہ کوئی موجود ضرور ہوگا۔''

جبار نے بھی اس راستے کو دیکھ لیا، بولا۔ ''آؤ پھر ادھر ہی چلیں۔''

یہ تینوں ایک بار پھر نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے سانپ کی طرح بل کھائے پہاڑی سے لپٹے راستے کی طرف چل پڑے۔ بظاہر تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ راستہ بالکل سامنے قریب ہی موجود ہے، لیکن جب وہ اس طرف بڑھے تو وہاں تک پہنچنے میں انہیں پون گھنٹا صرف کرنا پڑا۔ اب ان کی

چال اور چہروں پر تکان نمودار ہونے لگی تھی۔ وہ چستی، تیزی اور احتیاط اب نہیں رہی تھی۔

جبار کو جیسے ایک دم ہوش آ گیا۔ دونوں سے کہا۔ ''میرا خیال ہے اب ہم تینوں بیماروں کی طرح چل رہے ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو ہمیں کہیں کچھ دیر آرام کر لینا چاہیے اور جب تکان دور ہو جائے تو پھر مردوں، زندوں اور مہم جو حضرات کی طرح آگے بڑھنا اور چلنا چاہیے کیونکہ دنیا کا کوئی بھی بڑا کام بے دلی اور غفلت میں نہیں انجام دیا گیا۔''

حسن نے اسد سے پوچھا۔ ''پھر کیا خیال ہے بزرگو! کیا ہم تینوں یہیں کہیں لیٹ جائیں؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''نہیں، یہاں کہاں لیٹیں گے ہم تینوں...... احتیاط شرط ہے، لیٹنے کی جگہ بھی مل جائے گی۔''

جب یہ تینوں پیچیدہ راستے پر پہنچ گئے تو یہاں جبار نے آرام کرنے کی جگہ بھی تلاش کر لی۔ یہ عام راہ سے ذرا ہٹ کر گھنی اور وسیع ایک جھاڑی تھی۔ اونچے نیچے درختوں سے گھری ہوئی۔ جبار اپنے دونوں ساتھیوں کو اس میں لے گیا اور کہا۔ ''اللہ کا نام لے کر تم دونوں یہاں لیٹ جاؤ، میں پہرا دوں گا۔''

حسن نے مسکرا کر کہا۔ ''بزرگو! لیٹیں گے تو تینوں ہی ایک ساتھ، آخر پہرے کی کیا ضرورت ہے؟ ہمارے پاس کونسا قیمتی سامان موجود ہے جس کی پہرے داری کی جائے گی۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''ایک قیمتی چیز ہے کیوں نہیں...... ہم تینوں کے پاس ایک ایک قیمتی چیز موجود ہے۔''

حسن نے حیرت سے پوچھا۔ ''کون سی قیمتی چیز؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''ہماری اپنی جانیں، ہماری اپنی زندگیاں۔''

حسن زور سے قہقہہ مار کر ہنس دیا، بولا۔ ''بزرگو! تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ میں سمجھا واقعی کوئی قیمتی چیز ہم تینوں کے پاس موجود ہے۔ تم تو بڑے مسخرے نکلے جبار۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''مسخرے تو تم ہو کہ اتنی زور سے ہنس رہے ہو کہ تمہاری آواز سامنے کی پہاڑی سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔''

حسن نے ایک بار پھر اپنے گال تھپتھپائے اور شرمندہ ہو گیا۔ جبار نے دونوں کو لٹا دیا اور خود پہرا دینے لگا۔ کہیں قریب ہی بلبل نغمہ سرا تھی۔ جبار کو اس کی آواز میں سوز محسوس ہوا۔ ذرا سی دیر کے لیے وہ ماحول سے بیگانہ ہو گیا۔ وہ جھاڑی سے نکل کر ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ ہر طرف تنہائی اور سکوت تھا۔ انسان کا کہیں پتا نہ تھا۔ ہر طرف پرندوں کی حکومت تھی۔

اچانک اس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی اور دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے نہایت ہوشیاری اور توجہ سے اپنے گرد و پیش کا دور دور تک جائزہ لیا۔ اس کے قریب ہی کئی اور جھاڑیاں بھی تھیں۔ اس کو ان جھاڑیوں میں سے خطرے کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک ایک جھاڑی کے درخت زور زور سے ہلنے لگے۔ جبار تیزی سے اپنی جھاڑی میں واپس گیا اور نیم خوابیدہ ساتھیوں کو بیدار کر دیا، بولا۔

''تم دونوں بہ عجلت تیار ہو جاؤ، باہر خطرہ ہے۔''

حسن اور اسد ایک ساتھ اٹھ کر کھڑے ہو گئے، پوچھا۔ ''کہاں خطرہ ہے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''تم دونوں بس اتنا کرو کہ جھاڑی میں چھپ کر چوکنا بیٹھ جاؤ، بقیہ کام میں کروں گا۔''

اسد اور حسن تلواریں سنبھال کر بیٹھ گئے اور جبار جھاڑی کی پشت سے نکل کر چکر لگاتا ہوا مشتبہ جھاڑی کی پشت پر پہنچ گیا۔ یہاں اس نے گنجان جھاڑی کے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ اسے یہاں سفید سفید کئی چیزیں نظر آئیں۔ جبار ایک دم دبک کر بیٹھ گیا۔ وہ دیر تک دم سادھے بیٹھا رہا۔ پھر جھاڑی کے اندر سے سرسراہٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ جبار کی نظریں شکرے کی طرح اپنے شکار پر جمی ہوئی تھیں۔

کچھ دیر بعد جھاڑی کے اندر سے دو سر ابھرے اور پھر سفید لباس والے دو آدمی صاف نظر آنے لگے۔ ان دونوں کی نظریں اسد اور حسن والی جھاڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ جھاڑی کے اندر سے نکلنے لگے، یہاں تک کہ ان کی لال دستار اور سرخ کمر بند بھی صاف نظر آنے لگے۔ دونوں دبے قدموں جھاڑی سے نکل کر مکار چیتے کی طرح رک رک کر آہستہ آہستہ اسد اور حسن کی طرف بڑھنے لگے۔ دونوں کے ہاتھوں میں رسے تھے۔ شاید وہ رسوں کے پھندے ڈال کر اپنے شکار کو گرا لینا چاہتے تھے۔

جبار بھی آہستہ آہستہ رک رک کر ان دونوں کی طرف بڑھتا رہا۔ جب وہ دونوں اسد اور حسن کی جھاڑی کے پاس پہنچ گئے تو ان دونوں پر دوسری طرف سے اچانک حملہ کر دیا گیا۔ یہ حملہ اسد اور حسن کی طرف سے ہوا تھا۔ یہ حملہ اتنا اچانک اور بھرپور تھا کہ دونوں سفید پوش بدحواس ہو کر پیچھے ہٹے لیکن اپنے پیچھے جبار کو حملہ آور ہوتے دیکھا۔ اب ان دونوں کے لیے فرار کی کوئی راہ نہیں رہ گئی تھی۔ دونوں طرف

کے واروں نے انہیں زخمی کر دیا، وہ گر گئے۔ حسن ان گرے ہوؤں کے سر پر پہنچ گیا اور ان کے ہاتھوں سے تلواریں چھین کر دور پھینک دیں اور پوچھا۔ ”تم دونوں کے پاس یہی دو تلواریں تھیں یا کچھ اور بھی ہے؟“

دونوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسد نے کہا۔ ”ان کے پاس چھرے بھی تو ہوں گے اور یہ کمر میں اڑسے ہوئے ہوں گے۔“

حسن نے ایک پر جھک کر جیسے ہی اس کی کمر کی تلاشی لینا چاہی، دوسرے نے اس پر چھرے سے حملہ کر دیا لیکن اسی وقت اسد نے حسن کو اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ بال بال بچ گیا۔ حسن گھبرایا نہیں۔ پیچھے ہٹ کر زور زور سے ہنسنے لگا، بولا۔ ”تو تم یہ سمجھتے ہو کہ مجھ کو دھوکے سے قتل کر دو گے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میں تو تمہارے ہاتھ کاٹ دوں گا۔ منہ کچل دوں گا۔“

جبار نے ابھی دونوں کی رسیوں سے انہیں باندھ دیا اور منہ میں کپڑے ٹھونس دیے۔

اسد نے حسن سے کہا۔ ”یہ تُو جو بعض اوقات جلد بازی سے کام لیتا ہے، اس میں تُو کسی نہ کسی دن شہید کر دیا جائے گا۔“

حسن نے بگڑ کر جواب دیا۔ ”مجھ کو شہید کرنا اتنا آسان بھی نہیں ہے۔“

جبار نے کہا۔ ”ان دونوں کو ناکام بنا کر کیا تم دونوں یہ سمجھ رہے ہو کہ خطرے سے نجات مل گئی؟ شاید ابھی نہیں۔ میرے اندازے کے مطابق جھاڑیوں میں ایک آدھ آدمی اور موجود ہوگا۔“

حسن نے کہا۔ ”اچھا تو یہ بات ہے۔ مطلب یہ کہ ابھی ایک آدمی اور موجود ہے یہیں کہیں۔ اگر یہ بات ہے تو اس کو میں قتل کر دوں گا اپنے ہاتھوں سے۔“

اسد کو ہنسی آگئی، بولا۔ ”اسی طرح جس طرح ان دونوں کو زخمی کر کے تم نے گرا دیا ہے۔“

حسن نے جواب دیا۔ ”میرا مذاق نہ اڑاؤ بزرگو! میں ان دونوں کو اکیلا ہی زخمی کر سکتا تھا۔“

جبار اور اسد نے مشتبہ جھاڑی میں تلاشی جو لی تو پتا چلا وہاں ایک شخص بے ہوش پڑا ہے۔ جبار نے اپنے دوستوں سے کہا۔ ”اس شخص کو مت مارنا کیونکہ اسے بھی یہ لوگ جنت میں داخل کرنے کی غرض سے لیے جا رہے تھے، اس کو حشیش پلا کر بے ہوش کر دیا گیا ہے۔“

حسن اس کے سینے پر جھک گیا اور دل کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کرنے لگا، بولا۔ ”یہ ابھی زندہ ہے اس کو دعا کی ضرورت ہے، بس اور کچھ نہیں۔“

انہوں نے اس بے ہوش شخص کو باہر نکالا اور اس کو ہوش میں لانے کی کوششیں کرنے لگے لیکن جبار نے اس سلسلے کو یہ کہہ کر ترک کر دیا کہ اس شخص کو ہوش میں نہ لاؤ کیونکہ پھر ہم اسے اپنی بابت کیا بتائیں گے اور اس کو اپنے ساتھ کہاں کہاں لیے لیے پھریں گے۔

حسن نے پوچھا۔ ”پھر اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”کوئی بھی سلوک نہیں کیونکہ ہماری اس سادہ لوح معصوم شخص سے نہ تو کوئی دوستی ہے اور نہ کسی قسم کی دشمنی۔ ہم اس کو یہیں اسی جگہ چھوڑ جائیں گے پھر جب بھی دوبارہ ادھر آئیں گے تو اس کا حال بھی دریافت کرلیں گے۔“

دونوں کو جبار کے فیصلے سے اتفاق تھا۔ انہوں نے زخمیوں کو اٹھا کر ایک کھڈ میں پھینک دیا اور بے ہوش شخص کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ وہ شام تک اسی طرح چلتے رکتے اور باتیں کرتے رہے۔ شام کو ایک چٹان کے سائے میں ٹیک کر لیٹ گئے۔ انہیں نیند اچھی طرح نہیں آئی حالانکہ وہ تھکے ہوئے تھے۔

صبح بیدار ہوئے تو چڑیوں کے شور نے کچھ دیر کے لیے انہیں فکر و تردد سے نجات دلا دی۔ جبار اور اسد کو سادہ لوح حسن کے حافظے پر بڑی حیرت تھی، اس نے راستہ خوب یاد کیا تھا۔ راستے کی علامات اور نشانیاں اسے ازبر تھیں۔ وہ تینوں پھر چل پڑے۔ کبھی وہ اوپر چڑھنے لگتے اور کبھی نیچے اترنے لگتے اور کبھی کبھی وہ پہاڑی کے اردگرد چلتے نظر آتے۔ جبار کو یہ یقین تھا کہ اب کوئی اور راہ میں نہیں ملے گا کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ بیک وقت کئی باطنی کئی کئی لوگوں کو بہشت زار لے جائیں۔

دوپہر تک وہ ایک گھاٹی کے قریب پہنچ گئے۔ حسن اس گھاٹی کی جھلک دیکھتے ہی بول پڑا۔ ”ہم بہشت کے قریب پہنچ چکے ہیں، کیونکہ مذکورہ شیخ کی بہشت دو پہاڑیوں کے درمیان دو گھاٹیوں پر محیط اور آباد ہے۔“

جبار اور اسد نے اس گھاٹی کے محل وقوع کا تیز نظروں سے مشاہدہ کیا تو انہیں کچھ کچھ ان کی دیکھی ہوئی بہشت کی مشابہتیں محسوس ہونے لگیں۔

حسن نے چیڑ کے ایک درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس درخت کو کبھی بھی نہیں بھول سکتا کیونکہ اس کے تنے پر ایک چھرے کا گہرا نشان اس وقت

بھی موجود ہوگا۔"

اسد نے پوچھا۔ "اس کے تنے پر چھرے کا گہرا نشان کیوں موجود ہوگا؟"

حسن نے جواب دیا۔ "وہ دونوں مجھے اس درخت کے تنے کے پاس ڈال کر کہیں چلے گئے تھے۔ پھر جب وہ واپس آئے تھے تو ان میں نشانے بازی کی مہارت پر بحث چھڑی ہوئی تھی۔ آخر ان دونوں نے اپنی اپنی کمر سے چھرے نکال لیے اور پچاس پچاس قدم کی دوری سے چیڑ کے درخت کے تنے کو نشانہ بنانے لگے۔ ان میں سے ایک کا نشانہ خطا گیا اور دوسرے کا نشانہ ٹھیک بیٹھا۔ چھرا تنے میں پیوست ہو کر پھنس گیا تھا۔"

جبار اور اسد نے جب اس نشان کو چیڑ کے درخت میں تلاش کیا تو وہ صاف نظر آ گیا۔ جبار نے اسد سے کہا۔ "دوست! یہ آدمی نہیں، کچھ اور معلوم ہوتا ہے۔"

حسن پھر کھلکھلا کر ہنس دیا۔ "میں آدمی نہیں ہوں؟ پھر کیا ہوں؟ یہ خوب کہا۔ ارے بھائی! میرے بزرگو! میں آدمی ہی ہوں تم دونوں جیسا۔ بس راستہ مجھے خوب یاد رہتا ہے۔ یہی ایک خوبی دوسروں سے کچھ زیادہ ہے مجھ میں۔"

یکایک حسن نشیب میں اترنے لگا، سرگوشی میں بولا۔ "ساتھیو...... میرے بزرگو! احتیاط...... میں اس وقت بہشت کے عقب میں کھڑا ہوں۔ یعنی ہم تینوں کے سامنے جو کچھ ہے اس کے دوسری طرف وہ بہشت زار ہے جس کی دلکشی ہمیں یہاں کھینچ لائی ہے۔"

تینوں ایک چٹان پر بیٹھ گئے اور اپنی قوتِ سامعہ سے بہشت زار کی سن گن لینے لگے۔ یہاں انہیں سازوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ دور بہت دور کہیں ساز بج رہے تھے اور ان کی آوازیں ہوا اپنے دوش پر لیے اڑی پھر رہی تھی۔ کبھی یہ آواز تیز ہو جاتی اور کبھی آتے آتے کہیں اور چلی جاتی۔

حسن چلایا۔ "بزرگو! سازوں کی آوازیں کم از کم میں تو سن ہی رہا ہوں، تم لوگ بھی سن رہے ہو یا نہیں؟"

اسد نے جواب دیا۔ "آواز تو میں بھی سن رہا ہوں لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ بہشت زار ہی سے آ رہی ہے۔"

جبار نے حسن کی تائید کی۔ "نہیں، یہ آوازیں بہشت زار ہی سے آ رہی ہیں۔ میں ان آوازوں کو کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔" پھر حسن سے کہا۔ "خدا کے لیے اپنی آواز کو قابو میں رکھ۔"

حسن نے پوچھا۔ "کیا میں چیخا تھا؟ پھر غلطی ہوگئی، اب نہیں چیخوں گا۔"

جبار نے کہا۔ "اب ہم تینوں جہاں تک آ چکے ہیں، یہاں احتیاط اور ہوشیاری کی بہت زیادہ ضرورت پیش آئے گی۔"

حسن نے جواب دیا۔ "میں تو اللہ کے فضل سے پہلے ہی سے محتاط اور ہوشیار واقع ہوا ہوں، اب آپ دونوں بھی محتاط اور ہوشیار ہو جائیں۔"

تینوں چلتے چلتے ایک سرنگ میں داخل ہو گئے۔ حسن نے دونوں کو سمجھایا۔ "یہ سرنگ انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہے۔ جب ہم تینوں اس کے دوسرے کنارے پر پہنچ جائیں گے تو ہمیں تین دربانوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ صرف تین دربان۔ یہ دربان سرنگ میں چھپ کر اس راستے کی چوکیداری کرتے ہیں۔ اگر ان تینوں نے ہمیں پہلے ہی دیکھ لیا تو ہمارا کام تمام کر دیا جائے گا اور اگر ان سے پہلے ہم نے انہیں دیکھ لیا تو ان تینوں کا صفایا کر دیا جائے گا۔"

یہ تینوں پھونک پھونک کر قدم بڑھانے لگے۔ سرنگ خاصی لمبی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد دوسری طرف سے روشنی کی جھلک سی محسوس ہونے لگی۔ حسن نے ان دونوں کو اسی جگہ روک دیا اور کہا۔ "آگے خطرہ ہے بزرگو۔"

جبار اور اسد نے اپنی تلواروں کے قبضوں پر ہاتھ رکھ دیا اور جبار نے آہستہ سے کہا۔ "قسم ہے اس وحدہٗ لاشریک کی جس کے قبضے میں دنیا کے جانداروں کی جان ہے۔ میں تیری بات اس وقت تک نہیں مانتا تھا، جب تک کہ تو باہر رہا اور ہم دونوں بھی باہر ہی رہے اور پھر ہم تینوں یکجا ہوئے اور خوب خوب! بس کیا کہیں؟ جو کچھ دیکھا ہے، کسی طرح بھی اس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔"

اسد بھی بہت زیادہ حیران تھا، وہ بھی حسن ہی کو داد دے رہا تھا۔ ان تینوں کی نظریں سرنگ کے دوسرے کنارے کی روشنی پر پڑ رہی تھیں اور جبار اور اسد کو یہاں بڑی خوشی ہو رہی تھی۔ کسی کو بھی یہ امید نہیں تھی کہ بہشت زار اچانک پہنچ جائیں گے۔

اسد اور جبار نے حسن سے پوچھا۔ "حسن! زیادہ سے زیادہ ابھی کتنی دیر لگے گی بہشت زار تک پہنچنے کے لیے؟"

حسن نے جواب دیا۔ "بس ذرا سی دیر بعد، اب ہمیں بہت زیادہ نہیں چلنا ہے۔"

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں پر تینوں دربانوں کی موجودگی ضروری اور یقینی تھی۔

جبار زمین پر ادھر اُدھر نظریں دوڑا کر پتھر تلاش

کرنے لگا۔ اس نے چار پتھر ہاتھ میں لے لیے اور آگے بڑھنے لگا۔ حسن نے ان دونوں کے سینوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے، بولا۔ ''بس یہیں رک جاؤ، آگے مت بڑھنا۔ کیونکہ یہیں کہیں وہ تینوں بھیڑیے موجود ہوں گے اور اپنے شکار کی بُو سونگھ رہے ہوں گے۔''

جبار نے سرگوشی میں پوچھا۔ ''کیا درست ہے کہ تینوں دربان سامنے نہیں آتے، چھپ چھپ کر دربانی کرتے رہتے ہیں؟''

حسن نے جواب دیا۔ ''ہاں یہ درست ہے کیونکہ جب میں یہاں سے لے جایا جا رہا تھا تو تینوں دربان اچانک سامنے آگئے تھے اور آپس میں کچھ عجیب سی زبان میں باتیں کرکے اپنی زبان میں یہ کہا تھا کہ جلدی کرو ورنہ ہم تینوں یہیں کہیں چھپ کر تم سب کی نگرانی کرنے لگیں گے اور تم مصائب و آلام میں گھر کر یہیں بھٹکتے رہ جاؤ گے۔'' پھر بولا۔ ''میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ آخر ان باتوں سے ان کا مطلب کیا تھا؟''

جبار نے حسن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''خدا کے لیے اب چپ بھی ہو جا میرے دوست۔ میں تو تیری بک بک جھک جھک سے عاجز آچکا ہوں۔'' پھر جیسے اسے ہوش آگیا کہ اس کو یہاں ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔ ''بہرحال اب تم۔ یہ بتاؤ کہ ان دربانوں کو باہر کس طرح نکالا جائے؟''

حسن نے جواب دیا۔ ''دیکھو بزرگو! بات سیدھی سی ہے۔'' پھر پتھر والے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے تم تینوں دربانوں کو ان پتھروں سے ہلاک کردو گے، جب یہ ترکیب سوچ ہی چکے ہو تو مجھ سے کچھ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟''

جبار نے کہا۔ ''میں پتھروں سے دربانوں کو ہلاک یا زخمی نہیں کروں گا۔ میں جو کچھ بھی کروں گا، تم دونوں جلد ہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے۔ میں تو بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ تینوں دربان کس جگہ ہو سکتے ہیں؟''

حسن نے ذرا آگے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہاں اس جگہ...... شاید وہیں کہیں چھپے بیٹھے ہوں گے وہ تینوں۔ میرا تو یہی خیال ہے۔''

جبار نے کہا۔ ''اچھا پھر تم دونوں یہیں کہیں چھپ جاؤ اور اس وقت سامنے آنا جب تینوں دربان ہمارے سامنے آجائیں۔''

اسد نے سکوت اختیار کرلیا تھا مگر حسن بولے جا رہا تھا۔ حیرت سے پوچھا۔ ''تینوں دربان ہمارے سامنے کیونکر آجائیں گے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے۔''

جبار نے ذرا دور چل کر اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے پتھروں کو زور زور سے آگے پھینکا۔ سرنگ میں پتھروں کے گرنے کی آوازیں گونجنے لگیں اور اس کے نتیجے میں انسانی قدموں کی آہٹیں صاف سنائی دینے لگیں۔ جبار نے اپنے دونوں ساتھیوں سے سرگوشی میں کہا۔ ''ہوشیار! اپنی نظریں ان تینوں کو دیکھنے پر مرکوز رکھو اور خود دبکے رہو، پھر جیسے ہی یہ قریب آجائیں، انہیں قتل کردو۔''

اسد اور حسن لیٹ گئے اور جبار سرنگ میں موجود ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں چھپ گیا۔ انسانی قدموں کی آہٹیں قریب آتی جا رہی تھیں پھر انہوں نے آنے والوں کی آوازیں بھی سن لیں۔ ایک کہہ رہا تھا۔ ''یہ پتھر کس طرف سے گر رہے ہیں؟ کہیں کوئی چٹان تو نہیں گر رہی ہے؟''

دوسرے نے جواب دیا۔ ''مجھے تو ایسا لگا گویا کسی نے پتھر پھینکے ہوں۔''

تیسرا زور زور سے ہنسنے لگا۔ ''کسی نے پتھر پھینکے ہوں، کیا مطلب؟ یہاں کون پتھر پھینک سکتا ہے؟''

پہلا پھر بولا۔ ''میں نے بڑوں سے سنا ہے کہ پتھر بھی مردہ ہوجاتے ہیں تو یہ ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگتے ہیں۔ میں خوفزدہ ہوں کہ کہیں یہاں کی کوئی چٹان مردہ نہ ہوگئی ہو اور وہ ہم تینوں پر اچانک گر پڑے اور ہم خوامخواہ کچلے جائیں۔''

اب یہ تینوں حسن اور اسد کے قریب آچکے تھے، ان دونوں نے ان کی ٹانگیں کھینچ لیں۔ وہ ایک دوسرے پر چیخ مار کر گر گئے۔ چیخوں کی آوازیں سن کر جبار بھی ان کے سر پر پہنچ گیا لیکن اسد اور حسن نے جبار سے پہلے ہی ان تینوں کو زخمی کردیا تھا۔ وہ زخموں سے نیم جان ہوچکے تھے۔ ''ارے بھائی! تم ہو کون اور ہمیں کیوں قتل کر رہے ہو؟ کیا شیخ الجبال ہم سے ناراض ہو گیا ہے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''ہم ہیں تمہارے ملک الموت۔ بہت دن جنت کی دربانی کرلی، اب ذرا جہنم کے در پر چلے جانا اور اسی طرح اس کی دربانی کرتے رہنا۔'' اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کو حکم دیا۔ ''انہیں بالکل ہی ہلاک کردو، ان کا نیم جان ہونا بھی خطرے سے خالی نہیں۔''

تینوں زخمی رحم کی التجا کرتے رہے مگر انہیں معاف نہیں کیا گیا۔

اب حسن بہت خوش تھا، بولا۔ ''میرا خیال ہے اب جنت میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جو ہماری

مزاحمت کرے۔"

جبار نے جواب دیا۔"اس کے باوجود ہم بہشت زار میں زیادہ عرصہ نہیں رہ سکیں گے۔ ہمارے پیچھے آنے والے ہمارے حق میں مستقل خطرہ بنے رہیں گے۔"

اسد جنت میں رہنے کے لیے بے چین تھا، بولا۔ "لیکن میں جلدی نہیں لوٹوں گا۔ اتنی محنت اور مشکل سے تو یہاں تک آنا نصیب ہوا ہے۔"

حسن نے کہا۔"میرا بھی یہی خیال ہے۔ جب یہاں تک آئے ہیں اپنی مرضی سے تو واپس بھی اپنی مرضی ہی سے جائیں گے۔"

جبار نے بگڑ کر کہا۔"لیکن میں یہاں زیادہ دن نہیں رہ سکتا۔ ہمارا یہاں رک جانا خطرناک ثابت ہوگا۔"

حسن نے پوچھا۔"وہ کس طرح؟"

جبار نے جواب دیا۔"وہ اس طرح کہ شیخ کے کارکن اپنے نئے شکاروں کو یہاں تک لاتے ہوں گے اور جب وہ یہاں ہماری بابت جانیں گے تو پھر ہمارے خلاف طاقت استعمال کی جائے گی اور ہم تین آدمی شیخ الجبال کی عظیم اور سفاک قوت کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔"

حسن نے کہا۔"افسوس کہ پھر یہاں آنے کا فائدہ! پھر تو یہاں نہ آنا ہی بہتر تھا۔"

اسد نے کہا۔"اچھا دو ہفتے تو میں یہاں رہ سکتا ہوں یا یہ بھی زیادہ ہیں؟"

جبار نے جواب دیا۔"اسد! میرے دوست! تو جانتا ہے کہ کبھی میں کتنا سرکش، لڑاکو اور جھگڑالو ہوا کرتا تھا مگر حالات اور وقت کی چکی نے میری سرکشی اور جھگڑالو پن کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ اب میں سنجیدہ اور مصلحت اندیش ہوگیا ہوں۔ ہمیں اس جنت میں حد سے حد دو دن رہنا چاہیے۔ اس سے زیادہ ایک دن بھی نہیں۔ یہاں سے نکل کر ہمیں بہت کچھ کرنا ہوگا۔"

حسن نے ہنس کر پوچھا۔"یہاں سے نکل کر کچھ کرنے کے لیے ہمارے پاس رہ ہی کیا جائے گا۔"

جبار نے جواب دیا۔"یہ تو میں باہر نکل کر بتاؤں گا، ابھی یہاں نہیں۔"

اسد نے افسوس سے کہا۔"اس جنت میں ذنوبیہ کہاں ہے کچھ پتا نہیں۔ اس کو تلاش کرنا پڑے گا اور ذنوبیہ سے پہلے جومہ پارے ملیں گے انہیں بھی وقت دینا پڑے گا۔"

حسن نے کہا۔"میں نے بھی کئی لڑکیاں پسند کر رکھی ہیں، مجھے تو وقت نہیں، کئی دن دینا پڑیں گے۔"

جبار نے اسد سے کہا۔ ''اسد! جب ہم دونوں پچھلی بار یہاں آئے تھے تو ہمارا تمہارا جھگڑا بلکہ سر پھٹول ہو گیا تھا، کچھ یاد ہے تمہیں؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''خوب اچھی طرح یاد ہے مگر اس کا آج ذکر کیوں؟''

جبار نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''تم جنت کی جس لڑکی کا بھی ذکر کرو گے، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن اگر ذنوبیہ کی بات کرو گے تو شاید ہم ایک دوسرے کو پھر زخمی کر دیں گے۔''

اسد نے ہنس کر کہا۔ ''اچھا بھائی! میں ذنوبیہ سے دستبردار ہوتا ہوں۔''

تینوں نے دربانوں کی لاشوں کو پتھروں کے پیچھے چھپا دیا اور سرنگ سے نکلنے کے لیے آگے چل پڑے۔ کچھ دیر بعد وہ جہانِ رنگ و بو میں داخل ہو گئے۔ اب ان کے سامنے ایک ایسی دنیا تھی جس میں ہر طرف خوشبو ہی خوشبو تھی، پھول ہی پھول تھے۔ پھلوں سے لدے ہوئے درخت ہی درخت تھے۔ یہاں نہریں تھیں۔ پھولدار بیلوں میں چھپے ہوئے مکانات تھے۔ ہر طرف سازوں کی لہریں تھیں، سریلی آوازیں تھیں۔

جبار اور اسد ایک دوسرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ حسن نامی سادہ لوح مگر نسل کھ دیہاتی نے شیخ الجبال کے طلسم کو پاش پاش کر دیا تھا۔ دونوں کو اس بات کی خوشی تھی کہ شیخ کی جنت میں اس کی خوشنودی حاصل کیے بغیر ہی داخل ہو گئے تھے۔

انہیں رنگ برنگے اونچے اونچے پھولدار درختوں کے جھنڈ میں سے نہایت رسیلی اور سریلی نسوانی آوازیں سنائی دیں۔ کئی نازک اندام پری چہرہ لڑکیاں ایک ساتھ گانے گا رہی تھیں۔ یہ آوازیں سازوں میں گھل مل گئی تھیں۔ تینوں درختوں کی شاخیں اپنے ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے اندر داخل ہو گئے...... لڑکیوں نے انہیں دیکھا تو مسکراتی ہوئی کھڑی ہو گئیں، گانا بند ہو گیا اور ساز روک دیے گئے۔

ان چاند کے ٹکڑوں نے تینوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور نہایت مترنم آوازوں میں انہیں خوش آمدید کہا۔ انہیں پتھر کے ایک چبوترے پر بٹھا دیا گیا اور انہیں خوش کرنے کے لیے ایسے گیت گائے گئے جن میں شراب کا نشہ اور شباب کا ہیجان تھا۔ تینوں کو اس کا احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ ان میں اجنبی ہیں۔ مہ وشوں نے گاتے گاتے اس بے تکلفی کا مظاہرہ کیا کہ وہ دم بخود رہ گئے۔

اسی دوران خوب صورت پُر تکلف لباسوں میں ملبوس نوجوانوں نے ان کی خدمت میں پھل اور شراب پیش کی۔ یہ شیخ کی جنت کے غلامان تھے۔ تینوں بہت بھوکے تھے، انہوں نے پہلے تو پھلوں پر ہاتھ صاف کیے اس کے بعد شراب کے بجائے دودھ نوش کیا۔

جبار نے ایک مست و سرشار لڑکی کو اپنے پاس بٹھایا اور اس سے پوچھا۔ ''تیرا نام کیا ہے؟''

لڑکی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''یہاں نام نہیں ہوتے، یوں تم جو نام چاہو رکھ لو۔''

اس لڑکی کی مسکراہٹ میں ایک طوفان تھا، ایک ہیجان تھا، شورش تھی، سرمستی تھی، جوانوں کی بربادی کا سامان تھا۔ جبار از خود رفتہ ہو گیا۔ وہ لڑکی کا جواب بھی نہیں سن سکا اور ایک بار پھر وہی سوال کیا۔ ''لڑکی! تیرا نام کیا ہے؟''

لڑکی نے مسکرا کر اپنا سر جھکا لیا اور ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''کہہ جو دیا میرا کوئی نام نہیں، جو نام چاہو رکھ لو۔''

جبار کو ایک دم ذنوبیہ یاد آ گئی، لڑکی سے پوچھا۔ ''یہاں ایک لڑکی ذنوبیہ نام کی ہے وہ کہاں ملے گی؟''

لڑکی پھر ہنسنے لگی، بولی۔ ''میں نے کہہ جو دیا کہ یہاں کسی کا کوئی نام نہیں ہوتا، لوگ اپنی مرضی سے جو نام چاہتے ہیں رکھ لیتے ہیں۔ اسی طرح تم نے بھی اپنی پسند کی کسی لڑکی کا نام ذنوبیہ رکھ لیا ہوگا۔''

جبار چکرا گیا۔ اس نے سوچا، تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ ذنوبیہ کو تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کو وحشت سی ہونے لگی۔

لڑکی نے پوچھا۔ ''کیا سوچنے لگے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''میں ذنوبیہ نامی ایک لڑکی سے مل چکا ہوں اور اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

لڑکی نے برا سا منہ بنایا، بولی۔ ''یہاں کی ہر لڑکی حسن و جمال کا ایک تراشیدہ پیکر ہے۔ تم معلوم نہیں کس ذنوبیہ کی بات کر رہے ہو۔ تمہیں جو کچھ دیا گیا ہے یعنی عطا کیا گیا ہے، اس سے لطف اٹھاؤ، مزے لو۔ فکر و تردد کو اپنے دل سے نکال دو اور اپنا وقت ضائع نہ کرو۔''

حسن اور اسد کو دوسری دو لڑکیوں نے لبھانا شروع کر دیا تھا۔ حسن کو ایک ایسی لڑکی نے اپنے قابو میں کر لیا تھا، جس کی زلفیں رات کی طرح سیاہ اور گھنیری تھیں۔ اس کی آنکھیں مد بھری اور ہونٹوں کی مسکان فتنہ خیز تھی۔ اس لڑکی نے حسن کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ حسن کسمسایا اور اس

کے بازوؤں سے نکلنے کی کوشش کی، بولا۔ ''لڑکی! یہ تو کیا کر رہی ہے؟ ذرا تو شرم کر، تو ہے کس خیال میں؟ تو لڑکی ہے اور میں ایک غیر مرد۔ اپنے دل سے اس خیال کو نکال دے۔ کیا یہ جنت ہے اور تو حور ہے؟''

لڑکی نے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی، مسکرا کر جواب دیا۔ ''یہاں اکثر آنے والے نوجوان اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ وہ جنت میں نہیں، اپنی دنیا میں ہیں لیکن پھر یہ وہم اور غلط فہمی بہت جلد زائل ہو جاتی ہے۔''

حسن نے جبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لڑکی! کچھ تو شرم کر۔''

لڑکی نے جواب دیا۔ ''اگر شرم کی بات کرتے ہو تو آؤ میرے ساتھ، گھر چلو۔''

حسن لڑکی کے ساتھ گھر چلا گیا جو اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ جبار ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسد کو جو لڑکی ملی تھی وہ پستہ قامت مگر بڑی فتنہ لڑکی تھی۔ وہ بھی اسد کو اپنے گھر لے گئی۔ یہ گھر حسن والے گھر سے ملحق تھا۔

بقیہ لڑکیاں بھی اِدھر اُدھر غائب ہو گئیں۔ اب جبار اور لڑکی تنہا رہ گئے تھے۔ وہ دونوں دیر تک رنگ رلیاں مناتے رہے مگر جبار کو دھڑکا بھی لگا ہوا تھا۔ اس کو شیخ الجبال کے کارندوں کا خوف تھا جو کسی وقت بھی آسکتے تھے۔

☆☆☆

پورا دن اور رات گھروں میں مہ وشوں کے ساتھ گزارنے کے بعد صبح صبح تینوں یکجا ہو گئے۔ جبار اور اسد کو ذنوبیہ کی فکر تھی۔ وہ یہاں تک آکر اس سے ملے بغیر واپس نہیں جانا چاہتے تھے۔ ان دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ذنوبیہ کو تلاش کر کے رہیں گے لیکن دوسری لڑکیاں ان کا راستہ روکتی رہیں۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ جب خدا نے تم تینوں کو حوریں دے رکھی ہیں تو کسی اور لڑکی کو تلاش کرنا فضول اور بے معنی ہے۔ حسن بھی ان دونوں کا ہم خیال نہیں تھا۔ وہ بھی شیخ الجبال کے کارندوں سے خوفزدہ تھا جو کسی وقت بھی آسکتے تھے۔ ان دونوں نے حسن کو تسلی دی۔ اس سے کہا۔ ''حسن! تو کیوں پریشان ہوتا ہے۔ ہم دونوں جس کی تلاش میں جا رہے تھے، اس کو تلاش کر کے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔''

حسن نے ان دونوں کا مذاق اڑایا، بولا۔ ''دوستو! مجھے واپسی کا نہیں کسی اور بات کا ڈر ہے، خدا وہ روزِ بد نہ دکھائے۔''

حسن جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہا اور وہ دونوں آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ایک جگہ سبزہ زار پر ایک نوجوان تین پری وشوں کے درمیان اکیلا بیٹھا تھا اور ان میں ہنس ہنس کر باتیں ہو رہی تھیں۔ جبار اسد کو لے کر ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ نوجوان لڑکیوں کو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا، پوچھا۔ ''کون ہو تم دونوں؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''انسان...... جبکہ تو مجھے شیطان نظر آ رہا ہے۔''

نوجوان طیش میں کھڑا ہو گیا لیکن جبار نے طنزاً کہا۔ ''بھائی میرے! تو غصہ کیوں کرتا ہے۔ یہ جنت ہے، یہاں غصہ حرام ہے اور یہاں لڑائی جھگڑے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

لیکن نوجوان نشے میں معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس نے گویا جبار کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ غصے میں لڑکھڑا کر ان دونوں کی طرف بڑھا اور لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ ''تم دونوں یہاں سے جاتے ہو یا میں اٹھوں اور تم دونوں کو دھکے دے کر نکال باہر کروں۔''

جبار نے آگے بڑھ کر اسے ہلکا سا دھکا دے دیا۔ وہ گر گیا تو دونوں کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ جبار نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا اور اسد کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ ان دونوں نے یہاں ایک ایسا گھر دیکھا جو عشق پیچاں کی بیلوں میں ڈھنپا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے اس مکان کی طرف دوڑے اور دروازے پر آہستہ آہستہ دستک دی۔ اندر سے ایک فربہ اندام شخص باہر نکلا۔

جبار نے پوچھا۔ ''کیا ذنوبیہ اندر ہے؟''

فربہ اندام شخص مسکرایا۔ ''کیا نام بتایا؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''ذنوبیہ۔''

فربہ اندام شخص زور زور سے ہنسنے لگا، بولا۔ ''دوستو! یہ بہشت زار ہے، یہاں کسی کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ ذنوبیہ اگر ہوگی بھی تو وہ یہاں نہیں ہوگی۔ دنیا ہی میں کہیں رہ گئی ہوگی۔''

جبار نے غصے میں اس شخص کو ایک طرف ہٹا دیا اور گھر کے اندر چلا گیا۔ یہ شخص جبار کی طرف دوڑا مگر اسد نے اس کے سر پر ایک مکا رسید کیا، وہ شخص چکرا کر گر گیا۔

جبار اندر پہنچ گیا۔ اندر ایک خوب صورت مسہری پر نہایت حسین عورت سو رہی تھی۔ جبار نے اس کے چہرے پر جھک کر دیکھا۔ یہ ذنوبیہ نہیں تھی لیکن ذنوبیہ سے زیادہ حسین تھی۔ جبار کو یہ عورت بہت پسند آئی۔ وہ اس عورت کے پاس بیٹھ گیا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ عورت کو بیدار

کردیتا۔ خوابیدہ حسن نے اس کو مغلوب کرلیا تھا۔
جبار کو اپنے پیچھے کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی۔ گھوم کر دیکھا تو پیچھے اسد کھڑا تھا۔ اسد نے پوچھا۔ ''کیا یہ ذونوبیہ ہے؟''
جبار نے جواب دیا۔ ''نہیں یہ ذونوبیہ نہیں، کوئی اور ہی عورت ہے مگر حسن میں ذونوبیہ سے بڑھ کر ہے۔''
اسد نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا کہا، حسن میں ذونوبیہ سے بھی بڑھ کر؟ یعنی اس عورت کے حسن نے ذونوبیہ کے حسن کو مات دے دی؟''
جبار نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔''
اسد نے پوچھا۔ ''ٹھہرو گے یا چلو گے؟''
جبار نے جواب دیا۔ ''ہاں چلوں گا مگر کچھ دیر بعد، فوراً نہیں۔''
اسد نے رک رک کر عرض کیا۔ ''بھائی جبار! اگر آپ اجازت دیں تو یہ کل کا کام میں آج ہی کر ڈالوں۔''
جبار نے پوچھا۔ ''یہ کل کا کون سا کام؟''
اسد نے جواب دیا۔ ''میں ذونوبیہ کو تلاش کروں گا، جیسے ہی ملے گی، تمہیں مطلع کردوں گا اور جبکہ......''
اسد کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ جبار نے کہا۔ ''بولو بولو......تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''
اسد نے کہا۔ ''بھائی جبار! آپ نے اس خوابیدہ فتنے کو پسند کرلیا ہے؟''
جبار نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے اس کو پسند کرلیا ہے۔ میں اپنا کچھ بھی کسی اور کے پاس نہیں دیکھ سکتا۔ جس دن ایسا ہوگا، اس دنیا میں بہت برا ہوگا اور پتا نہیں اس دن میں......''
اب فربہ اندام شخص ہوش میں آچکا تھا۔ ہوش میں آتے ہی وہ دوڑ کر جبار کے سر پر پہنچ گیا اور چلا کر کہا۔ ''آج میں تجھ کو کچا ہی چبا جاؤں گا۔''
جبار نے جواب دیا۔ ''دوست! سمجھوتا کرلو، کیونکہ میں اس وقت لڑنا نہیں چاہتا۔ یہ شور و غل سن کر جاگ جائے گی۔''
فربہ اندام شخص چیخ کر بولا۔ ''تم دونوں نے مجھے مارا تھا، اب میں تم دونوں سے بدلہ لوں گا۔''
عورت کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اپنے آس پاس تین مردوں کو دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ تینوں ہی سے پوچھا۔ ''تم لوگ کب آئے؟''
فربہ اندام شخص نے سب سے پہلے جواب دیا۔ ''پہلے میں آیا تھا اس گھر میں۔''
جبار نے جواب دیا۔ ''اور بعد میں، میں آیا تھا لیکن میں یہاں تیرے جاگنے کے انتظار میں بیٹھ گیا جبکہ یہ شخص ادھر ادھر ٹہلنے چلا گیا تھا۔''
فربہ اندام شخص جھنجلا کر بولا۔ ''تو جھوٹا ہے۔ تم دونوں نے مجھے مار کر بے ہوش کردیا تھا، اب میں تم دونوں سے بدلہ لوں گا۔''
جبار نے جواب دیا۔ ''کہیں ایسی غلطی بھی نہ کرنا کیونکہ جنت میں رہنے کے لیے رشک، حسد، انتقام، غصہ اور رقابت کے جذبات کو جنت کے باہر ہی چھوڑ دینا ہوگا۔ یہاں انتقام کی بات نہیں کی جاسکتی۔''
عورت نے ان تینوں سے پوچھا۔ ''تم تینوں میرے پاس خود سے آئے ہو یا کسی نے بھیجا ہے؟''
جبار نے جواب دیا۔ ''ہم خود سے آئے ہیں، ہمیں کون بھیجے گا؟''
عورت نے فربہ اندام شخص سے پوچھا۔ ''اور تم کیا کہتے ہو؟''
اس نے جواب دیا۔ ''اور میں کسی کے لیے......میرا مطلب یہ ہے کہ میں یہاں کسی کے لیے نہیں اپنے لیے......''
عورت نے پوچھا۔ ''تمہیں اپنے جذبۂ انتقام کو مشتعل اور کارآمد بنانے کا جنت کی حدود میں کوئی حق نہیں پہنچتا۔ یہاں بھائیوں کی طرح رہنا پڑتا ہے۔''
فربہ اندام شخص نے بڑی حسرت سے کہا۔ ''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں صبر کرلوں اور میرے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے، اس کا بدلہ نہ لوں۔''
عورت نے جواب دیا۔ ''اگر چاہو تو بدلہ لے لو لیکن جیسے ہی تم بدلہ لے چکو گے، تمہیں جنت سے باہر پھینک دیا جائے گا کیونکہ جنت میں رکیک اور انتقامی جذبات اور احساسات کے لیے کچھ بھی گنجائش نہیں۔''
فربہ اندام شخص رونے لگا۔ ''کیا مشکل ہے کہ مارے بھی اور رونے نہ دے۔ صاحب! میں پٹا ہوں، میں ان دونوں کو پیٹ کر اپنے اندر کے آتش فشاں کو خاموش کرنا چاہتا تھا، مگر آپ نے منع کردیا اور میں باز آگیا۔''
جبار نے فربہ اندام شخص سے پوچھا۔ ''اب کیا ارادے ہیں؟''
فربہ اندام شخص نے جواب دیا۔ ''اب ہمارا کوئی ارادہ نہیں۔ تیرا کوئی ارادہ ہو تو مجھے بتا دے۔ میں چاہتا ہوں کہ جب تک یہاں ہوں تب تک......''
جبار نے پوچھا۔ ''ہاں جب تک تو یہاں ہے پھر اس کے بعد؟''
اس نے جھک کر اور جھنجلا کر جواب دیا۔ ''ٹھیک

ہے، میں ہی سب سے بڑا...... میرا مطلب ہے......"

عورت نے ایک پلیٹ میں کوئی چیز رکھ کر ان سب کے بیچ میں رکھ دی۔ پھر پہلے خالی پیالوں کو شراب، دودھ اور شربت سے بھر دیا۔ جبار کو یہ عورت اتنی اچھی لگی تھی کہ وہ اس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا رہا تھا۔

موٹے شخص نے پھل کھاتے کھاتے جبار کو ڈانٹ دیا۔ "تو اس کو مسلسل گھورے جا رہا ہے، میں کہتا ہوں اس بازاری حرکت سے باز آجا ورنہ میں اس کا کوئی بندوبست کر دوں گا۔"

جبار نے جواب دیا۔ "موٹے! اٹر ٹر مت کر۔ جو کچھ کھا رہا ہے، کھاتا رہ۔"

عورت نے پوچھا۔ "آپ لوگوں کو اور کچھ درکار ہو تو بتا دیجیے گا۔"

جبار نے جواب دیا۔ "ہاں، مجھے ایک چیز درکار ہے۔ آپ وعدہ کریں کہ آپ میری خواہش پوری کر دیں گی تو میں فوراً ہی اپنی خواہش بتاؤں گا۔"

عورت نے جواب دیا۔ "تم اپنی خواہش بیان کرو ممکن ہے میں پوری کر سکوں۔"

جبار نے جواب دیا۔ "میری خواہش یہ ہے کہ آپ اس موٹے موذی کو یہاں سے دفع کر دیں۔ اگر آپ نہ دفع کر سکیں تو مجھے اجازت دے دیں، میں یہ کام خود کر لوں گا۔"

عورت نے شرما کر جواب دیا۔ "میں یہ خواہش پوری نہیں کر سکتی۔ میں اس شخص کو نہ تو خود بھگا سکتی ہوں اور نہ ہی آپ کو اس کی اجازت دوں گی کہ اس کو یہاں سے بھگا دیں۔"

اتنی دیر میں موٹا اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جبار پر حملہ کر دیا لیکن اسد نے اسے پیچھے سے پکڑ کر بے بس کر دیا۔ اسد نے جبار سے کہا۔ "دوست! میں نے اس کو پکڑ لیا ہے، اب تم اس کی پٹائی کرتے رہو، یہاں تک کہ یہ کسی کام کا نہ رہے۔"

عورت نے اس کو چھڑانے کی کوشش کی مگر نہیں چھڑا سکی۔ جبار نے اس کی کنپٹی پر زور زور سے مکے مارے جس سے وہ بے ہوش ہو گیا۔ اسد نے جب اس بے ہوش موٹے کو چھوڑا تو وہ اوندھے منہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

عورت کو ان دونوں کی یہ حرکت بری لگی، پوچھا۔ "یہ تم نے کیا کر دیا؟"

جبار نے جواب دیا۔ "اب آپ خاموش ہو جائیں کیونکہ ہم نے جو کچھ کیا ہے، آپ کے سامنے ہے۔"

عورت نے کہا۔ "میں اس مظلوم کی مدد کروں گی۔"

جبار نے پوچھا۔ "آپ اس موٹے مظلوم موذی کی کیا مدد کریں گی؟"

عورت نے جواب دیا۔ "میں اس کو ہوش میں لاؤں گی۔ اس کا دکھ درد سنوں گی اور اس کے کام آؤں گی۔"

عورت نے ابھی تک صرف باتیں ہی کی تھیں یا پھل اور مشروبات وغیرہ پیش کیے تھے۔ اس نے پوچھا۔ "افسوس کہ میں نے ایسا ہنگامہ آج تک کہیں اور نہیں دیکھا تھا۔ کیا میں حسرت کے ساتھ آپ سے یہ کہہ سکتی ہوں کہ اس بے ہوش شخص کو معاف کر دیجیے۔ اس کو تو یہیں میرے پاس رہنے دیں اور میں...... میں......"

جبار...... عورت کے مقابل بیٹھ گیا۔ اسد ایک طرف لاتعلق سا ہو کر بیٹھ گیا تھا اور عورت جبار کی ترچھی نظروں کی تاب نہیں لا پا رہی تھی۔ اس نے اپنے نصف چہرے کو کپڑے سے چھپا لیا تھا۔ جبار نے کہا۔ "معزز خاتون! میں نہ جانے کس ارادے سے چلا تھا۔ یہاں آپ کے حسن میں اتنا کھویا کہ اور کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا۔ کیا آپ میری آمد اور موجودگی سے خوش نہیں ہیں؟"

جبار نے اس عورت سے بڑی دیر تک مزے مزے کی باتیں کیں اور اس کے بعد اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب آپ اس موٹے موذی کو خوش کریں۔ ہم دونوں جا رہے ہیں، اللہ نے چاہا تو کل پھر حاضری دیں گے۔"

پھر جاتے جاتے پوچھا۔ "معزز خاتون! میں بہشت زار میں ذنوبیہ نامی ایک لڑکی کو تلاش کر رہا ہوں مگر وہ نہیں مل رہی۔ کیا آپ اس نام کی کسی لڑکی سے واقف ہیں؟"

عورت نے شاید پہلی بار ان دونوں کو شک وشبے کی نظر سے دیکھا اور پوچھا۔ "کیا نام بتایا تھا ابھی آپ نے اس لڑکی کا؟"

جبار نے جواب دیا۔ "ذنوبیہ۔"

عورت نے پوچھا۔ "آپ دونوں اس بہشت زار میں کس طرح پہنچے؟"

جبار نے جواب دیا۔ "پتا نہیں، مگر آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

عورت نے ایک بار پھر لڑکی کا نام پوچھا۔ "کیا نام بتایا تھا، اس لڑکی کا؟"

جبار نے جواب دیا۔ "ذنوبیہ۔"

عورت نے کہا۔ "جناب آپ کو ایک بات معلوم

ہونی چاہیے، بہشت زار میں کسی کا کوئی نام نہیں اور چونکہ یہاں نام کا تکلف نہیں ہوتا اس لیے ذنوبیہ نامی کسی لڑکی کی بہشت زار میں موجودگی ناممکن ہے۔''

جبار نے کہا۔ ''معزز خاتون! شاید آپ نہیں جانتیں، ذنوبیہ نامی ایک حسین ترین لڑکی اس بہشت زار میں موجود ہے اور میں اس کی تلاش میں آوارہ وسرگرداں پھر رہا ہوں۔''

عورت نے کاندھے اچکائے اور برا سا منہ بنا کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ جبار اسد کے ساتھ باہر نکل آیا۔ راستے میں اسد نے جبار کو سمجھایا۔ ''دوست گڑبڑ ہو گئی، میرا خیال ہے ہم تینوں کو یہاں سے جلد از جلد نکل بھاگنا چاہیے ورنہ پکڑے جائیں گے۔''

جبار نے پوچھا۔ ''یہ وہم کیوں بیٹھا تیرے دل میں؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''جب اس عورت نے یہ سوال کیا کہ آپ دونوں اس بہشت زار میں پہنچے کس طرح؟''

جبار کو بھی خطرے کا فوراً ہی احساس ہو گیا، بولا۔ ''ہاں اس قسم کی بات ہوئی تو تھی۔ خیر پروا نہ کرو۔ کچھ نہ کچھ ہو رہے گا، گھبرائیں کیا۔''

اسد نے درخواست کی۔ ''میرا خیال ہے بہشت زار میں فتنہ وفساد کا بیج بویا جا چکا ہے اس لیے ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''میں تو بس اتنی سی بات جانتا ہوں کہ جو کچھ قسمت میں لکھا ہوگا، ہو کر رہے گا۔ ہم تینوں یہاں جان کی بازی لگا کر آئے ہیں اس لیے ہمیں ڈرنا نہیں چاہیے۔ میں ذنوبیہ کو اس لیے تلاش کر رہا ہوں کہ اس کو یہاں سے نکال لے چلوں۔''

اسد لاجواب ہو گیا اور وہ دونوں ذنوبیہ کی تلاش میں اور آگے چلے گئے۔

☆☆☆

وہ دیر تک اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے لیکن ذنوبیہ نہیں ملی۔ وہاں یکسانیت اتنی تھی کہ دونوں جہاں بھی گئے ایسا لگا، گویا وہ یہاں پہلے بھی آ چکے ہیں۔ انہوں نے ایک جگہ مہندی کے درختوں کی جھاڑیاں دیکھیں۔ ان میں لیمو... کے درخت بھی ملے جلے تھے۔ لیمو... کی ترشی ہوا میں شامل ہو گئی تھی۔ جھاڑی کے پیچھے مصنوعی پہاڑی بنی ہوئی تھی۔ یہ مصنوعی پہاڑی بڑے بڑے پتھروں کو تلے اوپر رکھ کر بنائی گئی تھی۔ یہ حصہ چونکہ بہشت زار کے بقیہ حصوں سے مختلف تھا، اس لیے ان دونوں نے فیصلہ کیا کہ چل کر اس کو بھی دیکھ لیا جائے۔ جب یہ دونوں مہندی اور لیمو کے درختوں کو دونوں ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے اندر داخل ہوئے تو مصنوعی پہاڑی کے اندر داخل ہونے کے لیے انہیں اپنے سامنے ایک دروازہ دکھائی دیا۔ جبار نے دروازے کو آہستہ سے اندر دھکیلا۔ وہ کھل گیا۔ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ یہاں کی دنیا نرالی اور عجیب تھی۔ وہ ایک کمرے میں بے تکلف مہمانوں کی طرح داخل ہوئے۔ یہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ دیوار گیر الماریوں میں معلوم نہیں کیا کچھ رکھا تھا۔ جبار نے اسد سے کہا۔ ''کیا یہاں کوئی نہیں رہتا؟ یہ سب لوگ کہاں چلے گئے؟''

اسد نے الماری کی اشیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہاں کوئی نہیں رہتا تو یہاں یہ سامان کس نے رکھا ہے اور سامان کے اوپر گرد و غبار کا نام تک نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں ہر روز کوئی نہ کوئی سامان کو صاف ضرور کرتا ہے ورنہ یہ جگہ اتنی گندی ہوتی کہ اس کو دیکھنا بھی محال ہوتا۔''

جبار کو حیرت تھی کہ یہاں اتنا سناٹا کیوں ہے۔ جبار کی چھٹی حس اسے کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ اس نے اسد کو خبردار کیا۔ ''دیکھو، یہاں کا سناٹا ایسا نہیں ہے کہ ہم غافل ہو جائیں۔ اس سناٹے میں ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ ایسا ممکن ہے کہ بہشت زار کے کچھ لوگ ہمیں سمجھ گئے ہوں اور ہمیں قابو میں کرنے کے لیے ادھر ادھر چھپ گئے ہوں۔''

اسد نے جبار کو تائیدی نظروں سے دیکھا اور مسکرانے لگا۔ کمرے کے آخری سرے پر ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ اسد اور جبار اس دروازے کے پاس کھڑے ہو کر یہ سوچنے لگے کہ اس میں داخل ہوا جائے یا نہیں۔ آخر دونوں نے سرگوشی میں طے کیا کہ ایک اس چھوٹے سے دروازے میں داخل ہو جائے اور دوسرا باہر ہی کھڑا رہے۔ جبار نے کہا۔ ''اچھا تو تم باہر رہو، میں اندر جاتا ہوں۔''

وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ جبار کی عقل دنگ تھی کیونکہ وہاں جو کچھ تھا، بہت اعلیٰ درجے کا تھا۔ جبار نے یہاں ایک جھولے پر ایک حسین ترین لڑکی کو چھوٹی چھوٹی پینگیں لیتے دیکھا۔ لڑکی نے جبار کو اپنی طرف آتے دیکھا تو پینگیں روک دیں اور جھولے سے اترتے ہوئے بولی۔ ''خوش آمدید اے بلند مرتبت نوجوان!''

جبار نے لڑکی کو کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنے گرد و پیش میں بہت زیادہ حسین مناظر دیکھے۔ یہ بھی کوہستانی گھاٹی تھی لیکن پچھلی سے مختلف اور الگ تھلگ۔

لڑکی اس کے قریب آ گئی، بولی۔ ''تم نے کسی گناہ گار کو مار کر یہ بلند مقام حاصل کیا ہے؟''

جبار کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ اس لڑکی کو کیا جواب دے لیکن وہ یہ ضرور سمجھ گیا تھا کہ لڑکی کے اس سوال میں کوئی خاص راز پنہاں ہے، جواب دیا۔ ''میں نے شیخ کے لیے بڑی خدمات انجام دی ہیں۔''

لڑکی نے جبار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، بولی۔ ''اس کا علم مجھے بھی ہے کیونکہ یہ بہشت اعلیٰ ہے اور اس بہشت میں وہی لوگ بھیجے جاتے ہیں جو شیخ کی عظیم الشان خدمت انجام دیتے ہیں اور یہاں تک رسائی حاصل کرنا کسی بھی نوجوان کی سب سے بڑی خوش قسمتی ہوتی ہے۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''مجھے جب یہاں بھیجا گیا، میں بہت پریشان تھا کیونکہ میں جس بہشت میں سے گزر کر یہاں تک آیا ہوں، میں اسی کو سب کچھ سمجھتا تھا لیکن مجھے حکم دیا گیا کہ اس بہشت کو چھوڑ کر یہاں تیرے پاس تک پہنچوں۔''

لڑکی نے پوچھا۔ ''وہ فرشتے کہاں ہیں جو تجھے یہاں تک پہنچا کر گئے ہیں؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''ایک فرشتہ تو باہر موجود ہے اگر تم کہو تو یہیں بلوا لوں؟''

لڑکی نے جواب دیا۔ ''بلوا لو، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟''

جبار نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا کیونکہ جبار کے پورے وجود پر لڑکی حاوی ہو چکی تھی۔

لڑکی نے پوچھا۔ ''وہ فرشتہ کہاں ہے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''اوپر سیدھی طرف۔''

لڑکی نے تالی بجائی اور جب ایک ادھیڑ عمر عورت اندر داخل ہوئی تو اس نے اس کو حکم دیا۔ ''جا باہر چلی جا اور وہاں ایک نوجوان فرشتہ کھڑا دکھائی دے گا اس کو میرے پاس لے آ۔''

ادھیڑ عمر عورت کوئی جواب دیے بغیر چلی گئی اور جب واپس آئی تو اسد اس کے ساتھ تھا۔ اسد نے جبار کو لڑکی سے باتیں کرتے دیکھا تو منہ پھیر لیا۔

جبار نے لڑکی کے کان میں کہا۔ ''لڑکی! یہ فرشتہ نہیں، میرا دوست اسد ہے۔ اس نے بھی غیر معمولی کارنامے انجام دیے ہیں اور شاید اپنی خدمات کے صلے میں اسے بھی بہشت اعلیٰ عطا کی گئی ہے۔''

لڑکی نے کہا۔ ''اچھا تو یہ بات ہے۔'' پھر جبار کو چھوڑ کر ایک طرف جانے لگی، بولی۔ ''تم دونوں میرے ساتھ چلو۔'' لڑکی مسکرا رہی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکی اور ان دونوں سے کہا۔ ''تم دونوں سوچتے کیا لگے؟ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔''

جبار اور اسد ایک دوسرے کی صورت دیکھ دیکھ کر سوالیہ نشان بنے جا رہے تھے۔

اسد نے جبار کے کان میں کہا۔ ''دوست! ہمیں یہیں سے واپس ہو جانا چاہیے کیونکہ مجھے ایسا لگتا ہے گویا ہم لوگ دلدل میں پھنس گئے ہیں اور جیسے جیسے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں، دھنستے اور ڈوبتے جا رہے ہیں۔''

جبار نے اسد کا ہاتھ پکڑ لیا، سرگوشی میں کہا۔ ''ابھی تو اس لڑکی کا ساتھ دو، پھر واپسی کا منصوبہ بھی بنا لیں گے۔''

لڑکی نے پوچھا۔ ''کیا باتیں ہو رہی ہیں؟''

جبار نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''میرا دوست حیران ہے کہ یہ کہاں آ گیا؟ اور میں اس کو سمجھا رہا ہوں کہ بہشت اعلیٰ میں۔ یہ پوچھ رہا ہے کہ یہ بہشت اعلیٰ کیا چیز ہوتی ہے؟ میں نے جواب دیا کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔''

لڑکی نے کہا۔ ''میرے ساتھ ساتھ چلو ورنہ بھٹک جاؤ گے۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''بہتر ہے۔''

وہ دونوں لڑکی کے پیچھے پیچھے چلتے گئے۔ لڑکی آبشاروں، سبزہ زاروں سے گزرتی ہوئی ایک گل پوش وادی میں پہنچ گئی۔ دونوں نے اثنائے سفر میں حسینوں کے جھرمٹ دیکھے اور کہیں کہیں محفل رقص و سرود میں چند نوجوانوں کو سر دھنتے دیکھا۔ لڑکی سے پوچھا۔ ''یہ کون لوگ ہیں؟''

لڑکی نے جواب دیا۔ ''وہ لوگ جنہوں نے گناہ گاروں کو مار کر یہ بہشت حاصل کر لی۔'' دونوں نے لڑکی کی بات سنی اور خاموش رہے۔

پھر یہ لڑکی ان دونوں کو ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں شراب کا دور چل رہا تھا اور لڑکی نے ان کو ایک ایسی محفل میں پہنچا دیا جہاں غربت اور افلاس نام کی کوئی چیز نہیں مل سکتی تھی۔ جہاں کی ہر چیز پہلی جنت سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ اہالیانِ محفل نے جبار اور اسد کو یوں دیکھا گویا وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہوں۔

ماخذات

تاریخ دولت فاطمیہ، رئیس احمد جعفری۔ تاریخ فاطمین مصر، ڈاکٹر زاھد علی۔ طبقات ناصری، منہاج سراج۔ الفخری، محمد علی ابن علی۔ نظام الملک طوسی، مولوی عبدالرزاق کانپوری۔ تاریخ اسلام، اکبر شاہ خان

خود اپنے دام میں

طاہر جاوید مغل

گھر کو قید خانہ سمجھنے والے جب کھلی فضا کی تمنّا کرتے ہیں تو راستے میں جنگل، صحرا، بستی، سب ملتا ہے مگر... گھر نہیں ملتا... جو اپنا ہوتا ہے اور جہاں اپنے ہوتے ہیں... وہ بھی آوارہ گردی کرنے نکلے تھے اور جب پلٹ کر دیکھا تو اپنا نشان بھی کھو چکے تھے۔

دام میں پھانسنے والوں کی بے دم سازشوں کا قصہ



موٹر سائیکل چرانے کے لیے نادر اور وسیم کا طریقہ کار اچھوتا اور انوکھا تھا۔ انہوں نے جو موٹر سائیکل چرانا ہوتی تھی، بالکل اسی جیسی ایک اور موٹر سائیکل لاکر اس کے بالکل قریب کھڑی کر دیتے تھے، اگر موٹر سائیکل کو وائر لاک لگا ہوتا تھا تو وہ بھی اپنی موٹر سائیکل کو ویسا ہی وائر لاک لگاتے تھے۔ نادر تالا کھولنے میں ماسٹر تھا۔ وہ کچھ دیر بعد دوبارہ موقعے پر پہنچتا اور اپنی موٹر سائیکل کے بجائے دوسری موٹر سائیکل کا تالا کھولنے میں مصروف

ہوجاتا تھا۔ چند سیکنڈ یا زیادہ سے زیادہ ایک منٹ کے اندر وہ موٹر سائیکل لے اڑتا تھا، کچھ دیر بعد وسیم موقع پر پہنچتا اور وہ اپنی والی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے لے جاتا تھا۔

پچھلے چھ مہینے میں انہوں نے کئی درجن موٹر سائیکلیں اسی طرح اڑائی تھیں۔ ان چھ مہینوں میں فقط سات آٹھ دفعہ ایسا ہوا تھا کہ موٹر سائیکل کا تالا کھولنے کے دوران میں موٹر سائیکل کے مالک یا اس کے کسی ساتھی نے نادر کو دیکھ لیا تھا۔ ایسے موقعوں پر کچھ اس طرح کا مکالمہ ہوتا تھا۔

موٹر سائیکل کا مالک بھاگا ہوا آیا تھا۔ ''ارے، یہ کیا کر رہے ہو بھئی؟''

نادر نے چونک کر موٹر سائیکل کو دیکھا...... تھوڑا سا غور کیا...... اور پھر ماتھے پر ہاتھ مارتا ہوا کہتا۔ ''اوہ مائی گاڈ... ویری ویری سوری بھائی صاحب! میری موٹر سائیکل تو یہ کھڑی ہے۔ میں آپ کی موٹر سائیکل میں چابی لگا رہا ہوں۔''

برابر میں واقعی نادر کی اپنی موٹر سائیکل کھڑی ہوتی تھی جو کم و بیش اسی طرح کی ہوتی تھی۔ بات موٹر سائیکل کے مالک کی سمجھ میں آجاتی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے کچھ اس قسم کی بات کہتا تھا۔ ''آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔''

''ویری سوری۔ معافی چاہتا ہوں۔'' نادر دوبارہ معذرت کرنے لگتا تھا۔

''کوئی بات نہیں یار۔ ایسا ہوجاتا ہے۔'' موٹر سائیکل کا مالک خوش خلقی کا مظاہرہ کرتا۔ بات ختم ہوجاتی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نادر اور وسیم کا حوصلہ بڑھتا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنا ''کاروبار'' بڑھانے کا خیال بھی ان کے ذہن میں جگہ بنانے لگا۔ مسروقہ گاڑیاں خریدنے والوں کے ساتھ بھی ان کے اچھے تعلقات قائم ہوگئے تھے۔ اب انہوں نے دھیرے دھیرے موٹر سائیکلوں کے ساتھ ساتھ کاروں پر بھی توجہ دینا شروع کردی تھی۔ آغاز میں اس کام میں تھوڑی سی دشواری تو پیش آئی لیکن پھر وہ اپنے کام میں ماہر ہوتے چلے گئے۔ شروع میں انہوں نے کرائے کی کاریں استعمال کیں لیکن پھر ایک ساتھ اپنی دو ذاتی گاڑیاں خرید لیں۔ ایک سفید مہران اور دوسری سلور ہنڈا سٹی۔ دونوں نئے ماڈل کی تھیں اور سڑکوں پر عام نظر آتی تھیں۔

نادر اور وسیم کا طریقہ کار وہی پرانا اور آزمودہ تھا۔ اس میں رسک نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ سفید مہران اور سلور سٹی ہی چوری کر رہے تھے۔ انہوں نے جس گاڑی کو چرانا ہوتا تھا عموماً پہلے اس پر اچھی طرح ہوم ورک کر لیتے تھے۔ ایک یا دو دن پہلے قریب سے اس کا جائزہ لیتے تھے۔ اس کے سیٹ کور، اسٹیئرنگ کور اور الارم وغیرہ دیکھتے تھے۔ پھر اپنی ذاتی گاڑی کو بھی اس سے ملتی جلتی شکل دینے کی کوشش کر لیتے تھے۔ بعدازاں موقع دیکھ کر وہ اپنی گاڑی کو چوری کی جانے والی گاڑی کے برابر یا بالکل پاس کھڑا کر دیتے تھے، صورت حال پرکھنے کے بعد نادر موقع پر پہنچتا اور اپنی گاڑی کے بجائے بڑے بے پروا انداز میں دوسری گاڑی کے دروازے کھولنے میں مصروف ہوجاتا تھا۔ دروازوں کے بعد وہ چند سیکنڈ میں اگنیشن میں بھی چابی لگا لیتا اور گاڑی لے کر نو دو گیارہ ہوجاتا۔ دوسری گاڑی تو ظاہر ہے ان کی اپنی ہی ہوتی تھی۔ وہ کسی بھی وقت بلا روک ٹوک اسے وہاں سے لے جاسکتے تھے۔ چوری کے دوران میں اگر کبھی کہیں کوئی بدمزگی ہوتی بھی تھی تو وہی رٹا رٹایا مکالمہ سننے میں آتا تھا۔

مالک پکارتا تھا۔ ''ارے بھئی! یہ کیا ہو رہا ہے...... کون ہو تم؟''

نادر تعجب سے گاڑی کو دیکھتا اس پر گہری نظر دوڑاتا پھر برابر میں کھڑی اپنی گاڑی کو دیکھتا اور ماتھے پر ہاتھ مارنے لگتا تھا۔ ''اوہ مائی گاڈ......''

کام بڑی خوش اسلوبی سے چل رہا تھا۔ قسمت کی دیوی مہربان تھی۔ اب نادر اور وسیم کے پاس کافی رقم جمع ہوچکی تھی۔ دونوں ہی غیر شادی شدہ تھے مگر دونوں کے دلوں میں ارمان بھی مچلتے تھے۔ کچھ خواب انہوں نے بھی دیکھنے شروع کر دیے تھے۔ نادر کے والدین تو اس کے بچپن میں ہی فوت ہوچکے تھے...... دور کی ایک خالہ تھیں جنہوں نے اسے پالا مگر...... کچھ حالات کی سختیاں اور کچھ مقدر کی کارفرمائیاں کہ اسے اس گھر میں بھی نہ تو پیٹ بھر کر روٹی ملی اور نہ ہی اچھے مستقبل کو سنوارنے کے لیے کوئی مناسب تعلیم ہی دلوائی گئی...... خالی ذہن تو ویسے بھی شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے...... لمبی جمپ مارنے کی خواہش میں دربدر بھٹکتے ہوئے وسیم سے آن ملا...... جس کا ذہن بھی اس کی طرح باغیانہ خیالات کا مالک تھا...... اسے بھی اپنے ماحول سے فرار چاہیے تھا۔ والدین کی پیار بھری روک ٹوک کو سختیوں کا نام دے کر اس نے گھر چھوڑ دیا...... پلٹ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ والدین اس کے بغیر کیسے زندہ رہیں گے...... ایک بہن تھی اس سے بھی اس

کی نہیں بنتی تھی...... لہٰذا جب کوئی اپنے گھر کی قدر نہیں کرتا تو عمر سفر میں ہی تمام کر دیتا ہے...... بس جب اس کی ملاقات نادر سے ہوئی تو ہلکی پھلکی سلام دعا آہستہ آہستہ گہری دوستی میں بدلتی چلی گئی۔ ایک دن ایک اچھے ہوٹل میں ڈنر کرتے ہوئے وسیم نے نادر سے کہا۔ ''یار! میرا خیال ہے کہ اب ہمیں بریک لگا لینے چاہئیں۔''

''کیا مطلب؟'' نادر نے چونک کر کہا۔

''یار! کافی کچھ جمع ہو گیا ہے، اگر کہیں پکڑے گئے تو سب کچھ بھاڑ میں چلا جائے گا۔ میرا تو خیال ہے کہ دبئی چلے چلیں۔ وہاں کوئی چھوٹا موٹا ڈھنگ کا کام کر لیں گے۔ سنا ہے کہ گاڑیوں کی ورکشاپس کا بھی اسکوپ ہے۔'' نادر کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔

''ہاں یار! کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو...... چلو ایسا کرتے ہیں، بس اس مہینے کے آخر تک ایک دو ٹرائیاں اور مارتے ہیں پھر دبئی والے پلین کے متعلق سنجیدگی سے سوچتے ہیں۔ فل سنجیدگی سے۔''

''یار! دیکھ، میں تو کہتا ہوں اتنا ہی کافی ہے۔'' وسیم نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

کچھ دنوں سے وسیم واقعی پریشان تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اگر جلد از جلد انہوں نے اس کام سے ہاتھ نہ اٹھائے تو ان کے ساتھ کچھ نہ کچھ غلط ہو جائے گا۔ ویسے بھی آج کل اسے اپنے سامنے والے گھر میں رہنے والی کلثوم اچھی لگنے لگی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کا پورا گھرانا انتہائی شریف اور صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا اور کلثوم بھی آج کل انٹر میں تھی...... جبکہ وہ خود میٹرک فیل تھا پھر بھی خوابوں پر تو کوئی پہرا نہیں ہوتا نا.... ویسے بھی اس کے پاس اتنی دولت اکٹھی ہو چکی تھی کہ کوئی بھی لڑکی اس کے ساتھ خوش رہ سکتی تھی...... اس کا دل اسے بار بار اکسا رہا تھا کہ جو ہو گیا سو ہو گیا...... اب مزید اس دلدل میں دھنسنے سے بہتر ہے اپنے ہاتھ پاؤں دھو کر صاف کر لینے چاہئیں تاکہ آگے کی زندگی بغیر کسی خوف اور بے سکونی سے بسر کی جا سکے۔ اس لیے وہ گاہے بگاہے نادر کو مزید آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

اس دن بھی نادر جھنجلا کر بولا۔ ''یار! اب تو ایک دم فل اسٹاپ لگانے کی کوشش تو نہ کر۔ جہاں اتنے عرصے سے سب اچھا جا رہا ہے، ایک دو دفعہ کے اور ایڈونچر سے قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔ ویسے بھی عید آنے والی ہے۔ ''اچھا'' دن ہوتے ہیں۔''

مختصر... مختصر

تنہائی کی زندگی اور شادی شدہ زندگی میں کیا فرق ہے؟

تنہائی کی زندگی میں تنہائی کاٹنے کو دوڑتی ہے اور شادی شدہ زندگی میں بیوی۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ۔ حسن ابدال

پڑوسی نے ملک صاحب کو اپنے بکروں میں مگن پا کر ان سے پوچھا۔

''ملک صاحب! آپ اپنے بکرے کو کیا کھلاتے ہیں؟''

ملک صاحب بولے۔ ''کون سا والا بکرا...... سفید یا کالا؟''

پڑوسی نے کہا۔ ''سفید والے کو۔''

ملک صاحب۔ ''چارا کھلاتا ہوں۔''

پڑوسی نے پوچھا۔ ''اور کالے والے کو؟''

ملک صاحب۔ ''اسے بھی چارا کھلاتا ہوں۔''

پڑوسی نے پوچھا۔ ''آپ اپنے بکرے کو کس سے نہلاتے ہیں؟''

ملک صاحب۔ ''کون سے والے بکرے کو...... سفید والا یا کالا والا؟''

پڑوسی بولا۔ ''سفید والے کو۔''

ملک صاحب۔ ''پانی سے۔''

پڑوسی نے پوچھا۔ ''اور کالے والے کو؟''

ملک صاحب۔ ''اس کو بھی پانی سے۔''

پڑوسی کو بڑا طیش آیا۔ بھناتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ اپنے بکرے کو کہاں باندھتے ہیں؟''

ملک صاحب۔ ''کون سے والے بکرے کو...... سفید والے کو یا کالے والے کو؟''

پڑوسی شدید غصے کے عالم میں بولا۔ ''ابے! جب سارے سوالوں کے ایک ہی جواب دینے ہیں تو یہ کیوں پوچھتے ہو کہ سفید والے کو یا کالے والے کو؟''

ملک صاحب نے کہا۔ ''وہ دراصل سفید والا بکرا میرا ہے۔''

پڑوسی نے پوچھا۔ ''اور کالا والا......؟''

ملک صاحب۔ ''وہ بھی میرا ہے......''

مرسلہ۔ اطہر حسین، کراچی

وسیم خاموش ہوگیا۔ نادر طبیعت کا سخت تھا۔ اکثر وہ اپنے موقف پر اڑ جاتا تھا۔ ایسی صورت میں وسیم کو ہی جھکنا پڑتا تھا۔

ایک دن وسیم دوپہر کا کھانا کھا کر صوفے پر ٹانگیں پسارے لیٹا ہوا تھا۔ اچانک نادر آدھمکا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش بتا رہا تھا کہ وہ کوئی ''اسائنمنٹ'' لے کر آیا ہے۔

''چل یار! جلدی سے ڈیٹیل لکھ۔'' اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

وسیم نے گہری سانس لے کر سائڈ ٹیبل سے نوٹ بک اور قلم اٹھالیا۔ ''کون سی ہے؟'' وسیم نے پوچھا۔

''ہنڈا سٹی۔'' نادر نے چہکتے ہوئے کہا اور تفصیل لکھوانی شروع کردی۔ ''سیٹ کورز بلیک...... اسٹیئرنگ کور بلیک اور بلیو۔ میٹ کرسٹل...... پچھلے ڈیش بورڈ پر روز پیٹل کا ٹشو پیپرز والا ڈبا۔ الارم نہیں ہیں...... پچھلی اسکرین پر ہنڈا کا بڑا اسٹیکر......''

وسیم ساتھ ساتھ لکھتا جارہا تھا۔

ایکشن پلان تو طے شدہ تھا اور وہ دونوں اَن گنت مرتبہ اس پر عمل کرچکے تھے۔ یہ کارروائی عموماً نادر ہی کرتا تھا۔ گاڑی کو مطلوبہ گاڑی کے پاس لے جاکر کھڑا کرنا، اور کچھ دیر بعد واپس آکر اپنی کے بجائے ''مطلوبہ'' گاڑی پر چابی آزمانا اور اگر اتفاق سے گاڑی کا مالک پہنچ جائے تو اس کے سامنے غلطی ہو جانے... کی اداکاری اور معذرت کرنا، وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کاموں میں نادر ماہر ہوچکا تھا۔

نادر نے وسیم کو گاڑی کے متعلق جو مزید تفصیل بتائی وہ کچھ اس طرح تھی...... شکار کی جانے والی گاڑی اقبال ٹاؤن کے ایک مشہور پلازا کے سامنے سروس روڈ پر روزانہ صبح دس بجے سے شام ساڑھے چار یا پانچ بجے تک پارک رہتی تھی اور کسی رانا صاحب کی ملکیت تھی۔ آج منگل تھا۔ آج سے دو دن بعد یعنی جمعرات کو کارروائی کی جانی تھی۔ ان دو دنوں میں وسیم نے اپنی ڈیوٹی انجام دینا تھی یعنی اپنی والی سلور ہنڈا سٹی کو شکار کی جانے والی ہنڈا سٹی کے عین مطابق کردینا تھا۔ جمعرات کو ٹھیک ڈھائی بجے نادر نے اپنی گاڑی لے کر موقع پر پہنچنا تھا اور اسے شکار کی جانے والی گاڑی کے قریب پارک کردینا تھا۔ اس نے پلازا... میں جانا تھا اور پانچ دس منٹ بعد واپس آکر دوسری گاڑی کو کھولنا اور لے اڑنا تھا۔ اس دوران میں کوئی اپ سیٹ ہوتا تو وہی رٹے رٹائے جملے اور اداکاری۔

اگلے دو دن وسیم نے اپنی ''ڈیوٹی'' انجام دی۔ اس نے ایک بار خود بھی موقع پر جاکر گاڑی دیکھی۔ پھر اپنی گاڑی کو تیار کیا۔ تیاری کی زیادہ تر اشیا اسے اپنے اسٹور روم سے ہی مل جایا کرتی تھیں اور جو نہیں ملتی تھیں وہ قریبی مارکیٹ سے خرید لی جاتی تھیں۔

جمعرات کو وہ دونوں حسب معمول بارہ بجے اٹھے اور اپنے فلیٹ کے ٹی وی لاؤنج میں برنچ کیا۔ پتا نہیں کیوں آج نادر ضرورت سے زیادہ تناؤ محسوس کررہا تھا۔ گاہے بگاہے اس کی دھڑکن بے ترتیب ہوجاتی تھی۔ اس کے دل کے اندر سے آواز آنے لگی کہ اب واقعی اسے وسیم کی بات مان لینی چاہیے اور دبئی کا رخ کرنا چاہیے۔ جہاں ایک آرام دہ اپارٹمنٹ ہو۔ ایک خوب صورت لڑکی کا ساتھ ہو جسے شریک حیات بھی بنایا جاسکے۔ کوئی سہل سا اور ریگولر روزگار ہو...... اور زندگی سکون سے گزرنے لگے۔ بے شک جو کام وہ اور وسیم کررہے تھے بڑا سیف تھا۔ پکڑے جانا تو دور کی بات ہے وہ آج تک کسی شک شبے میں گرفتار بھی نہیں ہوئے تھے پھر بھی جو کچھ تھا...... آخر تھا تو غیر قانونی۔

☆☆☆

مضبوط پلاننگ اور اچھی تیاری کے ساتھ ڈھائی بجے کے لگ بھگ نادر اپنی گاڑی کو ''مطلوبہ گاڑی'' کے پہلو میں پارک کرنے کے لیے اقبال ٹاؤن کے معروف پلازا... کی طرف روانہ ہوگیا...... لیکن آج طبیعت میں وہ شوخی نہ تھی جو ہر بار وہ نئے جوش اور ولولے کے ساتھ یہ کام انجام تک پہنچاتا تھا۔ جب دل کی بے کلی اور گھبراہٹ سے نظر چراتے ہوئے وہ اپنی منزل تک پہنچا تو وہاں مطلوبہ گاڑی تو موجود تھی مگر اس کے آس پاس پارکنگ کے لیے کوئی جگہ موجود نہیں تھی گویا بدقسمتی اپنا وار کھیلنے کی مکمل تیاری کرچکی تھی...... نادر کو اب تھوڑا انتظار کرنا تھا۔ لہٰذا وہ ایک جگہ رک کر مناسب جگہ خالی ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ بے کلی بڑھنے کے ساتھ ساتھ انتظار لمبا ہوتا جارہا تھا۔

اچانک ایسا کچھ ہوا جس کی اسے ہرگز توقع نہیں تھی.... پلازا کی طرف سے ایک عورت مضطرب انداز میں... تیزی سے اس کی گاڑی کی طرف آئی۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے پینٹ اور

جیکٹ پہن رکھی تھی۔ بال جدید انداز سے تراشے ہوئے تھے۔ اس نے نادر کی گاڑی کو بہ ظاہر بے پروائی سے ایک نظر دیکھا اور بڑے اعتماد سے اس کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ عورت کے ہاتھ میں ایک وزنی بیگ تھا۔ اس نے یہ بیگ گاڑی کی نشست پر رکھا اور لرزاں آواز میں بولی۔

''بس اب جلدی سے نکل جاؤ یہاں سے......''

''کک...... کیا مطلب؟'' اس اچانک افتاد پر نادر ہکلایا۔

''مطلب وہی ہے جو رانا صاحب نے تمہیں بتایا ہے۔ اسے فوراً لے جانا ہے...... خطرہ ہے، میں کہہ رہی ہوں، چلو نکلو یہاں سے۔'' اس عورت نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''آپ کون ہیں؟''

''یہ تعارف بعد میں ہوتے رہیں گے۔'' وہ چڑ کر بولی اور دروازہ زور سے بند کرکے گاڑی سے نکلی اور بڑی سڑک کی طرف تیزی سے نکل گئی۔

ابھی وہ بیس پچیس قدم دور ہی گئی ہوگی کہ ایک پولیس کار طوفانی رفتار سے موڑ کاٹ کر رکی۔ نادر نے دیکھا وہ عورت ایک دم بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔

ایک پولیس والے نے اس دوڑتی ہوئی عورت سے چلا کر کچھ کہا۔ شاید اسے رکنے کا حکم دیا تھا۔ وہ نہیں رکی۔ اسے دور جاتا دیکھتے ہوئے پولیس کار سے تڑتڑ کی خوف ناک آواز آئی۔ گویا عورت پر فائرنگ کی گئی تھی۔ وہ اوندھے منہ سڑک پر گری اور کئی فٹ تک پھسل گئی اور اس کا خون پھیلتا چلا گیا۔

نادر کی رگوں میں خون منجمد ہو رہا تھا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ اس عورت کے ہاتھ میں ایک بیگ بھی تھا جو اس نے بیٹھنے سے پہلے ہی گاڑی میں رکھ دیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر قریب رکھے لیدر بیگ کی زپ کھولی۔ اندر جو کچھ اسے نظر آیا اس نے رہے سہے اوسان بھی خطا کردیے۔ بیگ میں کسی لاش کے کٹے پھٹے اعضا تھے، جنہیں پولی تھین میں لپیٹا گیا تھا۔ لگتا تھا کوئی نو عمر بچہ یا بچی ہے۔ یہ کیا ظلم ہے...... انہیں تو صرف گاڑیاں چرانے کا خبط تھا...... وہ جرم کی دنیا میں اتنے آگے تک جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ نادر کے ذہن میں بجلی سی کوند رہی تھی۔ اس کا ذہن اسے بتا رہا تھا کہ وہ کسی خطرناک ترین چکر میں پھنس گیا ہے اور اس چکر میں پھنسنے کی وجہ وہی تھی، جس ''وجہ'' سے وہ اور وسیم ہمیشہ ایک کامیاب واردات کیا کرتے تھے یعنی گاڑیوں کا بالکل ایک جیسا ہونا۔ کیا خبر تھی کہ خطرے سے بچنے کے لیے یہ ایک چھوٹی سی کارروائی انہیں ایسی منزل پر پہنچا دے گی جہاں سے اپنی بے گناہی ثابت کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ وہ عورت جو چند سیکنڈ پہلے ماری گئی تھی یقیناً نادر کی گاڑی کو دوسری گاڑی سمجھی تھی۔ جس کی مشابہت کے دھوکے میں وہ اس کی گاڑی کا دروازہ بے دھڑک کھول کر بیٹھی اور اسے ایک بہت بڑے امتحان سے دوچار کر گئی۔

یہ رانا صاحب کون تھا؟ یہ کس کی لاش تھی، یہ کون لوگ تھے، یہ کیا کرنا چاہ رہے تھے؟ اس سے نادر کو کچھ غرض نہیں تھی، وہ تو اب صرف اپنی جان بچانا چاہتا تھا اور جان بچتی نظر نہیں آرہی تھی۔

ایک اور پولیس موبائل شور مچاتی آئی...... اس کے بریک چرچرائے اور وہ نادر کی کار کے عین سامنے آن کھڑی ہوئی۔ دو اہلکار آٹومیٹک رائفلیں تانے اس کی طرف بڑھے۔ اسے ہینڈز اپ کرادیا گیا اور وزنی بیگ قبضے میں لے لیا گیا۔

جو کچھ بھی ہوا بجلی کی سی تیزی سے ہوا تھا اور اسی تیزی نے نادر کو ازحد حواس باختہ بھی کر ڈالا تھا۔ وہ تو ایک معمولی چور تھا۔ اب اسے پھانسی کا پھندا اپنے سامنے نظر آرہا تھا۔ جب پولیس اہلکار اسے پکڑ کر موبائل پر سوار کرا رہے تھے اچانک اس نے اندھا دھند زور لگایا اور خود کو چھڑا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ عورت کی خون چکاں لاش کے پاس سے گزرا اور ایک تنگ گلی کی طرف لپکا۔

''رک جاؤ...... گولی ماردیں گے...... رک جاؤ۔'' اس کے عقب سے آوازیں بلند ہوئیں۔

مگر وہ رکا نہیں۔ شاید اسے رکنا آتا ہی نہیں تھا۔ اگر رکنا آتا ہوتا تو سلیم کے کہنے پر چند دن پہلے ہی رک جاتا۔ ابھی وہ تنگ گلی سے دس پندرہ قدم دور ہی تھا کہ ایک بار پھر آٹومیٹک رائفل کی لرزہ خیز تڑتڑاہٹ ابھری۔ اس کی کمر میں ان گنت دہکتے ہوئے انگارے اترے اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔ دبئی...... دبئی کا آرام دہ اپارٹمنٹ، من موہنی صورت والی لڑکی اور ایسی بہت سی دوسری راحتیں اس سے بہت دور جا چکی تھیں...... اور ایسا کیوں ہوا تھا؟ ایسا اس لیے ہوا تھا کہ اس کی گاڑی کسی دوسری گاڑی سے بالکل ملتی جلتی تھی......



قسط:10

شیش محل

اسماء قادری

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے ربِّ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گھری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ وخم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین وفطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہو لہو کر دیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ بدلتی وارداتِ قلبی کی عکاس دلچسپ داستان



گذشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ قیامِ پاکستان سے قبل کا زمانہ ہے۔ جولیٹ ایک مقامی عیسائی لڑکی ہے جس کے والدین نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلائی ہے اور وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ اس کا محبوب اور کلاس فیلو عارف بھی اس کا کولیگ ہے۔ مذاہب کے فرق کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہیں لیکن عارف پہلے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ان کی ایک ساتھی ثنا بھی رہی ہے جو عارف کو پسند کرتی ہے لیکن عارف کے جولیٹ کی طرف جھکاؤ اور طبقاتی فرق کی وجہ سے کھل کر اظہار نہیں کرتی اور ایک جاگیردار و سیاست داں دلدار آغا سے شادی کر لیتی ہے۔ دلدار آغا کانگریس سے تعلق رکھتا ہے۔ جولیٹ اپنے اخبار کی طرف سے دلدار آغا کا انٹرویو لینے جاتی ہے۔ دلدار آغا اچھے کردار کا مالک نہیں ہے۔ اس کے انٹرویو کے بعد جولیٹ مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ آغا کی طرف سے پیغامات اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ان حربوں میں ناکامی کے بعد بالآخر جولیٹ کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ حالتِ بے ہوشی میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آغا سے نکاح پر راضی ہو جائے۔ جولیٹ کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر نکاح کے انتظامات جاری ہوتے ہیں کہ ثنا اس کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے اور اسے فرار کروا دیتی ہے۔ لٹی پٹی جولیٹ گھر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لٹنے کی داستان اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہے اور اس کی ماں جوزفین حرکتِ قلب بند ہونے سے مر گئی ہے۔ باپ جوزف بھی بیٹی اور بیوی کے دکھ میں بستر سے لگ جاتا ہے۔ ان مشکل حالات میں جولیٹ عارف سے جذباتی اور اخلاقی سہارے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن عارف ایک روایتی مرد کی طرح داغ دار لڑکی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں جولیٹ اپنے مجرم سے انتقام لینے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں محلے کے ایک بدمعاش فاروق کی مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فاروق رین دادا کے اڈے سے وابستہ ہے اور جولیٹ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ جولیٹ اس کے جذبات سے واقف ہے لیکن ظاہر ہے ایک غنڈے کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے ایک ساتھی سے ایک مہلک چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس چاقو کی مدد سے وہ دلدار آغا کو قتل کرنے کی خواہش مند ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ان جلسے جلوس میں پابندی سے شرکت کرتی ہے جن میں آغا کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ کشمکش کے اس عرصے میں اس کے باپ جوزف کی حالت مزید خراب ہو جاتی ہے اور مرنے سے قبل وہ جولیٹ کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں جوزفین نے اس کے لیے ایک صندوقچی میں کچھ چیزیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جولیٹ صندوقچی کھولتی ہے تو اس میں سے ایک ڈائری، ہیرے جڑا ایک لاکٹ اور دھندلائی ہوئی ایک بلیک اینڈ وہائٹ تصویر برآمد ہوتی ہے۔ تصویر جوزفین اور ایک اجنبی مرد کی جوانی کی ہے۔ جوزفین کی ڈائری پڑھنے کے بعد اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی ماں ماضی میں ایک نواب خاندان کی گورنس کے طور پر ملازمت کرتی تھی۔ ادھر فاروق سر میں چوٹ لگنے کے باعث اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک نرس کے ساتھ بدسلوکی کرنے پر فاروق ایک شخص کی مرمت کرتا ہے اور وہیں ان کی ملاقات سیٹھ بھالیہ سے ہو جاتی ہے۔ سیٹھ رین دادا کی خدمات حاصل کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق فاروق کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے شملہ بھیج دیا جاتا ہے اور وہ وہاں سیٹھ بھالیہ کی رہائش گاہ پر بطور مہمان قیام کرتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات بھالیہ کی بیٹی بملا سے ہوتی ہے جو بیوہ ہے۔ بملا اور فاروق میں دوستانہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ ادھر طوائف زادی چاند بانو جو فاروق سے محبت کرتی ہے اور فاروق کے دل میں چاند بانو کی محبت نہ سہی مگر وہ چاند بانو کا دل سے احترام کرتا تھا، وہ شوٹنگ کی غرض سے شملہ جاتی ہے اور فاروق سے ملنے بھالیہ کی رہائش گاہ پہنچتی ہے۔ تاہم بملا اسے فاروق سے ملنے نہیں دیتی اور دل میں رقابت کے جذبات محسوس کرتی ہے۔ مگر اتفاقاً بازار سے خریداری کے لیے جانے پر فاروق کو وہاں چاند بانو نظر آ جاتی ہے اور چاند بانو کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ کیے گئے برے سلوک کا بملا سے حساب لے لے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

”آپ جب چاہیں ملاقات کے لیے تشریف لا سکتی ہیں۔ میں اپنے تمام متعلقین کو آگاہ کر دوں گا کہ چاند بانو میری خاص مہمان ہیں اور یہ جب بھی ملاقات کے لیے آئیں بلا تاخیر مجھے ان کی آمد سے آگاہ کر دیا جائے۔“ چاند بانو کو ہونے والی کوفت اور دل آزاری کی تلافی کے لیے یہ جملے کہتے ہوئے فاروق کو اندازہ نہیں تھا کہ بملا کے سینے پر کیسے سانپ لوٹ رہے ہیں۔ وہ تو صرف چاند بانو کو دیکھ رہا تھا جس کا چہرہ اس کے الفاظ پر کھل اٹھا تھا اور وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ اسی وقت زمرد بائی بھی وہاں چلی آئی۔ اس کے پیچھے سامان سے لدا پھندا ڈرائیور بھی تھا۔

”آداب۔ امید نہیں تھی کہ آپ سے یہاں ملاقات ہو جائے گی۔“ زمرد بائی نے ڈرائیور کو سامان گاڑی کی ڈکی میں رکھنے کا اشارہ کیا اور خود فاروق سے مخاطب ہوئی۔ چاند بانو کے فاروق کے لیے جذبات محسوس کر کے وہ اپنے دل میں اس کے لیے ذرا ناپسندیدہ جذبات رکھتی تھی لیکن بہرحال اس ناپسندیدگی کو اس نے اپنے لہجے پر غالب نہیں آنے دیا تھا۔

”جی بس اتفاق ہی ہے۔ ہم لوگ خریداری کے ارادے سے نکلے تھے کہ یہاں چاند بانو پر نظر پڑ گئی۔ سوچا ذرا سلام دعا کر لیں۔“ فاروق نے بھی شائستگی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

”مزاج کیسے ہیں آپ کے؟ ہمارے علم میں ہے کہ آپ ڈاکٹرز کی تجویز پر بغرض تبدیلی آب و ہوا شملہ میں مقیم

ہیں۔ہم آپ کی مزاج پرسی کے لیے آتے لیکن چاند بانو اتنی عجلت میں روانہ ہوئی کہ ہمیں مہلت ہی نہیں ملی۔ ویسے بھی طویل سفر کی تھکان کی وجہ سے کہیں آنے جانے کی ہمت نہیں تھی۔" زمرد بائی نے اس کا احوال دریافت کیا۔

"جی مجھے اندازہ ہے کہ بمبئی سے یہاں تک کا سفر کتنا طویل اور دشوار ہے۔ آپ نہیں آسکیں تو آپ سے کوئی شکوہ بھی نہیں ہے۔ ویسے بھی اللہ کے فضل و کرم سے میں اب کافی بہتر ہوں۔" فاروق نے طریقے سے اسے جواب دیتے ہوئے دل میں شکر ادا کیا کہ وہ چاند بانو کے ساتھ نہیں آئی تھی ورنہ بملا نے وہاں چاند بانو کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، اس کے نتیجے میں اس بے چاری کو زمرد بائی کے سامنے سبکی اٹھانی پڑتی۔

"بہتر تو آپ لگ رہے ہیں۔ ماشاء اللہ کسی راجا اندر کی طرح رہ رہے ہیں۔ تیمار داری کے لیے اتنے خوب صورت لوگ آس پاس ہوں تو مزاج پر ویسے بھی اچھا اثر پڑتا ہے۔" اس نے فاروق کے ساتھ موجود کیتھرائن اور بملا کی موجودگی کو جتایا اور شاید چاند بانو کو احساس دلانے کی کوشش کی کہ وہ جس کے لیے دیوانی ہو رہی ہے، وہ تو بیک وقت دو دو حسیناؤں کے جلو میں رہ رہا ہے۔

"جی اللہ کے فضل و کرم سے مجھے ہمیشہ ہی بہترین ساتھیوں کا ساتھ میسر رہا ہے۔ مسز کیتھرائن اور گولو بمبئی سے بطورِ خاص میرا خیال رکھنے کے لیے ہی میرے ساتھ آئے ہیں جبکہ یہ جو مس بملا بھاٹیہ ہیں یہ بھاٹیہ ہاؤس کی مالکہ ہیں اور چھٹیاں گزارنے شملہ آئی ہیں۔" اسے جواب دینے کے ساتھ ساتھ فاروق نے تعارف کا مرحلہ بھی نمٹایا۔

"مس بملا بھاٹیہ...... آداب، بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" زمرد بائی لوگوں کو ان کی حیثیت کے اعتبار سے عزت اور اہمیت دینے کی عادی تھی چنانچہ بھاٹیہ سیٹھ جیسے آدمی کی بیٹی ہونے کا حوالہ سن کر بملا کے آگے بچھنے لگی۔ بملا نے اس کی خوش اخلاقی کو قطعی اہمیت نہیں دی اور فاروق سے مخاطب ہو کر بولی۔

"آپ کا شاپنگ کا ارادہ ہے یا یہیں کھڑے کھڑے سارا سے بتادیں گے؟"

"ہاں بس چلتے ہیں۔" فاروق اس کے انداز پر ذرا سا سٹپٹا گیا۔ بملا کا لہجہ زمرد بائی اور چاند بانو کو اہمیت نہ دینے والا تھا اور وہ یوں منہ پر کسی کی تذلیل کرنے والا آدمی نہیں تھا اس لیے اس صورت حال پر تھوڑا خجل ہو گیا تھا۔

"ہم بھی اب چلیں گے۔ خریداری کرتے کرتے کافی تھک گئے ہیں۔" زمرد بائی نے بملا کی بات کو اہمیت نہ دیتے ہوئے بڑی تمکنت سے کہا اور چاند بانو کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی پچھلی نشست کی طرف بڑھی۔

"خدا حافظ۔ موقع ملا تو پھر ملاقات ہوگی۔" فاروق نے ہڑبڑا کر الوداعی کلمات ادا کیے۔ چاند بانو نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر اسے آداب کہا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی گاڑی وہاں سے روانہ ہوگئی۔

"آپ نے ان خواتین کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ چند منٹ کی تاخیر سے کیا فرق پڑ جاتا۔" فاروق نے آہستہ آواز میں بملا کو ٹوکا۔ کیتھرائن اور گولو اس سارے عرصے میں خاموش تماشائی بنے رہے تھے اور انہوں نے کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کی تھی۔ اب بھی وہ دونوں خاموشی سے ان کے پیچھے قدم اٹھا رہے تھے۔

"ان عورتوں کے ساتھ کھڑا ہونا، مجھے شدید کوفت میں مبتلا کر رہا تھا۔ مجھے تو آپ پر حیرت ہے کہ آپ کیسے انہیں برداشت کر رہے تھے۔ میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ جیسے نفیس آدمی کے بھی بازاری عورتوں سے تعلقات ہو سکتے ہیں۔ آپ کا اور ان کا تو کوئی میچ ہی نہیں بنتا۔" بملا نے کھل کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

"آپ میرے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تو خود اڈے پاڑے کی دنیا کا آدمی ہوں اور لوگوں سے تعلق قائم کرتے ہوئے اتنا دھیان نہیں رکھتا کہ کس کا کہاں سے تعلق ہے۔ بس انسان کی حیثیت سے جو خود بخود میرے قریب چلا آئے، اسے قبول کر لیتا ہوں۔ انسانوں کو خانوں میں بانٹ کر ان سے دوستی کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ نہیں کرتا۔ آپ اگر اس قسم کی درجہ بندی پر یقین رکھتی ہیں تو مجھ سے دوستی کے دعوے کو ترک کر سکتی ہیں۔ یقین جانیے مجھے بالکل بھی شکوہ نہیں ہوگا۔" فاروق نے آزردہ سے لہجے میں اس کے اعتراض کا جواب دیا۔

"آپ کی بات الگ ہے۔ آپ جس دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اس کے باسی بالکل نہیں لگتے۔ آپ کی اسی انفرادیت نے تو مجھے آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور کیا ہے۔" بملا نے جلدی سے وضاحت کی۔

"بس تو ایسا ہی معاملہ چاند بانو کا سمجھیے۔ وہ کیچڑ میں کھلا کنول ہے اور میں اپنے اندر یہ جرأت نہیں پاتا کہ اس جیسی لڑکی کو بازاری قرار دے کر اس کے خلوص کی توہین کروں۔" فاروق کا انداز دوٹوک تھا۔ بملا اختلاف کی

خواہش رکھنے کے باوجود اسے کچھ نہ کہہ سکی اور ہونٹوں کو بھینچ کر خاموشی سے اس کے سنگ چلنے لگی۔

☆☆☆

"تیاری کر لو بیٹا۔ حیدرآباد اسٹیشن آنے والا ہے۔" جوزفین کی ہم سفر صبیحہ بانو اسے یہ اطلاع دے کر خود اپنا اسباب سمیٹنے میں مصروف ہو گئیں۔ جوزفین کے ساتھ سامانِ سفر تھا ہی کتنا کہ اسے سمیٹنے کی زحمت کرنی پڑتی چنانچہ وہ صبیحہ بانو کی مدد کروانے لگی۔ ان کے ساتھ خاصا ساز و سامان تھا۔ جوزفین نے اس سارے سامان کو سمیٹنے میں ان کی دل و جان سے مدد کی۔

"جیتی رہو بیٹی۔ تم بالکل میری نفیسہ بانو جیسی ہو۔ انہیں بھی منٹوں میں اچ سارا کام نمٹا دیتی ہے۔" اس کی مدد نے صبیحہ بانو کو خوش کر دیا۔ جوزفین خاموشی سے مسکراتی رہی۔ اسے ان مہربان خاتون کی ہم سفری نے بڑا اسہارا دیا تھا اور گھر سے روانہ ہوتے وقت طبیعت پر جو افسردگی اور اضمحلال چھایا ہوا تھا، اس میں خاصی کمی واقع ہو گئی تھی۔

"ادھر اسٹیشن پر کوئی تمہارے کو لینے کے لیے آئیں گا یا تمہیں خود نواب سلیم کی حویلی پہنچنا ہوں گا؟" وہ جو حیدرآباد نزدیک آنے پر خاصی پُرجوش نظر آنے لگی تھیں، خیال آنے پر اس سے دریافت کرنے لگیں۔

"جی اطلاع تو بھجوا دی تھی اور وہاں سے پیغام بھی ملا تھا کہ وقت پر کوئی اسٹیشن پہنچ جائے گا۔ اب دیکھیے کہ کیا ہوتا ہے۔ پتا تو میرے پاس لکھا ہوا ہے۔" جوزفین نے انہیں بتایا۔

"پیغام ملا ہے تو پھر کوئی نہ کوئی ضرور تمہیں لینے آئے گا۔ نواب صاحب کا خاندان بڑا اچ وضع دار ہے۔" صبیحہ بانو نے اس کی بات سن کر اسے یقین دہانی کروائی تو وہ بھی اپنی جگہ اطمینان محسوس کرنے لگی۔

"جب تک نواب صاحب کی حویلی سے کوئی تمہیں لینے کو نہیں آ جاتا، میں تمہارے ساتھ اچ رکی رہوں گی۔ تم بالکل بھی فکر نکو کرو۔" صبیحہ بانو نے اسے مزید تسلی کروائی اور واقعی انہوں نے اپنے اس قول پر عمل بھی کیا۔ حیدرآباد اسٹیشن سے گاڑی رکنے کے بعد جب ملازم لڑکا اکبر ان کا سامان اٹھانے آیا تو انہوں نے اسے آگاہ کر دیا کہ وہ جوزفین کے اسٹیشن سے روانہ ہونے تک اس کے ساتھ ہی رکیں گی چنانچہ اکبر ان کا اسباب تانگے میں رکھوا کر ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرے۔ اکبر ان کے حکم کا غلام تھا چنانچہ ان کے فیصلے سے اختلاف کیسے کرتا۔ خاموشی سے عمل پیرا ہو گیا جبکہ صبیحہ بانو اسے کسی چوزے کی طرح اپنے پروں میں چھپائے ٹرین سے نیچے اتر آئیں۔ اسٹیشن پر روایتی رش تھا۔ مسافروں سے زیادہ ان افراد کی تعداد تھی جو اپنے اعزا کو رخصت کرنے یا ان کے استقبال کے لیے جتھوں کی صورت میں آئے ہوئے تھے۔ جوزفین اور صبیحہ بانو جیسے مسافر بہت کم تھے جن سے متعلق ہجوم وہاں موجود نہیں تھا۔ صبیحہ بانو کی پوزیشن اس اعتبار سے بہتر تھی کہ وہ اپنے شہر میں واپس لوٹی تھیں اور کسی غیر یقینی صورتِ حال کا شکار نہیں تھیں۔ ان کے ساتھ اکبر جیسا تابعدار لڑکا بھی موجود تھا جو نا صرف ان کا سامان سنبھالے ہوئے تھا بلکہ سواری وغیرہ کا انتظام بھی اس کے ہی ذمے تھا۔ جوزفین کو تو یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ حسبِ وعدہ کوئی اسے لینے آئے گا بھی یا نہیں اور اگر آئے گا تو وہ اسے کیسے پہچانے گی۔ صبیحہ بانو کے پہلو میں کھڑی وہ بس بے چینی سے ادھر ادھر نظریں دوڑاتی رہی۔ وہاں بے شمار چہرے تھے لیکن سب کے سب اجنبی۔ ان اجنبی چہروں میں سے کسی پر اس نے اپنے لیے کھوج نہیں پائی لیکن پھر ایک جگہ اس کی نظر ٹھہر گئی۔ گتے کے ایک کارڈ پر انگریزی میں اس کا نام لکھا ہوا تھا اور کارڈ کو ایک شخص اپنے سر سے اوپر اٹھائے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

"وہ دیکھیے خالہ جان! وہ شخص میرے نام کا کارڈ اٹھائے ہوئے ہے۔ لگتا ہے وہی مجھے لینے آیا ہے۔" اس نے صبیحہ بانو کی حسبِ ہدایت انہیں خالہ جان کہہ کر پکارتے ہوئے، اس شخص کی طرف متوجہ کیا۔ انہوں نے فوراً آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا کر اس کی بتائی ہوئی سمت میں دیکھا۔

"ہاؤ ماں۔ وہ نواب صاحب کی حویلی کا اچ ملازم ہے۔ میں اس کو اچھی طرح پہچانتی ہوں۔" انہوں نے تصدیق کی اور اس کا ہاتھ تھام کر اس شخص کی جانب بڑھیں۔ اب اس نے بھی ان لوگوں کو دیکھ لیا تھا اور جوزفین کے لباس وغیرہ سے یقیناً اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ یہی وہ مطلوبہ مہمان ہے جسے لینے کے لیے وہ اسٹیشن پر آیا ہے۔

"مس جوزفین......؟" ان کی طرف لپکتے ہوئے اس نے سوالیہ لہجے میں اسے مخاطب کیا تو جوزفین نے اثبات میں جواب دے کر اس کے اندازے کی تصدیق کی۔

"آپ میرے ساتھ چلیے۔ آپ کے لیے موٹر منتظر ہے۔" اس کی طرف سے تصدیق ہوتے ہی وہ فوراً بولا۔

''جاؤ بیٹی جاؤ۔ فی امان اللہ۔ میں تمہاری کامیابی کے واسطے دعا کروں گی۔ اپنا پتا تو میں تمہیں لکھوا ہی دی ہوں اگر کوئی مسئلہ ہو تو سیدھی میرے کنے چلی آنا۔'' صبیحہ بانو نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی محبت سے کہا تو وہ ان کے خلوص کو دل سے محسوس کرتی ہوئی انہیں الوداع کہہ کر اپنے مخاطب کے ساتھ چل پڑی۔ وہ اسے اپنے ساتھ ایک سفید رنگ کی موٹر کار تک لے کر آیا۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر پہلے سے کوئی موجود تھا۔

''وہ چھوٹے مالک نواب زادہ اسد اللہ ہیں۔'' اس کے ساتھ چلتے شخص نے سرگوشی میں اسے آگاہ کیا تو وہ حیران رہ گئی۔ نواب زادہ اسد اللہ کا نام اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ جن صاحب کے حوالے سے وہ یہاں آئی تھی، وہ نواب زادہ اسد اللہ کے ہی کلاس فیلو رہے تھے لیکن وہ امید نہیں کرسکتی تھی کہ ایک نواب زادہ اسے لینے اسٹیشن تک چلا آئے گا۔

''گڈ مارننگ سر۔'' قریب پہنچ کر اس نے بہ زبانِ انگریزی اسے سلام پیش کیا۔

''گڈ مارننگ۔'' نواب اسد اللہ نے مسکرا کر اسے جواب دیا اور جوزفین دل میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکی کہ اس نے اس سے قبل کسی مرد کی اتنی خوب صورت مسکراہٹ نہیں دیکھی ہے۔ شخصی وجاہت کے اعتبار سے بھی نواب اسد اللہ خوب تھا۔ اجلی رنگت پر سیاہ گھنے بال اور گھور سیاہ آنکھیں خوب جچ رہی تھیں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہونے کے باوجود اس کا دراز قد اور مضبوط سراپا نمایاں تھا۔

''تشریف رکھیے۔'' نواب اسد اللہ نے اس کی نگاہ میں اپنے لیے ستائش کو محسوس کرلیا لیکن بردباری سے مسکراتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔ اسٹیشن پر پلے کارڈ اٹھا کر آنے والا شخص پچھلی نشست کا دروازہ کھولے اس کے بیٹھنے کا منتظر تھا۔ جوزفین جھجکتی ہوئی اندر بیٹھ گئی۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب وہ اتنی شاندار موٹر کار میں بیٹھ رہی تھی ورنہ اس کے طبقے میں تو بس کی سواری میسر آجانا بھی ایک نعمت ہی تصور کیا جاتا تھا۔ کرائے کے پیسے موجود نہ ہونے کی صورت میں اس نے بہت بار طویل فاصلوں کو اپنے نازک پیروں پر طے کیا تھا اس لیے اتنی آرام دہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس کا جھجکنا بڑا فطری عمل تھا۔ دروازہ کھولنے والا شخص اس کے بیٹھنے کے بعد دروازہ بند کرکے خود آگے پسنجر سیٹ پر جا بیٹھا۔ نواب اسد اللہ نے سبک رفتاری سے گاڑی آگے بڑھائی۔

''آپ کا سفر تو اچھا گزرا نا؟'' ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس نے انگریزی میں جوزفین سے دریافت کیا۔

''جی ہاں۔'' جوزفین نے اسے مختصر جواب دیا۔

''یہ آپ کا حیدرآباد آنے کا پہلا موقع ہے؟'' اس نے دوبارہ انگریزی میں ہی دریافت کیا۔

''جی۔ میں پہلی بار حیدرآباد آئی ہوں۔'' اس بار جوزفین نے پورے جملے میں اس کی بات کا جواب دیا۔ وہ ایک ذہین لڑکی تھی اور اس نے فوراً اندازہ لگالیا تھا کہ نواب زادہ اسد اللہ اس کی انگریزی دانی کا اندازہ لگانے کے لیے یہ گفتگو کررہا ہے اور اس کے لیے موقع ہے کہ وہ اپنی لیاقت کو ثابت کرسکے۔ وہ پوری توجہ سے اس کے بظاہر معمولی سوالوں کے جواب دینے لگی۔ سادہ سے لہجے میں کیے جانے والے ان سوالوں کے جواب دینے میں اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اس میں کچھ کمال مخاطب کے دوستانہ رویّے کا بھی تھا۔ اس نے نوابوں کے کروفر کے متعلق جتنی باتیں سن رکھی تھیں، یہ شخص ان سے قطعی مختلف محسوس ہورہا تھا۔

''ویل مس جوزفین۔ آپ سفر سے آئی ہیں۔ زنان خانے میں جاکر آرام کیجیے۔ ظہرانے کے بعد ابا جان آپ سے ملاقات کریں گے اور وہی آپ کی ملازمت کے سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ بھی سنائیں گے۔ ہماری ڈیوٹی بس یہیں تک تھی۔'' گاڑی بڑی سی حویلی کے بڑے سے پھاٹک سے گزر کر ایک مقام پر رکی تو نواب زادہ اسد اللہ نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا اور خود گاڑی سے اتر کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ایک سمت بڑھ گیا۔

''آیئے مس۔ میں آپ کو زنان خانے تک پہنچا دوں۔'' نواب اسد اللہ کے قدموں کے نشان گنتی جوزفین کو ملازم نے مخاطب کیا تو وہ چونکی اور گاڑی سے اتری۔ ملازم اسے اپنی ہمراہی میں لیے آگے بڑھا۔

''آغا بیگم! یہ مس جوزفین ہیں۔ آپ ان کے آرام کا خیال رکھیے۔ سہ پہر کو بڑے نواب صاحب ان سے ملاقات کریں گے۔'' زنان خانے میں اسے سوتی ساڑی میں ملبوس ادھیڑ عمر کی خاتون کے حوالے کرتے ہوئے ملازم نے خاتون کو بتایا۔

''ٹھیک ہے میاں تم جاؤ۔ ہم دیکھ لیں گے۔'' خاتون نے نرمی سے اسے جواب دے کر رخصت کردیا۔ خاتون کی شخصیت میں وقار تھا۔ انہوں نے گہرے نیلے بارڈر والی ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑی بڑے سلیقے سے

باندھ رکھی تھی۔ ساڑی کے ساتھ انہوں نے بلاؤز کے بجائے مکمل آستینوں والی سفید رنگ کی چھوٹی کرتی پہن رکھی تھی اور اس انداز کی وجہ سے ستر پوشی کے تقاضے بہت اچھی طرح پورے ہو رہے تھے۔ جوزفین نے بمبئی میں عورتوں کو کثرت سے ساڑیاں پہنتے دیکھا تھا لیکن ان کے ساڑی باندھنے کا انداز ایسا ہوتا تھا جس میں جسم کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا جا سکے۔ بمبئی کی عورتیں ساڑیوں کے ساتھ مختصر بلاؤز پہنتی تھیں جن کے گلے عموماً بہت کشادہ ہوتے تھے اور آستینیں بھی آدھی یا پھر سرے سے غائب ہوتی تھیں۔ اسے اکا بیگم کہہ کر پکاری جانے والی خاتون کا انداز بہت اچھا لگا۔

''آیئے مس صاحبہ! ہم نے آپ کے لیے کمرا تیار کروا دیے ہیں۔ آپ پانی نہا لیں تاکہ سفر کی گرد اتر جائے پھر ہم آپ کے لیے کھانا لگواتے ہیں۔'' اکا بیگم نے اسے مخاطب کیا پھر بلند آواز سے کسی سروری کو پکارا۔ سروری ایک پکار پر بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گئی۔

''مس صاحبہ کو ان کے کمرے میں لے جاؤ۔'' اکا بیگم نے اسے حکم دیا اور خود ایک راہداری میں مڑ گئیں۔ جوزفین کے لیے یہ سارا ماحول انوکھا تھا۔ ملازمین کی فوج، پرشکوہ در و دیوار، سکون آمیز خاموشی ان سب چیزوں سے بھلا اس کا پہلے کبھی کہاں واسطہ پڑا تھا۔ وہ ونڈر لینڈ میں آئی ایلس کی طرح سحر زدہ سی سروری کے پیچھے چل پڑی۔ سروری نے اسے جس کمرے میں پہنچایا، اس کا حدود اربعہ تقریباً اس گھر جتنا تھا جس میں اب تک وہ رہتی آئی تھی۔ خوب صورت حریری پردے، وسیع و عریض بستر جس پر قیمتی مخملیں چادر بچھی تھی، فرش پر غالیچے بچھے تھے، دیواروں پر تصویریں اور ایک بڑی سی گھڑی سجی تھی۔ کھڑکی کے قریب ایک جھولنے والی کرسی موجود تھی اور مزید بھی اتنا سامان تھا کہ جوزفین کے لیے ایک نظر میں جائزہ لینا ممکن نہیں تھا۔

''آپ کے لیے یہ کمرا میں نے تیار کیا ہے۔ آپ کو کیسا لگا؟'' ملازمہ سروری کے پُرتجسس سوال پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''بہت شاندار۔ تم نے بہت محنت سے کمرا تیار کیا ہے۔'' اس نے کوشش کی کہ جواب دیتے ہوئے اس کے لہجے میں وقار ہو اور سروری یہ محسوس نہ کرے کہ اس نے زندگی میں پہلی بار ایسے کمرے میں قدم رکھا ہے۔

''شکر ہے آپ کو پسند آیا۔ نواب زادہ اسد اللہ کی طرف سے خاص ہدایات آئی تھیں کہ بمبئی سے آنے والی مہمان کا بہت خیال رکھا جائے۔ آپ کی ملاقات ہوئی ہو گی نا نواب صاحب سے؟'' کم عمر سروری ذرا باتونی لگتی تھی۔

''ہاں۔ ابھی میں ان ہی کے ساتھ موٹر میں اسٹیشن سے آئی ہوں۔'' اس نے مسکرا کر سروری کے سوال کا جواب دیا۔

''ہائے میرے کو معلوم ہے۔ اصل میں خدا بخش چاچا کو بگھی میں آپ کو لینے اسٹیشن جانا تھا لیکن اچانک ہی آپا بیگم نے اس بگھی میں خانم سے ملاقات کے لیے جانے کا فیصلہ سنا دیا۔ آپا بیگم بڑے نواب صاحب کی بیوہ بہن ہیں۔ ان کا حکم ٹالنے کی جرأت کوئی نہیں کر سکتا۔ اتفاق سے آج حویلی کی ساری ہی سواریاں کہیں نہ کہیں نکلی ہوئی ہیں بس ایک اچ موٹر ہی کھڑی تھی لیکن ڈرائیور چھٹی پر تھا تو نواب زادہ صاحب نے کہا کہ وہ چلے جاتے ہیں آپ کو لینے ورنہ آپ کو پریشانی ہو گی۔'' سروری نے اسے نواب زادہ اسد اللہ کے اسٹیشن تک خود آنے کی ساری تفصیل کہہ سنائی جسے سن کر جوزفین نواب زادہ کے اخلاق کی گرویدہ ہو گئی۔ اس نے تو سن رکھا تھا کہ یہ نوابین اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے لیکن اسد اللہ سے پڑنے والے واسطے نے اس سنی سنائی کی تردید کر ڈالی تھی۔ ملازمہ نے اسے نہانے کے لیے غسل خانے میں پہنچایا تو وہ اس شاندار غسل خانے میں نہانے کے بعد خود کو بالکل تر و تازہ محسوس کرنے لگی۔ غسل کے بعد اسے پُرتکلف کھانا پیش کیا گیا۔

''یہاں کھانے پینے کے اوقات مقرر ہیں اور سب لوگ اکٹھے ہی کھانا کھاتے ہیں لیکن آپ لمبے سفر سے تھکے ہوئے آئے ہیں اس لیے اِکا بیگم نے وقت سے پہلے ہی آپ کو آپ کے کمرے میں کھانا پہنچانے کی ہدایت کی تھی۔'' سروری نے اس کے آگے کھانا چنتے ہوئے اسے آگاہ کیا۔

''یہ اِکا بیگم کون ہیں؟'' وہ جب سے حویلی پہنچی تھی، اِکا بیگم کی شان دیکھ رہی تھی چنانچہ تجسس سے پوچھا۔

''داروغہ جیل۔'' سروری نے بے ساختہ جواب دیا اور ہنسنے لگی پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکتے ہوئے بولی۔

''آپ انہیں حویلی کے ملازمین کی سردار سمجھ لیں۔ زنان خانے میں بیگمات کے بعد ان اچ کا حکم چلتا ہے۔ آپا بیگم کی بہت منہ چڑھی ہیں لیکن خیر کبھی کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتیں۔ ہم پر سختی کرتی ہیں تو ہمارا خیال بھی رکھتی ہیں۔'' سروری نے اسے معلومات فراہم کیں۔ کھانے کے دوران میں جوزفین اس سے چھوٹے چھوٹے کئی سوالات کرتی رہی جس کے نتیجے میں اسے اس بات کا علم ہو گیا کہ

حویلی میں کُل کتنے افراد رہتے ہیں۔ ان میں مرد و زن کی تعداد کیا ہے اور بچے کتنے ہیں۔ کھانے کے بعد سروری نے برتن سمیٹ کر اسے تخلیہ فراہم کیا تو وہ آرام کے لیے بستر پر دراز ہوگئی۔ نرم ملائم بستر پر لیٹ کر نیند کی آغوش میں جاتے ہوئے اس کے دل میں شدت سے خواہش تھی کہ وہ یہاں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے۔

☆☆☆

''اپن نے تیرے کو بیٹی بولا تھا اور تیرے بھلے کے لیے وہی فیصلہ کیے ہیں جو ایک باپ اپنی بیٹی کے لیے کرسکتا ہے۔ اپن اپنی طرف سے پوری طرح دیکھ بھال کے تیرے لیے بر تلاش کیے ہیں۔ لڑکے کی شہرت اور روزگار دونوں سے اپنا دل مطمئن ہے۔ اوپر والے نے چاہا تو تو اس کے ساتھ بہت سکھی رہے گی۔ اپن باپ بن کر تجھے اس کے ساتھ رخصت کررہا ہے پر تیرے کو یہ نصیحت نہیں کرے گا کہ ڈولی میں جارہی ہے تو اب شوہر کے گھر سے تیرا ڈولا ہی نکلنا چاہیے۔ تو نے جندگی (زندگی) میں بہت دکھ دیکھ لیے اب اپن تیرے کو صرف سکھی دیکھنے کو مانگتا ہے۔ تیرا گھر والا تیرے کو سکھی رکھے تو اپن اس کو سر آنکھوں پر بٹھائے گا، پر اگر وہ تیرے کو جرا بھی تنگ کرے تو بس تو اپنے کو ایک چٹھی ڈال دینا، اپن اس کی ناک میں رسی ڈال کر اس کو بالکل سیدھا کردے گا۔'' ثریا بانو دلہن بنی بیٹھی تھی اور ربن نکاح سے قبل اس سے ملاقات کے لیے آیا ہوا تھا۔ دوسری شادی کے نام سے ابتدا میں تو ثریا بانو بہت خوف زدہ ہوئی تھی اور انکار ہی کردیا تھا لیکن ربن کے سمجھانے پر راضی ہوگئی۔ اس کی رضامندی کی بڑی وجہ جو جیسے اوباشوں سے بچ کر ایک مرد کے سائے میں آنا تھی۔ چراغِ آخرِ شب کی طرح پھڑپھڑاتے ماموں تو اب بھی اس کی اور اس کے بچے کی حفاظت کے لیے کچھ بھی کرنے سے قاصر تھے اور جو یہ چراغ بجھ جاتا تو وہ کہاں جاتی۔ ربن کی منہ بولی بیٹی کی حیثیت بھی اسے کب تک پناہ دیتی۔ وہ جس دنیا کا باسی تھا، وہاں کب حالات پلٹا کھا جائیں کچھ پتا نہیں ہوتا۔ ربن نے خود اسے یہ ساری اونچ نیچ سمجھا کر شادی کے لیے راضی کیا تھا اور اب پھر دلاسے کے لیے اس کے پاس موجود تھا۔ ثریا بانو نے عروسی جوڑے کے نام پر ہلکے گلابی رنگ کی ریشمی شلوار قمیص پہن رکھی تھی جس کے ہم رنگ دوپٹے پر ہلکی سی سنہری کرن لگی ہوئی تھی۔ اس کے گلے اور ہاتھوں میں وہ طلائی زیور موجود تھا جو ربن نے اسے جہیز میں دیا تھا۔ ٹیکا اور نتھ پہننے سے ثریا بانو نے انکار کردیا تھا لیکن محلے کی خواتین نے بے حد اصرار کر کے اس کے ہونٹوں پر سرخی اور آنکھوں میں کاجل لگا دیا تھا۔ اتنی تیاری پر ہی وہ بے حد سج گئی تھی اور اس کا یہ سوگوار حسن دیکھنے والوں کی آنکھوں میں گھپا جا رہا تھا۔

''آپ کی محبت کا بہت شکریہ بابا! باپ کیسے ہوتے ہیں یہ میں نے آپ کے سائے میں آکر جانا ورنہ اپنے باپ کی محبت اور شفقت تو میرے نصیب میں ہی نہیں تھی۔ مجھے آپ کے سائے میں دیکھ کر میرے مرے ماں باپ کی روح کو بھی سکون ملتا ہوگا۔'' ثریا بانو بولتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''پگلی ہوئی ہے کیا۔ اب تیرے کو رونے کا نہیں ہے۔ آج سے تیرے رونے کے دن ختم، اب بس تو صرف ہنسے اور مسکرائے گی۔'' ربن نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور شفقت سے بولنے لگا لیکن ثریا بانو کے رونے میں کچھ اور بھی شدت آگئی۔ اسی وقت اس کا بیٹا تصور بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے جسم پر عمدہ لباس تھا اور وہ ہاتھ میں برفی کا ٹکڑا تھامے بڑے پرجوش انداز میں کمرے میں داخل ہوا تھا لیکن ماں کو روتے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

''آپ کیوں رو رہی ہیں امی؟'' اس نے ماں کے قریب جاکر پریشانی سے دریافت کیا۔

''نہیں بیٹا، رو نہیں رہی بس ایسے ہی آپ کی نانی کی یاد آگئی تھی۔'' بیٹے میں ثریا بانو کی جان اٹکی رہتی تھی، اب بھی اسے پریشان دیکھ کر فوراً اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

''آپ بڑی پیاری لگ رہی ہیں امی۔ ہمیشہ ایسے ہی کپڑے پہنا کریں نا۔'' تصور اب تک باہر دوستوں میں کھیلتا رہا تھا اور تیار ہونے کے بعد پہلی بار اسے ماں کو دیکھنے کا موقع ملا تھا اس لیے فوراً متوجہ ہوا۔

''ہاں منے! اب تیری امی ہمیشہ ایسے ہی تیار ہوا کرے گی۔ اب تو اپنی امی کے ساتھ اپنے ابو کے گھر جا رہا ہے نا۔ وہاں تیری ایک منی سی بہن بھی ہے۔ تم سب وہاں مل کر خوب مزے سے رہنا۔'' ثریا تو بیٹے کے تبصرے پر جھینپ گئی تھی لیکن ربن نے اسے جواب دیا۔ نئے گھر اور باپ کے لیے تصور کو پہلے ہی ذہنی طور پر تیار کیا جاتا رہا تھا اس لیے اس کے لیے ربن کی بات انوکھی نہیں تھی اور وہ اسے سن کر خوش ہوا تھا۔

''آپ وہاں ہم سے ملنے آئیں گے نا نانا؟'' اس نے بڑی محبت سے ربن سے پوچھا۔ ربن کو نانا بولنا اسے ثریا بانو نے سکھایا تھا۔

"کبھی موقع ہوا تو ضرور آئیں گے پر تیرا تو ماں کے ساتھ ادھر آنا لگا رہے گا بس یہیں ہم سے مل لیا کرنا۔" ربن نے اس کا سر سہلایا۔

"دادا، دادی بھی ہمارے ساتھ نہیں چل رہے۔ مجھے سب لوگوں کی بہت یاد آئے گی۔" بچہ تھوڑا سا اداس ہوا۔ ثریا بانو کے ماموں عرصے سے بستر پر تھے اور اس لائق نہیں رہ گئے تھے کہ پوتے کے لاڈ اٹھا سکتے۔ ممانی کا بھی حال جدا تھا۔ بیٹے کی اولاد سے محبت سے پیش آنے کے بجائے وہ اسے اس کی ماں کی طرح منحوس خیال کرتی تھیں اس لیے دادیوں والا پیار بھی نہیں جتاتی تھیں۔ اس کے باوجود بچہ اپنے خونی رشتوں کی فطری محبت میں مبتلا تھا۔

"دادا، دادی اس لیے ساتھ نہیں جا رہے ہے کہ جب تم لوگ بمبئی آیا کرو تو یہاں تمہارے رکنے کا کوئی ٹھکانا ہو۔ اگر دادا، دادی یہاں نہیں ہوں گے تو تو کدھری آ کر رکے گا۔" ربن نے بچے کو بہلایا۔

"یہ تو ہے۔" بچے نے بھی بڑے تدبر سے گردن ہلائی۔

"بس تو اب باہر جا کر کھیل۔ ابھی تھوڑی دیر میں تیرے ابو تجھے لینے آ جائیں گے۔" ربن نے اسے پچکارا۔

"پہلے امی کو یہ مٹھائی تو کھلا دوں۔ میں انہیں مٹھائی کھلانے ہی تو آیا تھا۔" اس نے ہاتھ میں موجود برفی کا ٹکڑا ثریا بانو کے لبوں کے قریب کیا۔ جھجکتی جھجکتی ثریا بانو نے دانتوں سے ذرا سا ٹکڑا کترا۔

"اور کھایئے نا امی!" تصور نے اصرار کیا۔

"بس بیٹے آپ کھاؤ۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔" ثریا نے انکار کیا تو وہ بھی مزید اصرار کیے بغیر کمرے سے باہر بھاگ گیا۔

"اللہ نے تیرے کو اتنی بڑی نعمت دی ہے۔ اس کے ہوتے تو تجھے دنیا کے کسی غم کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔" ربن نے ثریا بانو کو جتایا۔

"آپ نے ٹھیک کہا بابا، یہ تصور ہی تو ہے جس کی خاطر میں زندہ ہوں۔" وہ اداسی سے مسکرائی۔

"جس نے زندگی دی ہے، وہ جینے کے بہانے بھی دے دیتا ہے۔ آگے وہ تجھے اور بھی بہت سکھ دے گا۔ بس اب دل سے ہر غم اور فکر بھول کر خوشیوں کے لیے تیار ہو جا۔" ربن نے اسے سمجھایا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"باہر جا کر دیکھتا ہوں۔ برات آتی ہی ہوگی۔" اس نے ثریا بانو کے سر پر ہاتھ رکھا اور باہر نکل گیا۔ باہر شامیانہ لگا کر مرد مہمانوں کو بٹھانے کا انتظام کیا گیا تھا جبکہ خواتین کے لیے اندر گھر میں ہی انتظام تھا۔ گھر سے باہر قدم رکھتے ہوئے اس کی جولیٹ سے مڈبھیڑ ہوگئی وہ شادی میں شرکت کے لیے آئی تھی۔ اگرچہ اس کا خوشیوں کی کسی محفل میں شرکت کا دل نہیں چاہتا تھا لیکن جوزف کی موت کے بعد ثریا بانو نے اس کا جس طرح خیال رکھا تھا اور دیگر محلے داروں کے ساتھ مل کر دلجوئی کی تھی، وہ اس پر ایک قرض تھا اور اس قرض کی ادائیگی اسی طرح ہو سکتی تھی کہ وہ ثریا کی شادی میں شرکت کرتی۔

"کیسی ہے رے تو؟" ربن نے اسے دیکھ کر اس سے حال دریافت کیا۔

"اچھی ہوں۔ مبارک ہو، آپ اپنی منہ بولی بیٹی کی شادی کر رہے ہیں۔" اس نے جواب دینے کے ساتھ ہی مبارکباد بھی دی۔

"باپ کا کام ہی بیٹیوں کی خوشیوں کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ تو بھی اپنی بیٹی ہے۔ اپنے سے اپنا دکھ سکھ کہے گی تو اپنے کو سگے باپ سے کم نہیں پائے گی۔" ربن کا لہجہ گہرائی لیے ہوئے تھا۔ جولیٹ نے بھی اس کے لہجے کی خصوصیت کو محسوس کر لیا اور ذرا گڑبڑائی ہوئی نظر آنے لگی۔

"باپ کے ہوتے بیٹی ہاتھ میں خنجر چاقو پکڑے تو دل بڑا دکھتا ہے۔ لگتا ہے سالا باپ کسی لائق نہیں اس لیے بیٹی کو ہتھیار تھامنے پڑے۔" جانی کی زبانی ربن کو علم ہو گیا تھا کہ جولیٹ نے اپنی حفاظت کے بہانے جانی سے ہتھیار حاصل کیا ہے اور وہ اپنے یقین میں واثق ہو گیا تھا کہ جولیٹ انتقام کی راہ پر چل پڑی ہے۔ ربن کو نہیں معلوم تھا کہ جولیٹ کا مجرم کون ہے لیکن وہ چاہتا تھا کہ جولیٹ خود سے انتقام لینے کے چکر میں کسی نقصان سے دوچار نہ ہو اس لیے موقع ملتے ہی اسے سمجھانے لگا تھا۔

"میں اسی محلے سے اغوا کی گئی تھی اور میرے سگے باپ سمیت کوئی مجھے بچانے نہیں آسکا تھا۔ مجھے کسی کے خلوص پر شک نہیں ہے لیکن میں قسمت کے دھوکے سے ڈرنے لگی ہوں اس لیے اب کسی کے آسرے پر نہیں رہنا چاہتی۔" اس نے تلخی سے ربن کو جواب دیا اور قدم اٹھاتی مکان کے اندرونی حصے میں غائب ہوگئی۔

"کہتی تو تو بھی ٹھیک ہی ہے۔ سالا یہ نصیب تو بندے کو کبھی بھی دھوکا دے جاتا ہے۔" ربن آہستہ سے بڑبڑایا اور باہر نکل گیا۔ جولیٹ کے لیے اس کا دل اداس تھا۔ فاروق کے حوالے سے وہ اسے بہت عزیز تھی لیکن وہ بے بسی کی انتہا پر تھا کہ اس کے لیے چاہتے ہوئے بھی کچھ

نہیں کر پا رہا تھا۔ جولیٹ کے مجرم تک پہنچنے کے لیے کوئی سرا ہی نہیں ملتا تھا اسے۔ سرا ملتا بھی کیسے جبکہ جولیٹ خود اس سے تعاون پر آمادہ نہیں تھی اور وہ اتنے چکروں میں گھرا رہتا تھا کہ فرصت سے اسے آمادہ کرنے کے لیے وقت ہی نہیں نکال پاتا تھا۔ اب بھی وہ ثریا بانو کی آجانے والی برات کے استقبال اور پھر خاطر داری میں مصروف ہوگیا۔ برات مختصر تھی لیکن محلے والوں کو شامل کر کے اچھے خاصے مہمان ہو گئے تھے۔ مہمانوں کی خاطر مدارت کے لیے ربن نے خوب دل کھول کر انتظامات کروائے تھے۔ ہر ایک اس شادی میں شرکت کر کے خوش تھا۔ اڈے کے افراد جوش وخروش سے سب کچھ سنبھالے ہوئے تھے۔ مہمانوں کی خاطر داری کے علاوہ حفاظتی انتظامات بھی کیے گئے تھے۔ ربن نے اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ دشمن اور حاسد خوشی کے اس موقع پر رنگ میں بھنگ ڈالنے کی کوشش کر سکتے ہیں لیکن خیریت رہی اور نکاح کے بعد کھانے اور پھر رخصتی کے مراحل بخیر وخوبی طے پا گئے۔ محلے کے بزرگوں نے ربن کے ساتھ مل کر ثریا بانو کو کسی بیٹی کی طرح رخصت کیا۔ دلہا والے واپسی کے لیے ٹرین میں سیٹیں بک کروا کر ہی آئے تھے اس لیے برات محلے سے نکل کر واپس سیدھی اسٹیشن پہنچی۔ اڈے کے متعدد لوگ مختلف سواریوں میں براتیوں کو رخصت کرنے اسٹیشن تک جا پہنچے۔ اسٹیشن تک جانے والے افراد میں کمو اور وجے بھی شامل تھے۔ ٹرین آنے پر جب برات دلہن سمیت اس میں سوار ہوگئی تو باقی لوگ تو واپس اڈے کی طرف لوٹ گئے لیکن کمو اور وجے پلٹنے کے بجائے ربن کی ہدایت کے مطابق اسی ٹرین میں سوار ہو گئے۔ انہیں برات کو اس کی منزل پر پہنچنے تک حفاظت کا فریضہ انجام دینا تھا۔ وہ بالکل ساتھ والے ڈبے میں بنا ٹکٹ کے سوار ہوئے تھے۔ عجلت میں انہیں ٹکٹ لینے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ گاڑی چلی اور سفر کا آغاز ہوا تو تھوڑی دیر میں ٹکٹ چیکر ٹکٹ چیک کرنے آگیا۔ وجے نے ادائیگی کر کے اس سے ٹکٹ بنوا لیے۔ اس کے بعد دونوں اطمینان سے کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ عرصے بعد خوشی کی محفل میں شرکت کرنے کے باعث دونوں کا موڈ خاصا خوشگوار تھا۔ خصوصاً کمو خاصا چہک رہا تھا۔

”مزہ آگیا آج تو۔ عرصے بعد لگا کہ اپن بھی انسان ہے جو خوشی غمی میں شریک ہوتا اور ہنستا بولتا ہے۔ جس کا کوئی خاندان ہوتا ہے۔ دادا نے بیٹی بول کر ثریا بہن کو رخصت کیا تو اپنے کو بھی بالکل ایسا لگا کہ اپن اپنی بہن کے بیاہ میں شریک ہے۔ ماں قسم اپنی سگی بہن کے بیاہ کا دن یاد آگیا۔ بڑی آپا کا بیاہ ہوا تھا تو اپن صرف دس سال کا تھا۔ ابا نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر آپا کی شادی کا انتظام کیا تھا۔ اپن کا گھر دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ قریب دور کے سارے رشتے دار ہفتہ بھر پہلے سے رکنے آگئے تھے۔ بڑی رونق لگی تھی گھر میں۔ رسوئی سے سارا وقت مزے مزے کے کھانے پکنے کی خوشبو آتی رہتی تھی۔ اپن بڑے شوق سے آپا کے جہیز کے برتن بھانڈے، چمکیلے کپڑے اور وہ دوسری چیزیں دیکھتا رہتا تھا جو اماں ہر آنے والی رشتے دار عورت کو اس کے کہنے پر دکھانے کے لیے نکالتی تھی۔ مغرب کے بعد عورتیں ڈھولکی لے کر بیٹھ جاتی تھیں اور مزے مزے کے گانے گاتی تھیں۔ اپن چھوٹا ہونے کا فائدہ اٹھا کر عورتوں کے بیچ مزے سے بیٹھا رہتا تھا۔ کبھی دل کرتا تھا تو اٹھ کر ابا کے پاس مردانے میں چلا جاتا تھا۔ ابا کے ساتھ چار چھ لوگ لازمی موجود ہوتے تھے۔ وہ لوگ یا تو شطرنج کھیلتے رہتے تھے یا پھر آپس میں باتیں کرتے رہتے تھے۔ اپن کو نہ شطرنج کی سمجھ آتی تھی، نہ ان کی باتیں پلے پڑتی تھیں اس لیے زیادہ دیر وہاں ٹکنے کے بجائے زنان خانے میں واپس آجاتا تھا۔ ادھر بڑی رنگینی تھی۔ اپن کو ماتھے تک دوپٹا اوڑھ کر رکھنے والی اپنی شرمائی شرمائی آپا بہت پیاری لگتی تھی۔ آپا بھی اپن سے بڑا پیار کرتی تھی۔ کبھی کبھی تو اپن آپا کی گود میں سر رکھ کر سو بھی جاتا تھا اور وہ بے چاری بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہتی تھی۔ ہا...... کیا دن تھے وہ بھی۔“

کمو کو ثریا بانو کی شادی میں شرکت کر کے اپنے ماضی کا سنہری دور یاد آگیا تھا اور وہ کھنکھناتے لہجے میں وجے کو اپنی یادوں میں شریک کر رہا تھا لیکن اس کے اس کھنکھناتے لہجے کے پیچھے جو ایک کانچ ٹوٹنے کی صدا تھی وہ وجے سے پوشیدہ نہیں رہی تھی اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ کمو کے ہنستے چہرے کے پیچھے کوئی غم کرلا رہا ہے۔

”اب کدھر ہے تیری آپا اور دوسرے گھر والے؟ تو کبھی ان سے ملنے جاتا تو نظر نہیں آیا۔“ وجے نے ذرا تجسس سے سوال کیا۔

”آپا تو بیاہ کے دو سال بعد ہی مر گئی تھی۔ باقی گھر والوں کو چھوڑ کر اپن ایسا گھر سے نکلا کہ کبھی پلٹ کر واپس نہیں گیا۔ کچھ خبر نہیں کہ پیچھے کون کس حال میں ہے۔“ کمو نے اداسی سے جواب دیا۔

”آپا کیسے مر گئی تھی اور تو نے گھر کیوں چھوڑا؟“

وجے کے لہجے میں تجسس کے ساتھ حیرت بھی در آئی۔

''آپا کیسے مرگئی تھی......؟'' کمو پہلے گم صم سے انداز میں بڑبڑایا اور خواب کی سی کیفیت میں بولا۔ ''اصل میں تو آپا بیاہ کے بعد مہینے بھر کے اندر ہی مر گئی تھی۔ میں اسے دیکھتا تھا تو مجھے ایسا لگتا تھا کہ کسی نے اس کے جسم سے سارا خون چوس لیا ہو اور اس کے ہونٹوں سے ہنسی چھین لی ہو۔ آپا کے ہر بار کے چکر کے بعد اماں دیر تک روتی اور بڑبڑاتی رہتی تھی اور ابا بس تسلیاں دیتے رہتے تھے۔ آپا، اماں اور ابا کی آپس میں ہونے والی باتیں چھپ چھپ کر سننے سے مجھے پتا چل گیا کہ آپا کے سسرال والے اسے بہت تنگ کرتے ہیں۔ وہ بے چاری دن بھر گھر بھر کی خدمت کرتی رہتی ہے پھر بھی بدلے میں اسے گالیاں اور مار ہی ملتی ہے۔ پھر ایک دن خبر آئی کہ آپا کھانا پکاتے ہوئے کپڑوں میں آگ لگنے سے جل کر مر گئی۔ اس روز اماں بہت چیخ چیخ کر روئی اور یہی بولتی رہی کہ آپا کو اس کے سسرال والوں نے جلا کر مارا ہے۔ ابا اس وقت بھی بس تسلیاں دیتا رہا۔ غریب اور شریف آدمی اس کے سوا کر بھی کیا سکتا ہے پر اپن اپنے باپ جیسا نہیں تھا۔ اپن نے سوچ لیا کہ آپا کو جلانے والوں کو بھی جلا کر ہی مارے گا۔ بارہ تیرہ سال کی عمر زیادہ نہیں ہوتی لیکن اپن نے بڑا کام دکھایا۔ ایک رات مٹی کے تیل سے بھری بوتلیں آپا کے سسرالی گھر کے اندر اچھالیں اور جلتی لکڑی اندر پھینک دی۔ فٹ سے آگ کے بڑے بڑے شعلے نکلنے لگے پر اس سے ایک آدمی کی نظر اپن پر پڑ گئی۔ وہ شور مچاتا اپن کے پیچھے بھاگا۔ اپن اس سے بچنے کے لیے جو سر پر پیر رکھ کر بھاگا تو پتا نہیں کیسے اسٹیشن پہنچ گیا۔ ادھر گاڑی چھٹنے ہی والی تھی۔ اپن گھبراہٹ میں گاڑی پر چڑھ گیا اور بس پھر ادھر بمبئی کا دانہ پانی نصیب میں لکھا تھا تو ادھر پہنچ گیا۔ اب تو بمبئی ہی اپنا ٹھکانا ہے اور تم یار لوگ اپنا خاندان۔ پچھلے تو ایسے چھوٹے کہ اس رات کے بعد سے اپن نے کسی کا صورت نہیں دیکھا۔'' کمو کا لہجہ زخم زخم تھا۔

''کبھی لوٹ کر اپنے گھر کیوں نہیں گئے؟ جا کر دیکھتے تو کہ وہاں کیا حال ہے۔'' وجے نے اس پر ترحم آمیز نظر ڈالی۔

''اپن جانا تو چاہتا تھا پر ہمت نہیں پڑتی تھی۔ اس عمر میں بھی اپن کو اتنا تو پتا تھا کہ آپا کے سسرال میں آگ لگانے کے جرم میں پولیس اپنے کو دھر لے گی اور اگر اس آگ میں کوئی جل کر مر گیا ہو تو اپنے کو پھانسی بھی ہو سکتی ہے بس اسی ڈر سے واپس نہیں جا سکا۔ ابھی دو چار سال پیچھے ہمت باندھ کر گیا تھا۔ سوچا تھا اتنے سالوں بعد اب کون پہچانے گا۔ ڈاڑھی مونچھ بڑھا کر اور بھی حلیہ بدل لیا تھا لیکن جا کر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ معلوم پڑا کہ اماں تو میرے وہاں سے بھاگنے کے چھ مہینے بعد ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ آپا سے چھوٹی دونوں بہنوں کو ابا نے چچا کے بیٹوں سے بیاہ دیا اور خود بھی ان کے ساتھ ہی گاؤں میں جا کر رہنے لگے۔ چچا کے بیٹے میری بہنوں کے لائق نہیں تھے لیکن ابا نے اس لیے بہنوں کو ان سے بیاہ دیا کہ قاتل بھائی کی بہنوں کو کون بیاہنے آئے گا۔ اپن نے آپا کے سسرال میں جو آگ لگائی تھی، اس میں جل کر آپا کی ساس اور شوہر مر گئے تھے۔ باقی لوگوں کو محلے والوں نے بڑی مشکل سے بچایا تھا۔ اپنے کو اس گاؤں کا پتا تھا جدھر چچا رہتے تھے لیکن اتنا کچھ ہونے کے بعد ہمت نہیں پڑی کہ جا کر ابا اور بہنوں سے نظر ملا سکوں بس پھر ہمیشہ کے لیے بمبئی لوٹ کر آ گیا۔ اب تو ادھر ہی اپنا جینا مرنا ہے۔'' کمو کی ایک آنکھ سے آنسو کا قطرہ ٹپکا جسے چھپانے کے لیے اس نے فوراً کھڑکی کی طرف منہ موڑ لیا۔

''اسٹیشن آ رہا ہے چلو چل کر براتیوں کی خیریت لیتے ہیں۔'' چند لمحے لگے اس کو خود کو سنبھالنے میں۔ دوبارہ پلٹ کر وہ وجے سے مخاطب ہوا تو اس کا لہجہ صاف تھا۔

''ہاں چلتے ہیں۔'' وجے بھی فوراً کھڑا ہو گیا۔ کمو پر گزری پر گفتگو کرنے سے اب کچھ حاصل نہیں ہونے والا، یہ بات بالکل واضح تھی اس لیے اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ ویسے بھی ربن کے اڈے پر موجود تقریباً ہر آدمی کے پیچھے ایسی ہی درد بھری داستان تھی۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہی تھے جو اپنے پچھلوں کو کسی نہ کسی وجہ سے چھوڑ آئے تھے اور اب ان کے پاس اڈا ہی واحد ٹھکانا تھا۔ ایسے میں ایک کمو کی داستان پر کتنا غم منایا جا سکتا تھا اور فی الحال تو وہ تھے بھی ڈیوٹی پر۔ بوجھل دل کے ساتھ ہی سہی وجے، کمو کے ساتھ جا کر دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ کمو آگے تھا اور دھیرے دھیرے رکتی ٹرین سے باہر جھانک رہا تھا۔ یکدم ہی اس نے تیزی سے سر اندر کیا اور وجے کی طرف دیکھا تو وجے کو اس کے چہرے پر سنسنی نظر آئی۔

''کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟'' وجے نے فوراً اس سے پوچھا۔

''براتیوں سے آگے والے ڈبے کے دروازے سے اپن نے ٹیکے کو باہر جھانکتے دیکھا ہے۔''

''کیا بول رہا ہے؟'' وجے کو جھٹکا لگا۔

''اپن ٹھیک بول رہا ہے۔ وہ سالا ہنڈرڈ پرسنٹ

فیکا ہی ہے۔'' کمو اپنی پہچان پر پُریقین تھا۔
''پھر تو بڑی گڑبڑ ہے۔'' وجے نے تبصرہ کیا۔ وہ دونوں فیکے سے اچھی طرح واقف تھے۔ جو دادا والا اڈا ربن کے ہاتھ آنے کے بعد سے ان کا اس اڈے پر آنا جانا لگا رہتا تھا اس لیے وہ وہاں کے کارندوں سے اچھی طرح آشنا تھے اور اس بات کا تو سب ہی کو علم تھا کہ فیکے کو اس کی خودسری اور نافرمانی کی سزا میں ربن نے بیچ چوراہے پر جوتے لگوائے تھے اور اس بے عزتی کے بعد سے وہ مستقل غائب تھا۔ اس غیاب کے بعد اس کا اس ٹرین میں نظر آنا معنی خیز تھا۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ ہوشیار ہو گئے اور جب گاڑی رکنے پر اسٹیشن پر اترے تو اس حال میں کہ ان کے چہرے نصف سے زیادہ گلے میں پڑے مفلروں سے چھپے ہوئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ فیکا بھی ان کی صورت سے آشنا ہے اور اگر اس نے انہیں دیکھ لیا تو ہوشیار ہو جائے گا۔ یہ بات بھی طے تھی کہ اگر وہ کسی مذموم مقصد کے تحت اس گاڑی میں سوار ہے تو تنہا نہیں ہوگا اور اس کے دو چار ساتھی ضرور اس کے ساتھ ہوں گے۔ وجے اور کمو بااحتیاط قدم اٹھاتے آگے بڑھنے لگے۔ پہلے انہوں نے براتیوں والے ڈبے کے اندر جھانکا۔ ان لوگوں نے اسٹیشن پر گھومنے والے چائے فروشوں میں سے کسی سے چائے خرید لی تھی اور سب چائے پی رہے تھے۔ دُولہا کا چھوٹا بھائی البتہ صراحی ہاتھ میں لیے نیچے اترتا نظر آیا۔ یقیناً وہ اسٹیشن پر سے پانی بھر کرلانے کے ارادے سے اترا تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ دولہا کی والدہ کو صراحی کا پانی مرغوب ہے اور وہ دورانِ سفر بھی واٹر کولر سے پانی پینے کے بجائے صراحی کے پانی کو ترجیح دیتی ہیں۔ بمبئی اسٹیشن پر ان کی صراحی بھر کر ڈبے میں رکھنے کا فریضہ اڈے کے لوگوں میں سے ہی کسی نے انجام دیا تھا۔

براتیوں والے ڈبے پر نظر ڈال کر وہ اگلے ڈبے کی طرف بڑھ گئے لیکن پھر انہیں تیزی سے پلٹ کر رخ موڑنا پڑا۔ اگلے ڈبے سے فیکا نیچے اتر رہا تھا۔ اس کے پیچھے مزید دو آدمی اور بھی تھے جو چہرے سے ہی بدمعاش لگ رہے تھے۔ ان دونوں کو انہوں نے مجو کے اڈے پر نہیں دیکھا تھا جس کا مطلب تھا کہ فیکے نے کہیں اور ان سے تعلق گانٹھا ہے۔ بمبئی کی سڑکوں اور گلیوں پر اس طرح کے غنڈے موالی جابجا بکھرے رہتے تھے جنہیں تھوڑے سے معاوضے پر اپنے ساتھ کام کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ دونوں رخ موڑے کن انکھیوں سے فیکے اور اس کے ساتھیوں کو دیکھتے رہے۔ یہ دیکھ کر ان کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے کہ فیکے اور اس کے ساتھیوں کا رخ برات والے ڈبے ہی کی طرف تھا۔ یعنی وہ لمحہ آ گیا تھا جس کے ڈر سے ربن نے ان دونوں کو برات کی حفاظت کے لیے خاموشی سے روانہ کیا تھا۔ جوش سے دونوں کے جسم تن گئے اور اپنی جگہ کھڑے رہنا ممکن نہیں رہا۔ فیکا اور اس کے ساتھی ڈبے میں چڑھ چکے تھے وہ دونوں بھی تیزی سے ڈبے کی طرف لپکے۔ اوپر چڑھتے ہوئے انہوں نے دیکھ لیا کہ وہ لوگ ٹوائلٹ والے حصے کی طرف جا رہے تھے۔ وہ دبے قدموں اسی طرف بڑھ گئے۔ اسی وقت ٹرین نے روانگی کی وسل دی۔ اس اسٹیشن پر ٹرین بس پانچ منٹ کے لیے ہی ٹھہری تھی۔ وہ دونوں دبے قدموں ٹوائلٹ والے حصے کی طرف بڑھے لیکن زیادہ آگے جانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ فیکے کا ارادہ ظاہر ہونے سے قبل اس کی نظر ان پر پڑے اور وہ ہوشیار ہو جائے۔ انہیں خود کو پوشیدہ رکھنے میں اس لیے بھی زیادہ دشواری پیش نہیں آ رہی تھی کہ وہاں دیگر مسافر بھی موجود تھے جو ٹوائلٹ استعمال کرنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ فیکا اپنے دونوں ساتھیوں کو باہر ٹھہرا کر خود اندر چلا گیا تو وہ دونوں مزید مطمئن ہو گئے۔ اس دوران ٹرین نے بھی چلنا شروع کر دیا۔ اس کے رفتار پکڑنے سے قبل کمو ٹوائلٹ کا چکر لگا آیا کہ وہاں اپنی موجودگی کا جواز بھی دینا تھا۔

ٹرین نے رفتار پکڑی تو فیکا بھی اندر سے نکل آیا اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کرتے ہوئے اپنے پیچھے آنے کا حکم دیا۔ کمو اور وجے نے اپنے چہروں کو ایسے زاویے پر کر لیا تھا کہ فیکے کی ان پر نظر پڑے بھی تو ایک نظر میں پہچاننے میں کامیاب نہ ہو پائے لیکن وہ دیکھ رہے تھے کہ فیکا بہت زیادہ پراعتماد اور بے پروا دکھائی دے رہا ہے۔ اس نے سرے سے زحمت ہی نہیں کی تھی کہ اردگرد موجود دیگر لوگوں پر نظر ڈالے۔ کمو اور وجے البتہ اس پر پوری نظر رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے فوراً ہی نوٹ کر لیا کہ ان تینوں کا رخ اس حصے کی طرف ہے جہاں براتی براجمان ہیں۔ وہ بھی ان کے پیچھے لپکے۔ ہونے کو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ انہیں یہیں روک لیتے لیکن وہ ان پر پکا ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے فیکے اور اس کے ساتھیوں نے اپنی جیبوں سے چاقو نکالے اور دندناتے ہوئے براتیوں والے حصے میں گھس گئے۔ اب ان کے پاس بھی چاقو نکالنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، وہ بھی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے پیچھے لپکے۔ تین چاقو بہ دست افراد کو اپنے درمیان پا کر براتی پہلے

ہی ہراساں ہو چکے تھے۔ خواتین کے منہ سے تو باقاعدہ چیخیں نکل گئی تھیں۔ وہ دونوں بھی ان کے درمیان گھسے تو انہیں بھی پہلے والوں کا ہی ساتھی تصور کیا گیا۔

”اب کسی کی آواز نکلی تو اپن اس کی گردن کاٹ کر الگ کردے گا۔“ خواتین کی چیخوں کا گلا گھونٹنے کے لیے فیکا بھیڑیے کی طرح غرایا۔ اس کی اس دھمکی کا شدت سے اثر ہوا اور خواتین اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخیں روکنے کی کوشش کرنے لگیں۔ اس کوشش کے باوجود بہر حال ان کی سسکیاں نہیں رک پا رہی تھیں۔

”نہتے لوگوں کو کیا دھمکا رہا ہے۔ ماں کا دودھ پیا ہے تو اپن سے بات کر۔“ فیکے اور اس کے ساتھیوں کی توجہ براتیوں پر تھی اور وہ کمو اور وجے کی وہاں آمد کو بروقت محسوس نہیں کرسکے تھے اس لیے جب کمو نے للکارا تو وہ بری طرح چونکے۔

”تم سالے ربن کے پٹھے۔ تمہیں تو اپن ابھی چھٹی کا دودھ یاد دلاتا ہے۔“ فیکا بھڑک کر کمو کی طرف لپکا۔ اس کے ساتھیوں میں سے بھی ایک نے وجے کی طرف رخ کیا جبکہ تیسرا براتیوں پر نظر رکھے کھڑا رہا کہ کہیں مردوں میں سے کوئی ان کے لیے مصیبت نہ بن جائے۔ وہ سارے بے چارے عام سے لوگ تھے جنہوں نے زندگی میں نہ تو کبھی ہتھیار پکڑا تھا اور نہ ہی کبھی اس قسم کی صورتِ حال سے دوچار ہوئے تھے۔ وہ بے چارے کوئی مزاحمت یا حرکت کیا کرتے، وہ تو یہ بھی سمجھنے سے قاصر تھے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ان کے سامنے چاقوؤں سے لیس چار افراد محدود جگہ پر ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے اور بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے۔

”حرام کے جنوں! تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تم نے ادھر پاؤں رکھا۔ اپن تمہارے کو اس لائق نہیں چھوڑے گا کہ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکو۔“ فیکے کے ساتھ بھڑا کمو نہایت طیش کے عالم میں اسے باخبر کر رہا تھا۔

”اپن دیکھتا ہے کہ تو اپنا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ اپن اس برات کو دلہن لے جانے سے روکنے کے لیے آیا ہے اور روک کر رہے گا۔ مجو دادا کی پسند کو کوئی اور لے جائے، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔“ فیکے نے بھی گرج دار آواز میں اعلان کیا۔

”اپنی بہن کا نام تیری پلید زبان پر کیسے آیا۔ اپن تیری جان لے لے گا۔“ فیکے کی بات نے کمو کا غصہ سوا کر دیا اور وہ نہایت غیظ کے عالم میں فیکے پر حملہ آور ہوا۔ وار میں اتنی تیزی اور پھرتی تھی کہ بچتے بچتے بھی فیکے کے بائیں بازو پر چرکا لگ گیا۔ اگر وہ حرکت میں نہ آیا ہوتا تو چاقو سیدھا اس کے دل میں اتر جاتا۔ جوش اور غضب میں بھرے کمو نے اس پر دوسرا وار کیا۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی تو وہ اپنے دردناک ماضی کی تلخ یادیں دہرا رہا تھا اور اس دہرائی نے اس کے زخموں پر چڑھا کھرنڈ اتار کر انہیں پھر سے تازہ کر دیا تھا۔ اپنی بہن کی سوختہ لاش کی واحد جھلک اب بھی اسے پوری طرح یاد تھی۔ جب بہن مری تو وہ بہت چھوٹا تھا اور اس کے لیے کچھ نہیں کرسکا تھا لیکن ثریا بانو جسے ربن کے بیٹی کہنے کے بعد ان سب نے دل سے اپنی بہن مان لیا تھا، اس کو کوئی نقصان پہنچاتا وہ یہ کیسے برداشت کرسکتا تھا۔ اس کا تو دماغ ہی گھوم گیا اور وہ تابڑتوڑ فیکے پر حملے کرنے لگا۔ اس کے حملوں کی شدت کے سامنے فیکے کی ساری طراری دھری رہ گئی اور ایک لمحہ ایسا آیا کہ وہ فرش پر گر گیا۔ اس کی یہ پسپائی دیکھ کر لڑائی میں شامل نہ ہونے والا اس کا ساتھی حرکت میں آیا اور کمو پر وار کیا۔ کمو کا دھیان اس کی طرف نہیں تھا۔ چاقو اس کے پہلو میں لگا اور خون کا فوارہ سا پھوٹ پڑا۔ خون کو اتنی فراوانی سے بہتے دیکھ کر خواتین خود پر قابو نہیں رکھ سکیں اور بے ساختہ ہی ایک بار پھر ان کی چیخیں نکل گئیں۔ وجے نے بھی کمو کو زخمی ہوتا دیکھ لیا تھا لیکن اس کا مقابل خاصا سخت جان تھا اور وہ ابھی تک اسے زیر نہیں کرسکا تھا چنانچہ کمو کی کسی قسم کی مدد کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ کمو شاید مدد کی ضرورت بھی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس وقت اس پر جو جنون طاری تھا وہ ایسا تھا، جو آدمی کو دس سے بھی اکیلے بھڑ جانے کا حوصلہ عطا کر دیتا ہے۔ اس نے بھی اپنے پہلو سے نکلتے خون کو نظر انداز کیا اور برق کی سی پھرتی سے ہاتھ گھمایا۔ اگلے پل فیکے کے ساتھی کا خون آلود چاقو والا ہاتھ اس کی گرفت میں تھا۔ اس شخص نے لاکھ چاہا کہ اپنے ہاتھ کو آزاد کروا سکے لیکن اس کا ہاتھ تو گویا کسی شکنجے میں جکڑا گیا تھا۔ کمو نے چاقو سمیت ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ کا رخ خود اس کی جانب کر دیا۔ اگر وہ شخص عقل سے کام نہ لے کر عین وقت پر چاقو اپنے ہاتھ سے چھوڑ نہ دیتا تو اس کی شہ رگ کٹ جاتی۔ اب بھی کمو کے زوردار جھٹکے نے اس کے قدم لڑکھڑا دیے لیکن اس دوران نیچے گر جانے والا فیکا سنبھل کر کھڑا ہو چکا تھا۔ گرنے سے اس کا چاقو اس کے ہاتھ سے نکل کر کسی سیٹ کے نیچے چلا گیا تھا اس لیے وہ ایسے ہی کمو سے لپٹ گیا اور اسے اپنے مکوں کا نشانہ بنانے لگا۔ اس کے اس حملے نے اس کے ساتھی کو بھی سنبھلنے میں مدد دی اور وہ بھی کمو پر پل پڑا۔ تیزی سے خون بہنے کی وجہ سے کمو کو

کمزوری ہورہی تھی لیکن پھر بھی وہ اپنی ہمت اور جنون کے بل بوتے پر ان کے مقابل ڈٹا رہا۔ وجے بھی اب اپنے مقابل کو خاصا ادھ موا کر چکا تھا۔ ایک ہنگامہ تھا جو وہاں بپا ہو چکا تھا۔ فیکے کی خاموش رہنے کی اولین دھمکی تو جانے کب کی ہوا میں تحلیل ہو چکی تھی اور خواتین کی خوف زدہ چیخوں کے ساتھ مردوں کی مدد کے لیے پکار بھی دور تک سنی جارہی تھی۔ قریبی کوپوں سے دیگر مسافر صورتِ حال جاننے کے لیے بھاگے چلے آئے لیکن مسلح افراد کے خلاف کچھ کرنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ ایک مسافر نے بس اتنا کیا کہ ٹرین کو روکنے والی زنجیر کھینچ لی۔

"لونڈیا کو ٹھکانے لگادو۔" ٹرین کی رفتار کم ہوتی محسوس کر کے فیکا چلایا۔ اس کے ساتھی نے جھک کر اپنا گرا ہوا چاقو اٹھایا اور ثریا بانو کی طرف لپکا۔ کمو سے فیکا لپٹا ہوا تھا۔ اس نے تڑپ کر خود کو فیکے کی گرفت سے آزاد کروایا اور اس کے ساتھی کی طرف لپکا۔ وہ ثریا بانو کو نشانہ بنانے کے لیے چاقو کو حرکت میں لاچکا تھا۔ کمو نے اسے کھینچ کر اپنی طرف گھمایا تو متحرک چاقو سیدھا اس کے سینے میں پیوست ہوگیا۔ کمو کے حلق سے ایک چیخ نکلی اور وہ ڈھیر ہوگیا۔ اس دوران ٹرین رک چکی تھی۔ ادھر کمو کی دردناک چیخ سن کر وجے اس کی طرف لپکا، ادھر فیکے اور اس کے ساتھیوں نے فرار کی راہ اختیار کی۔ آخری سانسیں لیتے کمو کو اپنی بانہوں میں سمیٹے وجے کو ہوش نہیں تھا کہ ان فراریوں کا پیچھا کرتا۔ وہ تو بس کمو کو پکار رہا تھا جو اس وقت بڑی تیزی سے اس کی آغوش سے نکل کر موت کی آغوش میں جاتا جارہا تھا اور وہ کسی طور اسے روکنے پر قادر نہیں تھا۔ اس کی ہر آواز، ہر صدا رائگاں جارہی تھی۔

☆☆☆

"آپ کو بڑے نواب صاحب یاد فرمارہے ہیں۔"

جوزفین آرام دہ بستر پر کمرے کے پُرلطف ماحول میں جتنے مزے کی نیند سوئی تھی، ایسی نیند اسے زندگی میں پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ایسی آرام دہ نیند لے کر ایسا لگ رہا تھا کہ سفر کی ساری تھکن اڑن چھو ہوگئی ہو۔ سوتے ہوئے اگر اس کے ذہن میں یہ خیال نہیں ہوتا کہ سہ پہر کو اسے نواب سلیم اللہ کے حضور انٹرویو کے لیے پیش ہونا ہے تو جانے کب تک سوئی رہتی۔ یہاں ملازمت کے حصول کی شدید خواہش کے تحت اس نے پہلے ہی سروری کو ہدایت کردی تھی کہ وہ اسے وقت پر جگادے۔ سروری نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اس کی ہدایت کے مطابق اٹھادیا تھا اور اس کے اٹھ کر تیار ہونے تک پُرتکلف سی چائے بھی لاکر پیش کردی تھی۔ وہ چائے پی کر فارغ ہوئی تو سروری نواب صاحب سے ملاقات کا پیغام لے کر آگئی۔ اس پیغام پر جوزفین دھڑکتے دل کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھی اور سروری کی راہنمائی میں اس کے پیچھے چل پڑی۔ سروری کی زبانی ہی اسے علم ہوا کہ نواب صاحب اس وقت زنان خانے میں ہی موجود ہیں اور یہیں اس سے ملاقات فرمائیں گے۔ جس کمرے میں اس کا قیام تھا، اس کی راہداری سے گزرنے کے بعد سروری نے اسے دائیں طرف کی راہداری میں ایک کمرے کے دروازے پر لے جاکر کھڑا کردیا اور بولی۔

"اندر تشریف لے جائیں، نواب صاحب آپ کا انتظار کررہے ہیں۔"

منقش دروازے کے دونوں پٹ بند تھے۔ جوزفین نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ یہ بڑی نپی تلی دستک تھی جس کی آواز نہ تو بہت بلند تھی اور نہ ہی بہت پست۔ دستک دینے میں اتنی احتیاط اس نے اس لیے برتی تھی کہ اسے یہاں والوں کے مزاج کا کچھ کچھ اندازہ ہوگیا تھا اور وہ سمجھ گئی تھی کہ زبانی انٹرویو سے زیادہ اس کی حرکات وسکنات، اندازِ نشست و برخاست اور گفتگو کی صلاحیت کو پرکھا جارہا ہے۔ اگرچہ وہ بمبئی کے ایک تنگ و تاریک محلے میں غربت و افلاس کی گود میں پل کر بڑی ہوئی تھی اور مشنری اسکول سے تعلیم حاصل کی تھی لیکن اس کی یہ خوش قسمتی رہی تھی کہ اس کے اساتذہ میں سے چند لوگ ایسے بھی تھے جو ان باتوں کی طرف دھیان دیتے تھے اور طلبا کو اس سلسلے میں نصیحتیں کرتے رہتے تھے۔ بیشتر طلبا ان نصیحتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا کرتے تھے لیکن جوزفین کا شمار ان چند گنے چنے طلبا میں ہوتا تھا جو ایسی باتیں نہ صرف دل لگا کر سنتی تھی بلکہ ان پر عمل کرنے کی بھی کوشش کرتی تھی۔

اصل میں اس کی ماں نے اس کی آنکھوں میں یہ خواب سجایا تھا کہ وہ پڑھ لکھ کر اچھی نوکری کرے گی اور اپنا طرزِ زندگی بدلے گی چنانچہ وہ بہت کم عمری ہی سے اپنے طرزِ زندگی کو بدلنے کی کوشش کرنے لگی تھی جس کی وجہ سے اپنے محلے کے دیگر لڑکیوں سے خاصی مختلف نظر آتی تھی۔ ٹیوشن کا سلسلہ شروع کرنے کے بعد اسے اپنے اندر تبدیلی لانے کے مزید مواقع ملے تھے اور اچھے گھرانوں کے طور طریقے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس نے بہت کچھ سیکھا تھا لیکن یہاں نواب سلیم اللہ کی حویلی کی تو بات ہی سب سے الگ تھی۔ اتنے دولت مند اور پُرتکلف لوگوں سے اس کا بھی

واسطہ نہیں پڑا تھا اور حقیقتاً وہ اندر سے گھبرائی ہوئی تھی، اس کے باوجود ظاہری طور پر خود اعتمادی اور رکھ رکھاؤ کا مظاہرہ کررہی تھی۔

"اندر تشریف لے آئیں۔" دستک کے جواب میں اس نے بھاری مردانہ آواز سنی تو دروازے کو احتیاط سے بنا آواز کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ کمرا خاصا وسیع تھا اور ڈرائنگ روم کی طرز پر سجا ہوا تھا۔ سرخ گدیوں والی سنہری کرسیوں پر براجمان مرد وزن فوراً ہی اس کی نظروں میں آگئے۔ دونوں افراد کی عمریں پچاس سے متجاوز تھیں اور شکلوں میں مماثلت پائی جاتی تھی۔ اسے فوراً ہی یاد آگیا کہ نواب صاحب کی ہمشیرہ بھی اس حویلی میں ہی مقیم ہیں اور آپا بیگم کہلاتی ہیں۔ آپا بیگم نے بھی اکا بیگم کی طرح چھوٹی کرتی کے ساتھ ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی لیکن ساڑی کے کپڑے کی نفاست اور چمک دور ہی سے اس کے بے حد قیمتی ہونے کا اعلان کررہی تھی۔ قیمتی ساڑی میں ملبوس آپا بیگم کے سرخ وسفید چہرے پر موجود رعب و رعونت بھی دور ہی سے دیکھے جاسکتے تھے۔ وہ اندر تک اتر جانے والی نظروں سے جوزفین کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھے نواب سلیم اللہ کی شخصیت بھی خاصی رعب دار تھی۔ انہوں نے آف وہائٹ رنگ کی شیروانی پہن رکھی تھی اور سر پر ترکی ٹوپی موجود تھی۔ ان کے چہرے کے تاثرات اپنی بہن کے مقابلے میں نسبتاً نرم تھے۔

"گڈ آفٹر نون۔" جوزفین ایک نظر میں ہی سب کچھ دیکھنے کے بعد مہذب لہجے میں ان سے مخاطب ہوئی۔

"آیئے مس جوزفین، تشریف رکھیے۔ ہم آپ کا ہی انتظار کررہے تھے۔" اسے جواب دینے کا فریضہ نواب سلیم اللہ نے انجام دیا اور ہاتھ سے ایک نشست کی طرف اشارہ کیا۔ جوزفین باوقار انداز میں چلتی ہوئی اس نشست تک پہنچی اور "تھینک یو" کہتی ہوئی بیٹھ گئی۔

"سفر کیسا گزرا آپ کا؟ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟" نواب صاحب نے تقریباً وہی سوال کیا جو اس سے قبل نواب زادہ اسد اللہ بھی کرچکا تھا لیکن فرق لہجے اور زبان کا تھا۔ نواب زادہ کا لہجہ قدرے بے تکلف اور دوستانہ تھا جبکہ نواب صاحب کے انداز میں ان کی نوابی شان اور وقار کی جھلک تھی۔ انہوں نے گفتگو کے لیے انگریزی زبان کا استعمال بھی نہیں کیا تھا اور شاید ایسا آپا بیگم کی وہاں موجودگی کے سبب تھا۔ حویلی کی خواتین انگریزی زبان سے نابلد تھیں اور اپنی نئی نسل میں اس کمی کو دور کرنے کے لیے ہی نواب صاحب نے ان کے لیے حویلی میں انگریزی تعلیم کا سلسلہ شروع کروایا تھا۔

"گاڈ کی مہربانی سے میرا سفر بہت اچھا گزرا اور میں آرام سے یہاں تک پہنچ گئی۔" نواب صاحب کی تقلید کرتے ہوئے جوزفین نے بھی انگریزی زبان کا استعمال ترک کردیا۔

"گڈ۔ ان سے ملیے۔ یہ ہماری ہمشیرہ ندرت جہاں ہیں۔ یہاں انہیں سب آپا بیگم کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور حویلی کا سارا انتظام وانصرام ان ہی کے ہاتھوں میں ہے۔"

"آداب۔" آپا بیگم کو پہچان تو وہ پہلے ہی گئی تھی۔ نواب صاحب کے تعارف کروانے پر تصدیق ہوگئی اور اس نے نہایت ادب سے یہاں کے رواج کے مطابق انہیں "آداب" کہا جس کا جواب اسے محض سر کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ دیا گیا۔

"آپ کے جملہ کوائف نواب زادہ اسد اللہ کے دوست کی وساطت سے ہم تک پہنچ گئے ہیں۔ تعلیمی اعتبار سے اگرچہ آپ ہمارے مطلوبہ معیار پر پوری نہیں اترتی ہیں لیکن نواب زادہ کے دوست نے آپ کی پُرزور سفارش کرتے ہوئے آپ کی لیاقت اور قابلیت کی یقین دہانی کروائی ہے۔ نواب زادہ اسد اللہ نے بھی آپ سے ملاقات کے بعد اطمینان کا اظہار کیا ہے اور اسی بنیاد پر ہم سمجھتے ہیں کہ آپ کو اپنی لیاقت ثابت کرنے کا ایک موقع ضرور دیا جائے۔ فی الحال آپ کو ایک مہینے کے عبوری عرصے کے لیے ملازمت دی جارہی ہے۔ اس عرصے میں اگر آپ نے خود کو اہل ثابت کردیا تو آپ کی خدمات مستقل حاصل کرلی جائیں گی۔ ہمیں بس آپ سے اتنا ہی کہنا تھا۔ آپ سے باقی گفتگو ندرت جہاں کریں گی اور آپ کو حویلی کے طور طریقوں کے بارے میں آگاہ کردیں گی۔ اگر آپ بھی کچھ معلوم کرنا چاہیں تو ان سے پوچھ سکتی ہیں۔" نواب سلیم اللہ کے الفاظ نے اس کے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔ اگرچہ انہوں نے فی الحال اسے حویلی میں مستقل ملازمت نہیں دی تھی لیکن اسے یقین تھا کہ وہ اپنی محنت اور جانفشانی سے ایک مہینے کی عبوری ملازمت کو مستقل کروانے میں کامیاب ہوجائے گی۔ نواب صاحب اس سے گفتگو ختم کرکے وہاں سے رخصت ہونے لگے تو اس نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوکر انہیں تعظیم دی۔ اس کے بعد وہ ندرت جہاں المعروف آپا بیگم کی طرف متوجہ ہوگئی۔ آپا بیگم جو بڑی گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں، قدرے

توقف کے بعد اس سے مخاطب ہوئیں۔

''اپنے بارے میں بتائیے؟ والدین کیا کرتے ہیں اور کتنے بہن بھائی ہیں؟'' انہوں نے ذرا زنانہ دلچسپی سے تعلق رکھنے والے سوالات کیے۔ نواب صاحب اور نواب زادہ اسد اللہ نے اس سے اس نوعیت کے سوالات نہیں کیے تھے۔

''میرے فادر کی میرے بچپن میں ہی ڈیتھ ہوگئی تھی۔ مدر نے جاب کر کے میری پرورش کی۔ کچھ عرصے پہلے ان کی بھی ڈیتھ ہوگئی ہے۔ میں اپنے پیرنٹس کی اکلوتی اولاد ہوں اور میرا کوئی بہن یا بھائی نہیں ہے۔'' جوزفین نے محتاط انداز میں ان کے سوالات کے جوابات دیے۔ اگرچہ آپا بیگم نے مہذب الفاظ میں اس سے گفتگو کی تھی لیکن ان کے انداز میں ایک خاص قسم کی رعونت تھی اور اسے اس رعونت سے ڈر لگ رہا تھا۔ مال و دولت اور اونچے حسب نسب سے انسان کے اندر در آنے والی یہ رعونت اگلے بندے کو حقیر ثابت کرنے کی بڑی حریص ہوتی ہے۔

''تو کیا آپ بمبئی میں بالکل تنہا رہتی تھیں؟'' آپا بیگم نے حیرت سے دریافت کیا۔

''جی مجبوری تھی لیکن گاڈ کی مہربانی سے مجھے بہت اچھے نیبرز (پڑوسی) ملے ہوئے تھے جو میرا بہت خیال رکھتے تھے۔'' آپا بیگم کے سوال کا جواب دیتے ہوئے اس کے دماغ کی اسکرین پر جوزف کا چہرہ ابھرا۔ وہ اسے رخصت کرتے ہوئے کتنا اداس تھا لیکن اتفاق کی بات تھی کہ حیدرآباد میں قدم رکھنے کے بعد وہ پہلی بار اسے یاد آیا تھا، وہ بھی آپا بیگم کے سوال کی وجہ سے۔

''یہاں بھی آپ کا اچھے لوگوں سے ہی واسطہ پڑے گا لیکن حویلی کے چند اصول و قواعد ہیں جن پر آپ کو سختی سے عمل کرنا ہوگا۔ یہاں سونے جاگنے، کھانے پینے ہر شے کے اوقات مقرر ہیں اور حویلی میں قیام کے عرصے میں آپ کو ان کی پابندی کرنی ہوگی اسی صورت میں آپ یہاں مستقل ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو پائیں گی۔'' انہوں نے قدرے سخت لہجے میں اسے آگاہ کیا۔

''جی میں خیال رکھوں گی کہ مجھ سے کسی رول کی خلاف ورزی نہ ہو۔'' جوزفین نے انہیں یقین دلایا۔

''اس کے علاوہ آپ کو اپنے ملبوسات بھی تبدیل کرنے ہوں گے۔ ہم اپنے بچوں کو زمانے کے تقاضے پورے کرنے کے لیے انگریزی تعلیم سے ضرور آشنا کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ ہرگز بھی پسند نہیں کرتے کہ وہ انگریزی تہذیب کے رنگ میں رنگے جائیں۔ ہم اِکا بیگم سے کہہ دیں گے، وہ درزن کو بلوا کر آپ کے لیے نئے ملبوسات تیار کروا دیں گی۔ امید ہے کہ رات تک آپ کے لیے دو تین جوڑے تیار ہو جائیں گے اور کل صبح ناشتے کے بعد آپ بچوں سے ملاقات کر سکیں گی۔'' جوزفین نے لانگ اسکرٹ پہن رکھا تھا جس کے بلاؤز کی آستینیں بھی فل تھیں اس کے باوجود آپا بیگم نے اس کے لباس کو ناپسندیدہ نگاہ سے دیکھا تھا اور شاہی حکم سنا دیا تھا۔ جوزفین نے ان کے اس حکم پر بھی سر جھکا دیا۔ اس کے اپنے پاس گنتی کے چند ہی جوڑے تھے اور وہ بھی کوئی خاص اچھی حالت میں نہیں تھے جبکہ اس نے دیکھا تھا کہ یہاں ملازمائیں بھی بہت عمدہ پوشاک پہنتی ہیں۔ ایسے میں اگر آپا بیگم اس کے لیے نئے لباس تیار کروا کر عنایت کر رہی تھیں تو یہ اس کے حق میں اچھا ہی تھا۔ ویسے بھی بزرگ کہتے ہیں کہ جیسا دیس ویسا بھیس تو اگر وہ حویلی میں رہ کر حویلی والوں کی طرح پہناوے استعمال کرنے لگتی تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ آپا بیگم کی یہاں جو حیثیت تھی، اس کو جاننے کے بعد ان سے اختلاف کی کوئی گنجائش نکلتی بھی نہیں تھی۔

''بہت بہتر۔ جیسا آپ پسند کریں ویسا ہی ہوگا۔'' اس نے ایک بار پھر آپا بیگم کو اپنی تابعداری کا یقین دلایا۔

''ٹھیک ہے پھر آپ جا کر آرام کریں۔ ہم آپ کے سلسلے میں اکا بیگم کو ہدایات دے دیں گے۔ آپ ان کی ہدایات پر عمل کریں گی تو حویلی میں آپ کا قیام آسان ہوگا۔'' آپا بیگم نے ایک بار پھر اس پر صورتِ حال واضح کر کے اسے وہاں سے جانے کی اجازت دی تو جوزفین یوں باہر نکلی جیسے اس کمرے میں آکسیجن کی کمی ہوگئی ہو اور اسے سانس لینے کے لیے تازہ ہوا کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو۔ حقیقت تھی بھی کچھ ایسی ہی۔ آپا بیگم جیسی سخت گیر خاتون کی موجودگی میں اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور اس نے پہلی ملاقات میں ہی یہ بات جان لی تھی کہ حویلی کے قیام میں اسے جو سب سے بڑی مشکل پیش آئے گی، اس مشکل کا نام ''آپا بیگم'' ہے جو حویلی کی مطلق العنان حاکم بنی بیٹھی ہیں۔

☆☆☆

اڈے پر ایک کہرام برپا تھا۔ کموکی موت کی خبر نے ان سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے والے لوگ تھے جو اگر اپنی جیبوں میں چاقو رکھتے تھے تو اس بات سے بھی بخوبی واقف تھے کہ کسی مخالف کا چاقو ان کی زندگی کا چراغ بھی گل کر سکتا ہے لیکن

موت کو جاننا اور اس کا صدمہ سہنا مختلف باتیں ہوتی ہیں۔ انسان کے آس پاس دن رات لوگ مرتے ہی رہتے ہیں اور وہ اجنبی جنازوں کو دیکھ کر پل بھر کا افسوس کرنے کے بعد بھول بھال جاتا ہے لیکن جب موت بہت قریب سے وارد ہوتی ہے تو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ گویا دنیا میں صرف وہی اس سانحے سے دوچار ہوا ہو۔ اس حقیقت کو برداشت کرنا کہ یہ جو شخص بے روح جسم کے ساتھ ہمارے سامنے لیٹا ہے، اب کبھی ہمیں اپنے درمیان نظر نہیں آئے گا، بے پناہ اذیت ناک ہوتا ہے۔ وہ بھی اس اذیت کو سہتے بری طرح بلبلا رہے تھے۔ کمو سے خون کا رشتہ تو ان میں سے کسی کا بھی نہیں تھا لیکن وہ جس طرح ایک دوسرے سے بندھے تھے، وہ تعلق خونی رشتوں سے کچھ بڑھ کر ہی تھا۔ برسوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے انہوں نے آپس میں... ان گنت دکھ سکھ بانٹے تھے اور اب جدائی کے ان لمحات میں وہ سب انہیں یاد آ رہا تھا۔ کمو کی ایک ایک ادا یاد آ کر انہیں رلاتی جا رہی تھی۔ ان میں سب سے دگرگوں حال وجے کا تھا۔ کمو نے اسی کی بانہوں میں ہی تو دم توڑا تھا اور وہ اس کی جان بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکا تھا۔

اسے رہ رہ کر کمو سے ہونے والی آخری گفتگو یاد آتی تھی۔ کمو جس نے اتنے برسوں میں کبھی کسی کو اپنے حالات سے آگاہ نہیں کیا تھا، جانے اس وقت کیسے اس کے سامنے اپنا دل کھول کر بیٹھ گیا تھا اور اپنا ایک ایک زخم اسے دکھایا تھا۔ وجے کو یوں لگ رہا تھا کہ کمو نے اپنا سارا دکھ اس کے اندر منتقل کر دیا ہو۔ اس دکھ کے بوجھ سے اس کا دم گھٹ رہا تھا اور وہ تڑپ رہا تھا کہ کمو کیسا نامراد اس دنیا سے چلا گیا ہے اور کچھ نہیں تو بے چارے کو ایک بار اپنوں کی شکلیں دیکھنا تو نصیب ہو جاتیں۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں گھر سے بھاگا وہ کبھی اپنے کسی پیارے کی شکل دوبارہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ کہتے ہیں مرے ہوؤں کو صبر آ جاتا ہے لیکن جیتے جی بچھڑ جانے والوں پر صبر نہیں کیا جاتا۔ کمو بھی نہ جانے کیسے کیسے اپنے بچھڑوں کی صورت کو ترستا ہوگا اور ترستا ہوا ہی دنیا سے چلا گیا تھا لیکن جاتے جاتے بھی بہت بڑا کام کر گیا تھا۔ اس نے ثریا بانو پر اپنی جان نچھاور کر دی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اسے لگ رہا ہے کہ جیسے وہ اپنی بہن کی شادی میں شریک ہوا ہو تو اس نے بھائی ہونے کا حق ادا کر دیا تھا۔ بہن کے لیے اپنی زندگی نثار کر کے وہ سرخ رو ہو گیا تھا لیکن وجے کو شرمندہ اور دکھی کر گیا تھا۔ اسے سخت صدمہ تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے اس کے ساتھی کی جان چلی گئی اور قاتل اتنی آسانی

سیلف میڈ

بیٹی۔ ”امی ہمارا انگلش کا استاد اتنا خوب صورت ہے کہ......“

ماں۔ ”بیٹی! استاد باپ کی جگہ ہوتا ہے۔“

بیٹی۔ ”آپ بس اپنا ہی سوچنا، ہماری کوئی فکر نہیں آپ کو۔“

☆☆☆

یک نہ شد

بیوی۔ ”ہماری بیٹی کی عمر نکلی جا رہی ہے، اس ماہ 26 سال کی ہو جائے گی، کوئی ہم عمر رشتہ ڈھونڈیں اس کے لیے۔“

سردار۔ ”اگر اس کی عمر کا چھورا نہ ملے تو 13،13 کے دو لے آؤں؟“

☆......☆☆......☆

پریشانی

سردار (ڈاکٹر سے)۔ ”آواز آتی ہے مگر کوئی نظر نہیں آتا۔“

ڈاکٹر۔ ”ایسا کب ہوتا ہے؟“

سردار۔ ”فون پر بات کرتے ہوئے۔“

☆......☆☆......☆

خوف

بیوی۔ ”اجی آپ کدھر ہو؟ جلدی گھر آ جاؤ، ادھر زلزلہ آیا ہے۔“

سردار۔ ”تم اس کو بٹھاؤ، میں ابھی آتا ہوں۔“

☆......☆☆......☆

خود فریبی

ایک مچھر کہیں جا رہا تھا، راستے میں زور کا طوفان آیا، مچھر ایک کیکر کے درخت سے لپٹ گیا اور طوفان ٹل جانے کے بعد پسینا صاف کرتے ہوئے بولا۔

”جے اج میں ناں ہوندا تے ایہہ کیکر گیا سی۔“

مرسلہ۔ معراج محبوب عباسی، ہری پور ہزارہ

سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ دم توڑتے کمو کو دیکھ کر اسے اتنا ہوش ہی نہیں رہا تھا کہ فیکے اور اس کے ساتھیوں کی راہ روکتا۔ بعد میں جب پولیس آئی اور اس سے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع ہوا تو اسے قدرے ہوش آیا۔

اپنے دشمنوں کے خلاف پولیس میں رپورٹ لکھوانا اڈے کی روایت نہیں تھی۔ زیادہ تر وہ اپنے معاملات خود نمٹایا کرتے تھے اس لیے وجے نے بھی عقل مندی سے کام لیتے ہوئے فیکے یا مجو دادا کا نام نہیں لیا اور صرف اتنا بیان دیا کہ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ کلکتے جا رہا تھا۔ دیگر مسافروں کی طرح انہیں بھی علم تھا کہ ان کے ساتھ ایک برات بھی دلہن رخصت کروا کر واپس جا رہی ہے۔ برات والے پردہ دار خواتین کی وجہ سے دوسروں سے الگ تھلگ سفر کر رہے تھے اس لیے دوسرے بھی خیال رکھ رہے تھے کہ ان کی تنہائی میں خلل نہ ہو۔ اتفاق سے کچھ دیر قبل اس کے ساتھی کو ٹوائلٹ جانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور وہ ان لوگوں کے قریب سے گزرا تو اسے احساس ہوا کہ وہاں کوئی گڑبڑ ہے۔ اس نے ذرا سی توجہ دی تو معلوم ہوا کہ کچھ غنڈے براتیوں کو لوٹنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ان سے زیور اور نقدی وغیرہ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس نے فوراً وجے کو بھی بلا لیا اور دونوں نے فیصلہ کیا کہ ان غنڈوں کو ان کے ارادے میں کامیاب نہیں ہونے دیں گے چنانچہ انہوں نے مداخلت کر دی۔ ان کی اس مداخلت نے لٹیروں کو ان کے مقصد میں تو ناکام کر دیا لیکن جاتے جاتے وہ طیش میں کمو کو نشانہ بنا گئے۔ ثریا بانو کے شوہر اور سسر نے بھی اس کے اس بیان کی تصدیق کی۔ وہ لوگ کمو اور وجے کو پہچان گئے تھے اور انہوں نے یہی بہتر سمجھا تھا کہ ربن کے ساتھیوں کی تائید کی جائے۔ یوں بھی اصل بات بیان کرنے سے ثریا بانو کا نام سامنے آتا اور وہ اپنے گھر کی عورت کو تھانے اور کچہری کے چکر میں نہیں گھسیٹنا چاہتے تھے۔ شادی کے معاملات طے کرتے ہوئے ربن نے دلہا کو ثریا بانو کے جملہ حالات سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ مجو دادا والا قصہ بھی سنا دیا تھا اس لیے وہ یہ شکایت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور اسے جان بوجھ کر مصیبت میں ڈالا گیا ہے۔ گھر کی عورتوں نے بعد میں کچھ باتیں بنائی ہوں تو بنائی ہوں۔ ثریا بانو کا شوہر اور سسر بہرحال مسلسل استقامت کا مظاہرہ کرتے رہے تھے اور ان کا رویہ حوصلہ افزا تھا کہ ثریا بانو کو اپنی شادی شدہ زندگی میں کسی بڑی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

وجے نے اسٹیشن سے ہی ربن کے وکیل اشوک چگن کو ٹیلی فون کر کے اسے حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ اشوک نے اسے اپنے پہنچنے تک مزید کوئی بیان دینے سے روک دیا اور فوری طور پر ربن کو صورت حال سے باخبر کیا۔ ربن اور وہ فوراً بذریعہ کار جائے حادثہ پر پہنچے۔ حادثہ سفر کی ابتدا میں ہی پیش آ گیا تھا اور وہ لوگ بمبئی سے بہت دور نہیں پہنچے تھے اس لیے اشوک چگن اور ربن کو وہاں پہنچنے میں بہت زیادہ دیر نہیں لگی۔ پولیس والوں نے براتیوں اور وجے کو وہیں روک کر ٹرین کو آگے سفر کے لیے روانہ ہونے کی اجازت دے دی تھی اور کمو کی لاش اپنی تحویل میں لے لی تھی۔ وہ برات کے ساتھ موجود خواتین کو بھی جانے کی اجازت دینے کے لیے تیار تھے اور چاہتے تھے کہ مرد حضرات قانونی کارروائی کے لیے وہاں رک جائیں۔ عام حالات میں شاید ایسا کر بھی لیا جاتا لیکن ثریا بانو کے شوہر اور سسر کو اندیشہ ہوا کہ کہیں آگے بھی کوئی مسئلہ پیش نہ آ جائے اور تنہا خواتین مصیبت میں گرفتار ہو جائیں اس لیے انہوں نے خواتین کو بھی اپنے ساتھ وہیں روک لینا مناسب سمجھا اور انہیں ثریا بانو کے دیور کی نگرانی میں اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں ہی چھوڑ دیا۔ پولیس افسر نے انہیں یقین دہانی کروائی تھی کہ جلد از جلد کارروائی نمٹا کر انہیں روانگی کی اجازت دے دی جائے گی چنانچہ وہ پولیس والوں کے ساتھ تھانے آ گئے تھے جہاں ان کے بیانات لکھے گئے اور مفرور مجرموں کے حلیے بھی معلوم کیے گئے۔

تھانے آ کر بھی وہ لوگ اسی بیان پر جمے رہے تھے جو ان کے سامنے وجے نے پولیس والوں کو دیا تھا۔ فیکے اور اس کے ساتھیوں کے حلیے البتہ بالکل درست لکھوائے گئے۔ ضروری کارروائی کے بعد ان لوگوں کا کلکتہ کا پتا لکھ کر ۔۔۔ اگلی ٹرین سے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ وجے البتہ وہیں رکا رہا۔ پولیس والوں نے اس سے بڑی باریک بینی سے چھان بین کی۔ وجے نے ربن دادا کے اڈے سے اپنے تعلق کو پوشیدہ نہیں رکھا کیونکہ یہ بات چھپنے والی نہیں تھی۔ پھر یہ بھی حقیقت تھی کہ کوئی عام شخص ڈاکوؤں، لٹیروں سے بھڑنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ایسی جی داری تو وہی دکھا سکتا تھا جو خود بھی اپنے اندر کچھ زور رکھتا ہو۔ پولیس کو جائے واردات سے مفرور مجرموں کے علاوہ وجے اور کمو کے چاقو بھی مل گئے تھے اس لیے بھی انکار کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پولیس سے واسطہ اڈے کے لوگوں کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں تھی اس لیے وجے پولیس والوں کی

تفتیش کو استقامت سے بھگتا تا رہا۔ اس کو ربن اور وکیل کی آمد اور کمو کی لاش کی حوالگی تک وہاں بہر صورت رکنا تھا۔

ربن اور وکیل اشوک بچن تھانے پہنچے تو انہوں نے پہلے وجے سے تنہائی میں ملاقات کی خواہش کی۔ وجے ملزم کی حیثیت نہیں رکھتا تھا پھر وکیل کی موجودگی کی بھی بڑی اہمیت تھی اس لیے تھانیدار کو اجازت دینی پڑی۔

ربن اور اشوک نے وجے سے ساری تفصیل سنی اور پھر آگے کے معاملات انہوں نے خود سنبھال لیے۔ اشوک بچن خود تو جوان وکلاء میں شمار ہوتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے جانے مانے وکیل باپ کا حوالہ چلتا تھا اس لیے لوگ اس سے عزت سے پیش آتے تھے۔ اس کی دخل اندازی نے ہی وجے کی جان چھڑانے اور کمو کی لاش کی وصولی میں خاصی سہولت پیدا کردی۔ کمو کی موت کی اطلاع پہلے ہی اڈے پر ہو چکی تھی اور اڈے والے جانتے تھے کہ دلدا وکیل کے ساتھ معاملات نمٹانے گیا ہوا ہے۔ اس خبر کو سن کر ہی ان سب کے ہوش اڑ گئے تھے اور وہ اپنے بچھڑنے والے ساتھی کے لیے نوحہ کناں تھے لیکن لاش پہنچتے پر تو مانو سارے بند ہی ٹوٹ گئے۔ ربن اڈے پر پہنچتے ہی سب سے الگ ہو گیا تھا۔ کمو کی موت کا اسے بھی صدمہ تھا۔ گولو اور فاروق کی اہمیت سب سے بڑھ کر سہی لیکن وہ اپنے اڈے کے ہر فرد کو بالکل ایسے ہی عزیز رکھتا تھا جیسے وہ اس کے کنبے کا حصہ ہو اور سچ تھا بھی یہی۔ وہ سارے اس کا کنبہ ہی تو تھے۔ خود اپنا کنبہ تو ماضی کی دھول میں وہ جانے کتنے برس پہلے چھوڑ آیا تھا۔ دادا کی گدی سنبھالنے تک اس نے جانے زندگی کے کتنے نشیب و فراز دیکھے تھے۔ موت بھی اس کے لیے کوئی انوکھی چیز نہیں تھی لیکن تھا تو وہ بہر حال آدمی ہی جو موت کو جاننے کے باوجود اس کے اذیت ناک اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ اپنے احساسات اور جذبات کو کسی سے بانٹ نہیں سکتا تھا۔ وہ اس کنبے کا سربراہ تھا جسے ہر حال میں ہمت اور استقامت کا مظاہرہ کرنا تھا چنانچہ اس کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ کچھ دیر کے لیے تخلیے میں چلا جاتا۔ خود کو سمیٹ کر جب وہ دوبارہ نیچے اترا تو اس کا چہرہ پتھر بنا ہوا تھا۔ وہ سارے جو ابھی تک اپنے لٹ جانے کا ماتم کر رہے تھے اسے سامنے پا کر کچھ اور بھی شدت سے دھاڑیں مارنے لگے۔

”کیا سالا عورتوں کی طرح رونا دھونا لگا رکھا ہے۔ یہ ربن کا اڈا ہے۔ ادھر مرد بچہ مانگتا ہے اپن۔ ایسے ہیجڑوں کے ماتق رونا دھونا کرنے والوں کا کام نہیں ہے اپنے پاس۔ رو دھو کر تم کمو کو زندہ کر سکتا ہے تو اپنے کو بولو۔ ابھی اپن بھی تمہارے ساتھ مل کر لوٹنے لگتا ہے زمین پر۔“ ربن کی آواز میں ایسی گھن گرج تھی کہ سب کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ سب رونا بھول کر اپنی اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔

”تم سالا سارا حرام کا جنا کیا سمجھتا ہے کہ صرف تم کو ہی کمو کے جانے کا دکھ ہے اور اپن سالا سینے میں دل کی جگہ پتھر رکھتا ہے جو اپنے کو دکھ نہیں ہوئیں گا۔ تم سارا حرام کا جنا اپنی اولاد کے ماتق ہے اور باپ کو اولاد کا دکھ کیسے ہوتا ہے، یہ باپ کو ہی معلوم ہوتا ہے پر ادھر اپن رو پیٹ کر چپ بیٹھ جانے والا باپ نہیں ہے۔ اپن دادا ہے دادا...... اور اپن اپنے بندے کا خون ایسے معاف کرنے والا نہیں ہے۔ اپن اکھا بمبئی کو بتا دے گا کہ ربن کے آدمی پر ہاتھ ڈالنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ ابھی تم سارا کمینہ لوگ رونا دھونا بند کرو اور کمو کے کفن دفن کا انتظام کرو پر یاد رکھنا اس کا کفن میلا ہونے سے پہلے اس کے خون کا حساب لینے کا ہے ورنہ اپن تم سب کو ادھر سے گلٹی کر دینے کا ہے۔“ اس بار ربن کے لہجے میں نرمی اور گرمی دونوں کا عنصر برابر تھا۔ اس کے اس انداز نے واضح اثر کیا اور ساکت ہو جانے والے جسموں میں تحرک پیدا ہونے لگا۔

”تم ایک دم صحیح بولتا ہے دادا۔ اپن کمو کا خون معاف نہیں کرنے کا ہے۔ ماں قسم پورا پورا حساب لیں گے ان سالا بدمعاش لوگوں سے۔ اب ان کو جیادہ (زیادہ) دن زمین کے اوپر سانس لینے کو نہیں ملنے والا ہے۔“ ربن کی تائید میں ایک آواز بلند ہوئی تو ایک ایک کر کے وہ سب ہی کمو کے قاتلوں کو انجام تک پہنچانے کا عزم ظاہر کرنے لگے۔ ان کی اس کیفیت کو دیکھ کر ربن نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ اپنے آدمیوں میں جو آگ دیکھنا چاہتا تھا، وہ دہک چکی تھی اور اس آگ کو بجھانے کے لیے آنکھ سے بہنے والے نمکین پانی کی رسد بند ہو گئی تھی۔

☆☆☆

”آج کیا پروگرام ہے۔ کہیں باہر جانا ہے یا گھر پر رہ کر آرام کرنے کا ارادہ ہے؟“ ناشتے کی میز پر بملا نے چہکتی ہوئی آواز میں فاروق سے دریافت کیا۔

”نہیں۔ آج کہیں جانے کا موڈ نہیں ہے۔ طبیعت تھوڑی سست ہو رہی ہے اور کچھ بھی کرنے کا دل نہیں چاہ رہا۔“ فاروق نے بجھے ہوئے لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا تو بملا نے نوٹ کیا کہ اس کا چہرہ قدرے ستا ہوا ہے اور آنکھوں میں بھی ہلکی سی سرخی ہے۔

"کیا بات ہے، آپ کی طبیعت تو اچھی ہے نا؟ کہیں پھر سر میں درد تو نہیں ہو رہا؟" وہ تشویش زدہ لہجے میں اس سے دریافت کرنے لگی۔

"طبیعت تو ٹھیک ہی ہے۔ سر درد کا اٹیک بھی نہیں ہوا لیکن جانے کیوں رات بھر بے چینی کی سی کیفیت رہی اور ٹھیک سے نیند نہیں آئی اس لیے تھوڑی سی سستی ہے۔" فاروق نے اسے جواب دیا اور جوس کا گلاس ہونٹوں سے لگالیا۔ ناشتے کی میز حسبِ معمول لوازمات سے بھری ہوئی تھی اور توس، آملیٹ سے لے کر پوری، ترکاری تک بہت کچھ موجود تھا لیکن اس نے کسی بھی شے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ کھانے پینے کی کسی چیز کی طرف طبیعت مائل ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"رات سونے سے پہلے کیتھرائن نے آپ کا چیک اَپ کیا تھا یا نہیں؟ میں نے دیکھا تھا کہ رات میں وہ اور گولو بہت دیر تک لوڈو کھیل رہے تھے۔" بملا نے ذرا تیز لہجے میں اس سے دریافت کیا۔ لہجے کی یہ تیزی فاروق کے لیے نہیں بلکہ کیتھرائن کے لیے تھی۔ فاروق نے نوٹ کیا تھا کہ وہ اس سے متعلق لوگوں کے لیے اکثر یہ انداز اختیار کرنے لگی ہے اور اس کا رویہ ایسا ہوتا ہے جیسے وہ دوسروں کے مقابلے میں فاروق پر زیادہ حق رکھتی ہو۔

"کیتھی بہت ذمے دار لڑکی ہے اور اپنی ڈیوٹی بہت ذمے داری سے ادا کرتی ہے۔ وہ اور گولو اگر یہاں موجود ہیں تو صرف میری خاطر اور وہ دونوں ہی اپنے اپنے طور پر میرا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ میں خود کو ان کے اس خلوص اور محبت کے لیے مقروض محسوس کرتا ہوں اور کسی طور یہ مناسب نہیں سمجھتا کہ ان کے ساتھ زرخرید غلاموں کا سا سلوک کروں اور ان کی چھوٹی چھوٹی تفریحات کو بھی تنقید کا نشانہ بناؤں۔" اس نے بملا کو اس کی بے جا تنقید پر راست جواب دیا۔

"آپ تو برا ہی مان گئے۔ مانا وہ دونوں آپ کو عزیز ہیں لیکن مجھ سے بھی تو آپ کا دوستی کا ناتا ہے اور ایک دوست کے طور پر میں آپ کی بہت فکر کرتی ہوں اس لیے ایسی بات کہہ دی لیکن لگتا ہے کہ آپ کی نظر میں میری کوئی ویلیو ہی نہیں ہے اس لیے آپ کبھی چاند بانو کے لیے مجھے ڈی گریڈ کر دیتے ہیں تو کبھی کیتھی اور گولو کے لیے۔" بملا نے اداس سے لہجے میں بیک وقت وضاحت اور شکوہ دونوں کر ڈالے۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں کسی کو بھی ڈی گریڈ کرنے والا آدمی نہیں ہوں اور دوسروں سے بھی یہی امید رکھتا ہوں کہ وہ باقی لوگوں کی عزتِ نفس کا خیال رکھیں۔ آپ ایک دوست کی حیثیت سے میرے لیے محترم ہیں لیکن چاند بانو جسے آپ طوائف زادی کہتی ہیں، وہ بھی میرے لیے کم قابلِ احترام نہیں ہے۔ رہی کیتھی اور گولو کی بات تو وہ دونوں تو میرے لیے بالکل سگے بہن بھائی جیسے ہیں اور میں یہ کیسے برداشت کر سکتا ہوں کہ کوئی میری بہن یا بھائی پر بے پروائی کا الزام عائد کرے۔" فاروق نے لہجہ نرم کر کے اسے سمجھایا۔ بملا کے انداز اور رویوں پر اس سے شاکی ہونے کے باوجود اسے اس کی اداسی نے متاثر کیا تھا اور اسے یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ کوئی اس کی وجہ سے اداس یا دکھی ہو۔

"ٹھیک ہے بابا! آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گی۔ اب شما کر دیں اور ایک گڈ نیوز سنیں۔" بملا نے فوراً ہی اپنا لہجہ بدل لیا اور قدرے شوخ ہوگئی۔

"گڈ نیوز ہے تو فوراً سنائیے۔ یہاں اچھی خبریں ویسے ہی ذرا کم ملتی ہیں۔" فاروق نے بھی اپنا لہجہ بدل لیا۔

"میں نے اپنے کالج کی چھٹیاں بڑھوالی ہیں اور میں اب مزید کچھ عرصہ اور شملہ میں رکوں گی۔" اس کے لہجے کی شوخی برقرار تھی۔

"واقعی؟ لیکن کیسے؟ آپ نے یہاں بیٹھے بیٹھے ہی چھٹیاں بڑھوالیں۔ سنا ہے ان معاملات میں بڑے سخت رولز اینڈ ریگولیشنز ہوتے ہیں۔" فاروق نے حیرت کا اظہار کیا۔

"میں بملا بھاٹیہ ہوں اور سب جانتے ہیں کہ کالج کی جاب میری مجبوری نہیں۔ ہمارے ہاں رولز اینڈ ریگولیشنز کی پابندی صرف مجبوروں سے کروائی جاتی ہے مجھ جیسوں سے نہیں۔ میرا تو پرنسپل کو ایک فون کرنا ہی کافی ہو گیا تھا۔ چھٹیاں بڑھانے کی بات کرنے سے پہلے میں نے انہیں بس اتنا بتایا تھا کہ اس بار کالج کے اینول فنکشن میں ڈیڈی بھی شریک ہوں گے اور میں انہیں اس ایونٹ پر کالج کے لیے ایک بڑی مالیت کا چیک ڈونیٹ کرنے پر راضی کر چکی ہوں بس اس کے بعد پرنسپل کے پاس اس بات کی گنجائش کہاں رہتی تھی کہ وہ میری فرمائش کو رد کر سکیں، سو اب میں آرام سے کچھ دن اور شملہ میں ٹھہر سکتی ہوں۔" بملا نے ہنستے ہوئے اسے تفصیل سے آگاہ کیا جو فاروق کے لیے یقیناً زیادہ خوش کن نہیں تھی لیکن وہ خاموش رہا۔ اگر وہ بملا کو جتا دیتا کہ اسے حیثیت اور دولت کے اس استعمال پر کوئی خوشی نہیں ہوئی تو یقیناً وہ ایک بار پھر اداس شکل بنالیتی اور بہر حال وہ ایسا نہیں چاہتا تھا اس لیے رواداری سے بولا۔

"یہ تو واقعی اچھی خبر ہے۔ آپ شملہ سے اتنی محبت

کرتی ہیں۔ یہاں مزید وقت گزارنا یقیناً آپ کو بہت اچھا لگے گا۔"

"صرف مجھے......؟ کیا آپ کو میرے یہاں رکنے سے خوشی نہیں ہوگی؟" اس نے فوراً پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ دوستوں کے ساتھ رہنا تو سب ہی کو اچھا لگتا ہے۔" بملا کے سوال میں جو ایک ذومعنویت تھی، اس نے فاروق کو تھوڑا سا گڑبڑایا ضرور لیکن اس نے سنبھل کر بہت طریقے سے جواب دیا۔ بملا کے اپنے لیے بدلتے ہوئے احساسات وجذبات اسے سمجھ آنے لگے تھے لیکن وہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ اس امیرزادی کے بڑھتے قدموں کو کس طرح روکے۔ وہ محبت کا احترام کرنے والا آدمی تھا اور اس نے اس احترام میں چاند بانو جیسی بدنام پس منظر رکھنے والی لڑکی کو بھی اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی جگہ دے دی تھی اور اسے یہ باور کروانے میں کامیاب رہا تھا کہ اگرچہ وہ اس کی محبت کو قبول کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے لیکن اس کے جذبۂ دل کا احترام کرتا ہے۔ چاند بانو نے اس صورتِ حال کو قبول کرلیا تھا اور ایک عاشق صادق کی طرح اتنے پر بھی قناعت کر کے خوش تھی۔ اصل میں اس چھوٹی سی لڑکی کو قدرت کی طرف سے محبت کو سمجھنے اور نبھانے کا ہنر ودیعت کیا گیا تھا لیکن بملا اس ہنر سے یکسر بے بہرہ دکھائی دیتی تھی۔

اسے اپنی دولت اور باپ کی حیثیت کا غرور تھا اور وہ یہ گمان رکھتی تھی کہ جیسے بازار میں فروخت کے لیے سجی اشیا میں سے وہ جس شے پر ہاتھ رکھ دے اسے خریدنے کی استطاعت رکھتی ہے اسی طرح انسانوں میں سے جس کو چاہے اپنا بنا سکتی ہے۔ فاروق کو ڈر تھا کہ جس دن بملا کو صاف جواب دینے کی نوبت آئی وہ دن بڑا بھاری ہوگا اور وہ جو بڑی شائستہ، ذہین اور مدبر نظر آتی ہے بڑے شدید ردعمل کا مظاہرہ کرے گی۔ یہ ردعمل خود کو نقصان پہنچانے سے لے کر دوسروں کو تہس نہس کر دینے تک کسی بھی صورت میں سامنے آسکتا تھا اور فاروق اسی چیز سے ڈرتا تھا کیونکہ نہ تو وہ بملا کا نقصان چاہتا تھا اور نہ ہی اپنا اور اپنے ساتھیوں کا۔ اڈے والوں کو بھائیہ سیٹھ کی شکل میں ایک اچھا خاصا مضبوط سہارا مل گیا تھا اور وہ خود کو پہلے سے بہتر پوزیشن میں محسوس کرنے لگے تھے لیکن بملا کے معاملے میں بے احتیاطی سیٹھ کا دماغ بھی گھما سکتی تھی۔ بملا سے لاکھ اختلافات سہی لیکن بہرحال وہ اس کی اکلوتی بیٹی تھی جس کی خاطر وہ دوستی کو دشمنی میں بدل سکتا تھا۔

"ایسا کرتے ہیں کہ باہر نیٹ لگا کر بیڈمنٹن کھیلتے ہیں۔ آج موسم اچھا ہے۔ کھیلنے میں مزہ آئے گا اور آپ کی طبیعت کی سستی بھی دور ہو جائے گی۔" بملا کو اس کے جواب نے خوش کیا تھا چنانچہ اس نے فوراً ہی پروگرام ترتیب دے دیا اگرچہ اس قسم کی کسی سرگرمی میں حصہ لینے پر بھی فاروق کی طبیعت مائل نہیں ہو رہی تھی پھر بھی وہ بملا کی خوشی کے لیے راضی ہو گیا۔ کچھ یہ خیال بھی دل میں تھا کہ ہوسکتا ہے اسی طرح طبیعت پر اچھا اثر پڑ جائے۔ ناشتا تو اس نے کچھ خاص کیا نہیں تھا اور فارغ ہی بیٹھا ہوا تھا چنانچہ بملا سے تیار ہو کر آنے کا کہہ کر اپنے کمرے کا رخ کیا۔ کمرے میں پہنچتے ہی حسب معمول کیتھی دواؤں سمیت اس کے چیک اپ کے لیے آ دھمکی۔ پہلے اس نے بلڈ پریشر وغیرہ چیک کیا پھر ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوا اپنی نگرانی میں کھانے کے لیے دی۔ فاروق نے اسے بملا کے ساتھ طے ہونے والے پروگرام سے بھی آگاہ کر دیا۔

"او کے لیکن آپ بہت دیر تک نہیں کھیلیں گے۔ زیادہ مشقت آپ کے لیے نقصان دہ بھی ہوسکتی ہے۔" کیتھرائن نے فوراً اسے متنبہ کیا۔

"میں خیال رکھوں گا۔ ایسا کرو کہ تم اور گولو بھی ہمارے ساتھ باہر آجاؤ۔ مجھے سپورٹرز مل جائیں گے اور تم لوگ بھی انجوائے کرلو گے۔" فاروق نے اس سے کہا تو وہ انکار نہیں کرسکی۔ اس کے اپنے کمرے سے جانے کے بعد فاروق کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے تیار ہونے لگا۔ تیاری کے دوران بھی اس نے اپنی بے چینی اور بے دلی کو محسوس کیا لیکن خود پر جبر کر کے تیار ہوا اور باہر آ گیا۔ ملازم کرشن اور ڈرائیور بملا کی ہدایت پر نیٹ وغیرہ لگا کر کھیل کا انتظام کر رہے تھے۔ بملا بھی لباس تبدیل کر کے آچکی تھی اور اس وقت چست پتلون پر چست سی جرسی پہنے ہوئے تھی جس میں اس کا جسم خاصا نمایاں ہو رہا تھا لیکن اسے پروا نہیں تھی اور وہ بڑی بے نیازی سے ہاتھ میں موجود ریکٹ کو بے مقصد ہوا میں گھما رہی تھی۔ کیتھرائن اور گولو نے ان کے میچ کے دوران تماشائیوں کا کردار ادا کرنے کے لیے ایک بینچ سنبھال لی تھی۔ کچھ دیر بعد ساری تیاری ہوگئی اور انہوں نے کھیلنا شروع کر دیا۔ کھیل کی ابتدا میں ہی فاروق کو احساس ہو گیا کہ بملا بہت اچھی کھلاڑی ہے اور اسے اس کھیل کے اسرار و رموز سے پوری واقفیت ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ بس معمولی شدبد ہی رکھتا تھا اور حقیقتاً کھیل سے واقفیت سے زیادہ اپنی جسمانی چستی و پھرتی کے سہارے اس کے مقابل جما ہوا تھا لیکن بہرحال بملا کا پلڑا

ہی بھاری تھا اور پہلا راؤنڈ مکمل کر کے وہ ذرا دیر آرام کے لیے بیٹھے تھے تو ببلا کے پوائنٹس واضح طور پر اس سے بہت زیادہ تھے۔

''آپ بہت اچھا کھیلتی ہیں۔'' فاروق نے پانی پیتے ہوئے اس کی تعریف کی۔

''میں اپنے کالج میں اس کھیل کی بیسٹ پلیئر تھی۔ ڈیڈی کے ساتھ ڈیلی کلب جانے کی وجہ سے مجھے بہت اچھی پریکٹس ہو گئی تھی اب تو بس کبھی کبھار ہی کھیلنے کو ملتا ہے اس لیے آؤٹ آف پریکٹس ہوں۔'' ببلا نے چہکتے ہوئے اسے بتایا۔

''مجھ جیسے اناڑی کے لیے تو آپ کی یہ آؤٹ آف پریکٹس فارم بھی بہت بھاری ہے۔ میں نے کہیں کبھی اپنے اسکول کے زمانے میں تھوڑا بہت یہ کھیل کھیلا تھا اور اب برسوں گزرنے کے بعد ریکٹ ہاتھ میں لیا ہے۔'' فاروق نے اعتراف کیا۔

''اس صورت میں تو آپ بہت زیادہ تعریف ڈیزرو کرتے ہیں۔ آپ نے مجھ سے بہت کم پوائنٹس بنائے ہیں لیکن میں آپ کی پھرتی سے انسپائر ہوئی ہوں۔ آپ کی باڈی میں قدرتی طور پر بہت لچک ہے اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر آپ نے چند دن بھی لگاتار پریکٹس کی تو بہت ہی اچھا کھیلنے لگیں گے۔'' ببلا نے بھی اس کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر ان کے درمیان میچ شروع ہو گیا۔ اس بار فاروق نے محسوس کیا کہ وہ پہلے جیسی پھرتی اور چستی کا مظاہرہ نہیں کر پا رہا ہے حالانکہ پہلے کے مقابلے میں اس کا ہاتھ ذرا جم گیا تھا اور وہ زیادہ اچھے اسٹروکس لگا رہا تھا لیکن پھرتی کے بغیر سب بے کار تھا۔ ذرا دیر میں اس نے اپنا سانس پھولتا محسوس کیا اور سر میں بھی درد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ یقینی طور پر رات کی بے آرامی کے بعد یہ مشقت اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ اس نے کھیل روک دینا ہی مناسب سمجھا کیونکہ تجربے نے اسے سکھا دیا تھا کہ زیادہ بداحتیاطی اس کے لیے زیادہ تکلیف کا سبب بن جاتی ہے اور وہ جلد از جلد صحت یاب ہونے کا خواہش مند تھا تاکہ ان سب کے درمیان پہنچ جائے جن سے دوری اسے شاق گزرتی ہے۔

''کیا ہوا؟'' اس کے اچانک کھیل روک دینے پر ببلا نے دریافت کیا۔

''میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ گولو اور کیتھرائن بھی اس دوران اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آگئے تھے اور انہوں نے اس کی بات سن لی تھی۔

کیتھرائن فوراً ایکٹو ہو گئی۔

''پلیز اندر چلیں۔ میں نے آپ کو پہلے ہی سمجھایا تھا کہ زیادہ دیر تک نہیں کھیلنا ہے۔'' اس نے فکرمندی سے کہا اور فاروق کا ہاتھ تھام کر اسے اندر کی طرف لے جانے لگی۔ دوسری طرف سے گولو نے بھی اس کا بازو تھام لیا اور وہ تینوں اندر کی طرف چل پڑے۔ پیچھے ببلا ہاتھ میں ریکٹ لیے تنہا کھڑی رہ گئی۔ اس کا اچھا خاصا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ اس نے جھنجلاہٹ میں ریکٹ زور سے زمین پر پھینکا اور خود بھی اندر کا رخ کیا۔ کیتھرائن تربیت یافتہ نرس تھی اور ڈاکٹرز سے فاروق کے سلسلے میں مکمل ہدایات لے کر یہاں آئی تھی اس لیے اسے اچھی طرح علم تھا کہ کس نوعیت کے اٹیک کے لیے کیسا ٹریٹمنٹ دینا ہے۔ اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی فاروق پُرسکون نیند سو رہا تھا۔ اس کی پٹی سے لگا گولو دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا اپنی استعداد کے مطابق اسے آرام پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ زیرلب کسی آیت یا دعا وغیرہ کا ورد بھی جاری تھا۔ ابتدا میں ربن نے اسے قرآن پڑھنے قریبی مدرسے میں بٹھایا تھا لیکن اپنی کند ذہنی کے باعث وہ مکمل قرآن نہیں پڑھ سکا تھا اور مولانا کی مار کوٹ کر یاد کروائی گئی چند دعائیں اور سورتیں ہی اس کا کل اثاثہ تھیں جنہیں وہ ایسے اوقات میں بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ استعمال کرتا تھا۔

''سسٹر! ربن دادا کا ٹیلی فون ہے۔'' کیتھرائن فاروق کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اپنا سامان سمیٹ رہی تھی جب کرشن نے دروازے پر دستک دے کر اسے اطلاع دی۔ کیتھرائن نے فاروق پر ایک متذبذب نگاہ ڈالی۔

''دادا آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔'' کرشن نے اس کی نظروں کا تذبذب محسوس کر کے اسے اطلاع دی تو وہ حیران ہوتی ہوئی فون سننے کے لیے اس کے پیچھے چل پڑی۔ فاروق کی عدم موجودگی میں کبھی کبھار اس کی ربن سے بات ہو جاتی تھی لیکن بطورِ خاص وہ اسے فون نہیں کرتا تھا۔ آج اس کا فون آیا بھی معمول کے وقت سے ہٹ کر تھا۔ وہ کچھ تشویش زدہ ٹیلی فون اسٹینڈ تک پہنچی اور ریسیور کانوں سے لگانے کے بعد ماؤتھ پیس میں ''ہیلو'' بولی۔ دوسری طرف ربن نے بنا تمہید سب سے پہلے اس سے فاروق کی طبیعت کے بارے میں دریافت کیا۔ کیتھرائن کو اس کی آج کی طبیعت کی خرابی کے بارے میں بتانا پڑا۔ یہ سن کر ربن

نے ایک ہنکارا بھرا پھر اسے کمو کی حادثاتی موت کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے ہدایت کی کہ فی الحال فاروق یا گولو کو اس بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔ وہ سمجھتا تھا کہ ان سارے حقائق کو چھپانے پر اسے ہی فاروق کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا لیکن وہ اس کی صحت کی خاطر ہر طرح کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔

”اپن نے ادھر ڈاکٹر سے بھی بات کیا تھا۔ اس نے بولا ہے کہ ادھر چندی گڑھ سے اپنے جاننے والے ڈاکٹر کو فاروق کے چیک اپ کے لیے شملہ بھجوائے گا۔ ایک دو دن میں وہ ڈاکٹر آنے کا ہے۔ اپن تیرے کو فون کر کے پکا ٹیم (ٹائم) بول دے گا۔ سنا ہے وہ بھی دماغ کا بڑا ڈاکٹر ہے تو اسے سب تفصیل بول دینا۔“ ربن ہر طرح کے حالات میں ہر معاملے کو لے کر چلنے والا آدمی تھا۔ فاروق کو ایک نرس کے ساتھ شملہ میں چھوڑ دینا خود اسے تھوڑا سا کھٹکتا تھا اس لیے یہ بندوبست کیا تھا کہ باقاعدہ ڈاکٹر سے بھی اس کا چیک اپ ہو جائے۔ یہ معاملہ کمو کی موت سے پہلے ہی طے پا چکا تھا چنانچہ اس نے اس وقت فون کیا تو کیتھرائن کو اس سلسلے میں بھی آگاہ کر دیا۔ کیتھرائن نے اسے اس کی ہر ہدایت پر حرف بہ حرف عمل کرنے کی یقین دہانی کروائی تب جا کر اس نے سلسلہ منقطع کیا۔ ادھر کیتھرائن اپنی جگہ بیٹھی سوچتی رہ گئی کہ یہ کیسے حیرت انگیز لوگ ہیں جو کوئی خونی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے اتنی شدت سے جڑے ہوئے ہیں کہ فاصلے بھی ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور دور رہ کر بھی انہیں ایک دوسرے کا پورا خیال رہتا ہے۔ اس جیسی حالات کی چکی میں پسنے والی لڑکی نے بھی ان کے درمیان آکر ہی انسانیت پر سے اٹھ جانے والا اپنا اعتماد بحال ہوتا محسوس کیا تھا اور جان گئی تھی کہ ابھی انسانوں میں کچھ انسانیت باقی ہے۔ یہ اور بات کہ اسے اس انسانیت کا پتا ان میں ملا تھا جنہیں دنیا عرفِ عام میں غنڈے بدمعاش کہہ کر پکارتی تھی۔

☆☆☆

جولیٹ نے آفس سے آکر لباس تبدیل کیا اور بستر پر آکر لیٹ گئی۔ جب تک جوزف زندہ تھا تب تک پھر بھی اس کی گھر میں کوئی نہ کوئی مصروفیت رہتی تھی۔ جوزف کے لیے پکانا اور پھر اسے زبردستی کھلانا آفس سے واپس آنے کے بعد اس کے دو سب سے اہم کام ہوتے تھے۔ اب یہ مصروفیت ختم ہو گئی تھی۔ اپنے کھانے پینے کا وہ کچھ ایسا خاص خیال نہیں رکھتی تھی۔ ضرورت محسوس ہوئی تو کبھی کچھ کھا لیا ورنہ ایسے ہی بھوکی سو جاتی تھی۔ وہ کچن جہاں جوزفین روزانہ طرح طرح کے ذائقے دار کھانے تیار کیا کرتی تھی، ویران ہو گیا تھا۔ جوزفین تو اس لیے اتنی محنت سے پکاتی تھی کہ اپنی لاڈلی بیٹی اور محبوب شوہر کو اچھا کھلا پلا کر اسے خوشی حاصل ہوتی تھی لیکن جولیٹ کس کے لیے تردد کرتی۔ اس گھر میں اب اس کے سوا رہ ہی کون گیا تھا اور وہ بھی صرف جسم و جان کا رشتہ جوڑے رکھنے کے لیے کھاتی تھی ورنہ اپنے ساتھ بیتے تلخ حادثے نے اس کی زبان کا ذائقہ ہی چھین لیا تھا۔ کچھ بھی کھائے ایک سا لگتا تھا چنانچہ وہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے زیادہ تر چائے، ڈبل روٹی، آملیٹ یا اسی طرح کی کوئی ایسی شے استعمال کر لیتی تھی جسے پکانے میں زیادہ وقت صرف نہ ہو۔ کبھی کبھار للیتا موسی بھی اس کے لیے کھانا لے کر آجاتی تھی۔ گھر میں کوئی رہتا نہیں تھا تو صفائی ستھرائی کی بھی بہت کم ہی ضرورت پڑتی تھی اور وہ ایک دو دن کے وقفے سے، یہ کام کر لیا کرتی تھی۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ وہ اپنی ماں کے ہاتھ سے سجے گھر کو اسی حال میں رکھنا چاہتی تھی جس حال میں وہ اسے چھوڑ کر اس دنیا سے گئی تھی۔

آج اس کا نہ کھانے کا موڈ تھا اور نہ ہی صفائی کی ضرورت اس لیے وہ اداس سی بستر پر آکر لیٹ گئی تھی۔ کل سے آج تک اس کے گرد و پیش کے ماحول میں بڑی تیزی سے تبدیلی آئی تھی۔ کل یہی محلہ تھا جہاں خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ اڈے کی طرف سے ثریا بانو کی شادی کا بہترین انتظام کیا گیا تھا اور محلے والوں کو شرکت کر کے دعوتِ عام دی گئی تھی۔ محلے والے اس شادی میں شرکت کر کے خوش ہو گئے تھے۔ غرباء کے اس محلے میں ایسی شاندار شادیاں کہاں ہوتی تھیں۔ لوگوں نے خوب سیر ہو کر کھایا پیا تھا اور بعد میں بھی انگلیاں چاٹتے ہوئے ربن دادا کی کشادہ دلی اور ثریا بانو کی خوش نصیبی کے تذکرے کرتے رہے تھے۔ جولیٹ جیسی اپنے غموں کے بوجھ میں دبی لڑکی شاندار دعوت سے تو کیا خاک لطف اٹھاتی لیکن ربن کی کشادہ دلی کا اس نے بھی اعتراف کیا تھا۔ ثریا بانو کے گھر ہونے والی ربن سے مختصر ملاقات بھی اس کے دل پر اثر انداز ہوئی تھی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ ربن صرف زبان سے اسے بیٹی نہیں کہتا بلکہ اس کے انداز میں ایک خاص قسم کا خلوص ہوتا ہے لیکن اس نے بھی اس خلوص اور محبت کی گہرائی میں جا کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ حقیقت میں وہ ذہنی طور پر اس لائق ہی نہیں رہ گئی تھی کہ اس قسم کے تجزیے کر سکتی اس لیے اس نے ربن کے اصرار کے باوجود بھی اسے کچھ

نہیں بتایا تھا۔ کل ہونے والی ملاقات میں بھی وہ نہیں کھلی تھی۔ ربن کے پاس بھی وقت کی قلت تھی چنانچہ بات آئی گئی ہوگئی تھی۔

ثریا بانو کی رخصتی کے بعد بھی وہ کچھ دیر محلے دار خواتین کے اصرار پر ان کے درمیان ٹھہری رہی تھی اور ان کے شادی سے متعلق تبصرے سنتی رہی تھی۔ ان تبصروں اور تجزیوں نے اسے بتایا تھا کہ آج پورا محلہ ہی بہت خوش ہے لیکن اس خوشی کے رنگ اس وقت پھیکے پڑ گئے جب کمو کی موت کی اطلاع اڈے پر پہنچی۔ اڈے والوں کے غم نے لازمی طور پر اہلِ محلہ کو بھی متاثر کیا تھا۔ خود جولیٹ نے بھی اس واقعے پر افسوس محسوس کیا تھا۔ وہ جوان لوگوں کو غنڈے موالی قرار دے کر منہ لگانے کے لائق نہیں سمجھتی تھی، کسی حد تک ان کے معاملے میں نرم ہوگئی تھی۔ کم از کم اس نے یہ بات تسلیم کرلی تھی کہ اگر وہ غنڈے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان میں کوئی مثبت خصوصیت ہی نہیں پائی جاتی۔ وہ بھی دیگر انسانوں کی طرح اپنے اندر خیر و شر دونوں کا عنصر رکھتے تھے اور محلے والوں کے لیے ان کے خیر کا عنصر نمایاں تھا۔ محلے کی ایک فرد کی حیثیت سے انہوں نے اس کا بھی بہت خیال کیا تھا۔ خصوصاً جوزف اور جوزفین کے آخری سفر کے وقت چنانچہ اس نے بھی فطری طور پر اڈے والوں کے غم کو محسوس کیا تھا۔ عورتوں کا تو اڈے پر کوئی کام نہیں تھا لیکن محلے کے مرد باقاعدہ اظہارِ افسوس کے لیے گئے تھے اور کمو کے جنازے میں شرکت کی تھی۔ جولیٹ ان دونوں میں سے ایک بھی کام نہیں کرسکتی تھی چنانچہ اس نے معمول کے مطابق آفس چلے جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔ چھٹی کرکے گھر پر رہتی تو گھر کے در و دیوار کاٹنے کو دوڑتے۔ محلے کی عورتوں کے ساتھ دن بتانا بھی اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ ان سب کا احترام کرتی تھی اور سامنا ہونے پر عزت سے پیش آتی تھی لیکن پورا دن ان کی گفتگو سننا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس سے بہتر یہی تھا کہ آفس چلی جاتی۔

آفس سے واپس آتے ہوئے بھی اس نے محسوس کیا تھا کہ ابھی محلے پر اداسی کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ مرگ کی ویرانی اور وحشت بغیر کسی کے کچھ کہے بھی اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی اور بہ حیثیت انسان جولیٹ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی تھی اس لیے اب چپ چاپ اپنے بستر پر آنکھوں پر ہاتھ رکھے ساکت لیٹی ہوئی تھی لیکن یوں لیٹے لیٹے بھی کتنا وقت گزارا جاسکتا ہے۔ بند آنکھوں کے پیچھے کچھ خوش رنگ خواب و خیال بس رہے ہوں تو پھر بھی وقت گزرنے کا پتا نہیں چلتا۔ وہ تو اس معاملے میں بھی تہی داماں تھی۔ آنکھیں بند کرنے پر کوئی خوش رنگ خیال اس کے من کو گدگدانے نہیں آتا تھا۔ آتے تھے تو ان وحشت ناک اور پُراذیت لمحات کے مناظر جن سے وہ گزری تھی اور یہ ڈراؤنے خواب تو اس کو اکثر نیند سے بھی جاگ جانے پر مجبور کردیتے تھے۔ اس وقت بھی وہ کچھ دیر بعد ہی بے چینی محسوس کرنے لگی اور بستر پر اٹھ بیٹھی۔ ایسی وحشت کے وقت وہ عام طور پر چاقو زنی کی مشق کرتی تھی لیکن آج اس طرف بھی طبیعت مائل نہیں ہورہی تھی۔ اس نے دل کو بہلانے کے لیے دماغ کو ادھر ادھر دوڑایا تو تان جوزفین کی ڈائری پر آکر ٹوٹی۔ ذرا دیر میں ہی اس کے ہاتھ میں وہ مخملی جلد والی ڈائری موجود تھی جس کے صفحوں پر جوزفین کی موتیوں جیسی لکھائی میں اس کا زندگی نامہ بکھرا ہوا تھا۔ وہ ماں کی ہدایت کے مطابق دل کی آنکھوں سے اس زندگی نامے کو پڑھنے لگی۔

☆☆☆

کرتہ پاجامے پر مشتمل چار عدد نہایت خوب صورت ملبوسات اس کے سامنے موجود تھے۔ آپا بیگم کی ہدایت پر درزن اس کا ناپ لے گئی تھی اور نہایت مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رات تک اس کے لیے یہ چار عدد جوڑے تیار کردیے تھے۔ کپڑے اور سلائی کی نفاست نے جوزفین کو خاصا متاثر کیا تھا۔ اس نے ساری زندگی اتنے اچھے معیار کے کپڑے نہیں پہنے تھے اگرچہ اسے اندازہ تھا کہ یہ ملبوسات ان پہناووں کے مقابلے میں کچھ نہیں ہیں جو اس حویلی کی خواتین زیب کرتی ہوں گی۔ حویلی کی خواتین میں سے ابھی تک اس کا صرف آپا بیگم سے ہی سامنا ہوا تھا لیکن اس نے ان کی پوشاک اور زیورات ملاحظہ کیے تھے۔ بہرحال اسے جو ملا تھا وہ اس پر بھی بہت خوش اور مطمئن تھی اور حویلی مالکاؤں سے مقابلے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

"آپ ان ملبوسات کو پہن کر دیکھ لیجیے۔ اگر ناپ وغیرہ میں کوئی مسئلہ ہوا تو میں ابھی کے ابھی درزن کو بلوا کر درست کروادوں گی۔" اس کے لیے ملبوسات لے کر آنے والی سروری نے اس سے کہا تو اس نے سر ہلا دیا اور پھر اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگی۔ سارے لباس بڑی مہارت سے اور بالکل درست ناپ کے ساتھ تیار کیے گئے تھے۔ اس نے سروری کے سامنے اطمینان کا اظہار کردیا۔ اب اگلی صبح پہننے کے لیے ان میں سے کوئی ایک لباس منتخب کرنے کا مرحلہ تھا۔ چاروں ہی جوڑے بہت عمدہ تھے۔ آخر کار اس

نے بہت سوچ بچار کے بعد ہلکے کاسنی رنگ کا جوڑا منتخب کیا۔ اس جوڑے کے کرتے کی آستینوں اور گلے کے تعویذ کے گرد بہت خوب صورت بیل لگی ہوئی تھی۔ ایسی ہی بیل بڑے سے مہین دوپٹے کے چاروں طرف بھی موجود تھی۔ اس کی پسند پر سروری نے وہ جوڑا الگ کر کے باقی تین جوڑے الماری میں رکھ دیے۔ صبح اس نے جوزفین کا منتخب کردہ جوڑا استری شدہ حالت میں اس کے حوالے کر دیا۔ کرتہ پاجامہ زیب تن کرنے میں تو جوزفین کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی لیکن بڑے سے دوپٹے کو سنبھالنے کا اسے کوئی تجربہ نہیں تھا اور اس نے دیکھا تھا کہ یہاں ندرت جہاں سے لے کر ملازماؤں تک سب کے سر نہایت سلیقے سے ڈھکے رہتے ہیں۔ ان ہی کی طرح دوپٹا اوڑھنے کی کوشش میں وہ نڈھال ہوگئی اور بالآخر سروری کی مدد لینی پڑی۔ سروری نے ہنستے ہوئے نا صرف اسے سلیقے سے دوپٹا اڑھایا بلکہ پنیں وغیرہ لگا کر اس خوبی سے جما بھی دیا کہ اس کی ناتجربہ کاری کے باوجود بھرم رہ جائے۔

اس تیاری کے بعد اسے ناشتے کی میز پر پہنچایا گیا۔ وہاں اِکّا بیگم اس کی منتظر تھیں۔ اس نے ان کے ساتھ پرتکلف ناشتے کا لطف اٹھایا۔ یہیں اسے معلوم ہوا کہ سب سے پہلے مالکان کا کھانا پینا ہوتا ہے جس کی نگرانی اِکّا بیگم خود کرتی ہیں۔ اس کے بعد اکا بیگم، منشی اور اسی طرح کے دیگر خاص مصاحب کی باری آتی ہے اور سب سے آخر میں عام ملازمین کھاتے پیتے ہیں۔ کھانے پینے میں کسی کے ساتھ کنجوسی نہیں برتی جاتی اور ہر ایک کو اجازت ہے کہ وہ جو چاہے کھائے پیے لیکن خدمت گاری اور حکم کی بجا آوری میں کسی قسم کی کوتاہی ناقابلِ برداشت ہے۔ ناشتے کے دوران ہی اکا بیگم نے اسے حویلی کے مکینوں کا غائبانہ تعارف بھی کروایا۔ نواب سلیم اللہ اور ندرت جہاں سے تو وہ مل ہی چکی تھی۔ باقی افراد میں سے ایک نواب صاحب کی بیگم صفیہ جہاں عرف نواب بیگم تھیں جو نواب صاحب کے سگے ماموں ہی کی بیٹی تھیں۔ نواب صاحب کے دو بیٹے تھے۔ بڑے صفی اللہ اور چھوٹے اسد اللہ۔ اسد اللہ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ حال ہی میں تعلیم مکمل کر کے لندن سے واپس آئے تھے اور اب ان کے لیے مناسب لڑکی کے انتخاب کا مرحلہ درپیش تھا۔ بڑے صفی اللہ کی شادی کو البتہ کئی سال ہو گئے تھے اور ان کے تین بچے تھے۔ دو بیٹے حبیب اللہ اور محب اللہ اور اکلوتی سب سے چھوٹی بیٹی حانو۔ جوزفین کو اصل میں ان تینوں بچوں ہی کی تعلیم و تربیت کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ نواب صاحب کی اکلوتی صاحب زادی کا نام عالیہ تھا۔ عالیہ کا رشتہ ندرت جہاں کے بیٹے اختر سے طے تھا۔

ندرت جہاں جوانی میں بیوہ ہونے کے بعد اپنے بچوں اختر اور عشرت جہاں کے ساتھ حویلی واپس آگئی تھیں اور نواب صاحب کے بچوں کے ساتھ بلاتفریق ان کے بچوں کی بھی پرورش ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ نواب صاحب نے اختر کو اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن بھی بھجوایا تھا۔ اختر اور عالیہ کی شادی اس کے واپس آنے کے بعد انجام پاجانی تھی۔ جوزفین نے کوشش کی کہ یہ ساری معلومات اپنے ذہن میں محفوظ کرلے۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور ان کے بہت زیادہ رشتے دار بھی نہیں تھے اس لیے اسے رشتوں کے اس گورکھ دھندے کو سمجھنے میں کچھ مشکل پیش آرہی تھی۔

ناشتے سے فراغت کے بعد اکا بیگم نے اسے مطالعے کے کمرے میں پہنچا دیا۔ اسے معلوم ہوا کہ یہ مطالعہ گاہ صرف بچوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ یہاں بچوں کی دلچسپی اور ضرورت کے مطابق سب کچھ موجود تھا۔ تینوں بچوں سے وہیں اس کی ملاقات ہوئی۔ تینوں خوش شکل اور مودب بچے تھے۔ اکا بیگم نے بچوں سے اس کا تعارف کروایا اور خود باہر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد اس نے بچوں سے سوال جواب کا سلسلہ شروع کر دیا تاکہ جان سکے کہ سابقہ ٹیچر نے انہیں کیا پڑھایا ہے اور وہ کتنا جانتے ہیں۔ اپنے سوال جواب کے نتیجے میں اسے اندازہ ہوگیا کہ بچے ذہین اور پڑھنے لکھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ تینوں بچوں میں اسے پانچ سالہ محب اللہ سب سے زیادہ ذہین محسوس ہوا تھا۔ سب سے زیادہ اسی نے جوزفین کے سوالوں کے جواب دیے تھے۔ اسی نے جوزفین کو اپنے روزانہ کے نظام الاوقات سے آگاہ کرتے ہوئے سابقہ ٹیچر کا تیار کردہ شیڈول بھی دکھایا تھا۔ اس ابتدائی گفتگو کے بعد جوزفین نے طے کرلیا کہ اسے کس حساب سے بچوں کو لے کر چلنا ہے۔ ابھی بچوں کو اسکول میں داخل نہیں کروایا گیا تھا چنانچہ وہ سارا وقت گھر پر ہی گزارتے تھے اور اسی حساب سے جوزفین کو بھی تقریباً پورا دن ان کے ساتھ گزارنا تھا۔ بچوں کے کام کاج کے لیے ملازمہ مختص تھی اور جوزفین کو ان کا کوئی ذاتی کام انجام نہیں دینا تھا، وہ ان کے لیے صرف اتالیق جیسی ذمے داریاں انجام دیتی۔ اتنے ٹھاٹ باٹ کے ساتھ یہ فرض انجام دینا اسے خوش گوار لگ رہا تھا اور اس نے دل ہی دل

میں بہت تیزی سے اپنا لائحہ عمل بھی طے کرلیا تھا۔اس لائحہ عمل پر عمل پیرا ہونے کے لیے سب سے پہلے اس نے بچوں کی انگریزی کی کتابیں نکلوائیں تاکہ ان کی انگریزی پڑھنے اور لکھنے کی استعداد کو جانچ سکے۔

سب سے پہلے بڑے حبیب اللہ نے اس کے اشارے پر پڑھنا شروع کیا۔وہ کافی اچھا پڑھ رہا تھا اور بہت کم جگہ اٹکا تھا۔جوزفین نے اسے اس کی کارکردگی پر سراہا اور محب اللہ کو کتاب کھولنے کا حکم دیا۔اس کے اندازے کے مطابق محب اللہ نے اپنی ذہانت کو ثابت کرنا شروع کردیا اور کسی بھی جگہ اٹکے بغیر بہت روانی سے پڑھتا چلا گیا۔جوزفین نے اسے دل کھول کر شاباش دی۔اس مقصد کے لیے وہ انگریزی زبان کا استعمال کررہی تھی اور بچوں کے چہروں کے تاثرات پر نظر جمائے جانچتی جارہی تھی کہ وہ انگریزی کی کتنی شدبد رکھتے ہیں۔پورے انہماک سے یہ کام کرتے ہوئے اسے علم نہیں ہوسکا تھا کہ کوئی مطالعہ گاہ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا ہے اور اسے بولتے ہوئے بغور دیکھا جارہا ہے۔آنے والی انہی کی طرح دو کم عمر لڑکیاں تھیں جن کے قیمتی ملبوسات اور نازک سے قیمتی زیورات ان کی حویلی میں حیثیت کا اعلان کررہے تھے۔

بولتے بولتے جوزفین کی نظر ان لڑکیوں پر پڑی تو وہ چونک گئی۔دونوں میں سے ایک لڑکی بہت خوب صورت تھی اور اس کے نقوش میں اسے نواب زادہ اسد اللہ کی شباہت محسوس ہوئی تھی۔دوسری لڑکی اس کے مقابلے میں خاصی کم رو تھی۔خصوصاً اس کی گہری سانولی رنگت نے اس کی شخصیت کو بہت ہی زیادہ دبا دیا تھا۔

''ہم نواب زادی عالیہ ہیں اور یہ ہماری پھوپی زاد بہن عشرت جہاں ہیں۔'' اسد اللہ سے مشابہ خوش رو لڑکی نے اسے اپنی طرف متوجہ پاکر تعارف کا فریضہ انجام دیا۔

''نائس ٹو میٹ یو۔'' جوزفین نے کھڑے ہوتے ہوئے فوراً ہی کہا لیکن وہ یہ نہیں طے کرپائی تھی کہ اسے ان نواب زادیوں سے مصافحہ کرنا چاہیے یا نہیں۔عالیہ نے خود ہی ہاتھ آگے بڑھا کر اسے اس کشمکش سے نکال لیا۔عشرت جہاں نے بھی عالیہ کی تقلید میں اس سے مصافحہ کیا لیکن اس کے انداز میں بے دلی نمایاں تھی۔

''تشریف رکھیے، ہم آپ کا زیادہ وقت نہیں لیں گے۔'' مصافحے کی رسم ادا کرنے کے بعد عالیہ نے جوزفین سے کہا اور خود بھی عشرت کے ہمراہ اس کے مقابل نشست سنبھال لی۔

''آپ کا وقت بچانے کے لیے ہم بنا تمہید اپنی یہاں آمد کا مقصد بتادیتے ہیں۔'' بیٹھنے کے ساتھ ہی عالیہ نے فوراً بولنا شروع کردیا۔''اصل میں ہم دونوں کی خواہش ہے کہ بچوں کے ساتھ ساتھ آپ کچھ وقت ہمیں بھی دیں اور ہمیں انگریزی سے روشناس کروائیں۔ہم اردو، ہندی اور فارسی سے مناسب واقفیت رکھتے ہیں لیکن انگریزی سے بالکل نابلد ہیں اور آپ کی مدد سے اپنی اس خامی کو بھی دور کرنا چاہتے ہیں۔'' اس نے بہت سجاؤ سے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

''مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ میں خوشی محسوس کروں گی کہ آپ کے کسی کام آسکی لیکن اس سے پہلے مجھے نواب صاحب کی اجازت لینی ہوگی۔'' جوزفین نے بہت محتاط انداز میں اسے جواب دیا۔اس کی معلومات کے مطابق یہ نواب لوگ بڑے نازک مزاج ہوتے تھے اور اپنی مرضی اور منشا کے مطابق کوئی بات سننا یا عمل کرنا انہیں ناگوار گزرسکتا تھا۔

''اس طرف سے آپ بے فکر رہیں۔ہم نے اسد اللہ بھائی جان کے مشورے پر ہی آپ سے یہ فرمائش کی ہے اور ابا جان سے اجازت دلوانے کا فریضہ وہ خود انجام دے لیں گے۔'' عالیہ نے اسے تسلی دی۔اب تک وہی جوزفین سے ساری گفتگو کررہی تھی اور عشرت بالکل خاموش تھی۔اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اپنی ذاتی دلچسپی کے بجائے صرف عالیہ کا ساتھ دینے کے لیے چلی آئی ہے۔

''اگر ایسا ہے تو میں بھی تیار ہوں۔'' جوزفین نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔اس کے بعد ان کے درمیان اوقات کار کے سلسلے میں بات چیت ہونے لگی۔طے پایا کہ جوزفین رات کے کھانے کے بعد انہیں وقت دے گی۔بچے رات کا کھانا کھا کر جلدی سوجانے کے عادی تھے۔اس لیے اس وقت جوزفین کو فرصت ہوتی۔معاملات طے کرنے کے بعد وہ دونوں وہاں سے رخصت ہوگئیں جبکہ جوزفین دوبارہ بچوں کی طرف متوجہ ہوگئی۔بارہ بجے تک کا وقت اس نے مطالعہ گاہ میں بچوں کے ہمراہ گزارا۔اس کے بعد ملازمہ انہیں اپنے ساتھ لے گئی۔اب وہ دوپہر کا کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرتے اور سہ پہر میں جا کر جوزفین کی دوبارہ ان سے ملاقات ہوتی۔اس عرصے میں وہ خود بھی کھانا کھا کر آرام کرسکتی تھی۔پہلے اس نے نواب زادیوں کے پڑھنے کے لیے یہی وقت تجویز کیا تھا لیکن وہ ان اوقات میں آرام کرنے کی عادی تھیں اس لیے راضی نہ ہوئیں۔خود جوزفین

کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کی زندگی کے معمولات اتنے سخت رہے تھے کہ وہ قیلولے جیسی عیاشی بھی کرہی نہیں سکی تھی۔ اب بھی اس نے یہی سوچا تھا کہ ملنے والے اس وقفے میں نواب صاحب کی لائبریری سے مستفید ہونے کی کوشش کرے گی اس کے لیے اسے ان کی اجازت درکار تھی۔ بچوں کے ملازمہ کے ساتھ جانے کے بعد اس نے بھی ان کی مطالعہ گاہ سے نکل کر اپنے کمرے میں جانے کا قصد کیا اور باہر نکلی۔ راہداری کے وسط میں بالکل اچانک ہی اس کا نواب زادہ اسد اللہ سے سامنا ہو گیا۔ وہ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔ جوزفین سے سامنا ہونے پر وہ ٹھٹک گیا۔ وہ اسٹیشن سے جس لڑکی کو اپنے ساتھ لے کر آیا تھا، اس کا تو روپ ہی بدل گیا تھا۔ کرتہ پاجامے میں ملبوس، سر سے دوپٹا اوڑھے وہ دل میں اتر جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔

"آداب۔" جوزفین نے اسے سامنے پا کر حویلی کی روایت کے مطابق کہا۔

"تسلیمات۔ کیسی ہیں آپ مس جوزفین۔ یہاں آپ کو کوئی پرابلم تو نہیں ہے؟" نواب زادہ اسد اللہ نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

"آئی ایم فائن اینڈ آئی ہوپ کہ میں بہت جلد یہاں کے ماحول میں ایڈجسٹ کر جاؤں گی۔" جوزفین نے بھی مسکراہٹ کے ساتھ اسے جواب دیا۔

"گڈ۔ اگر آپ کو کوئی بھی پرابلم ہو تو ہمیں ضرور بتایئے گا۔"

"شیور۔" جوزفین نے کہا اور اجازت طلب نظروں سے نواب زادہ اسد اللہ کی طرف دیکھا۔ اس نے یہاں کے ماحول کو جس حد تک سمجھا تھا، اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں مرد وزن میں بنا رشتے کے باہمی روابط کا رواج نہیں ہے اور اگر کسی نے اسے نواب زادہ اسد اللہ سے گفتگو کرتے دیکھا تو اس بات کو پسند نہیں کرے گا۔ اسد اللہ نے اس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ لیا اور ایک طرف ہوتے ہوئے اسے آگے بڑھنے کا راستہ دیا۔

"تھینک یو۔" جوزفین نے قدم آگے بڑھائے۔

"آپ پر یہ لباس بہت سج رہا ہے مس جوزفین۔"

کئی سال مغرب میں گزارنے والے نواب زادہ اسد اللہ پر یقیناً وہاں کی تہذیب کا کچھ نہ کچھ اثر پڑا تھا چنانچہ وہ اپنی زبان پر قابو نہیں رکھ سکا اور اپنی پسندیدگی کا اظہار بہ زبانِ انگریزی کر ڈالا۔ چند قدم آگے بڑھ جانے والی جوزفین نے اپنی پشت پر سے یہ تعریفی جملہ سنا۔ اب ٹھٹک کر رک جانے کی باری اس کی تھی۔ اپنی جگہ کھڑے کھڑے اس نے گردن کو ذرا سا موڑ کر نواب زادہ اسد اللہ کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی بات کہہ کر وہاں رکا نہیں تھا اور شانِ بے نیازی سے چلتا ہوا راہداری میں جوزفین سے مخالف سمت میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

کمو کا جنازہ اٹھ چکا تھا اور آخری رسومات کی ادائیگی کے بعد اسے اس کی ابدی آرام گاہ تک پہنچا دیا گیا تھا۔ دنیا کے دستور کے مطابق جنازہ اٹھنے کے بعد غم کی وہ فضا قائم نہیں رہی تھی جو میت کی موجودگی میں تھی۔ یہ اللہ کا بنایا عجیب نظام ہے کہ جب تک مرنے والے کی لاش رکھی رہے، لواحقین بری طرح تڑپتے رہتے ہیں لیکن میت کے رخصت ہو جانے کے بعد بتدریج صبر آنا شروع ہو جاتا ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ غم کے بادل چھٹتے چلے جاتے ہیں۔

اڈے پر بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی۔ کمو کے ساتھیوں کا کرلانا اور سسکنا کم ہو گیا تھا اور اب غم و رنج پر انتقام کا جذبہ غالب آنا شروع ہو گیا تھا۔ رمن کے تعلقات وسیع تھے اور بمبئی کا تقریباً ہر دادا اس کی عزت کرتا تھا۔ اس نے فیکے کی تلاش میں اپنے ہرکارے دوڑائے تو اسے ہر طرف سے تعاون کی یقین دہانی کروائی گئی۔ اس ساری بھاگ دوڑ کا ہی نتیجہ تھا کہ شام ڈھلنے سے پہلے انہوں نے فیکے کا سراغ لگا لیا۔ ماما کے اڈے سے انہیں ایک ایسا آدمی مل گیا جس نے انکشاف کیا کہ فیکا وہاں آیا تھا اور اڈے کے دو آدمیوں سے علیحدگی میں ملاقات کی تھی۔ واردات کے وقت ان کے اڈے سے غیاب کے بارے میں بھی پتا چل گیا پھر کیا تھا جو انہیں ان دونوں پر ہاتھ ڈالنے سے روکتا۔ وجے سمیت وہ ایک جتھے کی صورت میں وہاں پہنچ گئے۔ اڈے کے دادا کا نام تو جانے کیا تھا بس وہ ماما کہلاتا تھا اور سب اسے ماما کہہ کر ہی مخاطب کرتے تھے۔ ماما نے ان لوگوں کا کشادہ دلی سے استقبال کیا۔ جو لوگ اس وقت اس کے اڈے پر پہنچے تھے، ان کی نمائندگی رامو کر رہا تھا۔

"ابھی اپن جازتی بات نہیں کرنے کا ہے ماما۔ ابھی اپن کو وہ دونوں آدمی چاہیے جو اپنا مجرم ہے۔" ماما نے آنے والوں کی آؤ بھگت کرنی چاہی تو رامو نے گرم لہجے میں اس سے کہا۔

"اپن تمہارے من کا حال جانتا ہے۔ اپن کو شرم بھی آرہا ہے کہ اپنے اڈے کا آدمی لوگ ایسی حرکت کیا۔ اصل

میں وہ سالا ٹپوری لوگ ابھی تھوڑے دن پہلے ہی ادھر آیا تھا اس لیے ایسا غلطی کر بیٹھا۔ سالا لالچ میں آگیا تھا۔ اگر اپن کے اڈے کا کوئی پرانا آدمی ہوتا تو کبھی ہڈی دیکھ کر ایسے ادھر ادھر منہ نہیں مارتا۔ ادھر سب جانتا ہے کہ ماما کی مرجی (مرضی) کے بغیر سانس بھی نہیں لینے کا ہے۔'' وہ اپنے اڈے کے آدمیوں کی حرکت پر شرمندہ، وضاحتیں پیش کررہا تھا۔

''ابھی اپن نے سالوں کا چمڑی ادھیڑ ڈالا ہے۔ ابھی کسی میں ہمت نہیں ہے کہ دم مار سکے۔ تم جو بھی پوچھے گا کمینہ لوگ ایک دم فرفر بولے گا۔'' اس نے انہیں اطلاع دی اور پھر اپنے چیلوں میں سے ایک کو حکم دیا کہ ہریا اور سلو کو ان کے سامنے پیش کیا جائے۔ تھوڑی ہی دیر میں دو آدمیوں کو اس حال میں ان کے سامنے پیش کیا گیا کہ ان سے ڈھنگ سے چلا بھی نہیں جارہا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر وجے اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ مار کھا کھا کر ان دونوں کے چہرے بگڑ گئے تھے لیکن فیکے کے ساتھ کمو کے قتل میں شامل ان دو افراد کو پہچاننے میں اس کو بالکل بھی دیر نہیں لگی تھی۔

''یہی دونوں ہیں استاد۔ اپن ان کا خون پی جائے گا۔'' پہلے وہ رامو کو مخاطب کرکے زور سے بولا اور پھر بگڑے تیوروں کے ساتھ ان کی طرف لپکا۔ اس کے ہاتھوں میں کھلا چاقو تھا اور صاف لگتا تھا کہ وہ جوشِ انتقام میں ان کا کام تمام کر ڈالے گا۔ اس موقع پر رامو نے پھرتی سے کام لیا اور اس کا بازو پکڑ کر زور سے جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔

''ذرا دھیرج رکھ۔ اپنے کو ان سے بہت کچھ معلوم کرنے کا ہے۔'' وجے کو اس کی بات سمجھ آگئی اور وہ پیچھے ہٹ گیا لیکن ان دونوں کو مسلسل خونخوار نظروں سے گھورتا رہا۔ وہ دونوں جو وجے کے خود پر لپکنے سے خاصے دہشت زدہ ہوگئے تھے یکدم ہی رامو کے قدموں میں گر گئے۔

''اپنے کو شما کردو استاد۔ اپن لالچ میں آگیا تھا۔ اپنے کو پتا نہیں تھا کہ یہ ربن دادا کے اڈے کا لفڑا ہے۔ فیکے کمینے نے اپن کو ایسا کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس نے صرف اتنا بولا تھا کہ مجو دادا کے لیے ایک لونڈیا اٹھانی ہے۔ اس بیچ کوئی قتل شتل ہوجائے گا، اس کا اپن کو ذرا اندازہ نہیں تھا۔'' وہ دونوں روتے دھوتے اپنی صفائی پیش کررہے تھے۔

''اٹھ کر کھڑے ہوجاؤ۔'' رامو نے دونوں کو ایک ایک ٹھوکر رسید کی اور قہربار لہجے میں حکم دیا۔ وہ دونوں لرزتے کانپتے اس حال میں کھڑے ہوگئے کہ ان کے دونوں ہاتھ آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ وہ اپنے انجام سے بے حد خوف زدہ نظر آرہے تھے۔ رامو نے اپنا لہجہ نرم کیے بغیر ترشی سے ان کے ساتھ سوال جواب کا سلسلہ شروع کردیا۔ اس تفتیش کے نتیجے میں جو معلومات سامنے آئیں، ان کے مطابق فیکے نے ایک معقول رقم کے عوض انہیں اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے راضی کیا تھا۔ یہ رقم مجو دادا کے سامنے اس کے حکم پر انہیں دی گئی تھی۔ ساتھ ہی مجو نے انہیں یہ لالچ بھی دیا تھا کہ وہ اس کام کے بعد انہیں اپنے ساتھ شامل کرلے گا۔ فیکے کے ذریعے انہیں مجو دادا کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان کے مطابق مجو دادا سے وابستہ افراد عیش کی زندگی گزارتے تھے اور دادا انہیں کھل کھیلنے کی اجازت دیتا تھا۔ وہ دونوں گلی کے عام سے غنڈے تھے جو ماما کے اڈے سے بھی یہی امید لے کر جڑے تھے کہ ماما کی چھتری کے نیچے پناہ لے کر خوب مال بنائیں گے اور لوگوں کو اپنے رعب داب میں رکھیں گے لیکن ان کی یہ ساری امیدیں پوری نہ ہوسکیں اور جلد انہوں نے جان لیا کہ اڈے کے لوگ ایسے آزاد نہیں ہوتے اور انہیں اپنے ہر عمل کے لیے جواب دہ ہونا پڑتا ہے۔

اس صورتِ حال نے انہیں جلد ہی بیزار کردیا اور وہ رسیاں تڑانے کا سوچنے لگے۔ ایسے میں فیکے سے ہونے والی ملاقات اور اس کی دی ترغیبات نے انہیں مجو دادا کا ساتھ دینے پر اکسایا۔ وہ اگر اڈے کی دنیا کے پرانے آدمی ہوتے تو انہیں خبر ہوتی کہ مجو دادا کی حیثیت اب ایک پٹے ہوئے گھوڑے جیسی ہے اور یہ گھوڑا اس حد تک ناکارہ ہوچکا ہے کہ اب کسی ریس میں حصہ نہیں لے سکتا۔ آنکھوں میں مال و دولت کے خواب سجائے وہ فیکے کے ساتھ کام کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ہوش تو انہیں تب آیا جب بات بڑھ کر قتل تک پہنچ گئی اور انہیں افراتفری میں راہِ فرار اختیار کرنی پڑی۔ وہ دونوں فیکے کے ساتھ ہی واپس بمبئی لوٹے اور اس کے مشورے پر ہی واپس ماما کے اڈے پر پہنچ گئے۔ فیکے کا خیال تھا کہ وہ دونوں بالکل گمنام آدمی ہیں اس لیے کوئی انہیں تلاش کرکے ان تک نہیں پہنچ سکے گا اس لیے بہتر ہے کہ وہ فی الحال اس کے ساتھ رہنے کے بجائے ماما کے اڈے پر ہی رہیں۔ خود اس نے بھی روپوشی اختیار کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ فی الحال وہ خود کو اس مکان تک محدود کرلے گا جہاں ہریا اور سلو نے مجو سے ملاقات کی تھی۔ مجو خود بھی عرصے سے اپنے کچھ دشمنوں کی وجہ سے وہیں روپوش تھا اور اطمینان سے وقت گزار رہا تھا۔ وہاں ہر طرح کی سہولت میسر تھی اور باہر نکلنے کی آزادی کے

سو بڑے آرام سے وقت گزارا جاسکتا تھا۔ ہریا اور سلو نے فیکے سے درخواست بھی کی کہ انہیں بھی اسی جگہ رکھ لیا جائے لیکن اس نے دادا کی اجازت نہ ہونے کا بہانہ بنا کر اور انہیں مختلف تسلیاں دے کر واپس ماما کے اڈے پر بھجوا دیا جہاں وہ فیکے کی تسلیوں کے برخلاف بہت جلد گرفت میں آچکے تھے اور اپنی جان جانے کے خوف میں مبتلا بری طرح لرزاں تھے۔ رامو نے ان سے اس جگہ کا پتا معلوم کیا جہاں ان کی مجو دادا سے ملاقات ہوئی تھی اور جہاں ان کے بقول اب بھی مجو دادا اور فیکا روپوش تھے۔ ان دونوں نے شرافت سے پتا بھی بتا دیا اور اپنے مستقبل کے فیصلے کے لیے رحم طلب نظروں سے رامو کو دیکھنے لگے۔

''ابھی ان...... کو اپنے کنے ہی حفاظت سے رکھو ماما...... ربن دادا خود تم کو بولے گا کہ ان کا کیا کرنا ہے۔''

رامو نے ان دونوں کی التجائیہ نظروں کو نظرانداز کرتے ہوئے ماما سے کہا اور اپنے آدمیوں کے ساتھ فوری طور پر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ وہ لوگ واپس اڈے پہنچے تو خاصے پُرجوش تھے۔ انہوں نے فوری طور پر طے کر لیا کہ بلاتاخیر ہریا اور سلو کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچا جائے اور مجو اور فیکے کو ان کے بل سے باہر نکال کر انجام تک پہنچایا جائے۔ ربن نے ان کے اس پروگرام سے تعرض نہیں کیا اور رامو کو اجازت دے دی کہ وہ دس بارہ افراد کو منتخب کر کے اپنے ساتھ اس مہم پر لے جاسکتا ہے۔ شام تو ہو ہی چکی تھی، انہوں نے کارروائی کے لیے رات کے اندھیرے کا انتظار کر لینا مناسب سمجھا۔ اس دوران وہ کھانے پینے کے علاوہ اپنے دیگر کام نمٹاتے رہے اور ہر ایک نے ہی اپنے اپنے طور پر مناسب تیاری کر لی۔ انہیں جہاں پہنچنا تھا، وہ جگہ اڈے سے خاصی دور تھی اس لیے سواریوں کا پہلے ہی انتظام کر لیا گیا تھا۔ یہ دو عدد تانگے تھے جن میں چست اور توانا گھوڑے جتے ہوئے تھے اور ان کو چلانے والے کوچوان بھی اتنے ماہر تھے کہ ان کے اشارے پر گھوڑے، تانگے کو ہوا میں اڑانے لگتے تھے۔ ان برق رفتار تانگوں پر سوار رامو اور اس کے ساتھی اپنی مطلوبہ منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ رامو اس مہم کی سربراہی کر رہا تھا لیکن اس کا ذہن ربن کے رویے کی وجہ سے ذرا الجھا ہوا تھا۔ ربن نے اس معاملے میں ذرا بھی گرم جوشی نہیں دکھائی تھی اور سیدھے سبھاؤ ان لوگوں کو اجازت دے دی تھی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس اجازت کے ساتھ اس کے مشورے اور ہدایات تک شامل نہیں تھیں اور یہ بات رامو کو کھٹک رہی تھی لیکن اب اس کے پاس سوچنے کا وقت بھی نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے مطلوبہ مقام کے کافی قریب پہنچ چکے تھے۔ رامو نے تانگوں کو ذرا دور ہی روک لینے کا حکم دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تانگے مکان کے دروازے تک لے جائے اور آوازوں سے مکینوں کے ساتھ ساتھ اہل محلہ بھی نیند سے جاگ جائیں۔ اس کی ہدایت پر وہ سب بلی کی چال چلتے خاموشی سے مکان تک پہنچے۔ مکان کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ انہوں نے اس پر زور آزمائی کی کوئی کوشش نہیں کی اور رامو کی ہدایت کے مطابق دیواریں پھلانگ کر اندر داخل ہو گئے۔ رامو نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ اندر قدم رکھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ مکان میں غیر معمولی سناٹا ہے۔ شاید وہاں موجود افراد روشنیاں بجھائے گہری نیند سو رہے تھے۔ انہوں نے دبے قدموں مکان میں پھیل کر اس کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ ذرا دیر میں ان پر یہ انکشاف ہوا کہ مکان میں کوئی ذی روح موجود نہیں ہے۔

''لگتا ہے ہجڑوں کا خاندان ڈر کے مارے پہلے ہی بھاگ نکلا ہے۔'' رامو ایک جگہ اکٹھے ہو جانے والے اپنے آدمیوں سے مخاطب ہو کر بولا اور واپسی کا فیصلہ سنا دیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ ربن نے اسی وجہ سے اس مہم میں دلچسپی نہیں لی تھی لیکن انہیں اس خیال سے اجازت دے دی تھی کہ اس طرح ان کے بھڑکے ہوئے جذبات کو سرد کرنے کا موقع مل جائے گا۔ مایوسی اور بددلی کی کیفیت میں وہ مکان کے بیرونی راستے کی طرف بڑھے۔ مکان خالی تھا تو انہیں دیواریں پھاندنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ آرام سے دروازہ کھول کر بھی باہر جاسکتے تھے۔ سب سے آگے موجود وجے نے دروازے کی کنڈی کھولنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ جس دروازے کو اندر سے بند خیال کر کے انہوں نے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا، اس کی کنڈی اندر سے بھی کھلی ہوئی تھی۔ رامو کو یہ بات بتانے کے لیے اس نے اپنا منہ کھولا ہی تھا کہ دروازے کا پٹ پوری قوت سے آکر اس کے منہ سے ٹکرایا اور کچھ لوگ بپھرے سانڈوں کی طرح دندناتے ہوئے اندر گھستے چلے آئے۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور محبت کی فریب کاریوں کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

وہ ناشتے کی میز پر سر جھکائے جانے کن خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ جب اس نے اس کے سامنے توس اور کافی کا مگ رکھا، تب بھی اس نے اپنا سر اوپر نہ اٹھایا اور ادھ جلے توس پر جام لگانے لگا جبکہ وہ سمجھ رہی تھی کہ اسے یہ توس پسند نہیں آئے گا اور اسی کو بہانہ بنا کر وہ جلی کٹی سنانے لگے گا۔

اس نے منہ پھیر کر کھڑکی کی طرف کرلیا اور باہر دیکھنے لگی۔ رات بھر ہونے والی بارش اب تھم چکی تھی لیکن وقفے وقفے سے پھوار برسنا شروع ہوجاتی۔ گہرے بادل چھائے ہوئے



معمولی عورت

تنویر ریاض

یہ لفظوں کا الٹ پھیر ہو یا نقاطوں کی ذرا سی تبدیلی... مفہوم کیا سے کیا ہوجاتے ہیں۔ جیسے محرم سے مجرم... وہ بھی جب تک اپنایت کے دھوکے میں رہی انتہائی معمولی حیثیت سے ایک ان دیکھی آگ میں جلتی رہی مگر جیسے ہی اس نے اپنے پن کا لبادہ اتار پھینکا اور غیریت کا چولا پہنا تو غیر معمولی عورت بن گئی۔ گویا ثابت ہوا کہ احساسات کا زیروبم انسان کو ناقابلِ یقین مراحل سے گزارنے کی قدرت رکھتا ہے۔

پیر کی جوتی کا سر پر ناچنے کا عجیب وغریب منظر

تھے اور تاریکی نے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ پڑوس میں رہنے والے مسٹر رابرٹ کے گھر میں روشنی ہو رہی تھی لیکن اس نے یہ بات جیک کو نہیں بتائی کیونکہ ہمیشہ کی طرح وہ یہی کہتا۔

''تمہیں دن میں بھی بتیاں جلانے کا شوق ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ بجلی کا بل کتنا بڑھ گیا ہے۔''

بل پر اسے یاد آیا اور وہ بولی۔ ''جانے سے پہلے چیک دے جانا۔ گیس کا بل جمع کروانا ہے۔''

اس نے کپ پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ ''کتنی رقم کا ہے؟''

''ایک سو چھیاسٹھ ڈالرز......'' وہ اطمینان سے بولی۔ پھر وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ دو مہینے کا بل ہے۔''

''پھر بھی بہت زیادہ ہے۔ اگر یہی حال رہا تو سردیوں میں کتنا بل آئے گا۔''

وہ کہنے ہی والی تھی کہ اسے پائپ منہ سے لگا کر گیس حلق میں انڈیلنے کا کوئی شوق نہیں ہے لیکن کچھ عرصہ ہوا وہ پلٹ کر جواب دینے کی عادت ترک کر چکی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ میں چیک لکھ کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور بولا۔ ''رات کو مجھے دیر ہو جائے گی۔ دفتر میں ایک پارٹی ہے۔''

اس نے دروازہ بند ہونے اور گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی پھر ٹھنڈی سانس لے کر برتن دھونے میں مصروف ہو گئی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ کرسی میں دھنس گئی اور اپنی زندگی کے بارے میں سوچنے لگی جو دن بہ دن مشکل ہوتی جا رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے کام اسے پہاڑ کے مانند لگنے لگے تھے۔ صبح اٹھنا اس کے لیے اونچائی پر چڑھنے کے مترادف تھا کیونکہ اسے ایک بے رنگ اور خالی دن کا سامنا کرنا ہوتا تھا اور وہ اپنے آپ کو ایسی معمولی عورت سمجھنے لگی تھی جس کی زندگی کا کوئی مصرف نہ ہو۔

جیک سے اس کی ملاقات کافی تاخیر سے ہوئی تھی، اس نے کچھ عرصہ قبل ہی اپنی بیوی کو طلاق دی تھی جبکہ وہ اس وقت بھی اپنی ماں کے ساتھ رہ رہی تھی۔ وہ چالیس برس کی ہو چکی تھی اور تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اس کی ملاقات کسی ایسے شخص سے ہو جائے گی جس سے وہ محبت کرنے لگے گی لیکن اسی مہینے اس کی ماں چل بسی۔ جیک نے اس موقع پر اس کا بہت ساتھ دیا۔ ماں کے مرنے کے بعد وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ چنانچہ اس نے اس خلا کو پُر کرنے کے لیے جیک سے شادی کر لی۔ ان دنوں وہ مقامی لائبریری میں جاب کر رہی تھی لیکن جیک کے کہنے پر اس نے وہ ملازمت چھوڑ دی۔ جیک حساب کتاب کا ماہر تھا۔ اس نے کہا۔ ''تمہاری تنخواہ کی وجہ سے میرا ٹیکس بڑھ جائے گا اور اس طرح تم اپنی تنخواہ کا صرف ایک تہائی حصہ ہی وصول کر پاؤ گی۔ اس سے تو اچھا ہے کہ تم گھر پر ہی رہو۔ یہی ہم دونوں کے لیے بہتر رہے گا۔''

پہلے پہل تو اس نے اس خیال کی مزاحمت کی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ کام کے بغیر اس کی زندگی میں خالی پن آ جائے گا لیکن پھر وہ اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گئی اور سوچنے لگی کہ جیک کو اس کا کتنا خیال ہے۔ شادی کے بعد ابتدائی چند مہینوں میں وہ خاصی مصروف رہی۔ پہلے وہ اپنی ماں کے مکان کو ٹھیک کرنے میں لگی رہی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دفتر کے ساتھیوں سے ملنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ جو اس کی خوش قسمتی پر مبارکباد دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے لیکن کچھ ہی عرصے بعد اس نے محسوس کیا کہ اب ان کے پاس باتیں کرنے کے لیے کوئی موضوع نہیں رہا۔

وہ ان سے کیا بات کر سکتی تھی۔ یہی کہ ہر ہفتے سپر مارکیٹ کا چکر لگانے کے بعد اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے یا اس کی پڑوسن کا کینسر کتنا پھیل چکا ہے یا پھر... جیک کے بارے میں بات جو پہلے ہی اپنے دوستوں کے ساتھ ہر ویک اینڈ پر شکار کھیلنے چلا جاتا تھا۔

جیک سے اس نے جو توقعات وابستہ کی تھیں، وہ پوری نہ ہوئیں۔ وہ بھی عام مردوں کی طرح خودغرض، سطحی اور لالچی ثابت ہوا۔ اس میں کوئی ایسی خوبی نہ تھی جس پر وہ فخر کر سکتی۔ کام سے واپس آنے کے بعد وہ اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیتا۔ جسے اس نے آفس بنا رکھا تھا۔ اس دوران جیک کمپیوٹر سے کھیلتا رہتا اور وہ کبھی نہ جان سکی کہ گھر آنے کے بعد وہ اس مشین پر کیا کام کرتا ہے۔ کھانے کی میز پر بھی اس کی آنکھیں ٹیلی وژن پر جمی رہتیں اور اگر وہ کوئی بات کرنے کی کوشش کرتی تو اسے خاموش رہنے کے لیے کہہ دیتا تاکہ جیک اپنا پسندیدہ گیم شو یا کھیلوں کا پروگرام دیکھ سکے۔ رفتہ رفتہ اس کے بولنے کی عادت ختم ہوتی چلی گئی اور اس کی شامیں بھی دن کی طرح بے کیف گزرنے لگیں۔

شادی شدہ ہونے کے باوجود وہ ازدواجی طور پر تشنگی محسوس کرتی تھی۔ بیس سال کی عمر میں اس نے پہلی بار ایک لڑکے سے تعلق قائم کیا جو اس کی کمپنی میں کام کرتا تھا لیکن اس نے اسے ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اس کی ماں نے ہمیشہ یہی تاکید کی تھی کہ شادی سے پہلے ماں بننا کسی

لڑکی کے لیے کتنا نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ لیکن جیک سے شادی کرنے کے بعد اسے ایسی کوئی احتیاط کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جبکہ جیک خود بھی نو سال تک پہلی بیوی کے ساتھ ازدواجی زندگی گزار چکا تھا لیکن اس نے کبھی اس کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ یوں لگتا تھا کہ اس حوالے سے اس کا جوش وخروش سرد پڑ چکا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اسے بہت کم وقت دے پا رہا تھا۔

اس نے امید کے عالم میں ٹیلی فون کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی گھنٹی بجنے کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن اسے کون فون کرے گا۔ اس کی ماں مر چکی تھی اور دفتر کے پرانے ساتھیوں سے اس کا تعلق نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ خاندان میں صرف ایک خالہ ہی تھی جو تین ہزار میل دور ملک کے دوسرے سرے پر رہتی تھی۔

اسے اپنے حلق میں تھوڑی سے ترشی محسوس ہوئی اور اس کا جی متلانے لگا۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا بلکہ اس نے کئی مرتبہ اپنے حلق میں کڑواہٹ محسوس کی تھی۔ وہ ڈر گئی کہ کہیں اسے بھی اس کی پڑوسن مسز کلارے کی طرح کینسر تو نہیں ہوگیا۔ اس نے اسی وقت کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کا فیصلہ کرلیا لیکن وہ کسی ماہر ڈاکٹر کو نہیں جانتی تھی اور اس بارے میں مسز کلارے ہی اس کی راہ نمائی کرسکتی تھی۔ برتن دھونے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے مسز کلارے کو فون کیا لیکن آواز سن کر ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ اس بارے میں ان سے کوئی بات کرسکے۔ تاہم اس نے اتنا ضرور کہا۔

”اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتادو۔ کیا میں تمہارے لیے اچھا سا سوپ بنا کر لے آؤں؟“

”تم بہت پیاری لڑکی ہو۔“ مسز کلارے کی شفقت بھری نحیف آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”لیکن اس وقت میں کچھ بھی نہیں نگل سکتی۔“

مسز کلارے سے مزید کچھ کہنا بے کار تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے طور پر خود ہی کچھ کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاور لینے کے بعد اس نے لباس تبدیل کیا۔ معدہ میں تکلیف کی وجہ سے اس کے لیے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ اس نے ڈائریکٹری کے زرد صفحات کھولے اور مطلوبہ ڈاکٹر کا نمبر ملایا۔ اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اسے اسی دن کا اپائنٹمنٹ بھی مل گیا۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ کوئی ایسا ویسا ڈاکٹر ہے جس کی پریکٹس نہیں چلتی۔ بہرحال وہ مزید وقت ضائع نہیں کرسکتی تھی۔

اس نے ہلکا سا لنچ لیا اور مقررہ وقت پر ڈاکٹر کو دکھانے چل دی۔ اس کی کار سروس کے لیے گیراج گئی ہوئی تھی اس لیے اسے بس کے ذریعے سفر کرنا پڑا۔ ویٹنگ روم میں کچھ دوسرے مریض بھی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہی نرس نے اس کا نام پکارا۔ ڈاکٹر اس کی توقع کے خلاف خاصا کم عمر تھا اور پہلی نظر میں اسے دیکھ کر یقین کرنا مشکل تھا کہ وہ کوئی اسپیشلسٹ ہے۔ ڈاکٹر نے بیڈ پر لٹا کر اس کا اچھی طرح معائنہ کیا اور بولا۔ ”مجھے پریشانی والی کوئی بات نظر نہیں آرہی ممکن ہے یہ گیس کی تکلیف ہو۔“

”تمہیں یقین ہے کہ یہ سنجیدہ نوعیت کی بیماری نہیں ہے۔ مثلاً کینسر؟“

ڈاکٹر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”اگر میں کینسر کا اسپیشلسٹ ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرے پاس آنے والا ہر مریض کینسر کا ہی ہو۔“ پھر اس نے اپنے پیڈ پر کچھ لکھنا شروع کیا۔ ”کھانے سے پہلے دو گولیاں لینی ہیں، چند ہی دنوں میں تم فرق محسوس کرو گی۔“

اس نے قریبی میڈیکل اسٹور سے دوا خریدی اور گھر جانے کے لیے بس میں سوار ہوگئی۔ بس سے اترتے ہی تیز آندھی چلنے لگی اور اس کے فوراً بعد تیز بارش شروع ہوگئی۔ چند ہی لمحوں میں سارا منظر دھندلا گیا۔ وہ تیزی سے گھر کی طرف بھاگی، کمرے میں آکر اس نے اپنا بدن خشک کیا اور شیشی میں سے گولیاں نکال کر پانی سے نگل لیں۔ اسے اس دوا کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا لیکن شیشی میں رکھا پرچہ پڑھ کر اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ کوئی زیادہ سخت دوا نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ ڈاکٹر نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا اور محض تسلی دینے کے لیے یہ دوا لکھ دی تھی۔

اسی لمحے اسے زور کا چکر آیا اور معدے میں جلن شروع ہوگئی۔ اسے زور کی ابکائی آئی اور وہ تیزی سے باتھ روم کی طرف لپکی۔ اس کے حلق سے پیلا پیلا بلغم نکل رہا تھا۔ اس کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا اور کپکپی طاری ہوگئی۔ وہ نڈھال ہوکر وہیں باتھ ٹب کے کنارے بیٹھ گئی۔ یہ گیس کی تکلیف نہیں ہوسکتی۔ ڈاکٹر غلطی پر تھا اور اس کا مرض سمجھ نہیں پایا۔ اسے کمزوری سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ہمت کرکے اٹھی اور لیونگ روم میں چلی گئی۔ اس نے کاؤچ کے نزدیک والی لائٹ جلائی لیکن اس کی زرد روشنی کمرے کے نیم تاریک ماحول میں دب کر رہ گئی۔

ماں کے مرنے کے بعد وہ اس مکان کو جدید انداز میں تبدیل کرنا چاہتی تھی لیکن جیک نے اسے روک دیا

کیونکہ وہ مکان ابھی تک اس کے نام پر تھا۔ اس پر وہ خاصی مایوس ہوئی اور اس نے جیک کو سمجھانا چاہا۔ ''تم بھی تو اس کے وارث ہو۔''

''اگر ہمارے درمیان علیحدگی ہوگئی تو......'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''اتنا پیسا خرچ کرنے کے باوجود بھی میں تو سڑک پر آجاؤں گا۔''

''اس عمر میں تو علیحدگی کے بارے سوچا بھی نہیں جاسکتا۔'' وہ منمناتے ہوئے بولی۔

اس نے کندھے اچکائے اور دانت پیستے ہوئے بولا۔ ''طلاق کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔''

بہت جلد اسے اندازہ ہوگیا کہ پہلی بیوی کو طلاق دینے اور دوبارہ شادی کرنے کے باوجود جیک کی زندگی میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ کام کا بہانہ کرکے سارا وقت دوستوں میں گزار دیتا۔ شادی کے بعد وہ اسے ایک مرتبہ بھی باہر لے کر نہیں گیا تھا۔ بس ایک دو مرتبہ ہی وہ اس کے ساتھ قریبی چینی ریستوران میں گئی تھی۔

اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ تیز بارش ہورہی تھی اور اس کی وجہ سے اسٹریٹ لائٹس کی روشنی بھی ماند پڑ گئی تھی۔ اس لمحے اسے شدید تنہائی اور عدم تحفظ کا احساس ہوا۔ جس کا اسے پہلے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ماں باپ کے ساتھ رہتے ہوئے وہ کبھی کبھی بور ضرور ہوتی تھی لیکن ایسی نوبت کبھی نہیں آئی کہ اسے اپنے تنہا اور بے توقیر ہونے کا احساس ہوا ہو۔ پھر اس نے اپنے آپ کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ وہ ایسا کیوں سوچ رہی ہے۔ اب وہ ایک شادی شدہ عورت ہے، جیک کی وجہ سے اسے معاشرے میں یہ مقام حاصل ہوا تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا درد ٹھیک ہوچکا تھا۔ اس نے سوچا کہ کچھ کرنا چاہیے۔ اگلے روز اسے سپر مارکیٹ جانا تھا کیوں نہ پہلے اسٹور کو چیک کرلیا جائے۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے جانے لگی لیکن تیسری سیڑھی پر اسے رکنا پڑ گیا۔ راستے میں ایک ٹوکرا رکھا تھا۔ اس نے ٹوکرے کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے راستہ بنایا اور نیچے جاکر مختلف خانوں میں رکھی اشیا کا جائزہ لینے لگی۔ اچانک ہی اس کا پیر ایک چھوٹے سے ڈبے سے ٹکرایا۔ اس نے جھک کر وہ ڈبہ اٹھایا اور اس پر لکھی تحریر سے اس کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ ڈبے پر لکھا تھا۔

''خطرہ۔ چوہوں کو مارنے کے لیے زہریلی دوا۔ استعمال کرتے وقت دستانے پہنیں۔ استعمال کے بعد ہاتھوں کو صابن اور پانی سے اچھی طرح دھوئیں۔ بچوں اور پالتو جانوروں کی پہنچ سے دور رکھیں۔''

اس گھر میں چوہے نہیں تھے پھر یہ دوا کہاں سے آئی؟

وہ اس کے بارے میں جیک سے پوچھے گی۔ پھر اس نے وہ ڈبا ایک الگ جگہ پر رکھ دیا اور خود اوپر چلی آئی۔ سات بج چکے تھے جیک کہہ کر گیا تھا کہ وہ دیر سے گھر آئے گا۔ لیکن کھانے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ ویسے اسے کوئی خاص بھوک بھی نہیں تھی۔ ایک بار پھر اسے سینے پر جلن محسوس ہوئی۔ اس نے ایک گلاس پانی پیا جس سے درد میں کچھ کمی ہوگئی۔ اس نے وقت گزاری کے لیے ٹیلی ویژن آن کیا لیکن وہاں سے بھی ایک فضول سا گیم شو آرہا تھا۔

سات بج کر بیس منٹ ہوچکے تھے۔ اس بات کا بہت کم امکان رہ گیا تھا کہ جیک گھر آکر کھانا کھائے گا۔ وہ کچن میں جاکر اپنے لیے کھانا گرم کرنے لگی۔ سنک کے سامنے کھڑے ہوکر اس نے گلی کا جائزہ لیا۔ مسز کلارے کے مکان کی روشنیاں گل ہوچکی تھیں لیکن مسٹر رابرٹ کے کچن اور ڈائننگ روم میں روشنی ہورہی تھی۔ مسٹر رابرٹ گھر کے اندر ٹہل رہے تھے جبکہ مسز رابرٹ کچن میں مصروف تھیں۔ دونوں میاں بیوی جاب کرتے تھے۔ ان کی بیٹی ہاسٹل میں رہتی تھی جس سے ملنے کے لیے وہ سال میں دو مرتبہ جاتے تھے۔ وہ لوگ کافی عرصے سے وہاں رہ رہے تھے لیکن وہ کسی سے ملتے جلتے نہیں تھے۔

کھانا گرم کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر فارغ تھی۔ اس نے گھر کی ساری بتیاں جلادیں جس سے اسے تھوڑا سکون ملا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ جیک اسے فضول خرچی سمجھے گا لیکن وہ اس کی کار کی آواز سن کر فالتو بتیاں بجھادے گی۔

اگلے ہفتے کرسمس تھا۔ اس تہوار کے موقع پر لوگ اکٹھے ہوکر خوشیاں مناتے ہیں لیکن اس کی قسمت میں یہ خوشی بھی نہیں تھی۔ جیک اسے تنہا چھوڑ کر اس پارٹی میں چلا جاتا جو دفتر کے کسی ساتھی نے دوستوں کو جمع کرنے کے لیے کی ہوتی تھی۔ اس نے جب بھی ساتھ جانے کے لیے کہا تو جیک یہ کہہ کر ٹال دیا کرتا کہ وہ وہاں جاکر بور ہوجائے گی کیونکہ وہ اس کے دفتر کے کسی ساتھی کو نہیں جانتی۔ وہ کہتی۔ ''جب تک تم میرا تعارف نہیں کرواؤ گے، میں ان لوگوں کو کیسے جان سکتی ہوں؟''

جیک کے پاس اس کی کسی بات کا معقول جواب نہیں تھا لیکن وہ اپنی مردانگی کے زعم میں اسے خاطر میں نہ

لاتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ کیا اس نے محض اس لیے شادی کی تھی کہ وہ اس کے گھر کی دیکھ بھال کرتی رہے۔ ایک بار اس نے جیک کو بڑبڑاتے ہوئے سنا تھا وہ کہہ رہا تھا کہ بیوی کے مقابلے میں ہاؤس کیپر کی تنخواہ کم ہوتی ہے اور وہ تنگ بھی نہیں کرتی۔ اس کا جی چاہا کہ کہہ دے... واقعی اسے بیوی کی نہیں بلکہ خادمہ کی ضرورت تھی لیکن کوشش کے باوجود نہ کہہ سکی۔

اس نے گھبرا کر ایک بار پھر ٹی وی کھول دیا۔ اس وقت خبریں آرہی تھیں اور ان میں لیڈ نیوز یہ تھی کہ طوفان نے ریاست کے شمالی حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور اب وہ دوسرے علاقوں کی جانب بڑھ رہا ہے۔ لوگوں سے اپیل کی جارہی تھی کہ وہ بہت زیادہ محتاط رہیں اور وقتاً فوقتاً کیے جانے والے اعلانات غور سے سنیں۔ اس نے کھڑکی سے باہر کی جانب دیکھا، بارش مسلسل ہورہی تھی۔ یہ سلسلہ دو ہفتے قبل شروع ہوا تھا اور تقریباً بغیر کسی وقفے کے جاری تھا۔ وہ جانتی تھی کہ شہر کے بیچ سے بہنے والے دریا کی مسلسل نگرانی کی جارہی تھی۔ لیکن سیلاب کے متوقع خطرے کو دیکھتے ہوئے ان کا گھر بھی محفوظ نہیں تھا۔

اچانک ہی لائٹ چلی گئی۔ تیز ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے اور پورا گھر لرزتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں کھڑکی کی جانب لپکی۔ پورا علاقہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن اس اندھیرے میں بھی اسے سڑک کے کنارے لگے درختوں کی شاخیں ہلتی نظر آرہی تھیں۔ بارش میں مزید شدت آگئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بجلی آگئی اور اس کے ساتھ ہی ٹی وی بھی آن ہوگیا۔ اسکرین پر ان کے علاقے کا نقشہ دکھایا جارہا تھا جس میں سیلاب زدہ علاقوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اناؤنسر بتارہا تھا کہ دریا میں پانی کی سطح بلند ہونے سے نشیبی علاقے زیرآب آگئے ہیں۔ یہ سن کر وہ بری طرح خوفزدہ ہوگئی۔ کیونکہ ان کا گھر بھی اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے گھبرا کر جیک کو فون کیا۔ بڑی دیر تک گھنٹی بجتی رہی پھر اس نے فون ریسیو کرہی لیا۔ اس کی آواز کے بھاری پن سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ نشے میں ہے۔ اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ ”کیا بات ہے؟“

”ابھی ابھی خبروں میں بتایا ہے کہ دریا میں طغیانی آجانے کے سبب سیلابی ریلا نشیبی علاقوں تک پہنچ گیا ہے۔ جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے مجھے ڈر ہے کہ یہ ریلا ہمارے گھر تک نہ پہنچ جائے۔“

”یہ تم کیسی باتیں کررہی ہو؟“ وہ جھنجلاتے ہوئے بولا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ سیلابی ریلا نشیبی علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے اور کچھ ہی دیر میں وہ ہمارے علاقے تک پہنچ جائے گا۔"

"ایسی احمقانہ باتیں ٹیلی وژن والے ہی کر سکتے ہیں۔ انہیں تو اپنی اہمیت جتانے کا موقع ملنا چاہیے کچھ نہیں ہوگا۔ تم جا کر آرام سے سو جاؤ۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم فوراً واپس آجاؤ، ایسے موقع پر تمہارا گھر میں ہونا ضروری ہے۔"

"تم احمقانہ باتوں سے باز نہیں آسکتیں۔" وہ غراتے ہوئے بولا۔ "اس وقت پارٹی اپنے عروج پر ہے تم کیا چاہتی ہو کہ میں اپنے دوستوں کو یہ بتا کر رخصت مانگوں کہ میری بیوی اپنے پاؤں گیلے ہونے سے خوفزدہ ہے اور مجھے گھر جا کر اس کی دلجوئی کرنی ہے۔"

"جیک! اگر پانی کی سطح مزید بلند ہوگئی تو وہ اپنے ساتھ مٹی بھی بہا کر لے آئے گا۔ یہ صرف ٹی وی والے ہی نہیں کہہ رہے بلکہ ہر شخص یہ بات اچھی طرح جانتا ہے۔"

"تم لوگوں کی باتوں پر دھیان نہ دو۔ میرے آنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ میں پارٹی ختم ہوتے ہی گھر آجاؤں گا۔"

"جیک میں چاہتی ہوں کہ تم ابھی اور اسی وقت گھر آجاؤ، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" وہ گڑگڑاتے ہوئے بولی۔

"بکواس بند کرو۔" وہ فون پر ہی دہاڑا اور سلسلہ منقطع ہوگیا۔

وہ کافی دیر تک ریسیور ہاتھ میں پکڑے کھڑی رہی۔ اسے جیک سے اس ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ ہوا پہلے سے بھی زیادہ تیز چل رہی تھی اور لگ رہا تھا کہ اس طوفان میں سب کچھ بہہ جائے گا۔ ایک بار پھر اس کے معدے میں درد کی شدید لہر اٹھی اور وہ تکلیف کی شدت سے دہری ہوگئی۔ پھر وہ گرتی پڑتی کچن تک گئی اور دراز سے کچھ موم بتیاں نکال لائی تاکہ دوبارہ لائٹ جانے کی صورت میں انہیں روشن کرسکے۔ درد کچھ کم ہوا تو اسے مسز کلارے کا خیال آیا۔ وہ گھر میں اکیلی تھیں اور یقیناً اس صورت حال سے خوفزدہ ہوگئی ہوں گی۔ اس نے انہیں فون کرنے کے بارے میں سوچا لیکن اس حالت میں وہ ان کی کیا مدد کرسکتی تھی۔

ٹیلی وژن پر ایک بار پھر اناؤنسر کا چہرہ نمودار ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "شہری حکام نے شہر کے شمال میں نشیبی علاقوں کے مکینوں سے انخلا کی اپیل کی ہے۔ ان علاقوں میں رہنے والے ہر شخص کو فوراً اپنا گھر چھوڑنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ کیونکہ سیلابی پانی پہلے ہی کئی علاقوں تک پہنچ چکا ہے۔ متاثرہ علاقوں میں رہنے والوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ جلد از جلد قریبی محفوظ مقام تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ پولیس اور رضا کار لوگوں کی رہنمائی کے لیے سڑکوں پر موجود ہیں۔ ناروچ کا علاقہ سب سے زیادہ خطرے میں ہے اس لیے وہاں کے لوگوں کے رہنے والوں کو وقت ضائع کیے بغیر وہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔"

وہ اپنی جگہ پر کھڑی ہوگئی۔ یہ تو انہی کا علاقہ ہے۔

"اوہ میرے خدا، مجھے اپنا گھر چھوڑنا ہوگا۔" اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور پورے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ جیک بھی گھر پر نہیں تھا اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اپنے ساتھ کیا لے کر جائے۔ کاغذات اور قیمتی اشیا اس کے پاس ایسی کیا چیز تھی جس کی وہ قدر کرتی۔ اس نے تصور کی آنکھ سے دیکھا۔ وہ ڈوب رہی تھی۔ سیلابی ریلا اسے کیچڑ اور مٹی کے ساتھ بہا کر لے گیا تھا اور جیک کا کہیں پتا نہیں تھا۔

اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ مسٹر رابرٹ کے گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ کلارا بار بار اوپر نیچے جا رہی تھی۔ جبکہ مسٹر رابرٹ اپنی کار کو چیک کر رہے تھے۔ اسے اپنی کار کا خیال آیا جو مکینک کے پاس تھی اور دوسری جیک لے گیا تھا۔ اس کی واپسی تک وہ کہیں نہیں جاسکتی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ مسٹر رابرٹ سے کہے کہ وہ اسے بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔ وہ جانتی تھی کہ وہ انکار نہیں کریں گے۔ اس نے ایک بار پھر جیک کو فون کرنے کے بارے میں سوچا لیکن اس کی بے حسی کے بارے میں جان کر اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔ کیا اسے معلوم نہ ہوگا کہ پورا شہر کس خطرے سے دوچار ہے۔ بالخصوص وہ علاقہ جہاں وہ رہتے تھے لیکن اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔

اس نے ایک بار پھر مسٹر رابرٹ کے گھر کی جانب نگاہ دوڑائی۔ ابھی ان کی تیاری مکمل نہیں ہوئی تھی اور اس کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ چند ضروری اشیا سمیٹ سکے۔ اسے یاد آیا کہ اس کے ضروری کاغذات ایک فائل میں رکھے ہیں جو الماری کی دراز میں تھی۔ بہتر ہوگا کہ وہ انہیں اپنے ساتھ رکھے۔ وہ اپنے آپ کو گھسیٹتی ہوئی دوسری منزل تک لے گئی۔ معدے کا درد ایک بار پھر بڑھ گیا تھا۔ اسے کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ شاید کوئی اور پڑوسی گھر چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اسی دوران فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ شاید جیک ہو۔ وہ الٹے قدموں نیچے آئی لیکن وہ بند ہو چکا تھا اس

کے ساتھ ہی لائٹ ایک بار پھر چلی گئی۔ اس نے گھبرا کر کھڑکی کا رخ کیا۔ باہر کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔ پوری سڑک مٹی اور کیچڑ سے بھر گئی تھی۔ اسے لگا کہ رابرٹ فیملی بھی جا چکی ہے۔ اسے سڑک پر دور دور تک کوئی نظر نہیں آیا۔ تیز بارش کے سبب ہر طرف پانی بہہ رہا تھا اور آنے والی مٹی مکانوں کے درمیان جمع ہو رہی تھی۔

وہ بالکل تنہا ہو گئی تھی سب اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ کسی نے یہ زحمت گوارا نہیں کی کہ اس کے گھر میں جھانک لیتا۔ کسی اور سے کیا شکایت جب اس کے شوہر کو ہی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر زمین پر بیٹھ گئی...... اس نے دونوں ہاتھوں سے درد کی جگہ کو تھام لیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ سیکڑوں کیڑے اس کی کھال نوچ رہے ہوں۔ کہیں واقعی اسے کینسر تو نہیں؟ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اسے مرنا تو ہے چاہے ڈوب کر مرے یا کینسر سے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اسے کینسر نہیں ہے۔ کیا وہ اتنی بڑی غلطی کر سکتا ہے؟ یقیناً نہیں، بہر حال وہ ایک اسپیشلسٹ تھا اور اس کی دیوار پر ڈگریوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ اگر یہ کینسر نہیں تو پھر کیا ہے؟

جانے کس طرح اس کا خیال تہ خانے میں رکھے زہر کی طرف چلا گیا۔ اگر گھر میں چوہے ہوتے تو جیک اس کا تذکرہ ضرور کرتا۔ پھر چوہوں کو مارنے والی زہریلی دوا اسٹور میں رکھنے کا کیا مقصد تھا۔ رات اتنی تاریک تھی کہ وہ مشکل سے ہی سڑک کے دوسرے جانب مکانات کو دیکھ سکتی تھی۔ اس کے مقدر میں بھی اسی طرح سیاہی گھول دی گئی تھی۔ جیک کے ساتھ اس کا تعلق صرف نام کی حد تک تھا۔ ایسی زندگی کا کیا فائدہ جو محبت سے خالی ہو۔ ممکن ہے اس کی موت سے کچھ مسائل حل ہو جائیں۔ جب اس کی ماں زندہ تھی تو اس نے کبھی اس کے بارے میں اس طرح نہیں سوچا تھا کیونکہ اسے ماں کی ضرورت تھی لیکن اب شاید کسی کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔

جیک اس سے کئی بار کہہ چکا تھا کہ وکیل کے پاس چل کر اس مکان کو دونوں کے نام کروا لیا جائے۔ لیکن جانے کیوں وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ اب اسے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اگر وہ اس کی بات مان لیتی تو شاید ایسی موت سے بچ سکتی تھی جو دھیرے دھیرے اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ اس کی موت کے بعد کسی کو خیال بھی نہ آتا کہ اسے زہر دے کر مارا گیا ہے۔ اس لیے پوسٹ مارٹم کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سب یہی سمجھتے کہ اس کی موت کسی بیماری کے سبب ہوئی ہے۔

وہ دیوار سے ٹیک لگائے گہرے سانس لے رہی تھی اور گزشتہ زندگی کے مختلف ادوار ایک ایک کر کے اس کی نظروں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اسکول کے زمانے میں وہ ہمیشہ دوسروں سے دبتی آئی اور وہ اسے مختلف طریقوں سے نشانہ بناتے رہے۔ جب بلوغت کو پہنچی تو ماں کی غلام بن کر رہ گئی۔ دفتر میں بھی اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک روا رکھا گیا۔ اسے ہر وہ کام دے دیا جاتا جو کوئی دوسرا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر اس کی شادی ہوگئی۔ اس نے حماقت کی انتہا کر دی اور یہ بھی نہ سوچا کہ اس عمر میں اس میں ایسی کیا کشش ہے جو کوئی مرد اس سے محبت کر سکے۔ اس کی ماں نے ہمیشہ اسے ایسے مردوں سے محتاط رہنے کی تاکید کی تھی جو اسے نقصان پہنچا سکتے تھے۔ وہ کہا کرتی تھی۔ ”مرد ہمیشہ ایسی عورتوں کی تلاش میں رہتے ہیں جو خوب صورت ہوں، انہیں اچھے کھانے بنانے آتے ہوں یا پھر بہت مالدار ہوں، تمہارے اندر ایسی کوئی خوبی نہیں۔ اس لیے اگر کوئی مرد تمہاری طرف بڑھتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے۔“

اس نے ایک بار پھر کھڑکی کی طرف دیکھا چاروں طرف کیچڑ پھیل چکی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے دریا کا پانی بھی سیلابی ریلے کی صورت میں آ رہا ہوگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ بری طرح اس طوفان میں گھر چکی ہوگی۔ کیا جیک کو معلوم نہ ہوگا کہ چند لمحوں بعد یہاں کیا ہونے والا ہے۔ پورے شہر پر ہیبت طاری تھی اور ٹیلی وژن پر لمحہ لمحہ کی صورت حال بتائی جا رہی تھی۔ ایسی صورت میں وہ کس طرح بے خبر رہ سکتا تھا۔

اس کے مرنے کے بعد وہی اس مکان کا مالک ہوتا اور انشورنس سے ملنے والی رقم سے وہ اسے جدید طرز میں ڈھال سکتا تھا۔ پہلی بیوی سے طلاق ملنے کے بعد وہ بے گھر ہو گیا تھا۔ کئی برسوں کی خانہ بدوشی کے بعد اسے بھی ایک ٹھکانے کی تلاش تھی اور اسی لیے جیک نے اس سے شادی کی تھی۔ ورنہ اس میں کوئی ایسی کشش نہ تھی جو کوئی مرد اس کی طرف راغب ہوتا۔

اچانک ہی ایک زوردار گڑگڑاہٹ نے اس کے خیالوں کا سلسلہ توڑ دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ جیسے زلزلہ آیا ہو یا زمین شق ہو گئی ہو۔ بس چند ہی لمحوں میں پانی اس کے گھر میں داخل ہونے والا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اس آواز کو پہچان گئی جو کسی ہیلی کاپٹر کی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر کھڑکی کی طرف لپکی اور زور زور سے چلاتے ہوئے اس

نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا لیکن ہیلی کاپٹر مختصر فضائی جائزہ لیتے ہوئے ہائی وے کی طرف چلا گیا۔ وہ پتھر کے بت کے مانند ساکت رہ گئی۔ اسے اپنی حماقت پر غصہ آنے لگا۔ کھڑکی میں کھڑے ہونے کے بجائے اسے باہر جا کر مدد کے لیے پکارنا چاہیے تھا۔

وہ تھکے تھکے قدموں سے لیونگ روم میں آئی اور صوفے پر ڈھے گئی۔ اس نے اپنے دل کو تسلی دی کہ شاید ڈوب کر مرنا زہر خورانی کے مقابلے میں کم تکلیف دہ ہوگا۔ وہ سیلاب آنے سے پہلے خواب آور گولیاں لے کر سونا چاہ رہی تھی تاکہ نیند کی حالت میں بہتی ہوئی کہیں دور نکل جائے اور جب اس کی لاش دریافت ہو تو وہ اس حد تک مسخ ہو چکی ہوگی کہ کسی کے لیے اسے شناخت کرنا آسان نہ ہوگا۔ اسی لمحے اس نے اپنے دل میں جیک کے لیے بے پناہ نفرت محسوس کی جو کسی محفوظ مقام پر خاموشی سے طوفان کے گزر جانے کا انتظار کر رہا ہوگا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا دفتر جنوب کے علاقے میں ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ جہاں طوفان کا کوئی خطرہ نہیں۔ اس لیے جیک نے جان بوجھ کر وہاں سے ہلنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

اچانک ہی وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی، اسے مسز کلارے کا خیال آیا۔ اس بوڑھی عورت کے بارے میں کس نے سوچا ہوگا۔ وہ تیزی سے فون کی جانب لپکی اور نمبر ملانے کے بعد جواب کا انتظار کرنے لگی۔

”ہیلو!“ کافی دیر بعد مسز کلارے کی نحیف آواز سنائی دی۔

”مسز کلارے! تم جانتی ہو، باہر کیا ہو رہا ہے؟“

”نہیں، کیا ہوا؟“

”کیا تم سو رہی تھیں؟“

”تقریباً سارا دن ہی سوتی رہی۔ ڈاکٹر نے مجھے نیند کی گولیاں دی تھیں جس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ تم بتاؤ کیا ہوا؟“

وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت ہو گئی۔ یہ بڑھیا بھی ڈوب جائے گی۔ وہ تو اپنے طور پر حرکت بھی نہیں کر سکتی۔ وہ بے تابی سے بولی۔ ”مسز کلارے! میری بات سنو......“

اسے اپنا جملہ ادھورا چھوڑنا پڑا۔ وہ اس کے لیے کیا کر سکتی تھی۔ دونوں گھروں کے درمیان گلی پانی اور کیچڑ سے بھر چکی تھی اور اسے عبور کرنا بہت مشکل تھا۔ اگر وہ اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تب بھی وہ دونوں مل کر کچھ نہیں کر سکتیں۔

”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“ مسز کلارے نے دوبارہ پوچھا۔ وہ اب پوری طرح جاگ گئی تھی۔

”مسز کلارے! دریا میں طغیانی آگئی ہے اور سیلابی ریلا تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ ہمیں کسی بھی طرح یہاں سے نکلنا ہے۔“

”اوہ مجھے یقین نہیں آ رہا۔ اور ہمارے پڑوسی کیا کر رہے ہیں؟“

وہ کیا بتاتی کہ ان کے پڑوسی بزدلوں کی طرح بھاگ گئے تھے۔ کسی نے اس بڑھیا کے بارے میں سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ تھوڑی دیر پہلے تک وہ خود بھی انہی لوگوں میں شامل تھی اور اپنی پریشانی میں مسز کلارے کو تقریباً بھلا چکی تھی۔

”مسز کلارے! کیا تم اٹھ سکتی ہو؟“

”ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔“ مسز کلارے نے پورے اعتماد سے کہا۔

”میں تمہیں لینے آ رہی ہوں۔“

”کیا تمہاری کار آگئی۔ تم نے بتایا تھا کہ کل ہی تم اسے مکینک کے پاس چھوڑ کر آئی تھیں۔“

بڑھیا کے حواس پوری طرح کام کر رہے تھے اور کینسر نے اس کے دماغ کو بالکل بھی متاثر نہیں کیا تھا۔ وہ بات بدلتے ہوئے بولی۔

”تیار ہو جاؤ میں آ رہی ہوں۔ کیا تمہارے سامنے والا دروازہ کھلا ہوا ہے؟“

”ہاں۔ وہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔“

”یقیناً۔ کچھ گرم کپڑے اور اپنی دوائیاں ساتھ رکھ لینا۔ اس کے علاوہ اگر کچھ ضروری کاغذات ہوں تو......“

”جب تم آؤ گی تو میں تیار ملوں گی تاکہ تمہارا وقت ضائع نہ ہو۔“

اس نے فون رکھ دیا اور باہر نکلنے کے بارے میں سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ مسز کلارے تشویشناک لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ ”میرے پاس ایک عمدہ ٹارچ ہے۔ اس کی روشنی میں دیکھا ہے کہ مٹی کے بڑے بڑے تودوں نے گلی کو بند کر دیا ہے۔ تم اسے پار نہیں کر سکتیں۔“

”لیکن تمہیں بھی وہاں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ویسے بھی تمہارا مکان ایک منزلہ ہے۔“

”میری فکر مت کرو۔“ مسز کلارے سپاٹ لہجے میں

بولی۔ ”میں بوڑھی اور بیمار ہوں لیکن تم اب تک گھر پر بیٹھی کیا کررہی ہو۔ تمہارا شوہر کہاں ہے؟“

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس بات کا کیا جواب دے۔ کیا وہ اسے بتادے کہ اس کے شوہر نے جان بوجھ کر اسے مرنے کے لیے یہاں تنہا چھوڑ دیا ہے۔ اس نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ ”مجھے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ نہیں تھا۔ بتاؤ کہ تمہاری چھت پر کوئی کمرا ہے؟“

”ہاں لیکن وہ بہت زیادہ اونچا نہیں ہے۔“

اسی لمحے مسز کلارے کے مکان کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ جس کی پرشور آواز فون کے ذریعہ بھی سنائی دی۔

”مسز کلارے! کیا ہوا۔ خیریت تو ہے نا؟“

”میں کچھ نہیں جانتی۔ لگتا ہے کہ کوئی چٹان کا ٹکڑا یا مٹی کا تودہ میرے گھر کی دیوار سے ٹکرایا ہے۔ اب طوفانی ریلا مجھے بہا کر لے جائے گا۔ تمہارے آنے کی ضرورت نہیں۔ ہم دونوں کو ہر حال میں جدا ہونا ہے۔“

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی فون بند ہوگیا۔

”مسز کلارے، مسز کلارے۔“ وہ پریشانی کے عالم میں چلائی۔ لیکن دوسری جانب مکمل خاموشی تھی۔ وہ تیزی سے کھڑکی کی طرف لپکی۔ مسز کلارے کی دیوار میں عین کھڑکی کے نیچے بڑا شگاف پڑ چکا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد پانی ان کے گھر میں داخل ہوجاتا اور وہ کسی بے جان شے کی طرح اس میں بہہ جاتیں۔ اب اس کے پاس بالکل وقت نہیں تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر گئی۔ اس نے وہاں سے اپنا برساتی کوٹ، ربڑ کے جوتے اور فلیش لائٹ لی پھر تیزی سے نیچے کی جانب دوڑ لگادی۔ اس نے لیونگ روم کی کھڑکی کھول کر دیکھا اس کے گھر کی بیرونی باڑھ کا تیسرا حصہ پانی میں ڈوب چکا تھا۔ یہ گہرائی اتنی زیادہ نہ تھی جس سے اسے پریشانی ہوتی لیکن اس کے بہاؤ کی شدت اور مٹی کی وجہ سے مشکل پیش آسکتی تھی۔

وہ کھڑکی پر چڑھی اور اس نے باغ میں چھلانگ لگادی۔ اس کے جوتے پوری طرح پانی میں ڈوب چکے تھے۔ اس نے ایک نظر مسز کلارے کے گھر پر ڈالی۔ فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ اگر وہ مٹی کے تودوں اور درخت کے تنوں کے درمیان سے راستہ بنانے میں کامیاب ہوجاتی تو ان کے گھر تک پہنچ سکتی تھی۔ لیکن مٹی کی وجہ سے وہاں بہت زیادہ پھسلن تھی اور بارش بھی دوبارہ تیز ہوگئی تھی۔ وہ پوری طرح سر سے پاؤں تک بھیگ گئی لیکن رکنے یا سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، اسے کوئی ایسی چیز بہتی ہوئی نظر نہیں آئی جس سے ٹکرانے کا خطرہ ہوتا۔

وہ ہمت کرکے آگے بڑھی۔ اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے تاکہ توازن قائم رہ سکے۔ بارش کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اچانک وہ چکرا کر گری اور کیچڑ میں ڈوب گئی۔ اس نے ہمت کرکے اپنے قدم زمین پر جمائے اور دوبارہ کھڑی ہوگئی اور اپنا رخ اس جانب کرلیا جہاں سے پانی کا ریلا آرہا تھا۔ جیسے تیسے وہ گلی پار کرنے میں کامیاب ہوگئی اور مسز کلارے کے دروازے پر پہنچ کر اسے یوں لگا جیسے دریا عبور کرکے آئی ہو۔

مسز کلارے کی تیاری مکمل تھی۔ لگ رہا تھا جیسے کسی محاذ پر جارہی ہوں۔ انہوں نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور بولیں۔ ”آخر کار تم یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گئیں۔“

اس نے بھی جوابی مسکراہٹ پھینکی۔ ”میں تمہیں یہاں تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔“

”یقیناً“ مسز کلارے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اب ہم کیا کریں گے۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے کہ ہم اکیلے رہ گئے ہیں۔“

”ہاں“ اس نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ”چھت تک پہنچنے کا کوئی راستہ ہے؟“

”کیا تم مجھے چھت پر لے جاؤ گی؟“ بڑی بی نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں! اس سیلابی ریلے سے محفوظ رہنے کا یہی ایک راستہ ہے۔“ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ ”اگر تم اس کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

”میں سمجھتی ہوں کہ انکار کرنے کی صورت میں بھی تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گی۔“

”تم ٹھیک سمجھ رہی ہو۔ میں واقعی تمہیں چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

”پھر ہمیں چلنا چاہیے۔“ بڑی بی نے کہا۔ ”کچن میں سیڑھی رکھی ہے۔ وہ یہاں لے آؤ۔“ اس نے ٹارچ میں چھت سے بنے ہوئے مربع نما سوراخ کی جانب اشارہ کیا۔ وہ سوراخ اتنا بڑا تھا کہ اس میں سے ایک آدمی آسانی سے گزر کر چھت پر بنے ہوئے کمرے میں جاسکتا تھا۔

وہ سیڑھی لینے چلی گئی۔ اس وقت اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی تھی۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ بیمار اور بوڑھی مسز کلارے جو عملی طور پر مفلوج ہوچکی ہے، وہ کس طرح سیڑھیاں چڑھ پائے گی۔ اور اگر وہ چھت تک

پہنچنے میں کامیاب ہوگئی تو اس چھوٹے سے کمرے میں وہ دونوں کب تک محفوظ رہ سکتی ہیں۔ تیز ہوا کے جھکڑ اور طوفانی بارش میں وہاں کتنی دیر رکا جاسکتا ہے لیکن اس کے پاس یہ سب باتیں سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا اس نے سوراخ کے ساتھ سیڑھی لگائی اور مسز کلارے کو اس پر چڑھنے کے لیے کہا۔ عام حالات میں شاید یہ ممکن نہ ہوتا لیکن پانی اس کے گھر میں داخل ہوچکا تھا۔ جسے دیکھتے ہی مسز کلارے اپنی ساری بیماری بھول گئی۔ وہ پیچھے سے بڑی بی کو سہارا دیے ہوئے تھی اور خود بھی اس کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ خدا خدا کر کے وہ دونوں چھت تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئیں۔ تھکن اور درد سے اس کا برا حال تھا لیکن وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔

☆......☆......☆

ایک اجنبی شخص نے اس کی جانب گرم کافی کا کپ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ پی لو۔ اس سے تمہیں حرارت ملے گی۔''

اس نے وہ پیالی لے لی۔ مسز کلارے بھی اس کے قریب ہی لیٹی ہوئی تھیں اور ان کے چہرے پر بھرپور مسکراہٹ تھی۔ ایک شخص سفید کوٹ پہنے انہیں انجکشن لگا رہا تھا۔

''تم واقعی بہت بہادر ہو اور اس کے ساتھ ساتھ خوش قسمت بھی۔'' وہ کہنے لگا۔ ''تمہارے شوہر کا خیال تھا کہ تم مرچکی ہو۔ کچھ رپورٹرز تمہارا انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم نے کس طرح ایک بوڑھی اور بیمار عورت کے ساتھ اس بارش اور طوفان میں پوری رات گزار دی۔''

''میں نے کوئی غیر معمولی کام تو نہیں کیا۔'' وہ جھینپتے ہوئے بولی۔

''پہلے میں اپنا تعارف کرادوں۔'' وہ اجنبی بولا۔ ''میرا نام ہاروے ونٹروپ ہے اور میں ماحولیاتی افسر ہوں۔''

''تم سے مل کر خوشی ہوئی۔'' اس نے رسماً کہا۔

''نہیں بلکہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو تم کو دیکھ کر خوش ہورہے ہیں۔ میں لوگوں کو اس طوفان کے خطرے سے آگاہ کرتا رہا اور تمہارے ایڈونچر نے ثابت کردیا کہ میرے خدشات درست تھے۔ اگر تمہارے اندر زندہ رہنے کی امنگ نہ ہوتی تو شاید مرنے والوں کی تعداد میں مزید دو کا اضافہ ہوجاتا۔''

''کیا اس طوفان سے ہلاکتیں بھی ہوئی ہیں؟''

''ہاں، جو لوگ بروقت محفوظ مقام پر نہیں پہنچ سکے یا انہوں نے تمہاری طرح کسی اونچی جگہ پناہ لینے کی کوشش نہیں کی۔''

''اس کے لیے مجھے مسز کلارے کا شکر گزار ہونا چاہیے۔''

''مسز کلارے۔'' ونٹروپ نے تعجب سے کہا۔ ''میں سمجھا نہیں۔''

''اگر وہ اپنے گھر میں تنہا نہ ہوتی تو شاید میں بھی کچھ نہ کرپاتی۔''

''تم نے ایک نیکی کی اور اس کے بدلے تمہاری جان بچ گئی۔'' ونٹروپ تحسین آمیز انداز میں بولا۔ ''میں تمہارے شوہر کو بتادوں کہ تم محفوظ اور صحیح سلامت ہو۔''

''وہ تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں! اس نے عقلمندی کا مظاہرہ کیا اور دفتر میں ہی رک کر طوفان کے ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا۔'' یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم رپورٹرز کے آنے سے پہلے اس سے ملنا چاہوگی۔''

''مسٹر ونٹروپ!'' وہ مضبوط لہجے میں بولی جس میں ناگواری کا ہلکا سا تاثر تھا۔ ''اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ بہت جلد وہ میرے بارے میں جان جائے گا۔ جب اسے وکیل کی جانب سے طلاق کے کاغذات ملیں گے۔''

''میں نے مسز کلارے کی چھت پر سے اپنے آبائی گھر کو تباہ ہوتے دیکھا ہے اور اسے دوبارہ نہ بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ پھر میں نے اپنی زندگی کے بارے میں سوچا جو بالکل ڈل، بے رنگ اور پھیکی ہے۔ لہٰذا میں نے اس میں تبدیلی لانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مکان میں ٹوٹ پھوٹ ہونے لگے تو لوگ اسے دوبارہ بنانے یا مرمت کرنے کا سوچتے ہیں۔ میں بھی اپنی زندگی کی عمارت کی نئے سرے سے تزئین و آرائش کرنا چاہتی ہوں۔''

''لیکن تمہارا شوہر......''

''وہی تو میری زندگی کی عمارت کا بدترین حصہ ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خطرناک ہوتا جارہا ہے۔ اس سے نجات حاصل کرلینا ہی بہتر ہے۔ تم اگر میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے مسٹر ونٹروپ؟''

ونٹروپ حیرت سے اسے دیکھتا رہا جو معمولی عورت ہوتے ہوئے بھی غیر معمولی کارنامے انجام دینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

درحقیقت

ملک صفدر حیات

بعض اوقات تہ در تہ صرف انسان کی شخصیت ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ کچھ معاملات کو بھی مختلف عنوانات کا نام دے کر دباتا اور چھپاتا چلا جاتا ہے مگر... یہ بھول جاتا ہے کہ جب یہ حقیقتیں... کسی پر اپنے در وا کرتی ہیں تو سارا کچا چٹھا سامنے کھول کر رکھ دیتی ہیں۔ ایسی ہی صورتِ حال میں یہ سوال جنم لیتا ہے کہ جب انسان تلخیوں کو شیرینیوں میں بدلنے کی سکت رکھتا ہے تو کیوں اس کے لیے کوشش نہیں کرسکتا... کیونکہ... شاید وہ ایسا کرنا ہی نہیں چاہتا... اور جب وہ کوئی کام کرنا ہی نہ چاہے تو وقت کا پہیا اپنا کام بڑے شدومد سے کرگزرتا ہے، اب چاہے کوئی اس کے نیچے آکر دبے، مرے یا پھر سے جینے کا حوصلہ لے کر کھڑا ہو جائے... یہ سب ملک صفدر حیات کی کاوشوں اور مجرم تک پہنچنے کے تفتیشی انداز نے واضح کردیا کہ انسان اپنی زندگی کا رخ اگر درست سمت میں رکھنے کی کوشش کرے تو کسی میں مجال نہیں کہ اس کے قدم بہکا سکے۔

ایک بے بنیاد قتل کا احوال جسے اگر کیا ہی نہ جاتا تو بھی زندگی ایسے ہی گزر جاتی

بعض دن ایسے ہوتے ہیں کہ کچھ بھی کرنے کو نہیں ہوتا۔ صبح سے شام تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہو، بقول شخصے...... مکھیاں مارتے رہو لیکن بعض دن ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جدھر نگاہ اٹھاؤ، کام ہی کام دکھائی دیتا ہے۔ گویا ایک لمحے کو سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔

وہ جاتی ہوئی سردیوں کے دن تھے۔ ماہِ فروری اختتام پر تھا۔ موسم سرما رخصت ہورہا تھا تاہم رات اب بھی گلابی جاڑے کی یاد تازہ کرلیا کرتی تھی اور صبح کے وقت بھی فضا میں خنکی رچی بسی رہتی تھی۔ ایسی ہی ایک صبح میں تیار ہوکر تھانے پہنچا تو ایک سنسنی خیز اطلاع میری منتظر تھی۔

میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ ایک کانسٹیبل نے آکر بتایا۔ ”ملک صاحب! یوسف ماچھی کی بیٹی نے خودکشی کرلی ہے......“

”کون یوسف ماچھی؟“ میں نے اطلاع دینے والے کانسٹیبل سے پوچھا۔

”یہ بندہ ادھر قادر آباد میں رہتا ہے ملک صاحب۔“ کانسٹیبل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”قادر آباد سے دو بندے اس واقعے کی رپورٹ درج کرانے آئے ہیں۔“

”وہ دونوں بندے کہاں ہیں؟“ میں نے کانسٹیبل کامران سے استفسار کیا۔ ”کیا ان میں یوسف ماچھی خود بھی شامل ہے؟“

”نہیں جناب! یوسف ماچھی ان کے ساتھ نہیں آیا۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ان دونوں بندوں کا تعلق قادر آباد ہی سے ہے۔ وہ اس وقت باہر برآمدے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔“

میں جب تھوڑی دیر پہلے اپنے کمرے کی طرف آرہا تھا تو میں نے برآمدے میں دو افراد کو بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ آپس میں کھسر پھسر کررہے تھے اور مجھے یاد آرہا تھا کہ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی سلام بھی کیا تھا تاہم میں سر کی اثباتی جنبش سے ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ کانسٹیبل کامران یقیناً انہی دو افراد کا ذکر کررہا تھا۔ میں نے کامران سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم انہیں اندر بھیجو......“

وہ ”اوکے سر!“ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

موضع قادر آباد میرے تھانے سے دو میل کے فاصلے پر مشرق میں واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کی آبادی آٹھ



سو سے ایک ہزار کے درمیان تھی۔ یہ لگ بھگ دو سو گھروں پر مشتمل ایک روایتی گاؤں تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد قادر آباد سے آنے والے دونوں افراد میرے سامنے حاضر تھے۔

انہوں نے بڑے ادب سے جھک کر مجھے سلام کیا اور میں نے انہیں اپنے سامنے بٹھالیا۔ ان میں سے ایک کا نام یعقوب تھا۔ یعقوب پیشے کے اعتبار سے موچی تھا جبکہ اس کے ساتھ آنے والے شخص کا نام سلیم صوبے دار معلوم ہوا۔ یہ دونوں بندے موضع قادر آباد ہی کے رہنے والے تھے۔

سلیم کے نام نے مجھے چونکا دیا تھا لہٰذا میں نے اس سے پوچھ لیا۔ ''ہاں بھئی سلیم! تم کہاں کے صوبے دار ہو؟''

وہ ڈیل ڈول میں بنا بنایا پہلوان نظر آتا تھا۔ میرے سوال پر وہ ذرا سا جھینپا پھر اس نے جواب دیا۔ ''تھانے دار صاحب! میں اصلی صوبے دار نہیں ہوں جی۔''

''پھر تم نے اپنے نام کے ساتھ صوبے دار کا دم چھلا کیوں لگا رکھا ہے؟'' میں نے کڑے لہجے میں پوچھا۔ ''تمہارے نام کو دیکھ کر تو یہی لگتا ہے کہ تم پاک فوج کے ملازم ہو یا پھر صوبۂ سندھ کے کسی تھانے کے انچارج......!''

واضح رہے کہ صوبۂ سندھ میں ایس ایچ او یعنی تھانے دار کو عموماً صوبے دار کہا جاتا ہے لہٰذا ناواقف حضرات میرے ان الفاظ کو منفی انداز میں لینے کی کوشش نہ کریں۔

سلیم صوبے دار نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''وہ بات یہ ہے تھانے دار صاحب کہ مجھے بچپن ہی سے فوج میں جانے کا شوق تھا مگر بدقسمتی سے میرا یہ شوق پورا نہیں ہوسکا اور میں پہلوان بن گیا۔ اب ادھر سبزی منڈی میں پلّے داری کرتا ہوں جی۔''

''اور تم نے بچپن کے شوق کو پورا کرنے کے لیے اپنے نام کے ساتھ ''صوبے دار'' کو ٹانک لیا ہے۔'' میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔ ''کیوں...... یہی بات ہے نا......؟''

''جی سرکار...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ بڑی فرماں برداری سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں ہلکی پھلکی شوقیہ صوبے دار کو چھوڑ کر اصل موضوع کی طرف آگیا۔ میں نے باری باری ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لینے کے بعد سوال کیا۔

''یہ یوسف ماچھی کی بیٹی کا کیا قصہ ہے؟''

''رجّو نے پچھلی رات خودکشی کرلی ہے تھانے دار صاحب۔'' یعقوب موچی نے بتایا۔ ''ادھر ہمارے گاؤں میں تو صبح سے بڑی افراتفری مچی ہوئی ہے۔ رجو کے ماں باپ کا صدمے سے برا حال ہے۔ رجو ان کی اکلوتی اولاد تھی۔''

''رجو جوان جہان تھی جناب۔'' سلیم صوبے دار نے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''ابھی ایک سال پہلے تو اس کی شادی ہوئی تھی۔''

یہ ایک چونکا دینے والی خبر تھی۔ میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ ''ایک سال پہلے شادی ہوئی تھی تو اس کا مطلب ہے اس نے اپنی سسرال میں یعنی اپنے گھر میں خودکشی کی ہے......؟''

''نہیں جناب!'' یعقوب نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''اپنی سسرال میں تو وہ زیادہ سے زیادہ ایک مہینا رہی ہوگی۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''تھانے دار صاحب! شادی کے ایک ماہ بعد ہی وہ اپنے خاوند سے لڑ جھگڑ کر واپس آگئی تھی۔'' سلیم صوبے دار نے بتایا۔ ''اب تو وہ اپنے ماں باپ کے پاس ہی رہ رہی تھی۔''

''اوہ......'' میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ ''کیا رجو کے شوہر نے اسے طلاق دے دی تھی؟''

''نہیں جناب! ابھی تک تو دونوں جانب جھگڑا چل رہا تھا۔'' یعقوب نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''طلاق کی جانب معاملہ بڑھ ہی رہا تھا کہ......''

یہاں تک بولنے کے بعد یعقوب موچی خاموش ہوگیا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے جھلکتی اداسی نے پلک جھپکتے میں مجھے بتا دیا کہ وہ رجو کی موت کا ذکر کرتے ہوئے جذباتی ہوگیا تھا لہٰذا یہ جملہ مکمل نہیں کرسکا تھا۔

''رجو نے کس طریقے سے اپنی جان لی ہے؟'' میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، اس نے کلائی کی نس کاٹ لی ہے یا زہر کھا کر اپنی جان دی ہے اور یا پھر گلے میں پھندا ڈال کر خود کو ختم کرلیا ہے...... یا نہر میں چھلانگ لگائی ہے یا ریلوے لائن پر کٹ مری ہے؟''

گاؤں دیہات میں عورتیں اپنی جان سے کھیلنے کے لیے عموماً یہی پانچ طریقے اختیار کرتی تھیں، یعنی ان ہی میں سے کوئی ایک طریقہ اختیار کر کے زندگی کی قید سے آزاد ہوجایا کرتی تھیں......!

''جی ہاں، بالکل......'' سلیم صوبے دار نے سرسراتی ہوئی آواز میں بتایا۔ ''رجو نے چھت سے لٹک کر اپنی جان دی ہے تھانے دار صاحب۔ میں نے خود اپنی ان آنکھوں

سے اس کی جھولتی ہوئی لاش دیکھی ہے......"

"ٹھیک ہے......" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم لوگ جاکر باہر برآمدے میں بیٹھو۔ میں ابھی تمہارے ساتھ قادر آباد چلتا ہوں۔"

وہ خاموشی سے اٹھے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے، قادر آباد نامی وہ گاؤں میرے تھانے سے مشرق میں دو میل کے فاصلے پر آباد تھا۔ میں نے حوالدار خادم حسین کو اپنے ساتھ لیا اور ایک تانگے میں بیٹھ کر جائے وقوعہ کی سمت روانہ ہوگیا۔

یعقوب موچی اور سلیم صوبے دار اپنی اپنی سائیکل پر بیٹھ کر آئے تھے۔ وہ اپنی سائیکلوں پر سوار ہمارے تانگے کے پیچھے چلنے لگے۔

میرا تھانہ ایک نیم پختہ سڑک کے کنارے واقع تھا اور اس سڑک کے متوازی ریلوے لائن بھی رواں دواں تھی تاہم ان دونوں راستوں کے بیچ لگ بھگ چوتھائی میل کا فاصلہ حائل تھا اور قادر آباد اسی فاصلے کے درمیان تھانے سے دو میل کی دوری پر آباد ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ہم جلد ہی قادر آباد پہنچ گئے پھر یوسف ماچھی کے گھر تک رسائی حاصل کرنے میں ہمیں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا۔

وہ دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کا رقبہ پانچ مرلے یعنی تقریباً ایک سو بیس گز رہا ہوگا۔ دونوں کمرے پہلو بہ پہلو بنے ہوئے تھے۔ تاہم ان میں سے ایک کا سائز دوسرے سے مختلف تھا یعنی چوڑائی میں دونوں کمرے برابر اور لمبائی میں ایک قدرے زیادہ تھا۔ کمروں کے سامنے ایک مناسب سا صحن اور پھر بیرونی دروازہ۔ یہ تھا یوسف ماچھی کا کل گھر۔

رضیہ عرف رجو کی لاش چھوٹے کمرے کی چھت سے لٹکی ہوئی تھی۔ اس لٹکاؤ کے باعث جسم کے وزن نے اس کی گردن کی لمبائی میں غیر معمولی اضافہ کردیا تھا۔ پہلی ہی نظر میں مجھے یقین ہوگیا کہ وہ زندگی کی قید سے آزاد ہوچکی ہے۔

چھت کے جس مقام پر رجو کی لاش جھول رہی تھی، اس کے عین نیچے ایک چوبی اسٹول الٹا پڑا تھا۔ اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ اس نے مذکورہ چوبی اسٹول پر کھڑے ہوکر پھانسی کا پھندا اپنی گردن میں ڈالا ہوگا اور پاؤں کی ٹھوکر سے اسٹول الٹ دیا ہوگا۔ اس کے بعد جو ہونا تھا اس کی تفصیل بیان کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ نتیجہ رجو کی المناک موت کی صورت میں برآمد ہوا تھا۔

میں نے حوالدار خادم حسین اور یوسف ماچھی کی مدد سے رجو کی لاش کو نیچے اتار کر بستر پر ڈال دیا۔ اس کمرے میں ایک چارپائی پر گرم بستر بچھا ہوا تھا اور دیگر اشیا کی سیٹنگ سے بھی یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں کسی ایک شخص نے رہائش اختیار کررکھی تھی۔ لاش کے معائنے کے بعد میں نے اسے پوسٹ مارٹم کے لیے ضلعی اسپتال بھجوا دیا اور جائے وقوعہ کا جائزہ لینے لگا۔

وہ بارہ بائی بارہ فٹ کا ایک عام سا کمرا تھا جس میں نہایت ہی مختصر سامان موجود تھا۔ یوسف ماچھی اور اس کی بیوی نذیراں عرف جیراں ماچھن کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ وہ کمرا رجو کے استعمال میں تھا۔ میں نے جائے وقوعہ کی کارروائی نمٹائی اور متوفی کے والدین کے ساتھ دوسرے کمرے میں آگیا۔ اس کمرے کی پیمائش بارہ ضرب پندرہ فٹ رہی ہوگی۔

یوسف اور نذیراں کی حالت خاصی خراب ہورہی تھی لیکن ظاہر ہے، پوچھ گچھ بھی ضروری تھی۔ میں نے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مجھے آپ کی بیٹی کی موت کا شدید صدمہ ہے اور میں تم لوگوں کے دکھ میں برابر کا شریک ہوں۔"

"تھانے دار صاحب! میں نے بھی کیسی قسمت پائی ہے۔" یوسف ماچھی گلوگیر آواز میں بولا۔ "اللہ نے صرف ایک اولاد دی اور اس کا نصیب بھی ایسا کہ شادی کی تو وہ اسے راس نہیں آئی۔ ایک سال سے گھر میں بیٹھی ہوئی تھی اور اب تو وہ جان ہی سے چلی گئی...... میں ایک بار پھر بے اولاد ہوگیا۔ رجو ہماری شادی کے پانچ سال بعد پیدا ہوئی تھی۔"

"ہم تو جیتے جی مر گئے جی۔" جیراں ماچھن آنسو بہاتے ہوئے بولی۔ "پتا نہیں، کس بدبخت کی نظر میری رجو کو کھا گئی ہے......"

"میں آپ لوگوں کی بیٹی کو تو واپس نہیں لاسکتا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن اس کی موت کے سبب تک پہنچنا میرے فرائض کا حصہ ہے لہٰذا اس سلسلے میں مجھے آپ ہی سے، سب سے پہلے پوچھ پرتیت کرنا ہوگی۔"

"موت کا سبب!" یوسف ماچھی نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔ "جناب! سبب تو صاف نظر آرہا ہے کہ رجو نے اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال کر جان دی ہے۔"

"یہ سبب نہیں بلکہ طریقہ کار ہے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "چھت کے شہتیر کے ساتھ پھانسی کا پھندا

باندھنا۔ اسٹول پر کھڑے ہو کر اس پھندے کو اپنی گردن میں فٹ کرنا۔ اسٹول کو پاؤں کی ٹھوکر سے گرانا اور پھندے سے جھول کر خود کو ختم کر ڈالنا...... یہ سب جان لینے کے طریقۂ کار میں شمار ہوتے ہیں جبکہ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ اس تکلیف دہ عمل سے گزرنے پر مجبور کیوں ہوئی......؟''

میں نے لمحاتی توقف کر کے باری باری انہیں گہری نظر سے دیکھا۔ وہ متوحش انداز میں مجھے ہی تک رہے تھے۔ میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں جو کچھ جاننا چاہتا ہوں، اس حقیقت تک تم لوگ مجھے پہنچاؤ گے...... تم دونوں؟''

''ہم......'' جیراں ماچھن گھبرا کر بولی۔ ''ہمیں کیا پتا جی، رجو نے یہ خطرناک قدم کیوں اٹھایا ہے۔ اگر ہمیں پتا ہوتا، وہ ایسا کچھ کرنے والی ہے تو ہم بھلا اسے ایسا کرنے دیتے؟''

''ہم کچھ نہیں جانتے تھانے دار صاحب۔'' یوسف ماچھی منت ریز لہجے میں بولا۔ ''ہمیں رجو کے اس پروگرام کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔''

''آپ لوگ میری بات کو سمجھ نہیں رہے ہو......'' میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔ ''کوئی بھی انسان باقاعدہ اعلان کر کے خودکشی نہیں کرتا۔ یہ کسی بھی ''تنگ آمد بہ جنگ آمد'' انسان کا انتہائی خفیہ پروگرام ہوتا ہے۔''

''پھر...... ہم آپ کو کیا بتائیں جی؟'' یوسف ماچھی شکست خوردہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

میں ان دونوں کی دلی اور ذہنی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ ان کی جوان جہان بیٹی موت کے منہ میں چلی گئی تھی۔ اس جرح سے ان کی اذیت بڑھ رہی تھی لیکن میں بھی اپنے پیشہ ورانہ فرائض سے مجبور تھا۔ ایک انسان نے چھت سے لٹک کر اپنی جان دے دی تھی۔ اس کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوایا جا چکا تھا اور جن حالات نے اس بدنصیب کو اپنی جان لینے پر مجبور کیا تھا جب تک وہ میرے علم میں نہ آتے، میں اپنی تفتیش کو کسی بھی سمت میں آگے نہیں بڑھا سکتا تھا۔ میں نے قدرے نرمی کا انداز اختیار کرتے ہوئے ذرا مختلف زاویے سے سوالات کا آغاز کیا۔

''تم لوگوں کو کب پتا چلا کہ رجو نے خودکشی کر لی ہے؟''

''صبح...... آج صبح جی......'' جیراں نے بتایا۔

''رجو صبح جلدی اٹھ جاتی تھی۔'' یوسف وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''یہی کوئی ساڑھے پانچ یا چھ بجے تک...... لیکن آج جب وقت چھ سے بھی آگے چلا گیا تو ہمیں تشویش ہوئی کہ وہ ابھی تک جاگی کیوں نہیں۔ میں نے جیراں سے کہا کہ رجو کو اٹھا دے۔ صبح کا ناشتا رجو ہی بناتی تھی۔ میں ناشتا کرنے کے فوراً بعد اپنی دکان پر چلا جاتا تھا۔''

پھر اس نے تفصیلاً بتایا کہ قادر آباد کے مین بازار میں اس کی کریانہ کی دکان تھی جہاں وہ صبح سے شام تک بیٹھتا تھا۔ اس کی دکان درحقیقت ایک چھوٹا سا جنرل اسٹور تھی۔ وہ دن بھر اپنی دکان پر مصروف رہتا اور اس کی بیوی اور بیٹی تنور کا کام سنبھالتی تھیں۔ ان کے گھر کے باہر گلی ہی میں ایک تنور اور ایک بھٹی (بھاڑ) بھی لگی ہوئی تھی۔ جیراں ماچھن اس تنور میں گاؤں والوں کے لیے روٹیاں لگایا کرتی تھی اور بھاڑ میں دانے (چاول، چنے و دیگر اجناس) بھونا کرتی تھی۔ اس کام میں رجو اس کی بھرپور مدد کیا کرتی تھی اور یہی رجو اب کسی اور دنیا کی باسی ہو چکی تھی۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے یکے بعد دیگرے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''جیراں! جب تم رجو کو اٹھانے گئیں تو تم نے اس کے کمرے میں کیا منظر دیکھا تھا۔''

''تھانیدار جی......'' وہ روہانسی ہو گئی۔ ''رجو روزانہ کمرے کا دروازہ تو بند کر لیتی تھی مگر کبھی اندر سے کنڈی نہیں لگاتی تھی مگر آج صبح ایک عجیب بات ہوئی۔ جب میں نے رجو کو جگانے کے لیے آوازیں دیں اور اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تو میں نے اسے جھنجوڑ کر جگانے کا فیصلہ کیا اور اسی وقت پتا چلا کہ دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھی ہوئی ہے......''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

''جناب! جب جیراں نے مجھے بتایا کہ رجو نے دروازے کو کنڈی لگا رکھی ہے تو میں بھی پریشان ہو گیا۔'' یوسف ماچھی بھرائی ہوئی آواز میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''ہم دونوں نے کئی بار دروازے کو کھٹکھٹایا اور رجو کو آوازیں دیں مگر بے سود...... اندر سے کوئی آواز نہیں ابھری۔ مجبوراً دروازہ توڑ کر ہمیں اندر داخل ہونا پڑا۔''

''رات کو رجو کتنے بجے سونے کے لیے اپنے کمرے میں گئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''لگ بھگ سات بجے ہم نے ایک ساتھ باورچی خانے میں بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔'' جیراں نے بتایا۔ ''اس کے بعد یوسف اندر کمرے میں چلا گیا تھا۔ میں نے برتن سمیٹے اور ہم دونوں ماں بیٹی نے مل کر برتن دھوئے اور باورچی خانے سے باہر آ گئیں۔ رجو اپنے کمرے میں چلی گئی اور

میں بیرونی دروازے کو اچھی طرح بند کرنے کے بعد یوسف کے پاس آ گئی تھی......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''بس جی، ہم نے رجو کو اسی وقت آخری بار زندہ دیکھا تھا۔ اس کے بعد آج صبح اس کی جھولتی ہوئی لاش ہی سے ملاقات ہوئی تھی۔''

''تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ رجو لگ بھگ آٹھ بجے اپنے کمرے میں گئی ہوگی۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا کھانا کھانے کے دوران میں کوئی ایسی بات ہوئی تھی جو رجو کو بہت بری لگی ہو...... اسے دکھ پہنچا ہو؟''

''کوئی نہیں جی......'' جیراں نے اکتاہٹ آمیز انداز میں بتایا۔ ''وہی سب دن رات کی ایک جیسی باتیں...... کچھ بھی نیا نہیں ہوا تھا۔''

''دیکھیں جی تھانے دار صاحب!'' یوسف ما یوسی میں بھیگی ہوئی آواز میں بولا۔ ''رجو ہماری اکلوتی اولاد تھی جو منتوں مرادوں کے بعد پانچ سال کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ ہم اسے دکھ پہنچانے والی کوئی بات کیسے کر سکتے ہیں...... کیا اس کی زندگی میں پہلے کچھ کم دکھ تھے جو ہم اس میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتے۔''

جیراں اور اس کے شوہر یوسف کا کہا اپنی جگہ صد فیصد درست تھا لیکن میں یہ بات ماننے کو ہرگز تیار نہیں تھا کہ کسی انسان کی زندگی میں کوئی پریشانی نہ ہو اور وہ بیٹھے بٹھائے شوقیہ خودکشی کر بیٹھے۔ رضیہ عرف رجو نے جس انداز میں اپنی جان دی تھی، اس سے دیکھنے والوں کو بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے سینے میں غموں کا کتنا بڑا طوفان چھپائے بیٹھی تھی۔

یہ بات میرے علم میں آ چکی تھی کہ رجو کی ایک سال پہلے شادی ہوئی تھی لیکن وہ سسرال میں صرف ایک ماہ رہی تھی اور اس کے بعد میکے آ گئی تھی۔ جو لوگ رجو کی موت کی اطلاع دینے تھانے آئے تھے، ان کے مطابق رجو کو ابھی تک طلاق نہیں ہوئی تھی بلکہ دونوں خاندان بہت سارے اختلافی موضوعات لیے ایک دوسرے کو چت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جس لڑکی کی شادی کو صرف ایک سال ہوا ہو اور وہ شادی کے ایک ماہ بعد ہی میکے آ گئی ہو، اس کے دل کا حال جاننے کے لیے انسان کا عالم فاضل یا سائنس داں ہونا ضروری نہیں۔ میں نے اسی نازک پہلو کو چھیڑنے کی کوشش کی۔

''یوسف!'' میں نے متوفی رجو کے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ ایک سال پہلے تم نے رجو کی شادی کر دی تھی؟''

''آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے جناب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اپنی اپنی قسمت کی بات ہے جناب......!''

وہ اتنا بتا کر اچانک خاموش ہو گیا تو میں نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی پوچھ لیا۔ ''کیا ہوا یوسف...... تم بولتے بولتے رک کیوں گئے...... کس کی قسمت کی بات کر رہے ہو تم؟''

''رجو کی جی......'' وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ ''وہ صرف ایک ماہ اپنے خاوند کے گھر میں رہی اور اس کے بعد سے ادھر ہی پڑی ہوئی تھی اور اب تو......'' وہ ایک بار پھر بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

''ہوں......!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس کی واپسی کی وجہ؟''

''وجہ کوئی نہیں جی......'' یوسف کے بجائے اس کی بیوی جیراں نے بیزاری سے بتایا۔ ''رجو کی ساس بہت تیز عورت ہے۔ میں تو پہلے ہی وہاں رجو کی شادی کے لیے تیار نہیں تھی لیکن کسی نے میری ایک نہیں مانی اور میری بچی کو جہنم میں پھینک دیا......''

بات کے اختتام پر جیراں نے شکایتی نظر سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ میں ساری کہانی فوراً سمجھ گیا۔ یقیناً رجو کی شادی یوسف کے ایما پر ہوئی تھی جبھی وہ اپنے گھر والے کو آنکھیں دکھا کر اس شادی کی ناکامی کا ذمے دار قرار دے رہی تھی۔ ایسا عموماً ہوتا ہے۔ اگر باپ اپنے رشتے داروں میں اولاد کی شادی کر دے یا ماں اپنے خاندان میں اپنے بچوں کی شادی کر دے اور بدقسمتی سے وہ شادی چل نہ سکے تو اس کا سارا الزام اسی شخص پر آ جاتا ہے جس کی مرضی سے وہ شادی ہوئی ہوتی ہے۔

''اگر لڑکے کی ماں بہت تیز ہے تو یہ بات تو آپ لوگوں کو پہلے سے پتا ہوگی نا!'' میں نے یوسف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ لوگ تمہارے رشتے دار ہیں؟''

''اللہ نہ کرے جی وہ لوگ ہمارے رشتے دار ہوں۔'' جیراں ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ''وہ لوگ تو خاندانی کمہار ہیں جناب......'' رک کر اس نے اپنے خاوند کی طرف دیکھا اور کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

''یوسف! تم بتاؤ تھانے دار کو ساری بات۔ میں عورتوں

کے پاس جارہی ہوں۔ رجو تو جوان جہان چلی گئی۔ اب اس کے افسوس کے لیے آنے والوں کو بھی تو دیکھنا ہے نا......"

بات ختم کرتے ہی وہ کمرے سے نکل گئی۔ جیراں نے رجو کی سسرال والوں کے لیے "کمہار خاندان" کے الفاظ اس طرح استعمال کیے تھے جیسے خود وہ اعلیٰ حسب نسب رکھتی ہو۔ بہرحال، میں اس کے تبصرے کو نظرانداز کرکے یوسف کی جانب متوجہ ہوگیا۔

"تو رجو کی سسرال والے تمہارے رشتے دار نہیں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کمہار ہیں اور ہم ماچھی۔" وہ بڑی سادگی سے بولا۔ "رشتے داری تو اس شادی کے ذریعے ہی ہوئی تھی تھانے دار صاحب جو ایک ماہ سے زیادہ نہیں چل سکی۔ ویسے حنیف کے باپ سے میری اچھی خاصی دوستی تھی...... اس رشتے کی وجہ سے اس دوستی میں بھی دراڑ آگئی ہے۔"

"یہ حنیف کون ہے؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"میں رجو کے گھر والے کی بات کررہا ہوں جی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "بہت ہی بی با بچہ ہے جناب۔ میں نے حنیف اور اس کے باپ دین محمد کے منہ کے پیچھے رجو کی شادی اس گھر میں کردی تھی لیکن حنیف کی ماں نے میری بچی کو ایک ماہ بھی وہاں نہیں ٹکنے دیا......"

"مطلب یہ کہ آپ لوگوں کی واقعی ان لوگوں سے رشتے داری نہیں ہے؟" میں نے اتمام حجت کے طور پر پوچھ لیا۔

"جی بالکل نہیں۔" وہ قطعی لہجے میں بولا۔ "دین محمد سے میری اچھی خاصی دوستی تھی مگر آج کل اس سے بھی ناراضی چل رہی ہے اور وجہ یہی رجو کی شادی تھی اور...... اب تو رجو ہی نہیں رہی......" وہ ایک افسردہ سی سانس خارج کرکے خاموش ہوگیا۔

رجو کی بے جوڑ شادی نے اس کے والدین کو گہرے رنج والم میں ڈال دیا تھا اور اب جو اس نے خودکشی کرکے اپنی جان لی تھی تو اس کے بعد تو گویا بوڑھے یوسف اور جیراں کی کمر ہی ٹوٹ گئی تھی۔ میرے لیے یہ جاننا بہت ضروری تھا کہ رجو اپنی سسرال میں بس کیوں نہیں سکی تھی۔ اگر اس کی شادی کی ناکامی کا راز پتا چل جاتا تو میں خودکشی والے معاملے کو بھی بڑی آسانی سے حل کرسکتا تھا۔ ان دونوں معاملات میں کوئی لنک ضرور پایا جاتا تھا۔

"یوسف! تم نے بتایا ہے اور اس سے پہلے تمہاری بیوی جیراں بھی کہہ گئی ہے کہ رجو کی ساس بہت ہی تیز عورت ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس کی تیزی اور طراری کی نوعیت کیا ہے جو اس نے تمہاری بیٹی کو ایک ماہ بھی اپنے پاس ٹکنے نہیں دیا؟"

"ایک تو وہاب بی بی زبان کی بہت تیز ہے۔" وہ رجو کی ساس کے بارے میں بتانے لگا۔ "غصہ تو اس کی ناک پر رکھا رہتا ہے۔ پھر اس کی سات بیٹیاں بھی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اپنی ماں سے کم نہیں......"

"اوہ...... سات بیٹیاں......" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "تو حنیف کی سات بہنیں ہیں اور اس کے بھائی کتنے ہیں؟"

"بھائیوں میں وہ اکلوتا ہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن اس کی سات بہنیں ستر بھائیوں کے برابر ہیں۔ تین اس سے بڑی اور چار چھوٹی ہیں لیکن ابھی شادی کسی کی بھی نہیں ہوئی......"

"اوہ...... یہ تو اور بھی خطرناک بات ہے۔" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ "جس گھر میں جوان بہنیں کنواری بیٹھی رہیں اور ان سے چھوٹے بھائی کی شادی ہوجائے، وہاں اس گھر کی بہو کے لیے اس قسم کے مسائل پیدا ہوہی جاتے ہیں۔"

"اگر چھوٹے موٹے مسائل ہوتے تو میری رجو گھبرانے والی نہیں تھی تھانے دار صاحب۔" وہ ٹوٹی ہوئی آواز میں بولا۔ "کام کاج اور خدمت گزاری میں یہ کسی سے کم نہیں لیکن وہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ جس کی جتنی بھی دیکھ بھال کرلو، وہ کتے کی دم کی طرح ٹیڑھا ہی ہے......"

"یہ تو کتے کی دم سے بھی ٹیڑھا معاملہ لگتا ہے۔" میں نے کہا۔

"جی ہاں...... وہاب بی بی اور اس کی ساتوں بیٹیاں ایسی ہی ہیں۔" وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "زبانی کلامی زیادتی کی بات ہوتی تو رجو خندہ پیشانی سے برداشت کرلیتی لیکن وہ شیطان کی چیلیاں تو حد سے گزر گئی تھیں۔ آپ کو پتا ہے، ایک دن انہوں نے کیا کیا تھا؟"

"نہیں پتا...... تم بتاؤ......" میں نے کہا۔

میں دانستہ ہلکے پھلکے، دوستانہ انداز میں اس سے بات چیت کررہا تھا تاکہ وہ غم کے حلقے سے باہر آسکے۔ میں رجو کو دوبارہ زندہ تو نہیں کرسکتا تھا لیکن کسی بھی نفسیاتی ٹریٹمنٹ سے اگر میں ان کے دکھ کو کم کرسکتا تھا تو یہ بھی خاصا مثبت طرزعمل ہوتا۔

"ان لوگوں نے ایک گہری سازش کے تحت رجو کو جلانے کی کوشش کی تھی۔" یوسف نے بتایا۔ "وہ تو رجو کی قسمت اچھی تھی کہ اس کی آنکھ کھل گئی ورنہ بستر کے ساتھ ہی جل کر راکھ ہو جاتی۔"

"اوہ...... یہ تو واقعی افسوس ناک بلکہ قابلِ دخل اندازیٔ پولیس واقعہ ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "یہ لوگ تو مجھے جرائم پیشہ لگتے ہیں۔"

"جناب، اسی لیے تو ہم نے اس واقعے کے بعد رجو کو وہاں نہیں بھیجا تھا۔" وہ دکھی لہجے میں بولا۔ "ہم اپنے جگر کے ٹکڑے کو کس طرح جہنم میں پھینک دیتے۔"

اس کے بعد وہ رجو کو جلانے کی کوشش والے واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔ پچھلی سردیوں میں، لگ بھگ ایک سال پہلے یعنی شادی کے ایک ماہ بعد ایک رات رجو کی نندوں نے سوتے میں اس کے بستر کو آگ لگا دی تھی۔ آگ کی تپش اور دھوئیں کی گھٹن کے باعث رجو کی آنکھ کھل گئی اور وہ ہڑبڑا کر بستر سے باہر نکل آئی تھی۔ اگر پانچ دس منٹ تک وہ سوتی رہ جاتی تو پھر اس کی آنکھ اگلے جہان میں پہنچنے کے بعد ہی کھلنا تھی۔ اس واقعے نے رجو کے اعصاب پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا اور ہر وقت اسے اپنی سلامتی کا دھڑکا لگا رہنے لگا تھا۔ اس نے یہ واقعہ جب اپنے والدین کو سنایا تو یوسف کی شفقتِ پدری اور جیراں کی مامتا نے زور مارا اور انہوں نے رجو کو اپنے پاس روک لیا تھا۔

وہ یہ تفصیل ختم کر چکا تو میں نے پوچھا۔ "اس خطرناک اور سنگین صورت حال میں رجو کے شوہر حنیف کا رویہ کیا رہا...... وہ اپنی بیوی کی حمایت میں کچھ بولا کہ نہیں؟"

"اگر اس لڑکے میں اتنی ہمت اور جرأت ہوتی تو پھر دکھ کس بات کا تھا تھانے دار صاحب!" وہ زخمی لہجے میں بولا۔ "وہ اپنی ماں کا مرید ہے اور چھوٹی بڑی سات بہنوں کا منّا۔ یہ سب لوگ اسے اپنے اشاروں پر نچاتی ہیں۔ اس گھر میں صرف ایک دین محمد ہی معقول آدمی ہے جس کی وجہ سے میں نے رجو کا رشتہ وہاں کر دیا تھا اور جہاں تک حنیف کا تعلق ہے تو......" لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"یہ لڑکا ہے تو شریف بچہ۔ کسی عیب نقص میں بھی نہیں ہے۔ اس کا اخلاق اور کردار بھی بہت اچھا ہے مگر ذہنی غلامانہ ہے۔ بہت ہی ڈرپوک اور بزدل ہے۔ اپنے فیصلے خود نہیں کر سکتا۔ ماں اور بہنوں نے جو کہہ دیا بس اس کی نظر میں وہی قرآن اور حدیث کا لکھا ہے۔ مجال ہے، جوان کی خواہش اور حکم کے سامنے وہ "چوں" بھی کر جائے۔"

"بیویوں کے غلاموں کے تو بہت قصے سنے تھے مگر بہنوں اور ماں کے غلام کا یہ قصہ بھی نرالا ہے۔" میں نے کہا پھر پوچھا۔ "رجو لگ بھگ ایک سال سے اپنے میکے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کیا اس دوران میں اس کی سسرال والوں میں سے کسی نے اسے آ کر لے جانے کی کوشش نہیں کی؟"

"وہاب بی بی اور اس کی سات خبیث بیٹیوں نے تو شکر کیا تھا کہ رجو ان کی نظروں سے دور ہو گئی۔" یوسف ماچھی نے بتایا۔ "البتہ دین محمد نے دو تین مرتبہ اس بگڑی کو بنانے کی کوشش کی تھی لیکن ہم نے صاف انکار کر دیا۔ میں نے اس کے سامنے یہ مطالبہ رکھا تھا کہ پہلے اس مسئلے کو حل کرے جس کی وجہ سے رجو کو اس گھر سے باہر قدم نکالنا پڑا۔ جب تک وہ اپنی بیوی اور بیٹیوں کی اصلاح نہیں کرتا اور انہیں بندے دی پچھان نہیں بنا دیتا، ہم رجو کو نہیں بھیجیں گے۔"

"تو کیا دین محمد نے آپ کا مطالبہ مان لیا تھا؟"

"نہیں جی، اگر ایسا ہو جاتا تو رجو اس وقت اپنے شوہر کے ساتھ راضی خوشی زندگی گزار رہی ہوتی۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہی وجہ ہے کہ ہم نے رجو کو دوبارہ اس جہنم میں جھونکنے کی غلطی نہیں کی۔"

"کیا دین محمد کمہار بھی ادھر قادر آباد ہی میں رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جی، وہ لوگ ریلوے لائن کے اس پار دوسرے محلے میں رہتے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "ان کی رہائش فیض پورہ میں ہے۔"

موضع قادر آباد جیسا کہ میں نے شروع میں بھی ذکر کیا ہے...... نیم پختہ سڑک اور ریلوے لائن کے درمیان، میرے تھانے سے لگ بھگ دو میل کے فاصلے پر واقع تھا اور فیض پورہ ریلوے لائن کی دوسری جانب۔ یہ ریلوے کا مین ٹریک تھا جو نیم پختہ سڑک کے متوازی شمالاً جنوباً رواں دواں تھا۔ اسی نیم پختہ سڑک کے کنارے میرا تھانہ واقع تھا۔

"یوسف! تمہاری باتوں سے تو میں یہی سمجھ پایا ہوں کہ رجو اور حنیف میں میاں بیوی کا رشتہ ابھی تک برقرار تھا۔" میں نے کہا۔ "یعنی نوبت طلاق تک نہیں پہنچی تھی۔ وہ دونوں علیحدگی کی زندگی گزار رہے تھے؟"

"جی ہاں، یہی حقیقت ہے۔" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "واقعی، قانون اور شریعت کی رو سے وہ میاں بیوی ہی تھے۔ نہ تو ابھی تک حنیف نے رجو کو طلاق دی تھی اور نہ ہی ہماری جانب سے ایسا کوئی مطالبہ کیا گیا تھا۔"

"جب وہ دونوں رجو کی موت تک "میاں بیوی" تھے تو پھر اس عظیم سانحے پر حنیف کی طرف سے کیا ردِعمل آیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "یہ تو ممکن نہیں کہ فیض پورہ والوں کو ابھی اس واقعے کی خبر نہ ہوئی ہو......"

"رجو کی موت کی خبر تو آلے دوالے کے ہر گاؤں تک پہنچ چکی ہے تھانے دار صاحب۔" اس نے دکھی لہجے میں کہا۔ "لیکن ابھی تک حنیف یا اس کے گھر والوں میں سے کوئی ادھر نہیں آیا......"

"ہوں......" میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

یہ ایسا موقع تھا کہ کم از کم حنیف کو تو یوسف کے گھر آنا چاہیے تھا۔ دونوں خاندانوں کا لڑائی جھگڑا اور اختلافات اپنی جگہ مگر اپنی آخری سانس تک رجو حنیف کی بیوی تھی۔ اس کا اخلاقی فرض بنتا تھا کہ وہ پہلی فرصت میں یہاں پہنچتا۔ پھر قادر آباد، فیض پورہ سے کوئی کوسوں میل کے فاصلے پر بھی واقع نہیں تھا جو وہاں اس واقعے کی اطلاع پہنچنے میں یا وہاں سے کسی کو یہاں آنے میں مہینے لگ جاتے۔ دونوں موضعات کے درمیان ایک ریلوے لائن ہی تو تھی۔

میں دس پندرہ منٹ تک مزید یوسف ماچھی کے پاس بیٹھا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ جس حد تک ممکن تھا، میں نے اس کی دل جوئی بھی کی تھی۔ جب میں اس کے گھر سے باہر نکلا تو اس نے منت ریز لہجے میں پوچھا۔

"تھانے دار صاحب! رجو کی لاش کب تک ہمیں مل جائے گی؟"

میں نے آج یہاں پہنچتے ہی، موقع کی ضروری کارروائی کے بعد رجو کی لاش کو حوالدار خادم حسین کی نگرانی میں پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوا دیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ کل کسی وقت ہی حاصل ہو سکتی تھی اور لاش کا امکان پرسوں تک تھا لہٰذا انہی حقائق کی روشنی میں، میں نے یوسف ماچھی کے سوال کا جواب دے دیا۔

"یوسف! تم اپنے ذہن میں پرسوں دوپہر رکھو...... یہ بھی ممکن ہے کہ پرسوں صبح ہی رجو کی لاش اسپتال سے واپس آ جائے۔"

"ٹھیک ہے جی۔" وہ بڑی فرماں برداری سے بولا۔ "میں پرسوں عصر اور مغرب کے بیچ رجو کے کفن دفن کا بندوبست کرتا ہوں جناب......"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور یوسف ماچھی کے گھر سے نکل آیا۔

تھانے واپسی سے پہلے میں نے قادر آباد میں گھوم پھر کر رجو کے حوالے سے مختلف لوگوں سے سن گن لینے کی کوشش کی تاکہ کوئی نئی یا کام کی بات معلوم ہو سکے لیکن آدھے گھنٹے کی پوچھ تاچھ کے باوجود بھی کوئی مثبت نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ میں تانگے میں بیٹھا اور تھانے آ گیا۔

اب میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنے تک اندھیرے میں تھا۔ یہ رپورٹ ہی اس کی موت کے راز کا پردہ چاک کر سکتی تھی۔ کوئی بھی شخص خوامخواہ بیٹھے بٹھائے اپنی جان کا دشمن نہیں ہو جاتا۔ خودکشی کرنے والے شخص کے سامنے اپنی جان لینے کا بڑا مضبوط جواز ہوتا ہے۔ وہ جواز دنیا والوں کے لیے کتنا ہی احمقانہ کیوں نہ ہو۔ جب انسان کے لیے زندہ رہنا ممکن نہیں رہتا تبھی وہ موت کو گلے لگانے کا فیصلہ کرتا ہے۔

اگر یہ سمجھ لیا جاتا کہ رجو نے ناکام ازدواجی زندگی سے تنگ آ کر اپنی زندگی کا چراغ گل کر لیا تھا تو بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس کی ازدواجی زندگی کا تو ایک سال پہلے ہی ستیاناس ہو گیا تھا۔ یہ سوچنا منطقی طور پر درست نہیں تھا کہ رجو نے اپنے حالات سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لی تھی۔ اگر ایسا فرض بھی کر لیا جاتا تو یہ کام اسے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔

ایک سبب خودکشی کا کوئی حالیہ ناخوش گوار واقعہ بھی ہو سکتا تھا۔ یعنی ابھی ماضی قریب میں چند روز پہلے کچھ ایسا ہوا ہو جو رجو کے لیے ذہنی اور قلبی لحاظ سے ناقابل برداشت ہو اور اس نے ان ناگفتہ بہ حالات سے فرار حاصل کرنے کے لیے موت میں پناہ ڈھونڈ لی ہو......

آئندہ روز میں نے صبح ہی صبح اپنے عملے کے ایک بندے کو بھیج کر فیض پورہ سے حنیف اور اس کے باپ دین محمد کمہار کو تھانے بلوا لیا۔ ان لوگوں کا انٹرویو بھی بہت ضروری تھا تاکہ پتا تو چلے کہ رجو کی موت نے اس کے شوہر اور سسر پر کیا اثرات مرتب کیے تھے۔

حنیف کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد اور بھرے بھرے جسم کا مالک ایک سیدھا سادہ شخص تھا۔ رنگ گندمی اور سر کے بال سیاہ گھنگرالے۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر ایک خاص قسم کی سادگی پائی جاتی تھی جبکہ اس کے باپ دین محمد کی عمر ساٹھ سے متجاوز نظر آتی تھی۔ وہ خمیدہ کمر والا ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی جھلکتی تھی۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "یہ رجو کے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہے......؟"

"اس بچی نے چھت سے لٹک کر اپنی جان دے دی ہے تھانے دار صاحب۔" دین محمد نے افسردہ لہجے میں بتایا۔

"یہ تو مجھے بھی پتا ہے دین محمد بلکہ قادر آباد اور فیض پورہ کے علاوہ آس پاس کے سارے گاؤں تک رجو کی خودکشی کی خبر پہنچ چکی ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں نے یہ سننے کے لیے تم لوگوں کو تھانے نہیں بلایا...... میں حقائق جاننا چاہتا ہوں۔"

"حقائق......؟" دین محمد نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی کہ اس دوران میں حنیف گپ چپ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ بھی میری آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ بیمار مرغے کے مانند گردن ڈالے ایک طرف خاموش بیٹھا تھا۔

"ہاں...... میں رجو کی موت کی حقیقت تک پہنچنا چاہتا ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور اس حقیقت تک تم لوگ مجھے پہنچاؤ گے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ رجو نے خودکشی کیوں کی؟"

"یہ بات آپ یوسف اور جیراں سے پوچھیں جی۔" دین محمد نے کہا۔ "وہ ایک سال سے انہی لوگوں کے پاس بیٹھی ہوئی ہے۔ اگر رجو نے ہمارے گھر میں خودکشی کی ہوتی تو آپ ہم سے یہ سوال کرسکتے تھے۔"

"رجو اگر ایک سال سے اپنے میکے میں بیٹھی ہوئی تھی تو اس میں بھی تم لوگوں ہی کا قصور ہے نا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تمہاری بیوی اور سات بیٹیوں نے اس بے چاری کو سسرال میں سکھ کا سانس ہی کب لینے دیا تھا۔"

"میں مانتا ہوں، میری گھر والی وہاب بی بی زبان کی تھوڑی تیز ہے۔" دین محمد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ انسان روٹھ کر اپنے شوہر کا گھر ہی چھوڑ دے...... سسرال میں ہر قسم کے حالات کا سامنا کرتے ہوئے نباہ کرنا پڑتا ہے تھانے دار صاحب...... آپ سیانے بیانے ہیں۔ میری بات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔"

"بالکل سمجھ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "نباہ کرنے والی بات ہر معقول آدمی کی سمجھ میں آجائے گی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ رجو اپنی ساس کی زبان درازی کی وجہ سے سسرال چھوڑ کر میکے نہیں جا بیٹھی تھی۔ اس کے اس فعل کی کوئی اور وجہ تھی۔"

دین محمد نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

"کون سی وجہ جی......؟"

"اسے یوسف اور جیراں نے اپنے پاس روک لیا تھا۔" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس میں رجو کی کم اور اس کے والدین کی مرضی زیادہ شامل تھی۔"

"تو پھر سارا قصور اس کے ماں باپ کا ہوا نا......؟" دین محمد نے مجھ پر چوٹ کرنے والے انداز میں کہا۔

"نہیں......" میں نے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے کہا۔ "قصور یوسف اور جیراں کا نہیں بلکہ تمہاری بیوی، تمہاری بیٹیوں، تمہارے بیٹے اور سب سے بڑھ کر تمہارا قصور ہے دین محمد......!"

"میرا قصور......" وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ "میں نے کیا کیا ہے تھانے دار صاحب؟"

"تم اپنے گھر کے سربراہ ہو دین محمد!" میں نے اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ "تمہارے گھر میں دن رات کیا ہو رہا ہے، اس کی تمہیں خبر ہونا چاہیے۔ ہونا چاہیے یا نہیں؟"

"جی بالکل ہونا چاہیے......" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اور مجھے ہے خبر۔"

"تمہیں خاک بھی خبر نہیں ہے دین محمد۔" میں نے ترش لہجے میں کہا۔ "اگر تمہارا گھر کے معاملات پر دھیان ہوتا تو پھر کوئی بھی خرابی نہیں ہونا تھی۔ آج رجو اپنے گھر میں راضی خوشی رہ رہی ہوتی اور اللہ کے کرم سے یہ لوگ ابھی تک دو سے تین بھی ہو چکے ہوتے......"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار صاحب۔" وہ مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن ایسا نہ ہونے میں آخر میرا قصور کیا ہے؟"

"تمہارے قصور لاتعداد ہیں مگر ان میں سب سے بڑا قصور فرائض سے غفلت برتنا ہے۔"

"میں نے کون سی غفلت برتی ہے جناب والی......؟" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اگر تمہاری آنکھیں کھلی ہوتیں تو تمہیں پتا ہوتا کہ اس گھر میں تمہاری بیوی اور بیٹیاں رجو پر کون کون سے ظلم کے پہاڑ توڑ رہی تھیں۔ زیادتی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے...... ایسی بھی کیا دشمنی کہ تمہاری بیٹیوں نے اس بیچاری کو جلا کر مارنے کی بھی کوشش کر ڈالی......" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تو رجو کی قسمت اچھی تھی کہ زندہ بچ گئی۔ اگر آگ

کی تپش اور دھوئیں کی مخصوص گھٹن سے اس کی آنکھ نہ کھلتی تو ایک سال پہلے ہی اس کی موت واقع ہو چکی ہوتی......"

"تھانے دار صاحب! یہ حقیقت نہیں ہے۔" دین محمد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔"وہ ایک اتفاقیہ حادثہ تھا۔ کوئلوں والی دہکتی ہوئی انگیٹھی رجو کی چارپائی کے قریب پڑی تھی۔ لحاف کا کونا انگیٹھی میں گرا تو اس نے آگ پکڑ لی۔ میری بیٹیوں نے تو آگ بجھانے میں بھرپور مدد کی تھی۔"

"ابا بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" حنیف نے یکبارگی کہا۔"میں اس وقت رجو کے برابر والی چارپائی پر سویا ہوا تھا۔ جب یہ ہڑبڑا کر اٹھی تو اس کا شور سن کر میری آنکھ بھی کھل گئی۔ میں نے ہی چلا چلا کر سب کو اس طرف متوجہ کیا تھا۔ میری بہنیں فوراً بھاگی ہوئی آئیں اور ہم سب نے مل کر آگ بجھائی تھی۔ اللہ کا شکر کہ رجو کی جان بچ گئی تھی۔"

"برخوردار!" وہ خاموش ہوا تو میں نے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔"کیا تمہارے منہ میں زبان بھی ہے؟"

وہ میرے طنز کی تہ تک نہیں پہنچا اور جلدی سے منہ کھول کر مجھے زبان دکھاتے ہوئے بولا۔"جی، تھانے دار صاحب۔ میں گونگا نہیں ہوں...... یہ دیکھیں میری زبان۔"

"اگر گونگے نہیں ہو تو بیمار جانور کی طرح گردن جھکا کر چپ چاپ کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟" میں نے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا۔"اتنی دیر سے یہاں تمہاری بیوی کا قصہ چل رہا ہے اور تم خاموش بیٹھے ہو...... کیوں؟"

وہ اپنی دانست میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔"ابا جی بول رہے تھے نا...... اس لیے میں چپ بیٹھا تھا۔"

"اور پچھلا پورا سال بھی تم نے چپ بیٹھے بٹھائے ہی گزار دیا...... ہیں نا؟" میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔"ایک بار بھی تمہیں اپنی بیوی کا خیال نہیں آیا۔ اگر تمہاری بات کو سچ مان لیا جائے کہ رجو روٹھ کر میکے جا بیٹھی تھی تو تمہارا فرض بنتا تھا اس کو منا کر لانے کا...... بنتا تھا کہ نہیں......؟"

"میں نے کئی بار کوشش کی اسے واپس لانے کی......" وہ لنگڑی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔"لیکن اس کے گھر والے ہی نہیں مانے۔ انہوں نے عجیب وغریب مطالبہ کر دیا تھا۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔"کیسا مطالبہ؟"

"رجو کی ماں کا مطالبہ تھا کہ میں اپنے ماں باپ کو چھوڑ دوں۔" حنیف نے بتایا۔"چاچی جیراں اور چاچا یوسف کی خواہش تھی کہ میں رجو کے ساتھ الگ گھر میں رہوں......"

حنیف کی آنکھیں اور چہرے کے تاثرات اس کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ مجھے بہت واضح طور پر محسوس ہوا کہ وہ دروغ گوئی سے کام لے رہا تھا۔ میں کل ہی رجو کے ماں باپ سے بھی ایک بھرپور ملاقات کر کے آیا تھا۔ دنیا کے کوئی بھی والدین نہیں چاہتے کہ ان کی شادی شدہ بیٹی آکر گھر بیٹھ جائے لیکن اگر دنیا کے کسی بھی والدین کو یہ یقین ہو جائے کہ سسرال میں ان کی بیٹی کے لیے جان کا خطرہ ہے تو پھر وہ کسی بھی قیمت پر اسے میکے سے جانے نہیں دیتے اور یہ ان کا حق اور دانش مندی کا مظاہرہ بھی ہے۔

اسی تناظر میں، میں نے حنیف سے پوچھا۔"تم جھوٹ بول کر مجھے چکر دینے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہو؟"

"نہیں جی...... بالکل نہیں۔" وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔"اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں آرہا تو آپ ابا جی سے پوچھ لیں......"

"ابا جی سے کیوں پوچھوں۔" میں نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا۔"میں رجو کے باپ اور اس کی ماں سے کیوں نہ پوچھوں۔ اگر تم رجو کو منانے اور واپس لانے کے لیے وہاں گئے ہو گے تو انہیں زیادہ پتا ہو گا یا تمہارے ابا جان کو......؟"

وہ نگاہ چرا کر ادھر اُدھر تکنے لگا جس کا یہی مطلب تھا کہ اس نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ میں مزید دس منٹ تک ان دونوں باپ بیٹے کو مختلف زاویوں سے گھستا رہا پھر اس تنبیہ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔"جب تک یہ کیس حل نہیں ہو جاتا، تم قصبہ پورہ سے باہر نہیں جاؤ گے۔"

☆☆☆

پوسٹ مارٹم رپورٹ اسی شام موصول ہو گئی۔ اگرچہ یہ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ تھی لیکن اسے سنسنی خیز اور تہلکہ مچا دینے والی رپورٹ کہا جائے تو انصاف ہو گا۔ اس رپورٹ نے مجھے بہت دیر تک اور دور تک سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق متوفی رضیہ عرف رجو کی موت رات دس اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور سنسنی خیز پہلو اس رپورٹ کا یہ تھا کہ وہ اپنی موت کے وقت دو ماہ کی حاملہ تھی۔ علاوہ ازیں اس کے معدے اور خون کے ٹیسٹ سے یہ بھی پتا چلا تھا کہ اس کے جسم میں زہر کی ایک خاص مقدار بھی پہنچائی گئی تھی۔ رجو کی موت درحقیقت اس زہر کے باعث ہوئی تھی یا پھانسی کے پھندے کے سبب، یہ فیصلہ کرنا خاصا مشکل تھا۔ تاہم موت کا وقت

بڑے وثوق کے ساتھ دس اور بارہ بجے کے درمیان ہی بتایا گیا تھا۔

یہاں پر، رجو کی موت کے بارے میں دو انداز میں سوچا جاسکتا تھا۔ نمبر ایک...... اس نے موت کو گلے لگانے کے لیے زہر کھایا اور پھر اس خیال سے کہ شاید یہ زہر اس کے مقصد کو پورا کرنے میں کامیاب نہ رہے، اس نے خود کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا۔ یعنی ہر دو صورت میں اس نے زندگی کی قید سے رہائی حاصل کرنا تھی۔

نمبر دو...... اس نے از خود زہر نہ کھایا ہو بلکہ کسی نے اسے کھانے میں زہر ملا کر دے دیا ہو اور اس خیال سے کہ شاید وہ زہر اس کی زندگی کا کام تمام نہ کر پائے، اس کی موت کو یقینی بنانے کے لیے اسے پھانسی بھی دے ڈالی اور وہ شخص اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گیا۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ رجو کی زندگی کا خاتمہ کیوں ضروری ہو گیا تھا؟ اس سلگتے ہوئے سوال کا جواب پوسٹ مارٹم رپورٹ کے اندر موجود تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ چیخ چیخ کر اس امر کا اعلان کر رہی تھی کہ اپنی موت کے وقت رجو دو ماہ کے حمل سے تھی۔ یہ نہایت ہی سنسنی خیز اور توجہ طلب انکشاف تھا۔ جو عورت پچھلے ایک سال سے اپنے میکے میں بیٹھی ہو اور اپنے شوہر سے اس کا کوئی ربط ضبط، میل ملاپ نہ ہو، اگر وہ حاملہ ہو جاتی ہے تو اس کے کردار سے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔

''کیا اس دوران میں رجو کسی نامحرم مرد سے ملتی رہی تھی اور اس خفیہ ملاپ کے نتیجے میں وہ حاملہ ہو گئی تھی؟''

یہ قیاس کرنا احمقانہ ہوتا کہ اس کے ساتھ جو بھی ہوا تھا، وہ خود بخود ہو گیا تھا۔ اس امر میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ خود بخود والے معجزے اب نہیں ہوا کرتے۔ اب دنیا میں جو بھی ہو رہا تھا اس کی ایک ٹھوس وجہ تھی۔ عقل انسانی اس وجہ تک رسائی رکھتی تھی اور مشکل سے مشکل عقدے کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ یعنی اگر کوئی عورت حاملہ ہوتی ہے یا کوئی بچہ جنم لیتا ہے تو اس بچے کا کوئی نہ کوئی باپ بھی ضرور ہوتا ہے، چاہے وہ باپ جائز ہو یا ناجائز......

رجو اگر دو ماہ کے حمل سے تھی تو اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ تنہائی میں کسی مرد کے ساتھ وقت گزار چکی تھی۔ پچھلے ایک سال سے رجو جس نوعیت کے حالات سے گزر رہی تھی اس کے مطابق وہ ''ذمے دار مرد'' اس کا شوہر حنیف تو ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔

''پھر وہ کون تھا......؟''

یہ ایک ایسا سوال تھا جو اپنے اندر پیاز کے مانند پرت در پرت لاتعداد سوالات رکھتا تھا۔ پیاز اور پیار میں صرف ایک نقطے کا فرق ہے۔ پیار میں اگر ایک نقطے کا اضافہ کر دیا جائے تو وہ پیاز بن جاتا ہے۔ جس طرح پیاز چھیلنے والے کو رلاتا ہے اسی طرح پیار بھی رلاتا ہے۔ نقطے کی اونچ نیچ کیا کیا گل کھلاتی ہے یہ سب جانتے ہیں۔ انسان محرم سے مجرم بن جاتا ہے۔

رجو بھی مجرم تھی کیونکہ اس کے پیٹ میں پھوٹنے والی کونپل کسی نامحرم سے ملاپ کا نتیجہ تھا۔ وہ نامحرم بھی مجرم تھا اور مجھے اسی نامحرم کو تلاش کرنا تھا لیکن اس سے پہلے ایک نہایت ہی اہم معاملہ طے کر لینا بھی ضروری تھا۔

''رجو نے خودکشی کی تھی یا اسے قتل کیا گیا تھا؟''

یہ ایک ایسا سوال تھا جو اپنے اندر دو جواب رکھتا تھا اور دونوں ہی منطقی اعتماد سے درست نظر آتے تھے۔

اول، یہ سوچا جاسکتا تھا کہ رجو نے خودکشی کی ہو گی۔ وہ ایک سال سے اپنے میکے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کسی مرد سے اس کا میل ملاپ ممکن نہیں تھا، مطلب یہ تھا کہ لوگوں کی نظر میں ممکن نہیں تھا اور ہماری زندگی میں لوگوں کی نظر کی بہت اہمیت ہے۔ ہم اسے کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بہت سی چیزوں کو ذہن میں رکھنا پڑتا ہے۔ یہ زندگی کوئی بچوں کا کھیل نہیں، ایک ایک سانس بہت احتیاط کے ساتھ لینا پڑتا ہے تاکہ اس نازک آبگینے کو ہمارے کسی عمل سے ٹھیس نہ لگ جائے۔

لوگوں کی نظر میں رجو کا حاملہ ہو جانا گناہ کے زمرے میں جاتا تھا اور گناہ تو آخر گناہ ہی ہوتا ہے۔ اس کا بوجھ زیادہ عرصے تک اٹھائے اٹھائے پھرنا ہما شما کے بس کی بات نہیں۔ رجو کو جب یہ احساس ہوا ہو گا کہ وہ اپنے فعل کو زیادہ عرصے تک دنیا والوں کی نگاہوں سے چھپا کر نہیں رکھ سکتی تو اس نے موت کو گلے لگانے ہی میں عافیت محسوس کی ہو گی۔ اب اس نے زہر کھانے کے بعد خود کو پھانسی دی یا پھانسی کا پھندا گلے میں ڈالنے کے بعد زہر کھایا، اس معاملے کو بعد میں بھی طے کیا جاسکتا تھا۔

دوم، ایک امکان یہ بھی تھا کہ رجو کو قتل کیا گیا ہو۔ اس کے کرتوت کی یوسف ماچھی اور اس کی بیوی جیراں کو خبر ہو گئی ہو۔ بیٹی کے کارنامے کو چھپانے کے لیے انہوں نے ملی بھگت سے رجو کو ٹھکانے لگا دیا ہو۔ ہمارا معاشرہ عجیب دوغلا معاشرہ ہے۔ اپنے گھر میں جو کچھ بھی ہوتا رہے، ہم اس پر پردہ ڈالتے رہتے ہیں اور دوسرے کے گھر میں اگر کچھ

نظر آجائے تو اس کو اچھالنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ ایسے معاملات میں والدین کی پوزیشن بہت نازک ہوتی ہے۔ وہ اپنی رسوائی اور جگ ہنسائی سے بچنے کے لیے کوئی بھی خطرناک اور سنگین قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ عین ممکن ہے، رجو کا گناہ کھل جانے کے بعد اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اسے دائمی نیند سلا دیا ہو۔

اس نظریے میں مجھے ایک خامی کھٹک رہی تھی اور وہ یہ کہ...... یوسف ماچھی یا اس کی بیوی جیراں یا دونوں باہمی مشاورت سے ایک حتمی فیصلے پر پہنچنے کے بعد زہر دے کر اس مصیبت سے نجات تو حاصل کر سکتے تھے لیکن یہ کام ان دونوں کے بس کا نہیں تھا کہ وہ مری ہوئی یا سوئی ہوئی یا بے ہوش رجو کو اٹھا کر پھانسی کے پھندے پر بھی لٹکا دیتے۔

اس حوالے سے ذہن رجو ہی کی طرف جاتا تھا کیونکہ ان دونوں میاں بیوی نے مجھے بتایا تھا کہ جب وقوعہ کی صبح رجو حسب معمول بیدار نہیں ہوئی تو انہوں نے اسے جگانے کی کوشش کی تھی۔ تب پتا چلا تھا کہ اس نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا رکھی ہے حالانکہ ان کے بیان کے مطابق رجو رات کو سونے سے پہلے کمرے کا دروازہ بھیڑ دیتی تھی مگر اس نے کبھی دروازے کو اندر سے کنڈی نہیں لگائی تھی۔ ان لوگوں نے دروازہ توڑ کر کمرے کے اندر رسائی حاصل کی تھی۔ اگر جیراں اور یوسف کے بیان میں صداقت تھی تو پھر رجو پھانسی کے پھندے پر لٹکنے کی خود ہی ذمے دار تھی۔

میرا دھیان ایک تیسرے امکان کی طرف بھی جا رہا تھا۔ جب انسان پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ سوچنے بیٹھتا ہے تو اس کی نگاہ میں نئی نئی راہیں کھلنے لگتی ہیں۔ شاید اسی لیے قادر مطلق نے اپنے مقدس کلام قرآن مجید میں انسانوں کو بار بار غور و فکر کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ غور و فکر انسان کی زندگی کی پیچیدہ سے پیچیدہ گتھی کو بھی کھول کر رکھ دیتا ہے۔ میرا ذہن بھی ایک نئے اور زیادہ متاثر کن انداز میں سوچ رہا تھا جو منطقی اعتبار سے بھی زیادہ قابلِ قبول نظر آتا تھا۔

یہ بھی تو ممکن تھا کہ رجو کے کارنامے کی اس کے ماں باپ کو خبر ہو گئی ہو۔ انہوں نے اسے لعن طعن کی ہو۔ وہ خود بھی اپنے کیے پر نادم ہو اور دونوں پارٹیوں نے اپنے اپنے طور پر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کر ڈالی ہو۔ سوئے اتفاق یہ کہ دونوں کی کارکردگی کا دن اور وقت آپس میں میچ کر گیا ہو...... نہیں سمجھے نا!

میں سمجھاتا ہوں...... دیکھیں، جب رجو کو خبر ہوئی کہ وہ اپنے کارنامے کو دنیا والوں کی نظر سے زیادہ عرصے تک چھپا کر نہیں رکھ سکتی تو اس نے موت کو گلے لگانے کا فیصلہ کر لیا اور اس فیصلے کے نتیجے میں اس نے خود کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا کر جان دے دی۔ دوسری جانب جب رجو کے ماں باپ کو اس کے کارنامے کی خبر ہوئی تو انہوں نے بدنامی اور رسوائی کے خوف سے رجو کو ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر لیا اور ایک رات اسے زہر دے دیا۔ اب یہ اتفاق ہو سکتا ہے کہ جس رات انہوں نے رجو کو زہر دیا اسی رات اس نے خود کو پھانسی پر لٹکانے کا فیصلہ کر رکھا تھا لہٰذا رجو دوہری موت کا شکار ہو گئی۔ ایک طرف خطرناک زہر نے کام کیا اور دوسری جانب پھندے نے اس کی سانس کو موقوف کر دیا۔ اس طرح اس کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ تینوں میں سے جو بھی بات درست تھی، اس کا فیصلہ تو تحقیق اور تفتیش کے بعد ہی کیا جا سکتا تھا لیکن ایک بات طے تھی کہ رجو اب اس دنیا میں باقی نہیں رہی تھی۔

اگر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں صرف یہ لکھا ہوتا کہ اس کی موت کا سبب پھانسی کا پھندا ہے تو شاید اس کیس میں مجھے زیادہ بھاگ دوڑ نہ کرنا پڑتی۔ کچھ ہی عرصے کے بعد اس کیس کی فائل داخلِ دفتر ہو جاتی اور اس کے بعد زندگی معمول پر آ جاتی۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ میں دو انتہائی خطرناک باتیں درج تھیں۔ نمبر ایک...... رجو کے معدے اور خون میں کسی خطرناک زہر کے اثرات پائے گئے تھے۔ یہ زہر اس نے خود کھایا تھا یا کسی اور نے اسے زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی تھی، اس کا فیصلہ بعد میں کیا جا سکتا تھا۔

نمبر دو...... اپنی موت کے وقت رجو دو ماہ کے حمل سے تھی۔ یہ بہت ہی نازک اور حساس نکتہ تھا اور مجھے ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب کر رہا تھا۔ وہ پوری رات میں نے اسی معاملے پر سوچ بچار میں گزار دی اور اگلی صبح پہلی فرصت میں قادر آباد کے لیے روانہ ہو گیا۔

میں اگر چاہتا تو جیراں اور یوسف ماچھی کو تھانے بلا کر بھی پوچھ تاچھ کر سکتا تھا لیکن میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا اور خود ان کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔

گاؤں دیہات میں صبح بہت جلدی ہو جاتی ہے۔ جب میں قادر آباد پہنچا تو لوگ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اپنے اپنے کام کاج میں مصروف ہو چکے تھے۔ کھیتوں میں کام کرنے والے مرد تو علی الصباح گھر سے نکل جاتے ہیں جب چاروں جانب اندھیرے کا راج ہوتا ہے۔

بعدازاں ان کی گھر والیاں ان کے لیے ناشتا پانی لے کر ادھر کھیتوں ہی میں پہنچ جاتی ہیں۔ منہ اندھیرے کھیتوں میں محنت اور مشقت کے بعد سورج اگنے پر گھر کا بنا ہوا، خالص خوراک پر مشتمل ناشتا بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اس کھانے کی لذت، غذائیت اور لطف کا کوئی مقابلہ نہیں۔

میں حوالدار خادم حسین کے ساتھ جب یوسف ماچھی کے گھر پہنچا تو ان میاں بیوی نے سوالیہ نظروں سے ہمارا استقبال کیا اور ان کی نگاہیں ہمارے عقب میں بھی کسی چیز کو تلاش کرتی دکھائی دیں، جلد ہی ان کی تلاش کا موضوع زبان پر بھی آ گیا۔

ہم گھر کے اندر جا کر بیٹھے ہی تھے کہ یوسف نے پوچھا۔ ''تھانے دار صاحب! رجو کی لاش نہیں آئی اب تک......؟''

''لاش بھی آ جائے گی دوپہر تک۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تو کچھ اور ہی آیا ہے......''

''کچھ اور کیا آیا ہے جی......'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

اس وقت میں اور یوسف ہی کمرے میں بیٹھے تھے۔ جیراں باہر عورتوں کے ساتھ مصروف تھی۔ آج چونکہ رجو کی تدفین بھی متوقع تھی لہٰذا تعزیت کے لیے آنے والوں کا بھی تانتا بندھا ہوا تھا۔ میں نے حوالدار خادم حسین کو باہر تانگے ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ فی الحال گھر کے اندر اس کی ضرورت نہیں تھی۔

یہ گھر رجو کی المناک موت کے بعد جس قسم کے حالات اور کیفیات سے گزر رہا تھا، اس کا تقاضا یہ تھا کہ ان لوگوں سے پوچھ گچھ کرتے ہوئے اپنے انداز کو نرم رکھا جائے لہٰذا میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یوسف! میں نے کل صبح حنیف اور اس کے باپ دین محمد کو تھانے بلایا تھا۔''

''کیا کہتے ہیں وہ؟'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

''ان کا کہنا یہ ہے کہ ان کی طرف سے رجو کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی یا ظلم نہیں کیا گیا۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''بلکہ آپ لوگوں نے زبردستی رجو کو اپنے گھر میں روک رکھا تھا۔ آپ لوگوں کا مطالبہ تھا کہ حنیف اپنے گھر والوں کو چھوڑ دے اور رجو کے ساتھ الگ گھر میں رہے۔''

''ان باپ بیٹے نے اگر ایسی بات کی ہے تو سراسر بکواس کی ہے۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''حقیقت کیا ہے، یہ پورا پنڈ جانتا ہے۔''

''کیا ان میں سے کوئی رجو کی موت پر تعزیت کرنے یہاں آیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی......'' یوسف ماچھی نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ''جس دن آپ آئے تھے نا، اسی شام حنیف اور دین محمد آئے تھے اور تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس چلے گئے تھے۔ اس کے بعد ان کی شکل دکھائی نہیں دی۔''

''وہ کیا کہہ رہے تھے؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''بس، اس واقعے پر افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ میں نے ان کی بات پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔''

''حنیف، رجو کی تدفین فیض پورہ میں تو نہیں کرنا چاہتا؟'' میں نے ایک خاص انداز سے پوچھا۔ ''کچھ بھی ہے...... لڑائی جھگڑا اور ناراضی اپنی جگہ مگر یہ بھی تو ایک حقیقت ہے نا کہ رجو اپنی آخری سانس تک حنیف کی بیوی تھی......''

میں دانستہ اس قسم کی ہلکی پھلکی باتیں کر کے یوسف کے غم کو کسی حد تک کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ اس کے بعد میں جس نوعیت کا سنگین انکشاف کرنے والا تھا، وہ اس کے دماغ کے پرخچے اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔

''تھانے دار صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''رشتے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو خونی رشتے کہلاتے ہیں یعنی ماں باپ، بھائی بہن۔ ان رشتوں پر انسان کا اختیار نہیں ہوتا۔ یہ قدرت کی طرف سے بنے بنائے ملتے ہیں۔ ان کو نبھانا بھی نہیں پڑتا۔ یہ خود ہی نبھتے چلے جاتے ہیں۔ ہم ہزار کوشش کر لیں لیکن ان خونی رشتوں کو ختم نہیں کر سکتے......''

یہاں تک بولنے کے بعد وہ متوقف ہوا تو میں حیرت اور دلچسپی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس دیہاتی کو دیکھتا چلا گیا۔ ان لمحات میں وہ خاصی دانش مندانہ باتیں کر رہا تھا۔

چند لمحات کے توقف کے بعد اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ''اور دوسرے رشتے وہ ہوتے ہیں جنہیں انسان زبانی اقرار سے قائم کرتا ہے جیسے میاں بیوی کا رشتہ...... ایسے رشتوں کو نبھانا پڑتا ہے اور یہ خاصا مشکل کام ہے۔ اس میں بڑی نزاکتیں ہیں۔ حنیف اور رجو کے بیچ جو رشتہ ایک سال پہلے قائم ہوا تھا، وہ کاغذی طور پر تو رجو کی موت تک برقرار تھا لیکن اصل میں میری نظر میں اس کی کوئی حیثیت یا

اہمیت باقی نہیں تھی......''

وہ ایک مرتبہ پھر رکا، دو چار گہری سانسیں لینے کے بعد بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اول تو حنیف نے ایسی کسی خواہش کا اظہار ہی نہیں کیا کہ وہ رجو کی تدفین فیض پورہ میں کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ ایسا کہتا بھی تو میں اس کی بات ماننے والا نہیں تھا۔ ان لوگوں نے رجو کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کے بعد تو حنیف اس کا شوہر کہلانے کا حق ہی کھو چکا ہے۔ اس معاملے میں ایک اور بھی خاص بات ہے تھانے دار صاحب......!''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کون سی خاص بات؟''

''قادر آباد اور فیض پورہ دو الگ گاؤں ضرور ہیں لیکن ان کے درمیان فاصلہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ بس بیچ میں ریل کی ایک پٹری ہی تو ہے۔ اِدھر قادر آباد، اُدھر فیض پورہ......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور ان دونوں گاؤں کا قبرستان ایک ہی ہے۔ رجو کو ہر صورت میں اسی قبرستان میں دفن ہونا ہے۔''

''یہ تم نے بہت پتے کی بات بتائی ہے یوسف!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''گویا، فرق صرف تجہیز و تکفین کا ہے......ورنہ تدفین کا مقام تو ایک ہی ہے۔''

''ٹھیک کہا آپ نے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''رجو کا کفن اور جنازہ قادر آباد سے اٹھے گا اور وہ اسی قبرستان میں میرے ماں باپ کی قبروں کے پہلو میں دفن کی جائے گی جہاں فیض پورہ کے مُردوں کو بھی دفن کیا جاتا ہے۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے اور سچی بات یہ ہے کہ کسی نے اعتراض کیا بھی نہیں......حنیف اور اس کے گھر والوں کی جانب سے ایسی کوئی بات سامنے آسکتی تھی اور انہوں نے تو شکر کیا ہوگا، رجو گئی، ان کی جان چھوٹی لیکن......''

وہ بولتے بولتے اچانک رکا تو میں سوال کیے بنا نہ رہ سکا۔ ''لیکن کیا یوسف؟''

''تھانے دار صاحب۔'' اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ سے رجو کی لاش کے بارے میں پوچھا تھا اور آپ نے جواب دیا تھا......لاش بھی آجائے گی۔ ابھی تو کچھ اور ہی آیا ہے...... میں نے پوچھا تھا......کچھ اور کیا آیا ہے مگر آپ نے میرے اس سوال کا جواب نہیں دیا ابھی تک......!''

بات مکمل کرنے کے بعد وہ سوالیہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔ اس کی حالت کو میں نے اِدھر اُدھر کی باتوں سے کافی حد تک نارمل کردیا تھا۔ اب ایسا موقع تھا کہ میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پر کھل کر اس سے بات کرسکتا تھا۔

''یوسف! وہ جو میں نے ''کچھ اور آنے'' کا ذکر کیا تھا نا......'' میں نے نہایت ہی معتدل انداز میں کہا۔ ''وہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہے......''

''پوسٹ مارٹم'' بہت ہی کام کا لفظ ہے۔ یہ معاملے کی سنگینی کو بڑی خوب صورتی سے چھپا لیتا ہے ورنہ عام بول چال میں اسے ''مُردے کی چیر پھاڑ'' کی رپورٹ کہا جانا چاہیے یا زیادہ سے زیادہ ''پوسٹ ماتم''۔ مگر پوسٹ ماتم سے بھی خاصی سنگینی جھلکتی ہے یعنی کہ ''کھال کا ماتم'' بہرحال لفظ ''پوسٹ مارٹم'' کے معنی بھی یہی ہیں۔

''اس رپورٹ میں کیا لکھا ہے تھانے دار صاحب؟'' یوسف نے تشویش بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

''لکھا تو بہت کچھ ہے......'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن اس میں تین باتیں بہت اہم ہیں یوسف!''

وہ ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''کون سی تین باتیں جناب......؟''

''نمبر ایک......'' میں نے بتانا شروع کیا۔ ''رجو کی موت وقوعہ کی رات دس اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے......''

''اس میں ایسی کون سی خاص بات ہے؟'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔

''تم تحمل اور توجہ سے سنو گے تو اس کے اندر سے بہت سی خاص اور خاص الخاص باتیں بھی نکل آئیں گی۔'' میں نے ہلکی سرزنش کی اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''دوسری اہم بات یہ ہے کہ رجو کو زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے......''

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں...... تھانے دار صاحب......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''میں نہیں کہہ رہا یوسف۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''یہ سچائی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں لکھی ہوئی ہے۔ رجو کے معدے اور خون میں ایک خطرناک زہر کے آثار پائے گئے ہیں اور میڈیکل ٹیسٹ کی رپورٹ پر شک نہیں کیا جاسکتا۔''

''مگر......مگر رجو نے تو پھانسی کا پھندا گلے میں ڈال کر جان دی ہے......'' وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے خود اپنی آنکھوں سے اس کی جھولتی ہوئی

لاش دیکھی ہے...... پھر یہ زہر والی کہانی کا کیا مقصد ہے؟"

"ایک بات کا یقین کرلو اور بہت اچھی طرح اس بات کو ذہن نشین کرلو کہ زہر والی بات کوئی قصہ کہانی نہیں ہے۔" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "میں نے بتایا نا، میڈیکل ٹیسٹ کی رپورٹ کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔" لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے کب اس بات سے انکار کیا ہے کہ جب میں جائے وقوعہ پر پہنچا تو رجو کی لاش پھانسی کے پھندے سے جھول رہی تھی۔ میں نے رجو، بے جان رجو کو پھانسی پر لٹکے ہوئے دیکھا ہے اور تمہاری مدد ہی سے میں نے اسے پھانسی سے نکال کر بستر پر لٹایا تھا یعنی اس کی لاش کو مگر......"

"مگر کیا؟" صورتِ حال اتنی سنسنی خیز ہوگئی تھی کہ وہ خود کو سوال کرنے سے نہ روک سکا۔

"مگر یہ کہ......" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ رجو کو ایک خطرناک زہر دیا گیا ہے۔"

"اس گھر میں صرف تین افراد رہتے تھے۔" وہ دکھی لہجے میں بولا۔ "رجو کی موت کے بعد میں اور جیراں باقی بچے ہیں۔ ہم اس کے ماں باپ ہیں۔ ہم اسے ایک ذرا سی بھی تکلیف پہنچانے کا نہیں سوچ سکتے، زہر کھلا کر موت کے گھاٹ اتارنا تو بہت دور کی بات ہے۔" وہ ایک لمحے کے لیے تھما پھران الفاظ میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"میں نے خود دروازہ توڑ کر اندر کا منظر دیکھا تھا تھانے دار صاحب۔ رجو کی لاش چھت سے لٹکی ہوئی تھی اور میں یہی سمجھ رہا ہوں کہ اس نے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال کر خودکشی کی ہے۔"

"لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ رجو کو ایسا سنگین قدم اٹھانے پر کس نے مجبور کیا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دور تک جھانکتے ہوئے کہا۔ "وہ کون سے عوامل تھے جن کی بنا پر اس نے موت کو گلے لگالیا......؟"

"واقعی، میں رجو کی موت کے سبب سے واقف نہیں ہوں۔" وہ بے بسی سے بولا۔ "میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا...... کچھ بھی نہیں۔"

اس کی حالت پر مجھے دکھ کے ساتھ ہی افسوس بھی ہورہا تھا لیکن یہ ایسا مرحلہ تھا کہ میں اپنے فرض کے ہاتھوں مجبور تھا۔ مجھے صورتِ حال کی سچائی یوسف ماچھی پر آشکار کرنا ہی تھی، چاہے اس سے اسے صدمہ پہنچتا یا خوشی، یہ کڑوا

گھونٹ مجھے ہر حال میں بھرنا ہی تھا۔

"تم تو کچھ نہیں جانتے یوسف مگر......" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "مگر پوسٹ مارٹم رپورٹ کو سب معلوم ہے۔"

"جی......" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"مم...... میں کچھ بھی نہیں سمجھا...... آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں......؟"

"میں صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے رجو کی موت کا سبب بہت واضح کردیا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جس وقت رجو کی موت واقع ہوئی، وہ دو ماہ کے پیٹ سے تھی۔"

"او خدایا......" وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔ "یا اللہ! میں یہ سننے سے پہلے مر کیوں نہیں گیا...... یا مولا، مجھے اٹھالے...... میں زندہ نہیں رہنا چاہتا...... مجھے بھی رجو کی طرح تو اپنے پاس بلالے......"

اس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ وہ واقعی اپنی بیٹی کے اس "راز" سے ناواقف تھا۔ میرے انکشاف نے گویا اس کے سر پر ماؤنٹ ایورسٹ کو لا پٹخا تھا۔ وہ دکھ، رنج اور حیرت کی ملی جلی کیفیت میں تھا۔

"خود کو سنبھالو یوسف!" میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "جس طرح یہ ایک حقیقت ہے کہ رجو نے پھانسی لگا کر اپنی جان دی ہے، اسی طرح یہ بھی سچ ہے کہ اسے زہر دیا گیا ہے یا اس نے خود ہی زہر کھایا ہے اور اس کی موت کی وجوہات پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بڑی وضاحت کے ساتھ درج کردی گئی ہیں......"

"میری بیٹی ایسی نہیں ہوسکتی تھانے دار صاحب!" وہ غموں سے بوجھل اور آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں بولا۔ "وہ ایک سال سے ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ ہم اس کے کردار سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھاسکتی۔ میں کیسے مان لوں کہ وہ گناہ کے راستے پر چل رہی تھی......"

والدین کا دل اپنی اولاد کے معاملے میں ذرا مختلف نوعیت کا ہوتا ہے اور پھر لاڈلی اور اکلوتی اولاد کا معاملہ کچھ زیادہ ہی نازک اور حساس ہوتا ہے۔ میں یوسف ماچھی کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو بہت گہرائی تک سمجھ اور محسوس کرسکتا تھا لہٰذا میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

"یوسف! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں درج جس

سفاک سچائی کی جانب میں نے اشارہ کیا ہے، اس موضوع پر ہم بعد میں کسی وقت بات کریں گے......"

وہ آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ سوال بھری آنکھوں سے مجھے تکنے لگا تاہم منہ سے کچھ نہیں بولا۔ میں نے نہایت ہی نرمی سے کہا۔

"فی الحال، اس سے بھی اہم امور کو دیکھنا ضروری ہے۔"

"جی...... جی......" وہ ہکلا کر رہ گیا۔

میں نے کہا۔ "جیسا کہ تم بتا رہے ہو، تم دونوں میاں بیوی میں سے کوئی رجو کو زہر دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تو پھر اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ اس نے خود ہی زہر کھا لیا ہوگا۔"

"جی...... یہی ہو سکتا ہے۔" وہ کسی روبوٹ کے مانند تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس نے پہلے زہر کھایا ہوگا، اس کے بعد خود کو پھانسی پر لٹکا لیا ہوگا تاکہ اس کے زندہ بچ رہنے کا کوئی امکان باقی نہ رہے اور ایسا ہی ہوا...... وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمیں چھوڑ کر چلی گئی...... دور...... بہت دور......!"

"ہاں...... وہ چلی گئی اور اپنے پیچھے اَن گنت سوالات بھی چھوڑ گئی۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر اچانک سوال کیا۔ "یوسف! جب میں پہلی مرتبہ تمہارے گھر آیا تھا تو تم دونوں میاں بیوی کی باتوں سے مجھے پتا چلا تھا کہ وقوعہ کی شام تم تینوں نے ایک ساتھ باورچی خانے میں بیٹھ کر کھانا کھایا تھا...... میں غلط تو نہیں کہہ رہا......؟"

"نہیں جناب، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اور یہی حقیقت بھی ہے۔"

"تم لوگوں نے لگ بھگ سات بجے کھانا کھایا تھا اور آٹھ بجے تک کچن سمیٹنے کے بعد رجو سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔" میں نے ایک مخصوص انداز میں اسے گھورنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "پھر اگلی صبح لوگوں کو اس کی پھانسی پر لٹکتی ہوئی لاش ہی ملی تھی۔"

"جی ہاں...... بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔"

"تم لوگوں کے ہاں کتنے سالن بنتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی، میں آپ کی بات کو سمجھ نہیں سکا......" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"میرا اشارہ ہنڈیا یعنی ہانڈی کی طرف ہے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وقوعہ کی رات گھر میں کوئی ایک ہی ہانڈی بنی تھی یا ایک سے زیادہ؟"

"جناب! ہمارے گھر میں عموماً کھانا نہیں بنتا......" اس نے عام سے انداز میں بتایا۔ "جیراں تنور پر روٹی لگاتی ہے تو وہیں پر ایک آدھ سالن روز بنا لیتی ہے۔ وہ سالن ہمارے گھر میں بھی استعمال ہوتا ہے اور ہم گاہکوں کو بھی فروخت کرتے ہیں اور ایک دن میں ایک ہی سالن بنایا جاتا ہے جس میں سے ہم گھر کے لیے الگ نکال لیتے ہیں، باقی تنور پر بیچ دیتے ہیں۔ روٹی بھی تنور ہی سے لے کر ہم گھر میں بھی کھاتے ہیں۔"

"سمجھ گیا میں۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ "یعنی روزانہ تم لوگ تنور کے کھانے ہی سے گھر کا مسئلہ بھی حل کر لیتے ہو۔"

"جی...... جی ہاں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میں یہی کہنا چاہ رہا تھا۔"

"وقوعہ کی رات تم تینوں نے ایک ہی کھانا کھایا تھا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن اور کسی کے جسم میں زہر نہیں پہنچا، صرف رجو کے معدے میں زہر پایا گیا۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ اس کھانے میں کسی قسم کا زہر شامل نہیں تھا ورنہ تم تینوں لگ جاتے کام سے اور صبح ایک نہیں بلکہ تمہارے گھر سے تین لاشیں برآمد ہوتیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اس نے ہلکی سی بیزاری کے ساتھ میری بات کے جواب میں تبصرہ کیا۔ "اب میں سمجھ گیا کہ آپ کھانے کے حوالے سے اتنا کرید کرید کر کیوں پوچھ رہے تھے۔ آپ کو شک تھا کہ کہیں رجو نے رات میں زہریلا کھانا تو نہیں کھا لیا تھا۔"

"یوسف! شک کرنا پولیس کی مجبوری ہے کیونکہ پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول ہی سے چلتی ہے۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "کیا رجو رات کے کھانے کے بعد دودھ وغیرہ پینے کی بھی عادی تھی؟"

اب وہ میرے زاویہ سوالات کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا لہٰذا بڑے اعتماد سے بولا۔ "نہیں جناب! وہ کھانا کھانے کے بعد سونے کے لیے سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ کھانے کے بعد اس نے نہ کچھ کھایا اور نہ ہی کچھ پیا...... دودھ بھی نہیں۔"

"میں رجو کے کمرے کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"ایک منٹ...... آپ ادھر ہی رکیں۔ میں وہ کمرا

خالی کراتا ہوں۔" وہ میری بات کو سمجھتے ہوئے بولا۔ "تعزیت کے لیے آنے والی عورتیں ادھر بیٹھی ہیں۔"

"میں باہر جارہا ہوں۔" میں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "تم وہاں کی عورتوں کو اس کمرے میں لے آؤ۔ جب رجو والا کمرا خالی ہوجائے گا تو پھر میں اطمینان سے اپنی کارروائی کروں گا۔"

"ٹھیک ہے جناب! جو آپ کا حکم۔" وہ جلدی سے بولا پھر کہا۔ "رجو کے کمرے کی تلاشی تو آپ نے پہلے بھی لی تھی......؟"

"ہاں لی تھی۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کے سامان کو اچھی طرح چیک نہیں کیا تھا۔ اس وقت تک میرے ذہن میں یہی تھا کہ رجو نے خودکشی کی ہے لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بعد یہ معاملہ خودکشی سے بڑھ کر کہیں اور چلا گیا ہے لہٰذا اب اس کے ذاتی سامان کی تلاشی لینا بھی ازحد ضروری ہوگیا ہے۔ کیا تم لوگوں نے اس کے استعمال کی چیزوں کو اِدھر اُدھر تو نہیں کردیا؟"

میرے آخری سوالیہ جملے کے جواب میں اس نے کہا۔

"نہیں جناب! ہم نے اس کمرے کی کسی چیز کو نہیں چھیڑا۔ سب کچھ جوں کا توں پڑا ہے اور جہاں تک رجو کے ذاتی استعمال کی چیزوں کا تعلق ہے تو وہ ایک ٹرنک کے اندر رکھی ہیں۔ ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"ٹھیک ہے......" میں یہ کہتے ہوئے یوسف ماچھی کے گھر سے نکل کر باہر حوالدار خادم حسین کے پاس آگیا۔ خادم حسین تانگے کے قریب ہی کھڑا کوچوان سے باتیں کررہا تھا۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھا تو ایک دم اٹینشن ہوگیا۔

"کیا ہورہا ہے خادم حسین؟" میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"بس جی، گپ شپ ہورہی ہے۔" وہ سادگی سے بولا۔ "آپ تو اندر مصروف ہوگئے تھے۔ میں نے سوچا، وقت گزاری کے لیے کوچوان چاچا ہی سے بات چیت کرلیتا ہوں۔"

"وقت گزاری بہت اچھی چیز ہے مگر یہ کسی مقصد کی خاطر ہونا چاہیے۔" میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ "تم گپ شپ ہی میں مگن ہو یا آس پاس کے ماحول پر بھی نظر رکھی ہوئی ہے......؟"

"جناب! آپ کا شاگرد ہوں، ایسی غفلت کا مظاہرہ کیسے کرسکتا ہوں۔" وہ فخر سے سینہ تان کر بولا۔

"اگر غفلت کا مظاہرہ نہیں کیا تو اس کا مطلب ہے، چستی اور پھرتی دکھائی ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"جی...... جی ہاں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"پھر...... تمہاری اس چستی اور پھرتی کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟"

"جناب! میں نے ایک خاص بات محسوس کی ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "پتا نہیں، وہ آپ کی نظر میں کوئی اہمیت بھی رکھتی ہے یا نہیں......"

"تم بات تو بتاؤ......" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کی اہمیت یا فضولیت کے بارے میں فیصلہ میں کروں گا۔"

"جناب! میں بظاہر کوچوان سے گپ شپ کررہا تھا لیکن اردگرد کے ماحول پر بھی میری گہری نظر تھی۔" وہ گہری سنجیدگی سے بتانے لگا۔ ہم اس وقت چلتے چلتے کوچوان سے تھوڑا آگے نکل آئے تھے تاکہ اطمینان سے بات کرسکیں۔ "میں نے یوسف ماچھی کے گھر کے آس پاس ایک نوجوان کو بے چینی سے ٹہلتے ہوئے دیکھا ہے۔"

نوجوان کے ذکر پر میرا چونک جانا لازمی بات تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اس امر کی متقاضی تھی کہ مجھے جلد ازجلد اس شخص کو تلاش کرنا ہے جس کے ساتھ رجو تنہائی میں وقت گزارتی رہی تھی اور ایک معقول اندازے کے مطابق اس شخص کو کوئی نوجوان ہی ہونا چاہیے تھا۔

"وہ کس قسم کا نوجوان تھا؟" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"گورا چٹا، قدو میانہ، جسم بھرا بھرا اور خوب صورت......" خادم حسین نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ "اس کی عمر بائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔"

"تم نے بتایا ہے کہ وہ یوسف ماچھی کے گھر کے قریب بے چینی سے ٹہل رہا ہے۔" میں نے گفتگو کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ "اس کی بے چینی کیا کہتی تھی؟"

"میں نے جو محسوس کیا ممکن ہے، وہ غلط ہو۔" خادم حسین گہری سنجیدگی سے بولا۔ "مجھے ایسا لگا جیسے وہ نوجوان کسی قسم کی ٹوہ میں ہو...... وہ رجو والے واقعے کی مناسبت سے کچھ جاننے کی کوشش میں ہو۔"

"ہوں......" میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "کیا تم نے اس نوجوان سے بات وغیرہ کرنے کی کوشش بھی کی؟"

"نہیں جناب......" وہ بتانے لگا۔ "میں نے بس اسے دور ہی سے واچ کیا ہے۔ وہ مجھے دو تین بار یہاں نظر آیا ہے۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں گہری تشویش پائی

جاتی تھی جیسے وہ رجو کے حوالے سے کوئی خاص بات جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔''

خادم حسین کی باتوں نے میرے دل و دماغ میں کھلبلی سی مچادی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کی روشنی میں مجھے جس شخص کی تلاش تھی، وہ یہ نوجوان بھی ہوسکتا تھا جس کا ذکر حوالدار خادم حسین مجھ سے کر رہا تھا۔ میں نے کرید نے والے انداز میں پوچھا۔

''تم نے تو اس بے چین نوجوان کے ساتھ بات چیت نہیں کی لیکن کیا اسے کسی اور سے باتیں کرتے ہوئے تم نے دیکھا ہے؟ یہاں تو بہت سے لوگ موجود ہیں نا......!''

خادم حسین کے چہرے پر کچھ اس قسم کے تاثرات ابھرے جیسے وہ کوئی اہم بات یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔

''کیا ہوا خادم حسین...... کوئی مسئلہ ہے کیا......؟''

''ملک صاحب! ایک خاص بات تو میں آپ کو بتانا ہی بھول گیا......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''کوئی بات نہیں خادم حسین!'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''بھول گئے ہو تو اب بتا دو...... ایسی کیا خاص بات ہے؟''

''جناب! وہ بات یہ ہے کہ میں نے اس نوجوان کو کسی سے باتیں کرتے نہیں دیکھا۔'' وہ بتانے لگا۔ ''اور نہ ہی یہاں موجود لوگوں میں سے کسی نے اس سے کوئی بات کی......''

''کیا مطلب ہے خادم حسین۔'' میں نے پوچھا۔

''تمہاری باتوں سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے یہاں کوئی اسے جانتا ہی نہ ہو...... وہ ان لوگوں کے لیے اجنبی ہو؟''

''ایسا بھی ہوسکتا ہے مگر......؟''

''اگر مگر کیا خادم حسین؟'' وہ ادھوری بات چھوڑ کر رکا تو میں نے پوچھا۔

''جناب مگر یہ کہ......'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے، اس نے کسی کو بات کرنے کا موقع ہی نہ دیا ہو...... میں نے اسے ہر بار بہت جلدی اور بے قراری میں دیکھا۔ وہ لوگوں میں گھلنے ملنے کے بجائے دور سے گزرتا رہا ہے۔ متلاشی اور کھوجتی ہوئی نگاہ سے وہ یوسف ماچھی کے دروازے کو دیکھتا اور تیزی سے آگے بڑھ جاتا جیسے وہ دروازے میں سے کسی کے نکلنے کا منتظر ہو یا پھر وہ دروازے کے راستے اندر جھانکنے کا خواہش مند......!''

''ہوں......'' میں نے سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اس نوجوان کو ہم کسی بھی قیمت پر نظر انداز نہیں کر سکتے خادم حسین......''

''جی ملک صاحب...... میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔''

''خادم حسین! تم پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا اچھی طرح مطالعہ کر چکے ہو۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ابھی تم نے جس بے چین نوجوان کو یوسف ماچھی کے گھر کے آس پاس منڈلاتے ہوئے دیکھا ہے، اس کا کوئی نہ کوئی تعلق متوفی رجو سے ہوسکتا ہے۔''

''جی...... میں بھی اسی انداز میں سوچ رہا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''صرف سوچو ہی نہیں بلکہ اس انداز میں عمل بھی کرو۔''

''حکم ملک صاحب......!''

اسی لمحے میں نے یوسف ماچھی کو گھر کے دروازے سے باہر نکل کر ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے دیکھا۔ یقیناً اسے میری ہی تلاش تھی۔ وہ میرے معائنے کے لیے رجو والا کمرا خالی کرا چکا ہوگا۔ میں نے خادم حسین سے کہا۔

''دیکھو، مجھے ابھی یوسف کے گھر کے اندر جانا ہے۔ بس تھوڑا سا کام باقی ہے۔ اس دوران میں تم اپنی ساری توجہ اس بے چین نوجوان پر مبذول کردو۔ وہ جیسے ہی دکھائی دے اس سے بات چیت کرنے کی کوشش کرو۔ مجھے امید ہے کہ وہ تم سے بات نہیں کرنا چاہے گا۔ تم اس وقت پولیس کی وردی میں ہو۔ اگر کسی بھی حوالے سے اس نوجوان کا رجو کے ساتھ کوئی تعلق رہا ہے تو وہ پولیس سے بچنے کی کوشش کرے گا۔ اگر تم اس کے حوالے سے اتنا بھی معلوم کرلو گے کہ وہ کون ہے، اس کا نام کیا ہے اور وہ کہاں رہتا ہے تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہوگی......'' میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے تھوڑا توقف کیا پھر کہا۔

''تم میری بات سمجھ گئے نا......؟''

''جی ملک صاحب! میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ اس نوجوان کے سلسلے میں مجھے کیا کرنا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ بالکل بے فکر ہوجائیں...... میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔''

میں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور حوالدار خادم حسین کو وہیں چھوڑ کر یوسف ماچھی کی معیت میں اس کے گھر کے اندر داخل ہوگیا۔

رجو کا رہن سہن گھر کے چھوٹے کمرے میں تھا۔ یہ ایک چوکور کمرا تھا اور وقوعہ کی صبح اسی کمرے کی چھت سے

میں نے رجو کی لاش لٹکی دیکھی تھی۔ میں موقع کی کارروائی کے دوران میں اس کمرے کا پہلے بھی جائزہ لے چکا تھا لیکن اس وقت میں نے رجو کے ذاتی استعمال کے سامان کی تلاشی نہیں لی تھی۔

یوسف ماچھی نے مجھے اپنی متوفی بیٹی کے کمرے میں پہنچا دیا۔ اس نے میری سہولت کے لیے رجو کی چارپائی کے ساتھ ہی ایک کرسی بھی رکھ دی تھی۔ وہ اس کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"تھانے دار صاحب! آپ اس کرسی پر بیٹھ جائیں......"

"میں یہاں بیٹھنے یا آرام کرنے نہیں آیا یوسف؟" میں نے گہری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں جانتا ہوں سرکار! آپ رجو کے استعمال کا سامان دیکھنا چاہتے ہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "آپ اس کرسی پر تشریف رکھیں۔ میں رجو کا سامان ابھی آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔"

میں سوالیہ نظر سے اسے گھورتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ چارپائی کے پاس اکڑوں بیٹھا اور پھر جھک کر چارپائی کے نیچے ہاتھ پھیرنے لگا۔ میں دلچسپی سے اس کی کارروائی ملاحظہ کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں اس کی کوشش بارآور ثابت ہوئی اور اس نے چارپائی کے نیچے سے کھینچ کر ایک جستی ٹرنک برآمد کیا پھر اس ٹرنک کو اٹھا کر رجو کی چارپائی پر رکھتے ہوئے بولا۔

"تھانے دار صاحب! میری بچی کے استعمال کی ساری چیزیں اسی ٹرنک کے اندر رکھی ہیں......"

وہ عام سائز کا ایک جستی ٹرنک تھا جس کی کنڈی تو لگی ہوئی تھی تاہم اس کنڈی میں تالا لگانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "یوسف! رجو کی موت کے بعد کسی نے اس ٹرنک کو کھولنے کی یا اس میں سے کچھ نکالنے کی کوشش تو نہیں کی؟"

"جناب! اس ٹرنک کے اندر جو کچھ بھی رکھا ہوا ہے اس کا تعلق صرف اور صرف رجو سے ہے۔" وہ غم زدہ آواز میں بولا۔ "اس کے اندر کسی اور کے کچھ رکھنے یا نکالنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پھر......"

وہ لمحے بھر کو رکا، ایک مضمحل سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔ "جناب عالی! رجو کی موت کے بعد تو ہمیں کھانے پینے، سونے جاگنے کا ہوش نہیں ہے، اس ٹرنک کا خیال کیسے آتا۔ یہ جوں کا توں رکھا ہے۔ رضیہ (رجو) اسے جہاں چھوڑ گئی تھی، میں نے ابھی آپ کے سامنے وہیں سے نکالا ہے۔ اب آپ جس طرح بھی اس کا معائنہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں، یہ ٹرنک حاضر ہے۔"

ادھر یوسف ماچھی کی بات ختم ہوئی، ادھر باہر ایک آواز بلند ہوئی۔ کسی نسوانی آواز نے یوسف کو پکارا تھا۔

"یہ میری گھروالی جیراں ہے جناب!" یوسف ماچھی جلدی سے بولا۔ "آپ اس ٹرنک کا جائزہ لیں۔ میں اس کی سن کر آتا ہوں......"

"ہاں...... ہاں...... ٹھیک ہے۔ تم جاؤ......" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

وہ مجھے رجو کے کمرے میں چھوڑ کر گھر کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔

جیراں، یوسف سے کیا کہنے والی تھی، یہ زیادہ اہم نہیں تھا اور یوسف کی واپسی پر یہ مجھے معلوم بھی ہو ہی جانا تھا لہٰذا میں نے تمام خیالات میں سے اپنی فوری ضرورت کے خیال پر فوکس کیا اور اللہ کا نام لے کر اس جستی ٹرنک کو کھول دیا۔

اس ٹرنک کے اندر رجو کے ذاتی سامان ہی کی جھلک دیکھنے کو ملی جن میں اس کے استعمال کے چند کپڑے، سستے میک اپ کا چھوٹا موٹا سامان وغیرہ شامل تھا لیکن یہ تمام تر چیزیں میرے کسی کام کی نہیں تھیں۔ میں کسی خاص الخاص "کام" کی شے کی تلاش میں تھا اور پھر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی۔

ٹرنک کے اندر رجو کے سامان کے نیچے پرانے اخبار بچھے ہوئے تھے۔ میں نے سارے سامان کو چارپائی پر الٹ دیا اور اخبارات ہٹا کر اس کے نیچے ٹرنک کی سطح کا جائزہ لینے لگا اور اسی لمحے میری نگاہ دو ایسی اشیا سے ٹکرائی کہ میں ششدر رہ گیا۔ یہ ششدر رہنا کسی خوف یا دہشت یا وحشت کے باعث نہیں تھا بلکہ یہ میری کامیابی کی خوشی تھی۔

میں جن دو اشیا کو دیکھ کر خوش ہوا تھا، ان میں سے ایک تو تہ کیا ہوا کاغذ تھا اور دوسری تھی ایک چھوٹی سی شیشے کی بوتل، جیسے انجکشن کے خالی وائل کی شیشی ہوتی ہے بلکہ وہ کسی استعمال شدہ انجکشن والی خالی شیشی ہی تھی۔

میں نے شیشی کو سونگھا تو اس میں کسی دوا کی مخصوص بو محسوس ہوئی۔ اندر جھانک کر دیکھا تو پتا چلا کہ سفوف کی کچھ مقدار ابھی موجود ہے۔ میں نے اس سفیدی مائل سفوف کو...... ہرگز ہرگز چکھنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ میری عقلِ سلیم نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ سفوف کوئی خطرناک زہر ہی ہو سکتا تھا۔

اب اس امر میں کسی شک وشبہے کی گنجائش باقی نہیں

رہی تھی کہ رجو نے یہی زہر معدے میں اتار کر اپنی جان دے دی تھی اور اپنے مقصد کی کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے اس نے پھانسی کے پھندے کا سہارا لیا تھا تا کہ اس کے زندہ بچ رہنے کا کوئی بھی امکان موجود نہ ہو۔

میں نے سفیدی مائل سفوف والی بوتل کا تنقیدی جائزہ لیا تو پتا چلا کہ اس کے اوپر کوئی لیبل وغیرہ چسپاں نہیں تھا۔ جب بھی اس کے اندر انجکشن والی دوا موجود رہی ہوگی تو یقیناً اس کا لیبل بھی سلامت رہا ہوگا تاہم اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ اس وقت اس شیشی میں موجود وہ سفوف کوئی خطرناک زہر ہی ہوسکتا تھا۔ اس شیشی کا لیبارٹری ٹیسٹ ضروری تھا لہٰذا میں نے اسے محفوظ کرلیا اور تہ شدہ کاغذ کو کھول کر پڑھنے لگا۔

اس کاغذ کی تحریر نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ وہ خط دراصل ایک ''محبت نامہ'' تھا جو رجو کے کسی چاہنے والے نے تحریر کیا تھا۔ خط کے اندر پیار کی باتیں لکھی ہوئی تھیں، چاہت کے دعوے درج تھے اور اسی نوعیت کے دوسرے جملے تھے۔ مذکورہ خط کے اختتام پر ''بھولا'' لکھا ہوا ملا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ یہ خط بھولا نے رجو کے نام لکھا تھا۔ اگر میں کسی طرح بھولا کا سراغ لگالیتا تو پھر رجو کی موت کے معمے کو حل کرنا چنداں مشکل نہ ہوتا۔

ٹرنک کے دیگر سامان میں اور کوئی کام کی چیز موجود نہیں تھی لہٰذا رجو کے سامان کو میں نے واپس ٹرنک میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد یوسف ماچھی میرے پاس آگیا اور سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''تھانے دار صاحب! آپ نے تلاشی کا کام مکمل کرلیا؟''

''ہاں یوسف! میں اپنا کام کرچکا ہوں۔'' میں نے جستی ٹرنک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اب تم اسے واپس رکھ دو۔''

اس نے میرے حکم کی تعمیل کرنے کے بعد پوچھا۔ ''آپ کا مقصد پورا ہوا کہ نہیں؟''

''مقصد تو اس وقت پورا ہوگا جب میں اصل بندے تک پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''اصل بندہ...... میں کچھ سمجھا نہیں جناب!'' اس کے چہرے پر الجھن نمودار ہوئی۔

''میں اس بندے کا ذکر کررہا ہوں جس کا نام بھولا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''بھولا...... یہ بھولا کون ہے؟'' اس کی الجھن میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔

''بھولا وہ شخص ہے جس کا رجو کے ساتھ کوئی چکر چل رہا تھا۔'' میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے رجو کے سامان میں سے بھولا کا ایک خط ملا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں میں گہرا ربط ضبط تھا۔''

پھر میں نے وہ خط یوسف ماچھی کو نہ صرف دکھایا بلکہ پڑھ کر بھی سنا دیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

''تھانے دار صاحب! یہ آپ کیسی باتیں کررہے ہیں۔ ہمیں تو رجو کے ایسے کسی معاملے کی خبر نہیں۔ یہ سب کب اور کیسے ہوگیا، ہمیں کچھ پتا کیوں نہیں چلا۔''

''آپ لوگوں کو اس لیے پتا نہیں چلا کہ آپ دونوں میاں بیوی رجو پر اندھا اعتماد کرتے تھے اور وہ آپ دونوں کی آنکھوں میں بڑی صفائی سے دھول جھونکتی رہی تھی۔''

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ کسی بھولا نے رجو کو اس قسم کا خط لکھ دیا ہو لیکن رجو کا اس کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ نہ ہو۔'' وہ بے حد شکستہ لہجے میں بولا۔

میں ایک بے بس اور لاچار باپ کے دکھ کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا لیکن میں بھی اپنی جگہ مجبور تھا۔ تفتیش کا جو عمل میں نے جاری رکھا ہوا تھا، وہ بہت ضروری تھا۔

''میری بات غور سے سنو یوسف!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''جن لوگوں کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ نہیں ہوتا، ان کے خطوط کو سنبھال کر بلکہ چھپا کر ٹرنک کے اندر نہیں رکھا جاتا اور پھر پوسٹ مارٹم رپورٹ نے جو شرم ناک انکشاف کیا ہے اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ رجو کے کسی مرد کے ساتھ خفیہ تعلقات تھے۔''

اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام کر بوجھل آواز میں بولا۔ ''تھانے دار صاحب! یہ سب سننے سے پہلے مجھے موت کیوں نہ آگئی......''

''موت کا ایک وقت مقرر ہے یوسف!'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور جب تک انسان زندہ ہے، اسے ہر اچھی بری خبر تو سننا ہی پڑے گی۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں نے اس زہر کا سراغ بھی لگالیا ہے جو رجو نے کھایا تھا۔''

''کک...... کیا...... کون سا زہر......؟'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے سفیدی مائل سفوف کی شیشی اسے دکھائی اور

اپنی سوچ سے بھی اسے آگاہ کردیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اسے اس بے قرار نوجوان کے بارے میں بھی بتایا جسے تھوڑی دیر پہلے حوالدار خادم حسین نے یوسف ماچھی کے دروازے کے سامنے مشکوک انداز میں منڈلاتے دیکھا تھا۔ یہ ساری باتیں اس کے لیے کسی طوفان سے کم نہیں تھیں۔ آخر میں، میں نے مذکورہ نوجوان کا حلیہ بیان کرتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔

''اس نوجوان کی عمر بیس اور بائیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ درمیانہ قد، متناسب بدن اور رنگت گوری چٹی۔ کہیں یہ وہی بھولا تو نہیں؟''

''جناب! میں کسی بھولا کو نہیں جانتا۔'' وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ''اور آپ نے جو قد کاٹھ اور حلیہ بتایا ہے، اس طرح کا تو کوئی نوجوان پورے قادر آباد میں نہیں ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''اگر وہ اس گاؤں کا رہنے والا ہوتا تو کوئی نہ کوئی اسے ضرور پہچان لیتا۔''

''پتا نہیں، وہ منحوس کون ہے اور ہماری زندگی میں زہر بھرنے کے لیے کہاں سے چلا آیا ہے۔'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''رجو چلی گئی...... ہمارا سب کچھ لٹ گیا...... ہم برباد ہوگئے۔''

''وہ جو کوئی بھی ہے، میں اسے جلد ہی ڈھونڈ نکالوں گا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جب تک وہ ہاتھ نہیں آئے گا، رجو کی موت کا معما حل نہیں ہوسکے گا۔''

''تھانے دار صاحب!'' وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑا ہوگیا۔ ''رجو ہم سے روٹھ کر بہت دور جا چکی ہے۔ بھولا کے پکڑے جانے یا نہ پکڑے جانے سے رجو واپس نہیں آسکتی۔ آپ سے میری گزارش ہے کہ اس معاملے کو زیادہ نہ اچھالیں۔ اگر یہ معاملات پورے پنڈ والوں کو پتا چلیں گے تو ہماری عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ اس ذلت اور رسوائی کے ہاتھوں مجبور ہوکر ہم بھی خودکشی کرلیں؟''

''نہیں یوسف! میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا۔'' میں نے اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تمہاری عزت کا بھی خیال ہے اور تمہاری مجبوری کا بھی احساس ہے۔ میں جو کچھ بھی کروں گا، نہایت ہی غیر محسوس انداز میں کروں گا لیکن اس کے لیے مجھے تمہارے بھرپور تعاون کی ضرورت ہے۔''

''میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔'' وہ تشکر آمیز لہجے میں بولا۔ ''آپ حکم کریں سرکار۔''

''ابھی میں نے تمہارے سامنے رجو کے ٹرنک کے جو راز افشا کیے ہیں ان کا ذکر کسی سے نہیں کرنا...... اپنی بیوی سے بھی نہیں۔'' میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''اس کے علاوہ تمہیں کیا کرنا ہے، یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔''

''جی، بہت بہتر۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''آپ نے جیسا کہا ہے، میں ویسا ہی کروں گا۔''

میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور وہاں سے رخصت ہونے سے پہلے اس سے کہا۔ ''یوسف! آج کسی بھی وقت رجو کی لاش تمہارے سپرد کردی جائے گی۔ تم اس کی تدفین کے معاملات کو نمٹا لو۔ میں دوبارہ تمہارے پاس آؤں گا۔''

اس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور میں اس کے گھر سے نکل آیا۔

تانگے کے پاس حوالدار خادم حسین میرا منتظر تھا۔ اس کے ساتھ ہی یعقوب موچی بھی کھڑا تھا۔ یعقوب موچی اور صوبے دار سلیم رجو کی خودکشی کی اطلاع دینے تھانے آئے تھے۔ خادم حسین کے چہرے پر ایک خاص نوعیت کا اضطرار پایا جاتا تھا۔ میں جب اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔

''ملک صاحب! میں نے اس نوجوان کا اتا پتا معلوم کرلیا ہے۔''

''کس نوجوان کا؟'' میں نے سرسری لہجے میں دریافت کیا۔

''وہی نوجوان جناب جس کا ذکر میں نے آپ سے کیا تھا۔'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''جو یوسف ماچھی کے گھر کے سامنے منڈلاتا پایا گیا ہے۔''

''اوہ......'' میں نے گہری دلچسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کون ہے وہ اور کہاں کا رہنے والا ہے۔ میری معلومات کے مطابق اس کا تعلق قادر آباد سے تو نہیں ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس کا نام جمشید عرف بھولا پتا چلا ہے اور وہ فیض پورہ کا رہنے والا ہے۔''

''بھولا'' کے نام پر میں چونک اٹھا۔ رجو کے ٹرنک میں سے مجھے جو ''محبت نامہ'' ملا تھا، وہ بھی کسی بھولا ہی نے تحریر کیا تھا۔ گویا اس کیس کی کڑیاں ایک دوسرے سے مل رہی تھیں۔ میں نے خادم حسین سے پوچھا۔

''کیا تمہاری بھولا سے بات ہوئی ہے؟ تمہیں اس

کے بارے میں سب کچھ کیسے پتا چلا؟''

''جناب! یہ ساری معلومات مجھے یعقوب سے حاصل ہوئی ہیں۔'' اس نے قریب کھڑے یعقوب موچی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ نوجوان مجھے دوبارہ دکھائی دیا تھا۔ اتفاق سے اس وقت یعقوب ادھر سے گزر رہا تھا۔ میں نے یعقوب سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ بھولا کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اس کا تعلق فیض پورہ سے ہے۔''

''اب وہ نوجوان کدھر ہے؟'' میں نے گردونواح میں نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

''پتا نہیں جناب......'' وہ بھی متلاشی نظر سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''پتا نہیں ہے تو پتا کرو۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''یعقوب کو اپنے ساتھ رکھو۔ بھولا جہاں بھی ملے اسے پکڑ کر تھانے لے آؤ۔ اگر وہ قادر آباد میں نظر نہ آئے تو فیض پورہ جاؤ۔ مجھے شام سے پہلے بھولا اپنی نظر کے سامنے تھانے میں چاہیے......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''تم میری بات سمجھ رہے ہو نا خادم حسین؟''

''جی بڑی چنگی طراں سمجھ گیا ہوں۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''آپ بےفکر ہو کر تھانے جائیں۔ میں خالی ہاتھ واپس نہیں آؤں گا...... انشاء اللہ!''

میں تانگے میں بیٹھ کر تھانے آ گیا۔ تھانے پہنچ کر میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ رجو کے ٹرنک سے ملنے والی شیشی کو لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے اسپتال بھجوا دیا۔ اس کے بعد میں تازہ ترین صورت حال پر غور کرنے لگا۔

میں نے یوسف ماچھی سے جتنی بھی گفتگو کی تھی، اس دوران میں اس کی بیوی جیراں وہاں موجود نہیں تھی۔ وہ گھر میں آنے والی عورتوں کے ساتھ مصروف رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ موقع ملتے ہی یوسف اپنی بیوی کو پوسٹ مارٹم کی سنسنی خیز رپورٹ سے ضرور آگاہ کرتا۔ حالانکہ میں نے اسے تاکید کی تھی کہ ابھی اپنی بیوی کو بھی اس بارے میں کچھ نہ بتائے لیکن جب حالات انسان کو اندر باہر سے توڑ کر رکھ دیتے ہیں تو وہ زبان کھولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق یوسف اور جیراں رجو کی موت کے سبب سے واقف نہیں تھے اور نہ ہی اس سلسلے میں ان کا کوئی ہاتھ دکھائی دیتا تھا لیکن میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ جیسی صورت حال نظر آ رہی ہے، حقیقتِ حال بھی ایسی ہی ہو گی...... مجھے امید تھی کہ بھولا کے ہتھے چڑھ جانے کے بعد مزید نئے انکشافات سامنے آئیں گے۔

ایک بات ہے کہ مجھے رہ رہ کر یوسف ماچھی پر ترس آ رہا تھا۔ اس کی کیفیت سے لاچاری اور بےبسی کا اظہار ہوتا تھا۔ اس نوعیت کے حالات میں ایک غیرت مند باپ کے احساسات ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ اس کے الفاظ میرے دماغ میں چکرا رہے تھے۔

یقیناً میں اس کا برا نہیں چاہتا تھا اس لیے میں نے اس کی عزت کا خیال رکھنے کا وعدہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

شام سے پہلے خادم حسین نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔

جمشید عرف بھولا اس وقت میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں چند لمحات تک کڑے تیوروں سے اسے گھورتا رہا پھر ایک منٹ ضائع کیے بغیر میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے بتایا کہ اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ تھانے کے ماحول سے پہلی مرتبہ اس کا واسطہ پڑا تھا۔ وہ خاصا دہشت زدہ دکھائی دیتا تھا۔ اس پر مزید میرا انداز بھی خاصا خونخوار تھا لہٰذا وہ مزاحمت نہ کر سکا اور اس نے کسی تفتیشی مشکل سے گزرے بغیر زبان کھول دی۔

بھولا کے بیان کے مطابق وہ رجو سے محبت کرتا تھا۔ اس نے اس خط کو تحریر کرنے کا اقرار بھی کر لیا جو مجھے رجو کے ٹرنک سے ملا تھا لیکن بھولا کا کہنا یہ تھا کہ رجو نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ بھولا کو شک تھا کہ وہ کسی اور کو چاہتی تھی۔ جب بھولا کو رجو کی موت کا پتا چلا تو وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور قادر آباد آ کر یوسف ماچھی کے گھر کے قریب منڈلانے لگا۔ میں نے بہت کرید کرید کر بھولا سے پوچھا کہ رجو کس کو چاہتی تھی تو وہ میرے سوال کا دوٹوک جواب نہ دے سکا۔ علاوہ ازیں وہ رجو کی موت کے دو اسباب (زہر خورانی + امید سے ہونا) کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس نے قسم کھا کر مجھے بتایا کہ وہ رجو سے کبھی تنہائی میں نہیں ملا تھا۔ میں نے بھولا سے تمام سوالات اس امر کا خیال رکھتے ہوئے کیے تھے کہ اسے ذرا سا بھی شک نہ ہو رجو موت کو گلے لگانے سے پہلے کن حالات سے گزری تھی۔ بھولا کو میں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اپنی موت کے وقت رجو دو ماہ کے حمل سے تھی۔ بھولا سے ابتدائی سوالات سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ رجو نے کبھی اسے اپنی تنہائی میں وقت گزارنے کا موقع نہیں دیا تھا، اس لحاظ سے بھولا ایک

غیر متعلق، یک طرفہ محبت میں مبتلا ایک عاشقِ نامراد شخص تھا لہٰذا رجو کے راز کو اس پر افشا کرنا مناسب نہیں تھا کیونکہ میں یوسف ماچھی سے اس کی عزت کی حفاظت کرنے کا عہد کر چکا تھا تاہم میرا ذہن منطقی انداز میں اس متعلقہ شخص کی تلاش میں تھا جو بڑی آسانی سے رجو کی تنہائی میں وقت گزار چکا تھا۔

ضروری تفتیش کے بعد میں نے بھولا کو جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دی کہ وہ تھانے میں اطلاع دیے بغیر اپنے علاقے سے باہر کہیں نہیں جائے گا۔ اس نے میرے حکم کی تعمیل کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

آئندہ روز اسپتال سے شیشی میں پائے جانے والے سفیدی مائل سفوف کی لیبارٹری رپورٹ آگئی۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق رجو کے معدے اور خون میں جو زہر پایا گیا تھا وہ یہی سفوف تھا۔ کیمیکل تجزیے کے مطابق یہ دراصل چوہے مار دوائی تھی جس کی بھاری مقدار رجو کے معدے میں چلی گئی تھی جو اس کی موت کا سبب بنی۔ رپورٹ میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ اگر چوہے مار دوا کھانے کے بعد رجو خود کو پھانسی پر نہ لٹکاتی اور بروقت اسے اسپتال لے آیا جاتا تو معدہ صاف کر کے اس کی جان بچائی جا سکتی تھی لیکن جب انسان اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو پھر یہ سارے اگر مگر بے سود ہو کر رہ جاتے ہیں۔

رجو کی تدفین کے دو روز بعد میں نے یوسف ماچھی اور اس کی بیوی کو تھانے بلا لیا۔ رسمی کلمات کے بعد میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یوسف! رجو جن حالات سے گزر کر اس دنیا سے چلی گئی، وہ راز صرف ہم تینوں کے بیچ ہے۔ فیض پورہ اور قادر آباد میں بسنے والا کوئی شخص اس راز سے واقف نہیں اور میرا تم لوگوں سے یہ وعدہ ہے۔ اس راز کا کبھی کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کیونکہ میں نے تم لوگوں کی عزت کی حفاظت کا عہد کیا ہے۔''

''آپ کا یہ احسان ہم زندگی بھر یاد رکھیں گے تھانے دار صاحب۔'' یوسف نے گلوگیر آواز میں کہا۔

جیراں بولی۔ ''آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔''

''تم مجھ سے الفاظ ادھار لے لو......'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ دونوں چونک کر مجھے دیکھنے لگے اور بیک زبان بولے۔ ''کیا مطلب جناب......؟''

''مطلب یہ کہ اگر تم لوگ میرے ایک سوال کا بالکل سیدھا جواب دے دو تو اس احسان کا بدلہ چکا سکتے ہو جو میں تم لوگوں کی عزت کا خیال کر کے کر رہا ہوں۔ میں تم لوگوں کے منہ سے سچائی سن کر ساری زندگی اس سلسلے میں اپنی زبان بند رکھوں گا۔''

''کون سا سوال جناب؟'' یوسف نے پوچھا۔

''رجو کو چوہے مار دوا کس نے کھلائی تھی؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

''چوہے مار دوا؟'' یوسف کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں یوسف! مجھے رجو کے ٹرنک سے جو شیشی ملی تھی اس کے اندر چوہے مار دوا بھری ہوئی تھی۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ رجو نے پھانسی لگا کر اپنی جان دی ہے لیکن چھت سے لٹکنے سے پہلے اس کے معدے میں چوہے مار دوا کی وافر مقدار پہنچائی جا چکی تھی۔''

''میں تو اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھانے دار صاحب۔'' یوسف بے حد پریشانی سے بولا۔

جیراں کی گونج دار آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''میں جانتی ہوں...... سب کچھ جانتی ہوں...... وہ چوہے مار دوا میں نے رجو کو کھلائی تھی کیونکہ...... میں اس کے کالے کرتوت سے واقف ہو گئی تھی...... اس سے پہلے کہ ہماری جگ ہنسائی ہوتی، میں نے رجو کی جان لینے کا فیصلہ کر لیا لیکن میں یہ نہیں جانتی تھی کہ اسی رات رجو نے خودکشی کرنا تھی۔ اگر مجھے اس کے ارادے کا علم ہو جاتا تو میں اپنا فیصلہ بدل دیتی لیکن ہوتا وہی ہے جو قدرت کو منظور ہوتا ہے......''

اپنی بات ختم کر کے وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

جب اس کی حالت سنبھلی تو میں نے ان میاں بیوی کو جانے کی اجازت دے دی۔ رخصت ہونے سے قبل اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ تھوڑی سی دوا شیشی میں چھوڑ کر اس نے وہ شیشی رجو کے ٹرنک میں رکھ دی تھی تاکہ یہ رجو کی خودکشی کا واقعہ نظر آئے۔ میں نے جیراں سے اس شخص کے بارے میں ایک بھی سوال نہیں کیا جس کے ساتھ رجو ملوث رہی تھی۔ اب اس سوال و جواب کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ گڑے مردے اکھاڑنے سے رجو کی عزت کا جنازہ نکل جاتا اور میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا کیونکہ قدرت پردے کو پسند فرماتی ہے۔

انسان کی معمولی سی لغزش بعض اوقات ایسے گل کھلاتی ہے کہ جن کی بازگشت بہت دیر تک اور بہت دور تک سنائی دیتی ہے۔ رجو اپنی زندگی سے گئی۔ جیراں اور یوسف ماچھی ایک مرتبہ پھر بے اولاد ہو گئے......!

(تحریر: حسام بٹ)

اوپر نیچے، آگے پیچھے اور دائیں بائیں... جدھر دیکھو متحرک زندگی کارِحیات میں مصروف دکھائی دیتی ہے۔ وہ بھی اس مشقت میں مصروف تھی کہ اچانک اس کی تیز رفتاری میں تعطل پیدا ہوگیا... ایسا کیوں ہوا... بس اسی کھوج میں اسے باقی کے دن صرف کرنے تھے۔

ہوا کا رخ دیکھ کر موسم کا تعین کرنے والی دوشیزہ کا کارنامہ

ٹچ ڈاؤن

ثمر عباس

ڈیانا دن بھر دفتر میں مصروف رہنے کے بعد بے حد تھکن محسوس کر رہی تھی۔ چھٹی ہونے کے بعد وہ اپنی کار میں جولیا کے گھر کی جانب جا رہی تھی تاکہ اسے ساتھ لے کر حسبِ معمول جمنازیم پہنچ سکے۔ تھکن کے باعث اس کا معمول کی ورزشیں کرنے کا قطعی موڈ نہیں تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وہ جولیا کو قائل کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوگی۔

یہ موسمِ خزاں کی ایک سہانی شام تھی اور ڈیانا ورزش کے بجائے پارک میں چہل قدمی کرنا چاہ رہی تھی لیکن چہل



قدمی جولیا کا اسٹائل نہیں تھا۔ وہ جمنازیم میں موجود ہر مشین پر ورزش کرنے پر اصرار کرتی تھی۔ چہل قدمی کے بجائے وہ دوڑنے اور جاگنگ کرنے کو ترجیح دیتی تھی۔

جولیا اپنی فٹنس اور صحت کے معاملے میں کوئی سمجھوتا نہیں کرتی تھی۔ وہ سبزی خور اور ایروبکس کی عادی تھی اور درحقیقت پسینا بہانے میں اسے خوب لطف آتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ ویٹ لفٹنگ اور اسٹریچنگ بھی کیا کرتی تھی۔ ڈیانا کو اس کا ساتھ دینا پڑتا تھا البتہ آج شام اس کا جولیا کی مشکل ورزشوں میں ساتھ دینے کا جی بھی نہیں چاہ رہا تھا لیکن جولیا اس کی بہترین سہیلی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے جولیا کی مائنڈ کر جانے والی عادت کی بنا پر یہ سب کچھ برداشت کرنا ہوگا۔

جب راستے میں ایک سگنل پر وہ سبز بتی کے روشن ہونے کا انتظار کررہی تھی تو اسے اپنے ضبط کا خیال آگیا۔ وہ خود بھی خبروں کی دھتی تھی...... اس سے زیادہ وہ اسپورٹس کی دیوانی...... وہ خود تو کوئی گیم نہیں کھیلتی تھی لیکن اسپورٹس دیکھنے کی بے حد شوقین تھی۔ وہ تصور میں خود کو اپنے کاؤچ میں بیٹھی کوکا کولا کی ایک لیٹر بوتل اور چپس کا پیکٹ لیے ٹی وی پر رگبی گیم دیکھنے میں مگن محسوس کرنے لگی۔ اتنے میں سگنل کی بتی سبز ہوگئی۔

ڈیانا نے ایک سرد آہ بھری اور یہ سوچتے ہوئے اپنی کار آگے بڑھادی کہ اس کی ایسی قسمت کہاں! پھر اس نے اپنی کار کا ریڈیو آن کردیا کہ ہوسکتا ہے آج کے رگبی گیم پر پیشگی تبصرہ نشر ہورہا ہو۔

ریڈیو پر اناؤنسر کہہ رہا تھا۔ ''جیری ہوگن کی تلاش جاری ہے۔ وہ آج ریاست کی اصلاحی جیل سے فرار ہوا ہے۔ اس کے پاس ایک ریوالور بھی ہے جو اس نے ایک گارڈ پر قابو پانے کے بعد اس سے چھینا تھا۔ لہٰذا پولیس اسے مسلح اور خطرناک تصور کررہی ہے...... دلیرانہ بینک ڈکیتیوں کی کئی وارداتوں میں ملوث ہونے اور دو وارداتوں کے دوران فائرنگ کرنے کی بنا پر اسے ''دی کاؤبوائے'' کا نام دیا جاچکا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ کاؤبوائز کے مانند چوڑے حاشیے کا ہیٹ پہنے اور سرخ رنگ کا ریشمی رومال باندھے رہتا ہے۔ یہ ہیٹ اس کی پیشانی پر جھکا ہوتا ہے اور رومال سے وہ اپنا چہرہ چھپائے رکھتا ہے۔ پولیس کو شبہ ہے کہ وہ اطراف میں کہیں چھپا ہوا ہے اور اندھیرا پھیلنے کا انتظار کررہا ہے تاکہ......''

ڈیانا نے اپنے کار ریڈیو کا سوئچ آف کردیا۔ وہ یہ سب کچھ پہلے بھی کئی مرتبہ سن چکی تھی۔ بہرحال وہ گھر پر اپنا ڈی وی آر سیٹ کرآئی تھی تاکہ اس کا پسندیدہ رگبی گیم ریکارڈ ہوجائے۔ وہ یہ ریکارڈ شدہ رگبی گیم بعد میں بھی دیکھ سکتی تھی۔

وہ جولیا کے گھر پہنچ گئی۔ عام طور پر جب وہ جولیا کو لینے کے لیے پہنچتی تھی تو اس وقت وہ اپنے گھر کے پورچ میں ہاتھ پیروں کی ورزش کررہی ہوتی تھی لیکن آج شام وہ اپنے پورچ میں موجود نہیں تھی۔ ڈیانا نے سوچا کہ شاید آج اسے دیر ہوگئی ہے۔ لہٰذا وہ اپنی کار سے اتر کر جولیا کے پورچ میں پہنچ گئی اور دروازے پر لگی ڈور بیل بجادی۔

دو مرتبہ گھنٹی بجانے پر جولیا نے دروازہ ایک انچ کھولا اور بولی۔ ''سوری۔ مجھے تمہیں فون کردینا چاہیے تھا۔ میں آج نہیں جاسکتی۔ میرا ٹخنہ مڑ گیا ہے۔''

''پھر تو تمہیں بہت تکلیف ہورہی ہوگی۔'' ڈیانا نے کہا۔ ''تمہارا چہرہ پیلا پڑ رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ موچ آگئی ہو۔ میں تمہیں اسپتال ایمرجنسی میں لیے چلتی ہوں اور......''

''نہیں، نہیں۔'' جولیا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں پیزا ہٹ کو پیپرونی پیزا بھیجنے کا آرڈر دے چکی ہوں۔ میں آرام کرنا اور پیزا سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہوں۔''

یہ سن کر ڈیانا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''لیکن تم......''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' جولیا نے اس کی بات تیزی سے کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میں آج جلدی سونا چاہتی ہوں۔ میں کل بھی آرام کرنا چاہوں گی کیونکہ کل کی فلائٹ سے میری بہن ڈیلس سے آرہی ہے۔ مجھ پر ہیجانی کیفیت طاری ہے۔ میں ڈیلس کے بارے میں تازہ ترین حالات سننے کے لیے بے چین ہورہی ہوں اور مجھ سے صبر نہیں ہورہا ہے۔ میں حقیقت میں ڈیلس کو مس کررہی ہوں...... مجھے ڈیلس کے بارے میں خبریں سننے سے بے حد پیار ہے۔ سمجھ رہی ہونا؟''

ڈیانا آنکھیں پھاڑے اپنی سہیلی کے چہرے کو گھورنے لگی جس پر تناؤ کی کیفیت طاری تھی۔ اس نے یہ بات بھی خاص طور پر نوٹ کی کہ جولیا نے مسلسل دروازے کو تقریباً بند رکھا ہوا تھا اور اسے وا کرنے سے گریز کررہی تھی۔

''میں سمجھ رہی ہوں۔'' ڈیانا نے آہستگی سے کہا۔ ''اور مجھے یقین ہے کہ تم ٹھیک ہوجاؤ گی، جولیا۔ اپنا خیال رکھنا۔''

ڈیانا تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنی کار تک پہنچی اور کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگئی۔ سڑک کے کارنر سے گھومتے ہی اس نے اپنی کار روک دی اور پولیس ہیلپ

لائن کا ایمرجنسی فون نمبر نائن ون ون ڈائل کرنے لگی۔

☆☆☆

ایک گھنٹے بعد یہ کھیل ختم ہو چکا تھا۔

پولیس نے جولیا کے گھر کا محاصرہ کرلیا تھا۔ پھر ایک پولیس افسر پیزا ہٹ کے ڈیلیوری بوائے کے روپ میں پیزا لے کر وہاں پہنچ گیا۔ اس کے دستک دینے اور تعارف کرانے پر جولیا نے دروازہ کھول دیا اور پولیس افسروں کی ایک فوج نے دھاوا بول دیا۔

دی کاؤبوائے کو کچھ کرنے اور سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ پولیس نے اسے غیر مسلح کردیا اور...... حراست میں لے لیا۔ معمول کی کارروائی کے بعد پولیس دی کاؤبوائے کو اپنے ہمراہ لے گئی۔

اب جولیا اور ڈیانا ایک پولیس سراغ رساں کے ہمراہ کچن کی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔

''سو وہ زبردستی تمہارے گھر میں گھس آیا اور گن پوائنٹ پر تمہیں یرغمال بنالیا۔'' سراغ رساں نے جولیا سے کہا۔ ''اور اندھیرا پھیلنے کے بعد وہ تمہیں مجبور کرتا کہ تم اسے اپنی کار میں بٹھا کر اسے ریاست سے باہر پہنچا دو۔ اس کا خیال تھا کہ پولیس اس کار کو نہیں روکے گی جو کوئی عورت چلا رہی ہوگی۔ یہ سب کچھ تو میری سمجھ میں آرہا ہے لیکن یہ بات ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی کہ تمہاری سہیلی کو یہ کیسے پتا چلا کہ وہ یہاں پر موجود ہے؟''

''اس لیے کہ میں جولیا کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔'' ڈیانا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''وہ سبزی خور ہے اور صحت مند رہنے اور فٹنس برقرار رکھنے کا اسے خبط ہے۔ وہ کبھی بھی پیپرونی پیزا کا آرڈر نہیں دے سکتی۔ ہاں اگر کوئی اس کے سر پر گن رکھ کر اسے حکم دے تو الگ بات ہے۔ ویل، میں نے یہی اندازہ لگایا کہ کسی نے اس پر گن تانی ہوئی ہے۔''

''اور میں بھی تمہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں، ڈیانا۔'' جولیا نے جواباً اس کی جانب مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور چونکہ تمہیں خبریں سننے کا خبط ہے اس لیے مجھے یقین تھا کہ تم نے اصلاحی جیل سے فرار ہونے والے مسلح قیدی کے بارے میں خبر سن لی ہوگی اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ ڈیلس کا حوالہ سن کر تم سمجھ جاؤ گی کہ ''دی کاؤبوائے'' نے مجھے یرغمال بنایا ہوا ہے۔''

یہ سن کر سراغ رساں کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ ''تو کیا تمہاری بہن حقیقت میں ڈیلس میں نہیں رہتی؟'' اس نے جولیا سے پوچھا۔

''نہیں، وہ وہاں نہیں رہتی۔'' جولیا نے بتایا۔ ''مجھے یقین تو نہیں تھا کہ ڈیانا کو یہ حقیقت ذہن نشین ہوگی لیکن چونکہ اسے اسپورٹس کا خبط ہے تو میں جانتی تھی کہ ڈیلس کے حوالے سے اسے کسی خاص ٹیم کا خیال آجائے گا اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ اس حوالے سے وہ سمجھ جائے گی کہ۔ میرا اشارہ ڈیلس کاؤبوائز رگبی ٹیم کی جانب ہے۔ پھر اسے سب کچھ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی اور اسے صورتِ حال کی تہ تک پہنچنے میں مدد مل جائے گی۔ کیوں ڈیانا، میں نے ٹھیک کہا نا؟''

ڈیانا نے پیپرونی پیزا کے ایک اور سلائس کی جانب ہاتھ بڑھایا اور رگبی گیم کی ایک اصطلاح استعمال کرتے ہوئے بولی۔ ''ٹچ ڈاؤن!''

حقیقتیں

☆ اگر انسان اپنی انگلیوں کا استعمال اپنی ہی غلطیاں گننے کے لیے کرے تو دوسروں پر انگلی اٹھانے کا وقت ہی نہ ملے۔

☆ بندہ جب منافقت کی سیڑھیاں چڑھنا شروع کرتا ہے تو اسے جھوٹ بولنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔

☆ ہم میں سے اکثر لوگ جیب میں حرام کا مال لے کر حلال گوشت ڈھونڈتے ہیں۔

☆ محبت اگر عیب دیکھتی تو اللہ تعالیٰ بھی ہماری طرف نہ دیکھتا۔

☆ ہم لوگ زندہ لوگوں کو سہارا دینے سے کتراتے ہیں لیکن مردہ لوگوں کو کندھا دینا افضل سمجھتے ہیں۔

☆ جس نگری میں عقل اور شعور گھنگرو باندھ لیں وہاں بھوک ناچتی ہے، نفس ناچتا ہے، انسانیت ناچتی ہے۔

☆ ہمارے علم کی مثال ایک دیوار کی طرح ہے جس پر آپ چاہے جتنی اچھی باتیں لکھیں مگر اس دیوار کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

مرسلہ۔ اظہر حسین بچار، ہزاری، جتوئی



محفلِ شعر و سخن

❁ محمد صفدر معاویہ...... خانیوال

بھوک پھرتی ہے میرے ملک میں ننگے پاؤں
رزق ظالم کی تجوری میں چھپا بیٹھا ہے

❁ شوکت علی زخمی...... رحیم یار خان

وہ میرا ہو جو نگاہوں میں حیا رکھتا ہو
ہر قدم ساتھ چلے عزم وفا رکھتا ہو
ناز اس کے میں نہ بھی اٹھاؤں تو بھی برا نہ مانے
ہر ستم سہہ کے بھی مسکرانے کی ادا رکھتا ہو

❁ محمد کمال انور...... اورنگی ٹاؤن، کراچی

تم کیا جانو محبت کے میم کا مطلب
اگر مل جائے تو معجزہ اور نہ ملے تو موت

❁ زاہد چودھری...... چھور کینٹ

مجھ سے بچھڑ کر میری خواہش میں نہ رہنا
جب دھوپ کو سہنا ہے تو بارش میں نہ رہنا
سچائی کے راستے میں نہیں سائباں کوئی
چلنا ہے تو پھر چھاؤں کی خواہش میں نہ رہنا

❁ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان...... فورٹ عباس

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

❁ اظہر حسین پچار...... ہزاری، جتوئی

عمر گزری ہے سب گناہ کرتے
شرم آتی ہے اب دعا کرتے

❁ احمد خان توحیدی...... پاکستان اسٹیل، کراچی

سرکارؐ دو جہان کا رتبہ کچھ اور ہے
انسانیت سکھانے کو انساں بنا دیا

❁ معاویہ مغل...... ایبٹ آباد

کسی چیز کی شدت سے طلب نہیں ہوتی
کوشش کی مگر پہلی سی محبت اب نہیں ہوتی
کبھی گستاخ تھے ہم بھی، پر تیرے بعد
کوئی شکوہ، کوئی شکایت زیرِ لب نہیں ہوتی

❁ نجمی رحمان...... برٹلیٹ

دنیا کی محبت کو اس وقت پرکھنا تم
جب سر سے فضیلت کی دستار اتر جائے

❁ ریاض بٹ...... حسن ابدال

ہزاروں پروانے جلے اس راز کو پانے کے لیے
کہ شمع جلنے کے لیے ہے یا جلانے کے لیے

❁ رانا بشیر احمد ایاز...... ناظم آباد، کراچی

بہت دنوں تک یہ موسمِ گل نہیں رہے گا
جو شاخِ جاں پہ گلاب آئیں تو لوٹ آنا
جو اگر ضد پہ دل اتر آئے تو اس کی بھی مان لینا
کبھی جو پرانی یادیں بہت ستائیں تو لوٹ آنا

❁ عتیق الرحمٰن...... سمندری، فیصل آباد

ماں مجھے دیکھ کے ناراض نہ ہو جائے کہیں
سر پہ آنچل نہیں ہوتا ہے تو ڈر لگتا ہے

❄ عبدالجبار رومی انصاری.....چوہنگ، لاہور

اب گن رہا ہوں چاک گریباں کی دھجیاں
دیوانگی کا شوق یہ دانائی دے گیا

❄ ظفر اقبال ظفر.....کامرہ شرقی

میں جب بھی صبح کا انکار کرنے لگتا ہوں
تو کوئی دل میں میرے آفتاب رکھتا ہے
میں صابروں کے قبیلے سے ہوں مگر میرا رب
وہ محتسب ہے کہ سارے حساب رکھتا ہے

❄ زاہد اقبال زرگر.....نئی منڈی، سکھیکی

کڑے سفر میں اگر راستہ بدلنا تھا
تو ابتدا میں ہمرے ساتھ ہی نہ چلنا تھا
میں لغزشوں سے اٹے راستوں پہ چل نکلا
تجھے گنوا کے مجھے پھر کہاں سنبھلنا تھا

❄ ادریس احمد خان.....ناظم آباد، کراچی

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

❄ جنید احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی

ذکرِ شبِ فراق سے وحشت اسے بھی تھی
میری طرح کسی سے محبت اسے بھی تھی
وہ مجھ سے بڑھ کے ضبط کا عادی تھا جی گیا
ورنہ ہر ایک سانس قیامت اسے بھی تھی

❄ قاضی عرفان احمد.....آڑہ، چوآسیدن شاہ

بسا ہوا تھا جو سینے میں آرزو کی طرح
رگوں میں گونج رہا ہے وہ اب لہو کی طرح
بہت دنوں میں جو دیکھا اسے تو کیا کہیے
لگی ہے اس کی خموشی بھی گفتگو کی طرح

❄ وزیر محمد خان.....بٹل ہزارہ

غیروں سے پوچھتے ہیں وہ ترک نجات کا
اپنوں کی سازشوں سے پریشاں ہے زندگی

❄ ماسٹر جمیل انور.....آڑہ، چوآسیدن شاہ

جی تو چاہتا ہے دل کو آگ لگا کر دیکھوں
اور خود دور کھڑا اس کا تماشا دیکھوں

❄ مرزا طاہر الدین بیگ.....میر پور خاص

آج کیا دیکھ کر بھر آئی ہیں تیری آنکھیں
ہم پہ اے دوست یہ ساعت تو ہمیشہ گزری

❄ معراج محبوب عباسی.....ہری پور ہزارہ

اک میری بات نہیں، سب کا درد دسمبر تھا
برف کے شہر میں رہنے والا، اک اک فرد دسمبر تھا
پھولوں پر تھا سکتہ طاری، خوشبو سہمی سہمی تھی
خوف زدہ تھا گلشن سارا، وحشت گرد دسمبر تھا

❄ انیلہ رشید سیال.....خیر پور، میرس

یہ سوچ کر کہ غم کے خریدار آگئے
ہم خواب بیچنے سرِبازار آگئے
آواز دے کے چھپ گئی ہر بار زندگی
ہم ایسے سادہ دل تھے ہر بار آگئے

❄ محمد اشفاق سیال.....شورکوٹ سٹی

کریں ترکِ زمیں یا جائیں جاں سے
وہی انداز ان کے آسماں سے
محبت اور وہ بھی غیر مشروط
بہت مشکل ہے ایسے مہرباں سے

❄ محمد امین.....سکھر

تم نے کتنی دیر لگا دی پاس ہمارے آنے میں
ہم تبدیل ہوئے بستی میں اور بستی ویرانے میں

❄ دانش عمیر.....کراچی

بدلتے وقت نے بدلے مزاج بھی کیسے
تری ادا بھی گئی، میرا مزاج بھی گیا

❄ کشور جہاں.....حیدر آباد

زندگی رقص بھی کرتی تھی
اب تو چپ چاپ پڑی ہے مجھ میں

❄ مدحت.....کراچی

اک فسانہ ہے زندگی لیکن
کتنے عنوان ہیں فسانے کے
چاک داماں کی خیر ہو یارب
ہاتھ گستاخ ہیں زمانے کے

❄ احمد علی.....کوئٹہ

تمام عمر ہوا کی طرح گزاری ہے
اگر ہوئے بھی کہیں تو کبھو ہوئے ہم

❄ جبران احمد ملک.....گلشن اقبال، کراچی

اے حسن خود پرست ذرا سوچ تو سہی
مہر و وفا سے تجھ کو ملے دیر ہوگئی

❄ راشد علی......اسلام آباد

ہجر میں گرد ہوا غم بھی کوئی فرد ہوا
ایک تھا میں ہی یہاں اور رہا میں بھی کہاں

❄ شازیہ......کراچی

سبز جنگل میں پرندوں کے ٹھکانوں میں کہیں
وقت چھوڑ آیا ہمیں گزرے زمانوں میں کہیں

❄ زرمین نیازی......فیصل آباد

دکھ میں ڈوبا ہوا جہاں ہوں میں
کیا کوئی شہرِ رفتگاں ہوں میں

❄ شرجیل احمد......میرپور خاص

عشق وحشت کو عجب رنگ لگا دیتا ہے
قیس کے قدموں سے لپٹی ہے بہارِ صحرا

❄ مہوش جبار......خانیوال

اب وہ گھر اک ویرانہ تھا بس ویرانہ زندہ تھا
سب آنکھیں دم توڑ چکی تھیں اور میں تنہا زندہ تھا

❄ کہکشاں فاروق......لاہور

میں بھی بہت عجیب ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کرلیا اور ملال بھی نہیں

❄ محمد احسن......سیالکوٹ

ترے بغیر بھی فطرت نے لی ہے انگڑائی
چمن میں تیرے نہ ہونے پر بھی بہار آئی

❄ آفتاب احمد......سرگودھا

دستِ جنوں کو کارِ نمایاں بھی ہیں عزیز
یاروں کو شہر بھر کے گریباں بھی ہیں عزیز

❄ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی

تیری آنکھوں کا اجالا ترے چہرے کا دیا
میں تجھے بھول گیا پھر بھی مجھے یاد رہا

❄ الیاس احمد......نواب شاہ

کتنے ظالم ہیں جو یہ کہتے ہیں
توڑ لو پھول، پھول چھوڑو مت

❄ مدثر شاہ......راولپنڈی

ستم شعار، نشانے تلاش کرتے ہیں
کرو گلہ تو بہانے تلاش کرتے ہیں

❄ محب الحق......کراچی

مہک اٹھا ہے آنگن اس خبر سے
وہ خوشبو لوٹ آئی ہے سفر سے

❄ طلعت علی......پشاور

نادیدہ راہ لوگ ہوئے محملوں پہ بار
منزل شناس لوگ قطاروں کے ساتھ ہیں

❄ ظہیر الدین......شاہ فیصل ٹاؤن، کراچی

یہی قسمت ہماری ہے مداوا کیا کریں اس کا
فلک سے بجلیوں کی رو ہمارے آشیاں تک ہے

❄ اطہر حسین......کراچی

نگاہیں اب کسی راہبر کو پا جانے کی خواہش میں
بھٹکتی پھر رہی ہیں کارواں در کارواں میری

❄ مہتاب احمد......حیدرآباد

نالوں میں جگر سوز اثر دیکھ رہے ہیں
ہم رات کے پردے میں سحر دیکھ رہے ہیں

❄ جہانزیب احمد......میانوالی

عشق سے سوچ میں یہ کیسا تغیر آیا
اپنی ہستی پہ بھی اب ان کا گماں ہوتا ہے

❄ رضیہ عمیر......کراچی

شمع کی لو پر کیوں پروانہ آن گرتا ہے
کسی نصاب میں ایسا کوئی سوال نہیں

❄ شگفتہ نور......بہاولپور

وہ نہ آئے شبِ وعدہ نہ انہیں آنا تھا
منتظر رہ کے بہت سال مہینے دیکھے

❄ حفیظ فاروقی......فیصل آباد

مہرباں ہے کس لیے کوئی تو اس میں راز ہے
دے رہا ہے آج ساقی بھر کے پیمانہ مجھے

کوپن برائے شمارہ جولائی 2016

محفلِ شعر و سخن

نام : --

پتا : --



نیلی کہانی

نعمان اسحاق

نیلا، پیلا، ہرا، گلابی... یہ سارے رنگ انسان کے اپنے اندر کے رنگ ہیں اور جسے ان رنگوں کی پہچان نہیں ہوتی وہ کلر بلائنڈ یعنی رنگوں کا اندھا کہلاتا ہے... وہ بھی کچھ ایسی ہی معذوری کا شکار تھی جسے عقل و شعور ہونے کے باوجود ان کے استعمال کا طریقہ نہیں آتا تھا اور نہ ہی اس نے کبھی انہیں سیکھنے کی کوشش کی مگر ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا... وقت سب سے بڑا استاد ہے جو زندگی کی تمام الٹی سمتیں سیدھی کردیتا ہے... لیکن افسوس یہ سدھار آنے تک بہت دیر ہوچکی تھی۔ بہار کا ہر رنگ اس سے روٹھ چکا تھا۔

بے بہار و بے کیف لمحات میں رعنائیوں کا ہجوم اور حسرت بھری آنکھوں کا احوال

"دیکھو رضا، تمہیں تمہارے والدین نے پڑھنے کے لیے یہاں بھیجا ہے۔ اب اگر تم پڑھائی پر توجہ دو گے تو تمہارا ہی فائدہ ہوگا۔ کچھ بن جاؤ گے تو اپنی ذات کو ہی سب سے زیادہ فائدہ دو گے......" آپا بول رہی تھیں اور رضا یک ٹک انہیں دیکھ رہا تھا۔

آج آپا کے پاس ٹیوشن کا پہلا دن تھا۔ نکما رضا بیس سال کا ہونے کو آیا تھا اور ابھی تک میٹرک میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ اب کے بار انگریزی کا مضمون پاس نہ ہوا تو رضا کی

ماں نے اپنی بہن کے ہاں اسے بھیج دیا۔

''بڑی تعریفیں کرتی ہو تم اپنی آپا کی...... ہاں کیا نام تھا بھلا......'' رضا کی ماں سوچنے لگی تو دوسری طرف سے بہن سوچ میں ڈوب گئی۔ بھلا آپا کا کیا نام تھا؟ کئی سالوں سے آپا اس محلے میں رہائش پذیر تھیں۔ دیوار سے دیوار ملی ہونے کے باوجود رضا کی خالہ آپا کے نام سے واقف نہ تھیں۔ چونکہ آپا بس آپا کے نام سے جانی جاتی تھیں۔

''چھوڑو تم جو بھی نام ہے۔ بس میرا بیٹا پاس ہونا چاہیے۔''

''فکر مت کرو پاس ہو جائے گا۔'' تسلی دیتے ہوئے رضا کی خالہ آپا کی تعریفوں کے پل باندھنے لگیں۔ آپا محلے کے بچے بچیوں کو پڑھایا کرتی تھیں۔ ذہین سے ذہین طلبا، نکمے سے نکمے ترین طلبا جو کوئی بھی آپا سے فیض یاب ہوا، نشاط و کامران ہی ہوا اور دوسرے شہر سے رضا خاص الخاص آپا سے پڑھنے کے لیے ہی تو آیا تھا۔

''ہاں اب کتابیں کھولو، ٹینس آتے ہیں تمہیں؟'' آپا نے پاس پڑا رجسٹر خود ہی اٹھا کر کھولا۔ رضا گہری نگاہوں سے آپا کو دیکھتا رہا۔ پان کھانے والا رضا جس کے ہونٹ اور دانت...... پان داغدار کر چکا تھا۔ مونچھیں ابھی مکمل طور پر نہیں آئی تھیں مگر پھر بھی ان کو بل دار بنانے پر رضا روزانہ محنت کرتا۔ کالر کے اوپر دو بٹن کھلے ہوتے تھے کہ بنیان نظر آئے۔ بنیان نظر آئے تو مرد، مرد لگتا ہے۔ یہ رضا کی سوچ تھی۔

سفید بالوں والی ساٹھ کے ہندسے کو پار کرتی آپا خائف سی ہو گئی تھیں۔ یہ نہیں تھا کہ اس کے طلبا خواہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں...... اس کو گھورتے نہیں تھے۔ وہ اپنے طلبا کا اس قدر آئیڈیل بن جاتی کہ وہ اس کے چال، انداز ہر چیز کو غور سے دیکھتے۔ مگر ان بچوں کی نظروں سے وقار جھلکتا...... بچوں کو اس کے وجود میں شفقت اور ممتا نظر آتی مگر رضا ممتا اور شفقت کا متلاشی نہیں تھا۔ اس کی نظریں نسوانیت پر تھیں، عورت پن پر تھیں۔

''ادھر رجسٹر کی طرف دیکھو۔'' آپا نے رضا کو متوجہ کرنا چاہا۔

''سنا ہے آپ نے شادی نہیں کی۔''

آپا کا دل لمحے بھر کو اچھلا اور جیسے حلق میں اٹک گیا۔

''تم پڑھنے کے لیے آئے ہو۔''

''ساری جوانی کیسے اکیلے گزاری آپ نے؟'' آپا سن رہ گئیں۔ کل کا بچہ اس سے کیا کہہ رہا تھا۔ شاید وہ بھول رہی تھیں کہ وہ کل کا بچہ تھا آج کا جوان تھا۔

''اپنی کتابیں سمیٹو اور اسی وقت نکلو یہاں سے۔'' آپا کی آواز اونچی اور لہجہ کرخت ہو گیا۔

''دھیرج آپا، اتنی جلدی کیا ہے۔'' رضا کی آنکھوں میں شیطانیت پھیلتی گئی اور وہ اپنی کتابیں سمیٹنے لگا۔

''مجھ سے اب وقت نہیں گزرتا اور آپ نے ساری جوانی گزار دی، کمال ہے۔'' کتابیں لیے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''شرم کرو، میں تمہاری ماں کی عمر کی ہوں۔ نکلو یہاں سے......'' کہتے ہوئے آپا کی آواز پر لرزش طاری ہونے لگی۔

''عمر سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' رضا نے ایک نگاہ اوپر سے نیچے ڈالی اور جیسے نظروں میں تولا۔ ''میرے ساتھ رات گزاریں گی؟'' ہستی کے غم کو خوشی کی طرح منانے والا رضا یوں زمین پر قدم جمائے کھڑا تھا جیسے زمین قدموں تلے روندی جا رہی ہو۔

''سوچیے گا ضرور اور کل جواب دیجیے گا۔ میں کل آ کر پوچھوں گا۔'' کالر کا ایک بٹن مزید کھولتا رضا مڑا اور کوئی بے ہودہ سا گانا گاتے ہوئے دروازے کی طرف قدم بڑھانے لگا اور آپا یوں ساکت تھیں جیسے جسم میں جان ہی نہ ہو۔ رضا جا چکا تھا اور آپا کی نظریں دروازے پر جمی تھیں جس کے کواڑ لرز رہے تھے۔ ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا۔ ساتھ والے گھر میں لگے جامن کے چند سوکھے پتے آپا کے آنگن میں آن گرے۔ درختوں پر بیٹھی چڑیوں کی چہچہاہٹ تھوڑی اور تیز ہوئی۔ اسی لمحے آپا کے کانوں میں ایک بازگشت گونجی۔

''ساری جوانی کیسے اکیلے گزار دی آپ نے؟''

☆☆☆

آنگن میں آخری پہر کی رات اتری تھی۔ وہ رات جو اس قدر تاریک بھی نہ تھی۔ کوئی ہوا کا جھونکا آ کر پتوں کو لہراتا۔ پتوں کی سرسراہٹ ساکن ماحول میں ارتعاش پیدا کرتی۔ اندر کمرے میں آپا بید کی ٹوٹی ہوئی کرسی پر ساکن سی بیٹھی تھیں۔ پہر کے پہر گزر گئے۔ بیٹھے بیٹھے کر جسم اکڑ گیا مگر آپا خالی ذہن لیے بیٹھی رہیں۔

وہ ذہن جو شاید خالی نہ تھا۔ چند فقرے گونجتے تو عمر بھر کی کہانی سنا جاتے۔

''ساری جوانی......'' ان دو لفظوں میں کیا کچھ نہ سما گیا تھا۔

موذن نے اذان دی تو آپا کو احساس ہوا کہ رات گزر چلی۔ رات کا کام گزرنا تھا گزر گئی۔ دھیرے سے حرکت کرتے ہوئے ابھی آپا ٹوٹی ہوئی کرسی سے اٹھی تھیں

اور چند قدم ہی بڑھائے تھے کہ آپا کو وہم ہوا جیسے کوئی ہے۔ کوئی بھورا ریچھ۔

مڑ کر دیکھا کوئی ذی روح نہ تھا۔ کرب بھری سوچ ابھری اور معدوم ہوتی چلی گئی۔ زندگی گزر گئی۔ زندگی بدل گئی۔ پر بھورے ریچھ نے ساری زندگی پیچھا نہ چھوڑا۔

وضو کرنے اور نماز پڑھتے تک آپا شعوری طور پر لاشعوری سوچوں سے اجتناب کرتی رہیں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ذہن میں نہ آیا کیا مانگوں۔ تبھی آنکھ سے دو گرم آنسو نکلے اور چہرے کو بھگوتے چلے گئے۔

"دعا عبادت کا دماغ ہوتی ہے۔ دماغ کے بغیر انسان فرزانہ سے دیوانہ بن جاتا ہے تو عبادت دعا کے بغیر کیا ہوتی ہوگی۔" یہ سطر ابھی کل ہی آپا نے دینی کتاب سے پڑھی تھی۔ وہ دینی کتابیں جن کے سہارے آپا کی زندگی گزر رہی تھی۔

"یا اللہ، مرنے سے پہلے ایک ملاقات کرادے کہ میں اس سے معافی مانگ سکوں۔" چالیس سال سے یہ دعا آپا کے لبوں سے نکلتی اور آپا اس لمحہ جاں گسل انتظار میں تھیں جب یہ دعا پوری ہوتی۔

اور آپا یہ نہ جانتی تھیں کہ ملاقات کا وقت بس آن پہنچا ہے۔ صبح نے پر پھیلا لیے۔ دھوپ تیزی سے ہر چیز کو اپنی تحویل میں لینے لگی۔ تب آپا نے کھونٹی سے چادر اتاری۔ پہن کر گھر سے نکل کر ساتھ والے گھر میں چلی آئیں۔

کسرتی جسم والا رضا بنیان شلوار میں ملبوس دیوار کے سائے میں چارپائی پر لیٹا کانوں میں ہینڈ فری لگائے کسی دھن پر پاؤں جھلا رہا تھا۔ خالہ نے رضا کو اپنے گھر مہمان ٹھہرایا تھا تو اس میں خالہ کی اپنی طمع بھی تھی۔

خالہ کی تھی، نظر باز بیٹی جو محلے میں ہی دو معاشقے چلا چکی تھی۔ شہر کے میل ملاقات والے رشتے داروں میں تو اس کی خوبیاں پہنچ ہی چکی تھیں۔ اس لیے وہاں کہیں بات طے ہونا بعید از قیاس تھا اور بیٹی کے عاشق بھی نکے باتوں کے شیر، عاشق سے شوہر بننے کی منزل کا سن کر ہی دوڑ گئے۔ اب اس لڑکی کے لیے دوسرے شہر میں رہنے والا خالہ زاد رضا ہی موزوں تھا اسی لیے تو وہ آج کل یہاں تھا۔

"آپا! جواب کی اتنی بھی کیا جلدی، رات تو ہونے دیتیں۔" رضا کے نوجوان خوبصورت چہرے پر خباثت حاوی ہونے لگی۔

"بیٹھیں، میں کرسی لاتا ہوں۔ خالہ کو بلاؤں، باورچی خانے میں ہیں۔" رضا اٹھ کر جانے لگا۔

"رکو رضا!" رضا رکا اور مڑ کر آپا کو دیکھنے لگا۔

"انسان کو اتنے ہی گناہ کرنے چاہئیں جن کا بوجھ وہ اٹھا سکے۔ گناہ قد سے بڑے ہوں اور کندھوں پر نہ لادے جاسکیں تو آخرت کے ساتھ دنیا بھی برباد ہوجاتی ہے۔" آپا کا لہجہ مضبوط تھا۔ یہ وہ آپا نہ تھیں جو رضا کی بات سن کر لرزنے لگ گئی تھیں۔ یہ نیا روپ تھا۔

"خود کو اتنا سدھار لو کہ ماضی، حال اور مستقبل سنبھل جائیں، میرے پاس اب پڑھنے کے لیے آنے کی ضرورت نہیں۔ خود سے کوئی اچھا سا بہانہ بنالو۔ میں نے بتایا تو بے وجہ مشکل میں پڑ جاؤ گے۔" آپا چادر سنبھالتی ہوئی یہ کہتی جس طرح آئی تھیں، الٹے قدموں چلی گئیں۔ آپا کے جانے کے بعد رضا چارپائی پر لیٹ گیا۔ کانوں میں ہینڈ فری لگا کر پھر سے گانے سننے لگا اور پاؤں جھلانے لگا۔

"ہونہہ باؤلی بڑھیا!" گالیوں کے ساتھ لاحقے کے ساتھ رضا نے آپا کو اسی لقب سے پکارا تھا۔

☆☆☆

سرکاری اسپتال کا آؤٹ ڈور اس وقت مریضوں اور ان کے لواحقین سے بھرا ہوا تھا۔ پہلے کوریڈور کا دائیں طرف سے تیسرا کمرا ماہر نفسیات کا کمرا تھا۔ اکتایا ہوا ادھیڑ عمر ماہر نفسیات ڈیوٹی اوقات ختم ہونے کا انتظار کررہا تھا۔ طبیعت کچھ بوجھل سی تھی۔ اوپر سے مریض ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ تبھی آپا کمرے میں داخل ہوئیں اور پرانے نسخے ڈاکٹر کے سامنے کردیے۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

آپا کی آنکھ سے آنسو ٹپکا اور دامن میں جذب ہوگیا۔

"مجھے پھر سے ریچھ نظر آنے لگا ہے۔" آپا نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

"صرف نظر آتا ہے یا کچھ کہتا بھی ہے؟" ڈاکٹر نے کچھ پرانے نسخے پلٹے جن پر آپا کی مختصراً کیس ہسٹری اور دی جانے والی دوائیں درج تھیں۔

آنکھیں رگڑتے ہوئے بہ مشکل تمام آپا گویا ہوئیں۔

"کچھ کہنا چاہتا ہے اور نہیں کہہ پاتا۔"

"وارڈ میں داخل ہوجاؤ، سائیکو تھراپی کی کلاسز لوگی تو بہتر ہوجاؤ گی۔"

"داخلہ......" آپا نے زیر لب دہرایا۔

"گھر والے سے مشورہ کرلو پھر بتاؤ داخل ہونا ہے کہ نہیں۔" ماہر نفسیات نے نسخے آپا کی طرف بڑھائے۔

"صدیق! اگلا مریض بھیجو......" ڈاکٹر نے آواز

لگائی۔ اگلا مریض آگیا اور آپا کو جگہ خالی کرنا پڑی۔ کیا اس کی بیماری اس حد تک پہنچ چکی تھی...... کہ اب اسے نفسیات کے وارڈ میں داخلے کی ضرورت پڑ گئی تھی؟

کوریڈور پار کرتے ہوئے آپا کی آنکھوں سے آنسو روانی سے بہہ رہے تھے۔ لوگ ترس کھا کر بوڑھی عورت کو روتے ہوئے دیکھتے اور وہ گالوں کو بار بار دوپٹے کے پلو سے رگڑتی تھی۔

☆☆☆

آج 5 اکتوبر تھی۔ پانچ اکتوبر خاص تاریخ تھی۔ آپا کو اتنا تو یاد تھا مگر کیا خاص واقعہ پیش آیا، یہ یاد نہ آیا۔ صبح سویرے نماز پڑھنے کے بعد گھنٹا بھر تلاوت کی۔ جب سے پت جھڑ کا موسم شروع ہوا تھا، ہمسائیوں کے جامن کے درخت نے اپنے سارے سوکھے پتے آپا کے آنگن میں گرانے شروع کر دیے تھے۔ قرآن مجید پڑھنے کے بعد کچھ دیر تو آپا یونہی بیٹھی رہیں پھر جھاڑو لے کر آنگن کی صفائی کرنے لگیں۔ صد شکر کہ ہمسائیوں کے گھر میں جامن کا درخت تھا جو گرمیوں میں جامن گرا کر آنگن داغ دار کر دیتا اور پت جھڑ میں سوکھے پتوں سے آنگن بھر دیتا اور آپا کے ہاتھ آنگن کی صفائی کی مصروفیت آ جاتی۔ مختصر سے گھر کو رگڑ رگڑ کر دھوتے دس بج گئے۔ مصروفیت ختم ہوئی تو آپا کو پھر پریشانی لاحق ہوئی کہ کہیں ریچھ پھر سے ڈرانے نہ آ جائے مگر شکر خدا کا کہ ریچھ نہ آیا۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون؟'' کواڑ کے ساتھ لگ کر آپا نے پوچھا۔

''میں ہوں، خالدہ۔'' جامن کا درخت خالدہ کے آنگن میں ہی لگا تھا اور محلے میں آپا کی سب سے زیادہ دعا سلام خالدہ سے ہی تھی۔

''کیسی ہو خالدہ!''

''میں ٹھیک ہوں آپا۔ تم سناؤ۔'' خالدہ آپا کی ہم عمر تھی مگر وہ آپا کو آپا ہی بلاتی۔ مدت ہوئی آپا کا تعارف یہی لفظ 'آپا' ہی تھا۔ بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں، سب آپا کو بس 'آپا' ہی پکارتے۔ وہ سبھی کی آپا بن گئی اور کسی کو پتا بھی نہ چلا۔ آپا اور خالدہ برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھ گئیں اور جب آپا چائے بنانے کی نیت سے اٹھنے لگیں تو خالدہ نے آپا کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔

''نہیں ناشتا کر کے آئی ہوں، اب کچھ نہیں کھانا پینا۔''

''لیکن......'' آپا کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر خالدہ نے ٹوک دیا۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں، تم بیٹھو اور بتاؤ ماہر نفسیات سے چیک اپ کرا آئیں۔''

لمحوں میں آپا کے اعصاب پر منوں تھکن اتر آئی اور اس تھکن سے جیسے اعصاب چٹخنے لگے۔

''کیا کہتا ہے؟'' خالدہ بغور آپا کو دیکھنے لگی۔ آپا کی تکلیف خالدہ کو رنجیدہ کرتی تھی۔

''کہتا ہے وارڈ میں داخل ہو کر علاج کراؤ۔''

''تو پھر تم نے کیا سوچا؟'' خالدہ کی نظریں آپا پر ہی جمی تھیں۔

''کچھ نہیں سوچا' بس اللہ سے دعائیں کی ہیں کہ اب ریچھ کو مجھے ڈارنے نہ بھیجے۔''

''بے چاری!'' خالدہ سوچ کر رہ گئی۔

''پچھلی دفعہ جب میں تمہارے ساتھ ماہر نفسیات کے پاس گئی تھی، تب اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تم سے وجہ معلوم کروں کہ تمہیں یہ وہم یہ ڈر کیوں لاحق ہوا، تاکہ اس کے حساب سے اس مسئلے کا حل سوچا جائے۔ دیکھو آپا! میں تمہاری دوست ہوں بہن ہی سمجھ لو بتاؤ کہ ایسی کیا بات ہے کہ جو تم اس طرح اس مرض میں مبتلا ہو گئیں۔ جو زندگی بیت چکی سو بیت چکی۔ تم بتاؤ گی تو ممکن ہے......'' خالدہ مزید بھی کچھ کہتی لیکن نفی میں سر ہلاتی آپا نے اسے ٹوک دیا۔

''نہیں خالدہ! نہیں بتاؤں گی۔ میں بتا ہی نہیں سکتی۔ بھلا اپنی غلطیوں کے بارے میں گفتگو کرنا کہاں آسان ہوتا ہے۔ یہ شاید میری غلطی کی سزا ہے۔ تم دعا کرو اللہ مجھے معاف کر دے اور اس شخص سے ملاقات کا وسیلہ بنا دے کہ میں اس سے معافی مانگ سکوں......'' آپا کے آنسو اس بار نہ رک پائے۔ ٹپ ٹپ بہتے گال سے پھسلتے گئے اور خالدہ جو یہ سوچ کر آئی تھی کہ آج وجہ جان کر ہی جائے گی مزید کچھ نہ کہہ سکی۔

''اچھا اب روؤ مت۔'' خالدہ نے دلاسے بھی دیے اور اٹھ کر پانی بھی پلایا۔

''شام کو بچیاں تھوڑی لیٹ آئیں گی۔'' خالدہ کی پوتیاں اور چھوٹی بیٹی آپا سے پڑھنے آتی تھیں۔

''کیوں؟''

''وجہ تو شام کو پتا چل جائے گی۔ اچھا اب چلتی ہوں۔'' خالدہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اور شام کو پانچ اکتوبر کی خاص بات کا عقدہ بھی کھل گیا۔ بچیاں بیکری سے خوش رنگ کیک اور ہاتھ سے بنے ایک کارڈ کے ساتھ آئیں۔

''سالگرہ مبارک آپا۔'' خالدہ کی بیٹی زرتاشہ نے

کیک آپا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ آپا حیران و پریشان سی بچیوں کو دیکھتی رہیں۔

”تم لوگوں کو کیسے پتا چلا کہ آج میری سالگرہ ہے۔“

”اندر طاق میں جو کاغذ پڑے ہیں، ان میں آپ کے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی بھی تھی۔ بس ادھر سے دیکھا تھا اور میں نے مشورہ دیا آپ کی سالگرہ منانے کا۔“ کہنے والی خالدہ کی پوتی تھی۔ اس پرجوش سی لڑکی نے یہ محسوس بھی نہ کیا کہ آپا کے چہرے پر خوشی کے اثرات نہیں ابھرے تھے۔

”آپ کو برا لگا کیا؟“ زرتاشہ کا کیک والا ہاتھ ابھی تک آگے بڑھا ہوا تھا۔

”نہیں نہیں ......بس......“ آپا نے ہاتھ بڑھا کر کیک لے لیا اور چہرے پر ایک مسکراہٹ لے آئیں' وہ مسکراہٹ جس میں حزن کا عکس بھی جھلکتا تھا۔ چھوٹی لڑکیاں ایک دوسرے کو اشارے کرتیں اندر کمرے میں گئیں اور یکے بعد دیگرے مونڈھے اور چھوٹی میز لے آئیں۔ اس خستہ حال میز پر کیک سجا دیا گیا۔ باورچی خانے سے چھری بھی لائی گئی۔

”آپ میری فیورٹ ٹیچر ہیں۔ اسکول میں بھی آپ جیسا کوئی نہیں۔“ خالدہ کی چھوٹی پوتی نے آج آپا سے دل کی بات بھی کہہ دی۔

”آپا! آپ رو رہی ہیں۔ آپ کو برا لگا کیا؟“ زرتاشہ کی آنکھوں سے آپا کے آنسو چھپے نہ رہ سکے۔

”نہیں نہیں۔ مجھے بہت اچھا لگا۔ جب میں تمہاری عمر کی ہوتی تھی تب سالگرہ منانے کا بہت شوق تھا۔ بس کبھی منا نہ سکی۔“

”اچھا آپ کیک کاٹیں ہمارے پاس کچھ اور بھی ہے۔“

کچھ اور بھی...... کیک کٹنے کے بعد سامنے آیا تو آپا لمحہ بھر کو ساکن ہوگئیں۔

سرخ کاغذ میں لپٹے گولڈن جھمکے تھے۔ جو بچیوں نے بازار کے ایک اسٹال سے خریدے تھے۔

”نہیں زرتاشہ! یہ تم خود پہننا میں زیور نہیں پہنتی۔“ آپا نے لینے سے انکار کر دیا۔

”نہیں یہ آپ کے ہیں اور آپ اسے ابھی پہنیں گی۔“ زرتاشہ شگفتگی سے بولی۔

”پلیز ہمارے لیے......“

لڑکیوں کے لہجے میں اس قدر منت تھی کہ آپا خاموش رہ گئیں اور چند لمحوں کے بعد وہ گولڈن جھمکے آپا کے کانوں کی زینت تھے۔ بچیاں اس قدر خوش تھیں کہ ان کے چہرے دمکنے لگے اور جب مغرب ڈھلنے لگی تو لڑکیاں جانے لگیں۔

”کیک تو لیتی جاؤ......“ آپا کہنے لگیں۔

”نہیں ایک ٹکڑا ہی تو بچا ہے۔ آپ نے کھانا ہے اور آپ نے کارڈ تو دیکھا نہیں۔ میں نے خود بنایا ہے۔ کل پوچھوں گی کہ کیسا لگا۔“

زرتاشہ... چلی گئی اور گھر ایک بار پھر خاموشی میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر بعد جب آپا کارڈ دیکھنے کو بیٹھیں تو لمحہ بھر کو خود سے اجنبی ہوگئیں۔ خوش رنگ مارکرز سے انگریزی میں نیک تمناؤں کا اظہار تھا۔ آپا کی نظریں ٹھہریں تو لفظ نائلہ پر۔

”نائلہ“ یہ تو آپا کا ہی نام تھا۔ پر اتنا اجنبی کیوں لگ رہا تھا۔ شاید اب وہ نائلہ نہیں رہی تھیں۔

اچانک ہی ماحول تحلیل ہونے لگا۔ ماضی کے دریچے وا ہوتے گئے اور حال غائب ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ آپا ماضی میں جا پہنچیں۔ جب وہ آپا نہیں نائلہ ہوا کرتی تھیں اور سب انہیں نیلی بلایا کرتے تھے۔ ساٹھ سال کی بوڑھی عورت نہیں۔ بیس سال کی نوعمر منچلی لڑکی۔

☆☆☆

لکڑی کے بڑے پھاٹک کے پار کھلا احاطہ تھا۔ کچے احاطے میں تقریباً روز ہی چھڑکاؤ کیا جاتا اسی لیے تو مٹی جمی ہوئی اور احاطہ ہموار تھا۔ دائیں طرف سب سے پہلے مٹی گارے کی لیپ سے بنی ایک کچی کوٹھری تھی۔ کوٹھری کے اندر ایک ڈنڈے کے پائدان والا جھولا لٹکا تھا۔ جھولے پر بیٹھا بندر جھولے کی ایک رسی پکڑے اونگھ رہا تھا۔ آج کا دن معمول کی طرح تھا اور معمول میں ہی اتنا چلنا پڑتا اور بارہا تماشا کرنا پڑتا کہ شام تک جان ہی نکل جاتی۔ کوٹھری کے ایک کونے میں کیلے کے چند چھلکے بھی پڑے تھے۔ کل شام معمول کے کھانے کے ساتھ چند کیلے بھی عیاشی کو ملے تھے۔

تبھی ایک خوش رو لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ الھڑ دوشیزہ کا بانکپن اس کی چال سے جھلکتا تھا۔ وہ لڑکی نیلی تھی۔

”کیسا ہے تو بوبو......“ نیلی نے تھالی زمین پر رکھی۔ کسلمندی سے آنکھیں موندے بیٹھے بوبو کے جسم میں پھرتی سی بھر گئی۔ جھولے سے پھلانگتا وہ تھالی کے پاس آیا۔ تھالی کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کے بعد وہ بائیں ہاتھ سے کھانے لگا اور نیلی محبت پاش نظروں سے بوبو کو دیکھنے لگی۔

ابتدا میں نیلی نے کوشش کی تھی کہ وہ بوبو کو دائیں ہاتھ سے کھانا سکھائے لیکن ہر کوشش کہاں پوری ہوتی ہے۔ بوبو انہماک سے چاول کھاتا رہا۔ یہاں تک کہ تھالی بالکل خالی

ہوگئی، ایک ذرّہ بھی چاول کا نہ رہا۔ چاول کھانے کے بعد بوبو کچھ دیر نیلی کو دیکھتا رہا اور پھر منہ سے مہمل آوازیں نکالتا نیلی کے پاس آیا اور نیلی کے پیروں کو اپنے ہاتھوں سے سہلانے لگا۔

ایک پرکیف سا احساس تھا جس نے نیلی کے پیروں کو چھوا تھا۔ نیلی جھک کر بوبو کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

''بس اب سوجا، خوب تھکا ہوا لگتا ہے۔ کل پھر تڑکے ہی ابا تجھے لے جائے گا۔'' نیلی کوٹھری سے پلٹ آئی۔

باہر احاطے میں بچھی چارپائیوں میں سے پہلی چارپائی پر نیلی کا باپ یعقوب علی لیٹا تھا اور ماں پاس بیٹھی باپ کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ نیلی بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ جب نیلی احاطہ طے کر گئی تب یعقوب عذرا سے مخاطب ہوا۔

''کیسے سال کے اندر ہماری نائلہ اتنی بڑی ہوگئی۔''

دن بھر کی تھکاوٹ یعقوب کے لہجے سے چھلکتی تھی۔

''ہوں اس کی شادی کا سوچو۔'' عذرا کے لہجے میں بھی زمانے بھر کی تھکاوٹ تھی۔ جوان بیٹی کو دیکھتی تو دل میں ہول اٹھنے لگتے۔

''دیکھو، خورشید سے بات کی تو ہے۔ کہتا ہے دو سال تک شادی کریں گے، نعیم شہر سے کچھ کما لائے۔'' نیلی اپنے تایا کے بیٹے کی بچپن کی منگیتر تھی اور منگیتر نعیم گاؤں کے دوسرے نوجوانوں کی طرح شہر کمانے کے لیے گیا ہوا تھا۔

''دو سال...... دو سال تو بہت ہوتے ہیں یعقوب علی۔'' ٹانگیں دباتے ہاتھ سست پڑ چکے تھے، آواز میں تشویش نمایاں تھی۔

''ہم لڑکی والے ہیں۔ کیا کہہ سکتے ہیں۔'' یعقوب علی کی آواز نیند سے مغلوب ہو رہی تھی۔

''پھر بھی......''

اور اندر نیلی آئینے کا ٹکڑا ہاتھوں میں لیے اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔ سبز آنکھیں اس کے چہرے کی سب سے بڑی خوبصورتی تھیں۔ ان جھیل سی آنکھوں میں جیسے راز پنہاں تھے۔ خوبصورت سی نیلی اپنے چہرے کو تکنے لگی اور اپنے آپ سے محبت وعشق میں بدلتی گئی۔

☆☆☆

لوگوں کا ہجوم ایک دائرے کی شکل میں تھا۔ آنکھوں میں سراسیمگی سموئے بچے، بیزار شکلوں والے مرد اور سر پر بے پروائی سے دوپٹا ٹکائے چند عورتیں۔ دائرے کے وسط میں یعقوب علی اپنے بندر کے ساتھ کھڑا تھا۔

یعقوب نے ڈگڈگی کی تھاپ بدلی تو بندر نے چال بدلی۔ بندر ٹانگوں کو اوپر اٹھائے بازوؤں کے سہارے سر کے بل چلنے لگا۔ جب ایک چکر مکمل ہوا تو یعقوب نے ڈگڈگی کی لے بدلی۔ اب کی بار بندر ٹھمکے لگا کر مٹکنے لگا اور گول چکر کاٹنے لگا۔

دائیں طرف اپنی ماں کی گود میں موجود آدھے ننگے بچے نے بے اختیار ہو کر تالی پیٹی تھی۔ بندر کا کرتب حیران کن تھا اور بچے کی خوشی کو دوچند کرنے والا تھا۔ ماں نے بچے کے چہرے کی مسکراہٹ کو طمانیت سے دیکھا اور ہجوم چیرتی باہر آگئی۔ بچے کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ اب مزید ٹھہرنے کا جواز نہیں بنتا تھا۔ مزید ٹھہرتی تو مداری کو تماشا دیکھنے کے عوض چند سکے دینے پڑتے اور اس مفلوک الحال عورت کے پاس دینے کے لیے چند سکے بھی نہ تھے۔

یعقوب علی ایک مداری تھا۔ گھر کی دال روٹی اسی بندر اور... ڈگڈگی کے سہارے ہی تو چلتی تھی۔ قناعت پسند سا یعقوب مطمئن تھا کہ اللہ نے رزق کا کوئی وسیلہ تو بنایا ہوا ہے ورنہ گاؤں میں کتنے ہی ایسے مرد تھے جن کے پاس کوئی ہنر نہ تھا اور وہ فارغ بیٹھ کر دوسروں کی بھیک ملی امداد کا انتظار کرنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔

مغرب کا وقت قریب تھا۔ احمد اپنے حجرے سے نکلا اور مسجد کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ ''اللہ الصمد'' نظریں جھکائے مسجد کی طرف بڑھتے ہوئے احمد کی زبان پر یہ کلمات تھے۔ اللہ سے محبت کا یہ عالم تھا کہ زبان سے نکلے کلمات دل کی دھڑکن پر اثر چھوڑتے۔ اور محبت کا یہ سرور احمد کے گرد ایک ہالہ سا بناتا۔

اپنی آسودہ حال سہیلی کی گھر کی منڈیر پر کہنی ٹکائے۔ اپنے پیارے بندر بوبو کا تماشا دیکھتے ہوئے نیلی کو سہیلی کی آواز نے متوجہ کیا۔

''نیلی! وہ دیکھ......'' گلشن ہاتھ سے احمد کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

نیلی کی نگاہوں نے گلشن کے اشارے کا تعاقب کیا۔

''کیسا بھرپور مرد ہے یہ مولوی...... قسم سے میں تو اس کو دیکھ کر آہیں بھرتی ہوں۔''

حیا سے عاری یہ فقرہ بولتے ہوئے گلشن کے چہرے کی معصومیت خباثت کا دوسرا روپ لگ رہی تھی۔

نیلی یک ٹک احمد کو دیکھنے لگی۔ جو اب مسجد کے دروازے کی کنڈی کھول رہا تھا اور پھر وہ مسجد کے اندر داخل ہوگیا اور نیلی کے دل میں ایک ایسی خواہش پیدا ہوئی جو

شرمناک تھی۔ بلاشبہ جوانی سے بڑی آزمائش اللہ نے کوئی اور نہیں اتاری۔

انسان یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ قیامت کے دن جو سوالنامہ اس کا منتظر ہوگا اس میں ایک نمایاں سوال یہ بھی ہوگا۔۔۔جوانی کن کاموں میں گزاری؟

☆☆☆

احمد کا بچپن بہت کسمپرسی میں گزرا۔ ماں تو اسے پیدا کرتے ہوئے جان سے گئی اور باپ کو تپ دق ہوا تو بروقت دوا نہ لینے پر اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ انتڑیوں میں زہر جمع ہو گیا اور یہ انتڑیوں سے پورے جسم میں سرایت کرتا گیا۔ یہاں تک کہ جب اسے عزیز و اقارب سرکاری اسپتال لے گئے تو ڈاکٹر نے لاعلاج قرار دے دیا اور یوں وہ اسپتال کے ہی ایک بیڈ پر سسک کر مر گیا۔ اس وقت احمد کی عمر تین سال تھی جب وہ اپنے چچا کے گھر کا اضافی فرد آن بنا۔ چچا چچی کے اپنے حالات ایسے تھے کہ وہ اپنے بچوں کو گن گن کر نوالے دیتے تھے۔ احمد کا اضافہ کچھ خوش آئند اضافہ نہ تھا۔ لیکن بہرحال خدا ترسی بھی کوئی چیز تھی۔ تین سال تک چچا سے جس قدر کفالت ہو سکتی تھی کی اور پھر ایک نیک دوست کے مشورے پر احمد کو قریبی قصبے کے مدرسے چھوڑ آیا۔

یہ وہ وقت تھا جب احمد کو اللہ سے محبت ہونا شروع ہوئی حالانکہ وہ اس وقت صرف چھ سال کا بچہ تھا جینے کے لیے مضبوط سہارے کی ضرورت تھی۔ مدرسے کے دوسرے بچوں کی طرح وہ چھٹی کا انتظار کرتے ہوئے قاعدہ نہیں پڑھتا تھا۔ وہ دل سے پڑھتا تھا اور شوق سے پڑھتا تھا۔ پڑھنے میں اسے لطف آتا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ آٹھ سال کی عمر میں ناظرہ قرآن مجید کا حافظ تھا۔

اس دوران میں اس کا مہینے ڈیڑھ مہینے بعد ایک دن کی چھٹی پر چچا کے گھر جانا ہوتا تھا۔ وہ گھر جہاں اس کا استقبال کرنے کے لیے کوئی نہ ہوتا۔ اسی لیے اسے گاؤں جانے کا انتظار بھی نہ رہتا۔ احمد کی لگن کو دیکھتے ہوئے مدرسے کے مہتمم کی خاص شفقت احمد کے ساتھ تھی۔ وہ خصوصی محبت کے ساتھ اس سے پیش آتے اور اس کی ضروریات کا خیال رکھتے۔ مدرسے میں دنیاوی تعلیم کا اہتمام بھی تھا۔ سولہ سال کی عمر میں اس نے میٹرک کا امتحان بھی پاس کر لیا اور اسی سال اس نے مدرسے سے ملحقہ مسجد میں رمضان مبارک میں نمازِ تراویح بھی پڑھائی اور مدرسے کے قیام سے لے کر پچاس سالہ تاریخ میں سب سے کم عمر نمازِ تراویح پڑھانے والا امام بن گیا۔ اس اعزاز میں جہاں احمد کے شوق کا ہاتھ تھا وہاں یہ حقیقت بھی تھی کہ خدا اس پر مہربان تھا۔

انیس سال کی عمر میں وہ درس نظامی کا کورس بھی کر چکا تھا اور مدرسے کے کرم طلبا میں شمار ہوتا تھا۔ پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ جب دل دھڑکتا تو احمد کو محسوس ہوتا اللہ کی آواز آتی ہے۔ ان دنوں احمد کے گاؤں سے ایک تقاضا مدرسے پہنچا۔

گاؤں کی جامع مسجد کے امام صاحب کے انتقال کے بعد مسجد ویران ہی ہو گئی تھی اور گاؤں کے اکابر اپنے ہونہار لڑکے کو مسجد کی خدمت کے لیے لے جانا چاہتے تھے اور یوں احمد مسجد کا امام بن کر اپنے گاؤں واپس لوٹا اور قیام کے لیے اسے مسجد سے تھوڑے فاصلے پر امام صاحب کے لیے مختص حجرہ دیا گیا۔ وقت گزر رہا تھا اور اس گزرتے وقت کی خوبصورتی یہ تھی کہ احمد کی پرہیزگاری میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ بلاشبہ وہ گاؤں کا معزز باشندہ تھا۔ کیا چھوٹے کیا بڑے، سبھی اس کی دل سے عزت کرتے تھے اور یقیناً وہ عزت کا حق دار بھی تھا۔

اور وہ چچا جو احمد کے سربراہ تھے، جن کا رویہ بچپن میں اوسط درجے کا ہوتا تھا، اب اچھا بلکہ خوب اچھا ہو گیا۔ اس کی وجہ وہی تھی جو کہ عموماً معاشرے میں ہوتی ہے۔

حمیرا...... چچا کی بیٹی بھلا اس کے لیے احمد سے اچھا رشتہ کہاں ہو سکتا تھا۔ یوں بھی تو چچا قائل تھے کہ لڑکا بغل میں ہو تو شہر میں ڈھنڈورا نہیں پیٹنا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے گاؤں کے ایک معزز آدمی جو کہ سالوں سے پانچ وقت کے نمازی تھے کے ہاتھوں پیغام احمد تک پہنچایا اور احمد کے پاس انکار کا بھلا کیا جواز ہوتا۔

چنانچہ یہ طے پایا کہ ربیع الاول کے مہینے میں موسم بھی خوشگوار ہوگا تو نکاح اور حسب توفیق ویسے کے ساتھ رخصتی کر دی جائے گی۔ خدا کی محبت میں مبتلا احمد خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے نہ تھکتا تھا۔ اللہ نے اسے سب کچھ اس کی اوقات سے زیادہ دیا تھا اور احمد کو یقین ہو چلا تھا کہ خدا اس سے بھی اتنی ہی محبت کرتا ہے اسی لیے تو اس قدر دیتا ہے۔ یہ سب سوچتے ہوئے بھی اس کے ذہن میں یہ نہ آیا کہ اللہ اپنے پسندیدہ بندوں کو آزماتا بھی ہے۔

☆☆☆

دن چڑھے کافی وقت ہو چکا تھا۔ یعقوب علی بو بو کو لے کر کب کا روزگار کی تلاش کے لیے جا چکا تھا اور نائلہ ابھی تک چادر میں سر دیے سو رہی تھی۔ "نائلہ، نائلہ......" عذرا نے باورچی خانے سے آواز لگائی۔ اب جانے نائلہ کی نیند اتنی پکی تھی یا پھر وہ خود اتنی ڈھیٹ تھی کہ اس کے وجود میں کوئی

حرکت نہ ہوئی اور عذرا کی پریشانی سوا ہوگئی۔ نائلہ کو اس نے پیار سے سمجھا کر دیکھ لیا۔ ڈانٹ ڈپٹ اور یہاں تک کہ مار کر بھی دیکھا مگر بات وہی رہی کہ ڈھاک کے تین پات ...... جانے وہ اس دنیا میں انوکھی تھی جس پر جوانی آئی تھی۔

چھوٹی بہنیں سدرہ اور اقرا بھی تو تھیں عذرا کا اس قدر ہاتھ بٹاتیں کہ ایک طرح سے سارا کام یہ لڑکیاں کرتیں اور نائلہ......بس خدا کی پناہ۔

نیلی جانے اور کتنے پہر سوتی۔ تبھی اس کی سہیلی گلشن آئی۔ عذرا کو باورچی خانے کے دروازے سے سلام کیا اور نیلی کے سرہانے بیٹھ کر اسے اٹھانے لگی۔

اور دس منٹ بعد نیلی کمرے میں گلشن کے ساتھ بیٹھی تھی اور کمرے سے صدا لگا کر کہہ رہی تھی۔

"سدرہ! دو کپ چائے ہی دے جاؤ۔"

عذرا کو تاؤ تو بہت آیا مگر غصہ پی کر بیٹھی رہی اور سدرہ کے بجائے خود چائے دینے کمرے میں آئی۔

اندر کمرے میں نیلی اور گلشن جانے کون سے راز و نیاز کا سرگوشیوں میں تبادلہ کر رہی تھیں کہ عذرا کو اندر آتے دیکھا تو یکدم خاموش ہوگئیں۔

عذرا ٹھٹکی۔ اور اس بار اس نے ماتھے پر بل آنے سے نہ روکا۔

"آج اگر فرصت مل جائے تو پالک بنا لینا۔ میں پالک کاٹنے لگی ہوں۔ پھر سے بلانا نہ پڑے۔" عذرا کے الفاظ میں واضح تھا کہ گلشن کو جلد چلے جانا چاہیے اور یہ پوشیدہ پیغام گلشن نے فوراً سمجھ لیا۔

"تمہاری ماں تو بہت کڑوی ہے۔" گلشن نخوت سے سر جھٹک کر بولی اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جانے دے گلشن...... مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔" نیلی نے گلشن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ دوبارہ بیٹھی لیکن آدھ گھنٹے بعد روانہ ہوگئی۔ گلشن کے بعد نیلی چہرے پر ناپسندیدہ تاثرات لیے ماں کے پاس آئی۔

"اماں! کم از کم میری سہیلی سے تو ٹھیک طرح بات کیا کر۔"

"بیٹی ہے تو بیٹی بن کر رہ، میری ماں نہ بن۔ مجھے تیری یہ امیر سہیلی ایک آنکھ نہیں پسند۔" عذرا بولی تو اس کا لہجہ الفاظ سے زیادہ تڑختا ہوا تھا۔

"بہنیں ہیں مگر دل کی بات کہنے کے لیے کوئی دوست تو ہونا چاہیے۔"

"نہ ایسی کونسی دل کی باتیں ہیں اور اس وقت تم دونوں کیا باتیں کر رہی تھیں جو مجھے دیکھ کر یوں خاموش ہوگئیں؟" عذرا کا دل تو چاہا کہ نیلی کے دو ہاتھ لگائے۔

"بس! اماں تھی کوئی بات۔ تم تو تھانیداروں کی طرح تفتیش کرتی ہو۔" نیلی بیزار ہو کر اٹھ کر جانے لگی۔

"جو بات ماں سے چھپائی جائے اور سہیلی سے کہی جائے وہ کس طرز کی ہوگی، میں سمجھتی ہوں۔ نیلی سنبھل جا۔ بیٹی کا پاؤں پھسلے تو سارا گھر منہ کے بل گرتا ہے۔ آئندہ گلشن سے ملنے کی ضرورت نہیں اور یہ پالک لیتی جا، آج کھانا تو نے پکانا ہے۔"

نیلی نے رک کر ماں کی پوری بات سننے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور چلتے ہوئے کمرے تک آگئی۔

"اس گھر میں ایک بوبو ہے جس سے بندہ کچھ بات کرسکتا ہے باقی سب تو بس خدا کی پناہ......" چارپائی پر دراز ہوتے ہوئے نیلی بڑبڑائی۔

چند لمحوں بعد نیلی کے خیالوں میں وہ لڑکا آگیا جس کی مردانہ وجاہت آنکھوں کو خیرہ کر دیتی تھی۔

"اے کاش......" خیال رکے نہیں مجھ سفر رہے۔

☆☆☆

ساتھ والی صفیہ خالہ کے پیٹ میں اچانک درد شروع ہوگیا۔ صفیہ خالہ کا پوتا بھاگم بھاگ گاؤں کے حکیم سے دوا لے آیا۔ کچھ افاقہ تو ہوا لیکن مکمل طور پر درد ٹھیک نہ ہوا۔ تبھی صفیہ خالہ کا پوتا عذرا کے لیے پیغام لے کر آیا۔

"دادی بلا رہی ہیں، کہتی ہیں تسلی کے دو بول ہی بول جاؤ۔" عذرا اور صفیہ میں ان دنوں کی دوستی تھی جب وہ کنواری لڑکیاں تھیں اور یہ اسی دوستی کا مان تھا کہ عذرا اسی وقت چادر لیے تیمارداری کے لیے روانہ ہوگئی حالانکہ مغرب کا وقت تھا۔ مغرب کے بعد وہ گھر سے باہر نہیں جایا کرتی تھی۔

"باہر مت جانا۔ بہنوں کے پاس ہی رہنا۔" عذرا اپنے دس سالہ بیٹے کو ہدایت دے رہی تھی لیکن عثمان تھوڑا بے پروا تھا اور کچھ عمر کا تقاضا بھی تھا اسی لیے زیادہ دھیان نہ دیا اور اپنی ٹوٹے پہیوں والی گاڑی سے کھیلتا رہا۔

عذرا گئی تو کسلمندی سے اکتائی بیٹھی نیلی کا ٹوٹا بدن مزید ٹوٹنے لگا۔ خیالات انتشار پھیلانے لگے اور اس نے بھی باہر جانے کا پروگرام بنا لیا۔ کھونٹی سے چادر کھینچی اور اوڑھ لی۔ عموماً جاتے ہوئے نیلی بے پروائی سے سر پر دوپٹا لیا کرتی تھی، آج چادر لی تھی تو وہ چاہتی تھی کہ ملگجے اندھیرے میں پہچانی نہ جائے۔

"گلشن کی طبیعت خراب ہے اسی کو پوچھنے جا رہی ہوں۔"

آسمان کا رنگ ابھی جامنی سا تھا۔ مکمل سیاہ نہیں ہوا

تھا۔ ٹمٹماتے تارے آسمان کی خوبصورتی بڑھا رہے تھے اور نیلی تیز قدموں سے چل رہی تھی۔

چلتے چلتے وہ رک گئی، منزل آ گئی تھی۔ منزل احمد کا حجرہ تھا۔ حجرہ ڈیوڑھی اور ایک کمرے پر مشتمل تھا۔ ڈیوڑھی کے ایک کونے میں چولہا رکھا تھا اور ایک دروازہ بیت الخلا کا تھا۔ ڈیوڑھی کے دائیں طرف دروازہ کمرے کا تھا۔

کمرے میں سفید کپڑوں میں ملبوس احمد بے خیالی سے بیٹھا اپنی ڈاڑھی میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ پاکیزگی اس کے چہرے کا حسن تھی۔ حجرے کا دروازہ کھلا تھا۔ یہ دروازہ ہر وقت ہی کھلا رہتا تھا۔ احمد صرف رات سوتے وقت ہی دروازہ بند کرتا تھا۔ حجرے میں داخل ہونے کے بعد نیلی نے تیزی سے دروازہ بند کر دیا۔ کنڈی لگالی۔

دروازے پر کھٹکے کی آواز آئی تو احمد سمجھا چودھری صاحب کا ملازم ہوگا۔ چودھری صاحب کے بیٹے کو درد شقیقہ نہ چھوڑتا تھا۔ احمد نے چند دن دم کیا تو درد شقیقہ یوں بھاگ گیا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ تب سے رات کا کھانا چودھری صاحب کے گھر سے آتا تھا۔ حالانکہ احمد نے بہتیرا انکار کیا تھا۔ اسے بچوں کو قرآن مجید پڑھانے کے عوض ملنے والا ہدیہ ہی کافی تھا۔ اچھا گزارہ ہو جاتا مگر چودھری صاحب نہ مانتے تھے۔

آنے والا چودھری صاحب کا ملازم نہ تھا۔ نیلی کو دیکھ کر احمد لمحے بھر کے لیے ہڑبڑا گیا۔

نیلی دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی محویت سے احمد کو دیکھ رہی تھی۔

''میں تمہارے ساتھ......'' سرسراتے الفاظ نیلی کے لبوں سے ادا ہوئے۔ ماحول ایک دم ساکن سا ہو گیا۔

☆☆☆

ماضی کی یادیں ایسی تھیں کہ آپا کو اردگرد کا ہوش نہ تھا۔ ٹوٹے ہوئے ہتھے والی خستہ حال کرسی پر بیٹھے آپا ماضی میں کھو گئیں۔ وہ ماضی جس نے حال کی بنیاد رکھی تھی۔ ہمیشہ ماضی ہی تو حال کی بنیاد رکھتا ہے۔ تبھی ایک ہیولا پیچھے سے ظاہر ہوا۔ تھوڑا آگے سرکا تو نمایاں ہوا۔ یہ بھورا ریچھ تھا۔ بھورے ریچھ نے قدم بڑھائے اور آپا کا وجود اس کے ہیولے میں دب گیا اور اس سے پہلے کہ آپا کا وجود ریچھ میں مدغم ہوتا، ایک دلخراش چیخ آپا کے لبوں سے نکلی۔ چیخ دیواروں سے ٹکرا کر دوبارہ آپا تک لوٹ آئی۔ ڈرتے لرزتے آپا کرسی سے اٹھیں۔ وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھیں لیکن پاؤں کسی نادیدہ چیز سے الجھا اور آپا منہ کے بل

انمول موتی

☆ سورج کی روشنی میں کائنات کے نشیب و فراز نظر آتے ہیں اور علم کی روشنی میں زندگی کے نشیب و فراز۔

☆ بہترین یادداشت وہ ہے جس میں انسان اپنی نیکیاں اور دوسروں کی زیادتیاں بھول جاتا ہے۔

☆ صبر ایک روشنی ہے۔ جس کی وجہ سے باطل کے اندھیرے چھٹ جاتے ہیں۔

☆ مسکراہٹ خوب صورتی کی علامت ہے اور خوب صورتی زندگی کی۔

☆ اللہ کے سوا کسی سے توقع مت رکھو اور سوائے اللہ کے کسی پر بھروسا مت کرو۔

☆ زبان کو شکوہ سے روکو۔ خوشیاں عطا ہو جائیں گی۔

☆ یہ نہ دیکھو کہ بات کس نے کی ہے۔ یہ دیکھو کہ بات کیسی ہے۔

☆ تند و تیز لہجہ پُر فریب اور گمراہ کن خوشامد سے بہتر ہے۔

☆ زندگی کی عظیم ترین مسرت یہ ہے کہ تم وہ کام کر دکھاؤ جو دوسرے سمجھتے ہیں کہ تم نہیں کر سکتے۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

☆......................☆☆......................☆

کام کی بات

اگر آپ کسی مریض کی عیادت کے لیے جاتے ہیں اور آپ دیکھتے ہیں کہ مریض گہری نیند سو رہا ہے تو اسے جگانا مناسب نہیں۔ آپ اس کے جاگ اٹھنے کا انتظار کریں یا واپس لوٹ آئیں۔ عیادت کے لیے آپ دوبارہ جا سکتے ہیں۔

☆☆☆

کوئی آپ سے تلخ کلامی کرے تو آپ غصہ نہ کریں بلکہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کریں بلکہ خوش مزاجی کا مظاہرہ کریں اور اپنی آواز دھیمی رکھیں۔ اس سے جھگڑا ختم ہوگا۔ طول نہیں پکڑے گا۔

☆☆☆

کسی چغل خور کی بات پر دھیان مت دیں اور اسے ڈانٹ کر چلتا کر دیں۔ چغل خوروں کی وجہ سے لڑائی جھگڑا بڑھتا ہے اور تصادم میں کئی انسان جان سے جاتے ہیں۔

مرسلہ۔ بشیر احمد بھٹی، فوجی بستی بہاولپور

فرش پر گریں۔

اونچا نیچا فرش۔ جسم کے کئی حصوں پر چوٹ لگی۔ ماتھے سے خون بھی بہنے لگا۔

بہتے خون کی تکلیف اتنی زیادہ نہ تھی اور چند منٹوں بعد خون بہنا بند ہوگیا۔ آپا نے یوں ہی زمین پر گرے گرے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بھورا ریچھ جا چکا تھا جیسے آیا تھا ویسے ہی چلا گیا تھا۔ پر اپنے نقش چھوڑ گیا تھا۔

وہ اٹھنے کی سکت نہ پاتی تھیں لبوں سے سسکیاں نکل رہی تھیں، آپا یونہی زمین پر اوندھے منہ پڑی رہیں اور سسکتی رہیں۔ ماضی کی حقیقت ...... حال کا عفریت بن چکا تھا۔

اور پتا بھی نہ چلا کہ صبح کی اذانیں ہونے لگیں۔ جسم میں نقاہت حد سے زیادہ تھی۔ لیکن آپا ہمت کر کے اٹھیں اور صحن میں لگے نل سے وضو کرنے لگیں۔ نماز میں خدا سے کلام کر کے تھوڑا سکون تو ملا مگر ایک تشنگی بھی رہی۔ وہ تشنگی جو زندگی کا حصہ تھی۔ نماز پڑھنے کے بعد بھی آپا جائے نماز پر بیٹھی رہیں۔ شب بھر کی جاگی آپا کی آنکھیں کب جھپکیں آپا کو پتا نہ چلا۔

آنکھ دروازے پر ہونے والی دستک سے کھلی۔ تب تک دن نکل چکا تھا... چڑیوں کی چہچہاہٹ اب سرگوشیوں جیسی تھی۔ کمزور پڑتے نقاہت زدہ جسم کو گھسیٹتے آپا دروازے تک آئیں۔

"کون؟" لرزتی آواز کو مضبوط کرنے کی بھرپور کوشش کے ساتھ آپا نے پوچھا۔ اگلے بندے نے جواب دینے کے بجائے دوبارہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپا نے دروازہ کھول دیا۔

سامنے ہاتھ میں ٹفن لیے رضا کھڑا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"خالہ نے سوجی بھونی تھی، آپ کے لیے بھی بھیجی ہے۔"

"میں نے تمہیں کہا تھا کہ دوبارہ مت آنا۔ جاؤ ابھی۔"

"حوصلہ آپا، ایک تو آپ میں صبر کی کمی ہے، ڈیوڑھی پر کھڑا ہوں۔ ایمان سے ایک قدم آگے نہ آؤں گا۔" رضا کی مسکراہٹ تھوڑی اور گہری ہوگئی۔ پان زدہ دانہ دار ہونٹ تھوڑے اور نمایاں ہوگئے۔

"یہ ٹفن پکڑ لیں۔" رضا نے ٹفن آگے بڑھایا۔

کرخت نگاہوں سے رضا کو گھورتے ہوئے آپا نے ٹفن پکڑ لیا۔ اب یہ رضا کی شعوری کوشش تھی کہ اتفاقاً آپا کا ہاتھ رضا کے ہاتھ سے مس ہوا۔

"اف ...... ہاتھ تو آپ کے بیس سال کی لڑکی کی طرح نرم ہیں۔" آپا کے ہاتھ ہرگز نرم نہ تھے۔ کھردرے اور سخت تھے پر رضا نے چھچھورپن تو دکھانا تھا۔

"چلتا ہوں فکر نہ کریں میں ہر طرح کے معاملات میں فریقین کی رضامندی کا قائل ہوں۔ زور زبردستی رضا کا شیوہ نہیں۔" رضا آنکھوں میں ملعون چمک لیے کہہ رہا تھا۔

"شام کو اپنے شہر بھی جا رہا ہوں۔ یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ بھی نہیں مانتیں اور میری خالہ بھی بڑی اوپر کی چیز ہے اپنی بیٹی کی ہر وقت ایسے تعریفیں کرتی ہے جیسے میں اندھا ہوں۔ اور جیسا اس کا چلن ہے میں کہے دیتا ہوں اس کے معاشقے محض معاشقے تک محدود نہ ہوں گے۔ اگر دو چار دن اور رہ لیا تو خالہ اپنی بیٹی سے نکاح کے بول پڑھوا کے دم لے گی۔"

رضا کہتا ہوا چلا گیا اور آپا ہاتھ میں ٹفن لیے کھڑی رہیں۔

جوانی کے زعم میں انسان ہر چیز کو کس قدر دوسری نگاہ سے دیکھتا ہے خود آپا بھی تو ایسا کرتی تھیں۔ چند لمحے یونہی کھڑے رہنے کے بعد آپا نے کواڑ بند کر دیے۔ خستہ حال دروازہ مفلسی کی کہانی سناتا تھا۔

☆☆☆

آج زرتاشہ اکیلے پڑھنے آئی تھی۔ چھوٹی بھتیجیاں ماں کے ساتھ ددھیال گئی ہوئی تھیں۔ پڑھانے کے دوران آپا نے محسوس کیا کہ زرتاشہ کا ذہن پوری طرح سبق کی طرف متوجہ نہیں۔ بار بار وہ گھور گھور کر آپا کا چہرہ دیکھتی ایک پل کو تو آپا کو خیال آیا کہ زرتاشہ کو ٹوک دیں اور کہیں کہ پڑھائی کی طرف توجہ دو۔ لیکن آپا نے خود کو یہ کہنے سے باز رکھا۔ زرتاشہ دل سے پڑھائی کرنے والی لڑکی تھی۔ آج اگر تھوڑی کم متوجہ تھی تو کوئی بات نہیں۔ بعض اوقات پڑھنے والے بچوں کا بھی پڑھائی کا دل نہیں کرتا۔

تبھی ہوا کا ایک آوارہ سا جھونکا آیا۔ جامن کے پتوں نے مل کر عجب سا شور مچایا اور کئی خشک پتے آپا کے آنگن میں آن گرے۔

"آپا! آپ ان ہمسائیوں سے کہتی کیوں نہیں کہ وہ جامن کا یہ بڑھا ہوا ٹہنا کٹوا دیں۔ ہر وقت یوں ہی آپ کا آنگن سوکھے پتوں سے بھرا رہتا ہے۔ دن میں کتنی بار تو آپ کو صفائی کرنی پڑتی ہے۔"

زرتاشہ کی بات سن کر آپا کے لبوں پر ایک مسکراہٹ آ کر معدوم ہوگئی۔

"تم لوگوں کو پڑھانے کے علاوہ ایک آنگن کی صفائی کا کام ہی تو کرتی ہوں۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو ...... میں تو شکر کرتی ہوں کہ یہ جامن میرے آنگن میں بھی پتے بکھیرتا ہے۔"

آپا کی اپنی منطق تھی۔ رزتاشہ کی سمجھ میں آئی نہ آئی پر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اگر آج پڑھنے کا دل نہیں تو مت پڑھو کتاب بند کردو۔" زرتاشہ شاید اسی فقرے کے انتظار میں تھی۔ ابھی فقرہ آدھا ہی ہوا تھا کہ زرتاشہ نے کتاب بند کردی اور کہنی ٹکا کر بیٹھ گئی اور آپا کے لب ایک بار پھر مسکرا اٹھے۔

"آپا! ایک بات کہوں؟" زرتاشہ ہاتھ کی مٹھی گال پر جمائے آپا کو دیکھ رہی تھی۔

"ہوں۔"

"آپ مجھے بے حد اچھی لگتی ہیں۔ میں آپ جیسی بننا چاہتی ہوں۔ میں بھی بڑی ہوکر سارے محلے کی آپا بنوں گی۔ شادی نہیں کروں گی اور بچوں کو پڑھایا کروں گی۔"

چائے دان آپا کے ہاتھ سے پھسلا اور دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ ساری پتی احاطے میں بکھر گئی۔ آپا خالی نظروں سے یک ٹک زرتاشہ کو دیکھے گئیں اور زرتاشہ آپا کے یوں دیکھنے پر ٹپٹا گئی۔ اصولاً آپا کو یہ سن کر مسکرانا چاہیے تھا۔ آپا کا یوں گھور کر دیکھنا عجیب لگ رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے قدم بھرتی آپا زرتاشہ کے قریب آگئیں اور زرتاشہ کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئیں تب زرتاشہ نے بغور دیکھا تو اسے آپا کی آنکھوں کے گوشے نم لگے۔

"جو گناہ میں نے کیے وہ کوئی نہ کرے اور میرے جیسا نصیب کسی کا نہ ہو۔" گلوگیر لہجے میں آپا نے کہا۔ دل تو چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں مگر مصلحت کا جبر دامن گیر تھا۔ نوعمر لڑکی جو اس کی طالبہ تھی اس کے سامنے رونا کہاں کی دانشمندی تھی۔

☆☆☆

غصہ شر کے مانند انگ انگ کو دہکاتا تھا۔ نیلی کبھی اس کروٹ لیٹتی تو کبھی اس کروٹ۔ مگر غصہ تھا کہ بڑھتا ہی جاتا۔ اس غصے میں انا نے بھی اپنا حصہ ملایا تو تن من میں مزید آگ لگ گئی اور یہ آگ یونہی بجھنے والی نہ تھی۔ اس مولوی لڑکے احمد کا سراپا ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے لہرایا تو نیلی کا دل چاہا کہ اس کے منہ پر ہی تھوک دے۔

اپنی آگ بجھانے کے لیے تو وہ احمد کے دروازے پر گئی تھی مگر نیلی کو جھٹک کر، اس نے ایک اور آگ کو دہکا دیا تھا۔ یہ انتقام کی آگ تھی اور انتقام کی آگ انتقام لینے سے بجھتی ہے۔ رات بھر جاگ کر نیلی نے سوچ لیا تھا کہ اس نے کس طرح انتقام لینا ہے۔

اگلے دن مغرب کے وقت جب دن کی روشنی رات کے اندھیرے میں مکمل طور پر گم ہوچکی تھی تب نظر بچا کر نیلی ایک بار پھر احمد کے حجرے میں کھڑی تھی۔

"کیا تم میری بات نہیں مانو گے؟" نیلی کی سبز آنکھوں میں آج خمار نہ تھا بلکہ غصے کی لو زیادہ چمکتی تھی۔

ڈاڑھی میں انگلیوں سے خلال کرتے ہوئے احمد یک دم چونکا۔ آزمائش آتش ساماں ہوکر آج پھر آگئی تھی، بہتر ہوتا کہ وہ دروازہ مقفل رکھتا مگر......

"تمہیں اللہ سے ڈر نہیں لگتا؟" یہ کہتے ہوئے احمد کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں کہ اس کا ایمان اسے کسی نامحرم کو دیکھنے کی بھی اجازت نہ دیتا تھا۔

"کیا تم میری بات نہیں مانو گے؟" نیلی کا لہجہ تیز تھا۔

"لڑکی! جاؤ یہاں سے۔" احمد بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اب کے بار اس کے انداز میں کرختگی بھی تھی۔

"کیا تم میری بات نہیں مانو گے؟" نیلی پلکیں جھپکائے بغیر اپنی بات دہرا رہی تھی۔

احمد نے پہلی بار نظر اٹھا کر نیلی کو دیکھا۔ جو ایک ہی فقرہ دُہرائے جارہی تھی۔ آخر کیا چیز تھی یہ لڑکی۔

"ہرگز نہیں، میں مسجد کا امام ہوں۔ مسجد کا امام بدکاری کرے گا تو لوگ کہاں تک چلے جائیں گے۔ میں ایسا گھٹیا کام ہرگز نہیں کرسکتا۔" نیلی، احمد کو دیکھنے لگی۔ بے ترتیب سانسیں ہیجان کی علامت تھا۔

"تمہیں میری بات ماننی ہوگی۔"

"لڑکی! تم پاگل ہوگیا یہاں سے جاتی ہو کہ دھکے دے کر نکالوں۔" احمد کو لگنے لگا کہ شاید وہ باتوں سے نہیں مانے گی۔

کمرے کو روشن کرنے والی بلب کی زرد منگی روشنی تھی اور اس روشنی میں کمرے میں موجود ہر چیز کا عکس بن رہا تھا تب نیلی نے پہلی بار نظریں احمد کے سراپا سے ہٹا کر ارد گرد ڈالیں۔ سادگی ہر چیز سے ٹپکتی تھی اور سامنے والی دیوار پر احمد کا ہیولا بن رہا تھا۔ یہ ہیولا جیسے پوری دیوار پر محیط تھا۔

"اگر تم میری بات نہیں مانو گے تو میں شور مچادوں گی۔ تمہیں بدنام کردوں گی۔" اس بار نیلی کی نگاہ احمد پر نہیں بلکہ اس کے ہیولے پر تھی۔

احمد جیسے خاموش ہوگیا۔ وہ لڑکی یقیناً پاگل تھی۔

"میں مسجد کا امام ہوں۔ لوگ جانتے ہیں میرا کردار کیسا ہے۔ وہ تمہارے جھوٹ پر ہرگز یقین نہ کریں گے۔" احمد کو یقین تھا اور ایک سکون اس کے الفاظ و لہجے سے جھلکتا تھا۔

"ہونہہ......" نیلی استہزائیہ سی ہنسی ہنس دی۔

"آخری بار پوچھتی ہوں، کیا تم میری بات نہیں مانو گے؟"

"ہرگز نہیں......"

نیلی سبز آنکھوں میں غضب لیے چند ثانیے احمد کو گھورتی رہی اور پھر چپ چاپ کمرے سے نکل گئی۔ جاتے جاتے دوپٹا کمرے میں گراتی گئی۔

اور جب وہ حجرے سے نکل رہی تھی تب ایسی دلخراش چیخیں اس کے حلق سے نکل رہی تھیں کہ پگڈنڈیوں پر اپنے اپنے گھروں کو جاتے لوگ ٹھٹک کر رک گئے۔

ہذیانی انداز میں چیختی نیلی کی سبز آنکھیں وحشت سے باہر الٹ رہی تھیں۔ بوند بوند آنسو ٹپک رہے تھے۔

"ارے یہ تو مداری کی لڑکی ہے، اسے کیا ہوا؟"

ادھیڑ عمر آدمی نے اپنے ساتھی سے کہا تھا۔

"اور یہ مولوی کے حجرے سے کیوں نکل رہی ہے؟"

نیلی لڑکھڑائی اور ایک پتھر سے ٹکرا کر گر پڑی۔ چیخوں میں ہذیان کا عنصر پہلے سے گہرا تھا۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" دو سے چار لوگ جمع ہوئے، چار سے آٹھ......اور یوں پورا مجمع ہی اکٹھا ہو گیا۔ نیلی کی چیخیں تو آس پاس کے گھروں سے لوگوں کو پگڈنڈی پر لے آئیں۔

یعقوب بوبو کو لیے نگر نگر تماشا کرنے کے بعد گھر جا رہا تھا کہ پگڈنڈی میں اسے تماشا لگا نظر آ گیا۔ تھکاوٹ یعقوب پر حاوی تھی پر انسانی فطرت کے پیش نظر وہ رک گیا کہ دیکھ لے کہ کیونکر لوگ اکٹھے ہوئے ہیں اور سامنے جو منظر تھا اس نے حقیقتاً یعقوب علی کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی۔

اس کی بیٹی بال بکھرائے زمین پر خاک ہوئی چیخیں مار رہی تھی اور لوگ چہ میگوئیاں کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ تھے۔

"کیا ہوا؟ بیٹی...... بتاؤ؟" ایک بڑی عمر کی عورت آگے بڑھی اور سر پٹختی ہوئی نیلی کے بال سہلانے لگی۔ نیلی کی چیخیں تھم گئیں۔ پر خوف آنکھوں سے تا حال جھلکتا تھا۔ خالی نگاہوں سے نیلی نے ہجوم کو دیکھا۔ اندھیرا ہونے کے باوجود بھی کتنے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے اور پھر نیلی گویا ہوئی تو وہ سسک رہی تھی۔

"مجھے مولوی بہلا پھسلا کر اپنے حجرے میں لے گیا اور میرے ساتھ زیادتی کی کوشش کی۔" اور یعقوب علی کا دل ہی تھم گیا۔ یہ اس کی بیٹی کیا تماشا کر رہی تھی؟

☆☆☆

صبح دس بجے کا وقت تھا۔ گھنے پیپل کے سائے تلے پنچایت لگی تھی۔ لوگ سرگوشیاں کرتے ہوئے ایک کونے میں ماں کے ساتھ بیٹھی نیلی کی طرف اشارے کر رہے تھے۔ ملگجے حلیے میں غمگین تاثرات لیے نیلی ایسے بیٹھی تھی جیسے لٹ ہی گئی ہو۔ نیلی کے ساتھ بیٹھی عذرا کی آنکھیں اس قدر خالی تھیں جیسے ان کی بینائی ہی نہ رہی ہو۔ آخر اس کی بیٹی کے ساتھ واقعی کچھ ہوا تھا؟ اگر ہوا بھی تھا تو ڈھول بجا کر سب کو کیوں بتا رہی تھی......کیا یہ قیامت تھی؟ اگر یہ قیامت نہیں تھی تو قیامت سے پہلے کیونکر آ گئی۔ جھکا ہوا سر اٹھا کر عذرا نے یونہی سامنے دیکھا۔ سامنے گاؤں کا سب سے بدمعاش لڑکا بیٹھا تھا اور مسکرا، مسکرا کر نیلی کی طرف اشارے کر رہا تھا۔

عذرا کا سر ایک بار پھر جھک گیا۔

وہ تو رشتے دار مردوں کی انجمن میں یوں بیٹھنا پسند نہیں کرتی تھی پر آج بیٹی پنچایت تک لے آئی تھی۔ یہ عذاب کیونکر مسلط ہو گیا تھا۔ لمحے بھر کو تو عذرا کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ نیلی اس کی بیٹی نہ ہوتی۔ کم از کم یوں پنچایت میں تو نہ بیٹھنا پڑتا۔

ایک کونے میں احمد بھی بیٹھا تھا۔ آج لوگوں نے پہلی بار اسے ٹوپی کے بغیر دیکھا تھا۔ ماتھے پر چوٹ کا نشان تھا۔ نچلا ہونٹ بھی پھٹا ہوا تھا۔ یہ زخم نعیم نے دیے تھے۔ اب اگر احمد اس کی منگیتر کو چھیڑے گا تو نعیم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہے گا کیا؟ ایسا بے غیرت نعیم ہرگز نہ تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ رات کو ہی احمد کو جان سے مار ڈالے مگر وہ تو لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا لیا ورنہ احمد آج یوں زندہ نہ بیٹھا ہوتا۔

ایک طرف نعیم بھی غضب ناک تاثرات لیے بیٹھا تھا۔ اس کے تاثرات ایسے تھے کہ ابھی اسے موقع ملے تو احمد کو جان سے مار ڈالے گا۔

چودھری صاحب آئے تو مجمعے میں گھومتی سرگوشیاں خاموش ہو گئیں۔ بس پتوں کی سرسراہٹ ایک ردھم لیے بکھیرتی رہی۔

"میں اپنی دوست گلشن کی طرف جا رہی تھی گلشن کی طبیعت خراب تھی، اس نے بلا بھیجا تھا۔ راستے میں اس مولوی نے مجھے جھوٹا قصہ سنایا اور بہلا پھسلا کر اپنے حجرے میں لے گیا۔ ادھر اس نے......" نیلی کی باتوں کا کوئی سر پیر نہ تھا کہیں کی اینٹ کہیں جوڑ رہی تھی۔ بس بولتے ہوئے بلک بلک کر رو رہی تھی اور اس کا بلک کر یوں رونا ہی لوگوں کو یقین دلانے کے لیے کافی تھا۔ نیلی خاموش ہوئی تو

احمد کو بولنے کا موقع دیا گیا۔
”یہ لڑکی خود میرے حجرے میں آتی تھی۔ پہلے بھی ایک دفعہ آئی تھی۔ یہ مجھے ترغیب دینے آئی تھی مگر میں نے اسے جھڑک دیا۔“
”بکواس کرتا ہے یہ کمینہ، بڑا مولوی بنا پھرتا ہے اس کی تو......“ نعیم پھر اٹھ کر کھڑا ہوا اور بھوکے شیر کی طرح احمد پر جھپٹا اور دوسرے لمحے وہ احمد پر چڑھا اس کے سر پر گھونسوں کی برسات کر رہا تھا۔ چند تنومند نوجوان آگے بڑھ کر بچاؤ کرانے لگے پر نعیم کے پاس جانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی اور جب تک لوگ احمد کو چھڑا پاتے، احمد کا سر پھٹ چکا تھا اور زخم سے ہلکا ہلکا خون رس رہا تھا۔
درد سے دکھتے وجود کو سنبھالتے ہوئے احمد نے جیب سے رومال نکال کر ماتھے کے زخم پر رکھا۔ اس سے قبل کہ احمد کا خون دیکھ کر کچھ لوگوں کے دل میں ہمدردی پیدا ہوتی، نیلی سسک کر رو پڑی۔ گریہ وزاری سے وہ کچھ اس انداز میں بین کرتی کہ کلیجا منہ کو آتا۔
”استغفر اللہ... استغفر اللہ“ لوگوں کی زبان سے یہ کلمات جاری ہوئے اور دل موم کا ٹکڑا بن گئے۔ سب نے کچھ سوچے سمجھے بغیر ہی یہ تعین کر لیا کہ نیلی سچ کہہ رہی ہے۔
”یہ ظلم جو اس پر ہوا، اب ظالم کو ایسی سزا دینی چاہیے کہ زمانہ یاد رکھے اور کوئی نفس کا مارا آدمی کسی بیٹی کی طرف گندی آنکھ سے دیکھنے سے پہلے سو بار سوچے۔“
لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ نیلی بین ڈال کر روتے ہوئے نہ تھکی تھی۔
عذرا اور یعقوب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے یہ خواہش کر رہے تھے کہ زمین پھٹ جائے اور وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔
ماتھے کے زخم کو رومال سے صاف کرتے ہوئے احمد سوچ رہا تھا کہ ابھی انصاف ہوگا۔ ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔
ایک بے سہارا انسان کی محبت اور عزت کی لوگوں کی نظر میں کوئی قیمت نہ لگ سکی۔ اسی لیے تو ایک جھوٹی لڑکی کے آنسوؤں کو سچ سمجھتے ہوئے اسے ٹھوکروں پر رکھتے ہوئے گاؤں سے دور پھینک آئے تھے۔
ایک نیک انسان، عورت کے شر میں پھنسا ہوا تھا مگر پھر بھی لوگوں سے انصاف کی امید کرتا تھا۔ کس قدر غلط امید کس قدر غلط جگہ سے لگائی تھی۔

☆☆☆

ایک نوجوان تھا۔ یوں تو اس کا رنگ شہد آگیں سانولا تھا مگر آج کوئلے سے کالا کیا گیا تھا۔ گھنی سیاہ ڈاڑھی اس کے چہرے کی سجاوٹ تھی جو آج مونڈ دی گئی تھی۔
وہ لڑکا جو سر پر ٹوپی یا دستار نہ ہو تو سر کو ننگا شمار کرتا آج اس کے بدن پر قمیص بھی نہ تھی۔
وہ جو صبح شام طرح طرح کے وظائف پڑھا کرتا تھا، گاؤں کے بچوں کو قرآن پڑھایا کرتا تھا، گاؤں کے لوگوں کو سماجی اور عائلی زندگی سے متعلق مسائل بتایا کرتا تھا۔ گاؤں کے بڑے چھوٹے سبھی اس کی عزت کرتے تھے، آج اس قدر بے عزت کیا جا رہا تھا کہ جس کی کوئی حد نہ تھی۔
”خبیث شیطان......“ دھکے دیتے ہوئے لوگ احمد کو اس طرح کے لقب سے نواز رہے تھے۔
گاؤں سے باہر کو جانے والی پگڈنڈی اتنی لمبی تو نہ تھی پر آج تو اس کی طوالت جیسے صدیوں پر محیط ہو گئی تھی۔
کیا یہ عذاب تھا جو احمد پر مسلط ہوا تھا؟ نہیں، خدا اپنے پیاروں کو آزماتا ہے یہ شاید آزمائش تھی۔ پگڈنڈی ختم ہوئی تو نعیم نے احمد کو زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا گر پڑا۔ گاؤں کے سبھی اوباش لڑکے جمع تھے۔ زمین پر گرے احمد کو گھونسوں اور لاتوں سے مارتے ہوئے لطف اٹھا رہے تھے۔
لوگ احمد کو مار مار کر تھک گئے اور گھائل احمد کو چھوڑ کر واپس گاؤں چل دیے۔ یہ پنچایت کا فیصلہ تھا کہ احمد کا منہ کالا کر کے ڈاڑھی مونڈ کر گاؤں سے نکال دیا جائے اور دوبارہ گاؤں میں داخلے پر پابندی لگا دی جائے تاکہ وہ عبرت کا نمونہ بن جائے۔
پنچایت کے فیصلے نے اسے کس طرح عبرت کا نمونہ بنایا تھا۔ سب عیاں تھا۔ رحم دل لوگوں کو احمد پر ترس آرہا تھا، پر وہ اپنی ہمدردی دل میں سنبھال کر رکھنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔
لوگ دور چلے گئے اور مٹی کے ڈھیر پر ڈھیر کی طرح پڑے احمد کے وجود میں معمولی سی حرکت ہوئی۔ دائیں ہاتھ میں مٹھی بھر مٹی لیتے ہوئے اس نے مٹی منہ پر مل لی۔
”یا خدا! تو کہاں ہے؟ کیا تو نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا؟“ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، بہتے آنسو بھی منہ پر لگی کالک کو صاف نہیں کر سکتے تھے۔

☆☆☆

”نیلی تو نے زیادتی کر دی۔ کچھ سنا بھی ہے گاؤں والوں نے مولوی احمد کا منہ کالا کر کے سر اور ڈاڑھی مونڈ کر

جوتے مارتے ہوئے گاؤں سے نکالا ہے۔" گلشن کے لہجے میں تاسف تھا۔

"ٹھیک ہی ہوا نا...... میری بات مانتا تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ کچھ کھانے کو لائے گی یا سہیلی کو یوں سوکھے منہ ہی بھیجے گی۔"

"کل ابا شہر سے ریوڑیاں لایا تھا۔ وہ لے آتی ہوں۔" گلشن چلی گئی تو نیلی منڈیر پر کہنی ٹکائے دور پگڈنڈی پر گزرتے لوگوں کو دیکھنے لگی اور اندر جب گلشن لفافے سے ریوڑیاں نکال رہی تھی تب گلشن کی ماں چلی آئی۔

"میں نے تجھے کہا تھا نا کہ اپنی اس سہیلی سے میل جول نہ رکھ اگر تو منع نہیں کر سکتی تو میں خود کہہ دیتی ہوں۔" ماں کے ماتھے پر دو نمایاں بل تھے۔

"اماں! بچپن کی سہیلی ہے۔ ایک دم سے منع نہیں کر سکتی۔ میں کہہ دوں گی۔" لفافے سے پلیٹ بھر ریوڑیاں نکال کر گلشن باقی لفافہ طاق میں رکھنے لگی۔

"یہ ایک دم کیا ہوتا ہے؟ تیری سہیلی نے جو گل کھلائے ہیں صبح شام تو جیسے تیری سہیلی کے ذکر کے بغیر ہی نہیں ہوتے۔"

"اماں نیلی نے تو کچھ نہیں کیا وہ تو مولوی لڑکا......"

"بس گلشن یہ قصہ رہنے دے، سب سمجھتی ہوں۔ بس یہ لڑکی آئندہ میرے گھر میں نہ آئے۔ اگلی بار آئی تو میں خود اسے بھگا دوں گی۔" ماں کے ماتھے کے بل مزید گہرے ہو گئے تھے۔

اور جب گلشن ریوڑیوں سے بھری پلیٹ لے آئی تب نیلی منڈیر سے جھانک رہی تھی۔

"نیلی! ہر وقت کی تاک جھانک اچھی نہیں ہوتی۔" ماں کی باتیں ابھی گلشن کے ذہن میں اٹکی ہوئی تھیں۔ اسی لیے وہ تلخ ہو رہی تھی۔

"لگتا ہے تو مولوی کی زیادہ سگی ہو گئی ہے اسی لیے مجھ سے ایسی کڑوی باتیں کرنے لگی ہے۔" نیلی نے مٹھی بھر ریوڑیاں اٹھائیں اور ایک ایک کر کے منہ میں ڈالنے لگی۔

"نیلی! اب ہم اگلے ایک ماہ تو نہیں مل پائیں گے۔ میں کل حیدرآباد جا رہی ہوں۔ نانی اور ماموں لوگوں کے پاس...... ایک ماہ سے پہلے آنے کا بالکل ارادہ نہیں۔" نیلی کو اپنے گھر آنے سے روکنے کے لیے وہ ایسا بہانہ ہی بنا سکتی تھی۔

"واہ تیرے تو مزے ہو گئے۔ وہاں جا کر خوب عیش کرے گی۔ تیرے ماموں کے تو گبرو جوان بیٹے بھی ہیں۔ کسی کو پھنسا لینا۔" نیلی بس ایسا ہی سوچ سکتی تھی۔

کوئی اور وقت ہوتا تو شاید گلشن قہقہہ لگا کر ہنس دیتی مگر ابھی تو مسکرا بھی نہ پائی۔ کچھ ریوڑیاں کھا کر اور کچھ مٹھی میں دبائے نیلی اپنے گھر کے لیے نکلی۔ پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے لوگ اس کو رک رک کر دیکھتے تھے پر اسے کوئی پروا نہ تھی۔ اپنے گھر کے دروازے پر ہی اس کی نعیم سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

"آپ......" نیلی کی تو باچھیں کھل گئیں۔

نعیم لمحے بھر کو رکا۔ نخوت سے نیلی کو دیکھا اور سر جھٹکتا ہوا اپنے راستے پر ہولیا۔ نیلی علیک سلیک بھی نہ کر سکی۔ دروازہ پار کر کے اندر داخل ہوئی دور سے ہی اس نے دیکھ لیا کہ برآمدے میں ماں سر پکڑے بیٹھی ہے۔ باپ بھی سر نیہوڑائے بیٹھا تھا۔

"غصے میں رہنا تو اماں کی عادت ہے۔" ریوڑیاں منہ میں ڈالتی وہ پہلے بوبو کے کمرے میں گئی۔ بوبو کو تیز بخار نے آلیا تھا اسی لیے تو آج یعقوب اسے کرتب کے لیے نہ لے جا سکا تھا۔

"کیسی طبیعت ہے تیری بوبو۔" بوبو زمین پر آڑھا ترچھا لیٹا گہرے سانس لے رہا تھا۔ نیلی نے بوبو کے ماتھے پر ہاتھ لگایا تو جیسے وہ آگ کی طرح دہک رہا تھا۔

"بوبو تیرا بخار تو بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ میں ابا سے کہتی ہوں تجھے ساتھ والے قصبے میں ڈاکٹر کو دکھا آئے۔ جانے جانوروں کی ٹھنڈے پانی سے پٹیاں کی جاتی ہیں کہ نہیں......" نیلی لہجے میں تشویش سموئے اپنی دھن میں خود کلامی کر رہی تھی۔ تبھی عذرا اندر آئی۔ تاثرات کچھ ایسے غضب ناک تھے کہ لگتا تھا کہ دنیا ہی تہس نہس کر دے گی۔

اندر آتے ہی اس نے نیلی کو چٹیا سے پکڑ لیا۔ ایک کراہ نیلی کے منہ سے نکلی اور ہاتھ میں دبی ریوڑیاں زمین پر بکھرتی چلی گئیں۔

"ذلیل...... کمینی...... ناہنجار۔" چٹیا پکڑ کر عذرا نے دو تین جھٹکے دیے تو نیلی دُہری ہوتی گئی۔ چٹیا کھینچ کر ہی عذرا نے نیلی کو سیدھا کیا اور منہ پر تھپڑوں کی برسات کر دی۔ مارتی جاتی اور اونچی آواز میں مغلظات بکتی جاتی تھی۔

"بے حیا، سارے گاؤں میں بدنام ہو کر خوشی مل گئی۔" مار کھاتے ہوئے نیلی کو سمجھ نہ آیا کہ ماں کیوں مارے جا رہی ہے۔

تبھی یعقوب اس طرف آیا اور کمرے کی چوکھٹ میں کھڑا ہو گیا۔ عذرا شوہر کو دیکھ کر بھی نہ رکی، مارتی رہی۔ یعقوب بھی بے تاثر چہرہ لیے دیکھتا رہا۔ نیلی تو جیسے زمین

میں ہی گزر گئی۔

"خوش ہو جا...... سارے گاؤں میں چرچے ہو رہے ہیں۔ اری کم بخت اگر مولوی دست دراز ہوا تھا تو گاؤں میں ڈھنڈورا پیٹنے کی کیا ضرورت تھی۔ اکیلے میں مجھے بتا دیتی۔ اب خود بھی بھگت اور ہمارے سر پر بھی عذاب مسلط کر۔ نعیم منگنی توڑ کر گیا ہے۔ کہتا ہے ایسی لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کرسکتا جو شادی سے پہلے ہی سارے گاؤں کے لیے سوالیہ علامت بن گئی ہو۔" مار مار کر عذرا تھک گئی تو خود ہی رک گئی۔ نیچے زمین پر بیٹھ کر ہانپتے ہانپتے ساتھ میں اس نے رونا بھی شروع کر دیا۔ عجب بے بسی تھی جو عذرا کے آنسوؤں میں گھلی تھی۔ مار کھا کر نیلی زمین پر ساکت و جامد پڑی رہی ایسے جیسے جان ہی نہ ہو۔

☆☆☆

خاموشی سے دھوپ دیواروں سے سرکتی احاطے میں براجمان ہو چکی تھی۔ عذرا ڈھکتے سر پر دوپٹا باندھے چولہے کے سامنے بیٹھی تھی۔ روٹی پر ساگ اور مکھن کی ٹکیہ کا ایک ٹکڑا رکھ کر روٹی دوہری کرتی چنگیر لیے کمرے میں چلی آئی۔ اندر کمرے میں نیلی منہ لپیٹے پڑی تھی۔ گم صم چپ چاپ۔ ماں کو دیکھ کر اس نے رخ بدل لیا اور بائیں کروٹ لے لی۔ عذرا بغیر برا مانے نیلی کے سرہانے بیٹھ گئی۔

"میری پیاری بیٹی......" عذرا نیلی کے بالوں کو سہلانے لگی۔ نیلی کا دل تو چاہا کہ ماں کا ہاتھ جھٹک دے مگر اپنی سوچ کو سوچ ہی رہنے دیا۔

"کل کیسے بے دردی سے مارا میں نے۔"

"سی......" عذرا نے ماتھے پر پڑے نیل کو ہاتھ لگایا تو نیلی بے ساختہ کراہ اٹھی۔ عذرا نے فوراً ہاتھ پیچھے کر لیا۔

"چل اٹھ کھانا کھا...... کل سے کچھ بھی نہیں کھایا۔"

نیلی یونہی بے رخی سے لیٹی رہی۔

"اٹھ نیلی!" پر نیلی ان سنی کر کے لیٹی رہی۔

"ماں ہوں تیری، دشمن نہیں۔ تیرا بھلا چاہتی ہوں۔ تو تو میری پیاری بیٹی ہے...... پہلی اولاد۔ پہلی اولاد سے محبت اور طرح کی ہوتی ہے۔ خود ماں بنے گی تو جانے گی۔" عذرا پیار سے بال سہلاتی رہی۔ نیلی اٹھ بیٹھی۔ ماں سے گلہ تو خوب تھا پر بھوک کا درد حد سے زیادہ تھا، اس لیے اٹھنا پڑا۔

چنگیر سامنے کیے چھوٹے چھوٹے نوالے کھانے لگی اور عذرا محبت پاش نگاہوں سے بیٹی کو دیکھنے لگی۔ بیٹی کو مار کر قلق کا احساس اس قدر گہرا تھا کہ کم ہی نہ ہوتا تھا...... اور اب یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ نیلی تو ناسمجھ نو عمر لڑکی ہے۔ باریکیوں کی بھلا اسے کیا سمجھ۔ اسی لیے تو ایسی خطا کر گئی۔ اب بیٹی کو سمجھانا اس کی ہی ذمے داری تھی۔ نیلی کو کھانا چھوڑ کر وہ گلاس بھر پانی بھی لے آئی۔ "کھانا کھا کر بوبو کو دیکھ لینا۔ تیرا ابا قصبے کے ڈاکٹر سے دوا بھی لے آیا تھا۔ پر افاقہ ہی نہ ہوا۔ تیرا لاڈلا ہے۔ کیا پتا تجھے دیکھ کر خوش ہو۔ سنا ہے خوش ہونے سے بھی بخار کم ہو جاتا ہے۔"

کھانا کھا کر نیلی چنگیر رکھنے کے لیے اٹھی تو عذرا نے نیلی کا ہاتھ تھام لیا۔

"پریشان مت ہونا، اللہ نعیم سے اچھا بر دے گا۔" نیلی سے زیادہ عذرا خود کو تسلی دے رہی تھی۔

باورچی خانے میں چنگیر رکھنے کے بعد وہ احاطہ پار کر کے بوبو کے کمرے میں آگئی۔ بوبو کے کمرے میں وہ دروازے پر ہی ٹھٹک کر رک گئی۔

بوبو جاں بہ لب زمین پر لیٹا رک رک کر سانس لے رہا تھا۔ نیلی کا دل جیسے اچھل کر حلق میں اٹک گیا۔

"بوبو......" نیلی آگے بڑھ کر بوبو کو سہلانے لگی۔ اس سے نیلی کو لگا جیسے بوبو بس اب چند ساعت کا مہمان ہے اور اسے کس قدر ٹھیک اندازہ ہوا تھا۔ اگلی صبح بوبو مر گیا۔ وہ بندر جس کے دم سے اس گھر کی دال روٹی چلتی تھی اچانک ہی عدم سدھار گیا تھا۔

☆☆☆

اس مداری کا کیا حال ہوگا جس کا وہ جانور ہی مر جائے جس کے مرہون منت مداری کا تماشا ہو۔ یعقوب علی کا بھی آج کل وہی حال تھا۔

سندھ کے اس دور افتادہ گاؤں میں نیا بندر لانا آسان نہیں تھا۔ مفلسی یعقوب کے بدن سے چپکی تھی۔ باوجود کہ بدن کپڑوں سے ڈھکا ہوتا مگر مفلسی پھر بھی نظر آتی اور اسی مفلسی کو چھپانے کی پوری کوشش کرتے ہوئے یعقوب اپنے دیرینہ دوست مختار علی کے پاس آیا تھا۔

مختار علی دوست سے کھلے دل سے ملا۔ ٹیوب ویل کے کنوئیں سے کچھ فاصلے پر بان کی چارپائی بچھائی اور اپنے چھوٹے لڑکے سے جلدی سے دو گلاس لسی بنوانے کا کہا۔

"کیسا ہے یعقوب؟" مسکرا کر اس نے یعقوب سے پوچھا۔ یعقوب علی جواب نہ دے پایا۔ پر مختار پر کچھ ایسی مسرت چھائی تھی کہ دھیان دیے بغیر وہ اٹھا اور دوست کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اٹھایا۔

سامنے مختار کی دو بیگھوں پر مشتمل گندم کی سنہری فصل

تیار کھڑی تھی۔ گندم کے خوشے ایسے سنہرے تھے کہ سورج کی روشنی کی تمازت بڑھاتے محسوس ہوتے۔

"یعقوب! جب پچھلی بار تو آیا تھا تب میں گندم کی بوائی کر رہا تھا۔ تب تو نے دعا دی تھی کہ ۔۔۔۔ سو من بیگھا ہو۔ یعقوب سچ کہتا ہوں جو بھی دیکھتا ہے۔۔۔۔ سو من بیگھے سے زیادہ کا اندازہ لگاتا ہے۔ تیری زبان مبارک۔ میرا وعدہ اس فصل میں اپنے یار کو پانچ من گندم ہدیہ دوں گا۔" تب یعقوب علی نے محسوس کیا کہ مختار کے چہرے کا سنہری پن گندم کے خوشوں سے کم نہ تھا۔ تب تلک لسی آ گئی۔ لسی پیتے ہوئے مختار علی کو احساس ہوا کہ دوست کچھ اداس اور چپ ہے۔

"سب خیر تو ہے یعقوب علی۔" تب یعقوب علی نے اپنے اوپر بیتنے والے حادثوں کے بارے میں بتایا۔

"میری بیٹی کا رشتہ ٹوٹ گیا، میرا بندر بھی مر گیا۔"

تب مختار علی نے بھی محسوس کیا کہ آج یعقوب کے ساتھ بندر نہیں ورنہ وہ جب بھی آتا تو بندر ساتھ ہی ہوتا۔

"اوہو......" مختار علی افسوس کرنے لگا۔

"یار! دل چھوٹا نہ کر اللہ مالک ہے۔ میرا ایک دور کا رشتے دار یہاں سے دو گاؤں چھوڑ کر رہتا ہے۔ اس کے پاس ریچھ ہے۔ ریچھ کا تماشا کرتا ہے۔ پر سنا ہے اب عاجز آ چکا ہے۔ فروخت کرنا چاہتا ہے کل اس سے جا کر مل لیتے ہیں، بھلا آدمی ہے۔ ممکن ہوا تو سستے میں سودا کر لیں گے۔ تم پریشان نہ ہو۔" مختار نے نہ صرف لفظی تسلی دی بلکہ حل بھی ڈھونڈا۔

"اور جہاں تک بیٹی کی بات ہے......" کچھ سوچتے ہوئے مختار سر ہلانے لگا۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے بھی تو دلہن ڈھونڈ رہا تھا۔ یعقوب علی کی بیٹی کوئی عیب والی تو نہ تھی۔ یوں بھی گاؤں الگ ہونے کی وجہ سے اسے نیلی اور مولوی والے معاملے کا پتا نہ تھا۔

"کوئی سرا ہاتھ آیا تو تجھے بتاؤں گا۔" خود سے کچھ کہنے سے پہلے مختار علی نے گھر میں مشورہ کرنا بہتر خیال کیا۔

"یار تو یاروں کا یار ہے۔ سچ میں دوستی نبھانا جانتا ہے۔" اس تمام وقفے میں یعقوب علی کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ آئی تھی۔

☆☆☆

اتری صورت کے ساتھ نیلی برآمدے میں بچھی چارپائی پر بیٹھی داخلی دروازے کو تک رہی تھی۔ بو بو کی شرارتیں یاد آتیں تو دل غم سے بوجھل ہو جاتا۔ چند دنوں کی رفاقت تو نہ تھی، کئی سالوں کا ساتھ تھا۔

اس کو اب باپ پر تاؤ آنے لگا جب قصبے کے ڈنگر ڈاکٹر کی دوا سے افاقہ نہ ہو رہا تھا تب یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے کی کیا تک تھی۔ اسپتال ہی لے جاتا۔

"نیلی اٹھ، جھاڑو ہی دے دے۔ دونوں کمرے گندے پڑے ہیں۔" باورچی خانے سے عذرا کی آواز آئی تو وہ بیزاری سے اٹھی اور احاطے میں ایک سرے میں چھپر تلے پڑا جھاڑو اٹھانے لگی تبھی داخلی دروازے پر تھوڑا کھٹکا ہوا اور نیلی نے مڑ کر دیکھا۔

باپ کے ساتھ گھر کے اندر ایک چوپایہ بھی داخل ہو رہا تھا۔ بھورے رنگ کا ریچھ جس کے گلے میں موجود موٹی سرخ گھنگرو کی مالا دور سے بھی واضح ہوتی تھی اور ریچھ کے سر کی ہر بار کی جنبش کے ساتھ چھن چھن بجتی تھی۔ تب تلک یعقوب علی برآمدے تک آ چکا تھا۔

"آ نیلی آ......" نیلی جھاڑو بھول کر باپ کے پاس آ گئی۔

یعقوب جوش سے گھر کے تمام افراد کا نام لیتے ہوئے جیسے... سبھی کو جمع کر لینا چاہتا تھا۔

لڑکیاں کمروں سے اور عذرا باورچی خانے سے برآمدے میں آ گئیں۔ عثمان البتہ کھیلنے...... کے لیے باہر گیا ہوا تھا۔

"یہ ریچھ کیوں لائے ہو؟" حیرت سے ریچھ کو دیکھتے ہوئے عذرا نے پوچھا وہ ریچھ جو ایک طرف کھڑی نیلی کو تکے جا رہا تھا۔

"وہ بھی گھر کا نیا فرد سمجھ لو اسے...... نیلی تجھ سے تو ابھی سے مانوس ہو گیا۔ جب سے آیا ہے تجھے ہی تکے جا رہا ہے۔ نیک بخت اللہ نے رزق کا نیا وسیلہ بنا دیا ہے۔"

یعقوب علی ہنس ہنس کر کہہ رہا تھا۔ نیلی کے دل میں بھی ریچھ کے لیے انسیت پیدا ہوتی گئی۔ آگے بڑھ کر اس نے ریچھ کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔

"ٹوٹو!" کچھ سوچتے ہوئے نیلی نے کہا۔

"یہ میرا ٹوٹو...... ہے اس کا نام ٹوٹو ہوا۔" مسکراتے ہوئے نیلی بہنوں کو بتانے لگی۔ خوشی و انبساط سے ریچھ کے گرد جمع گھر کے افراد یہ ہرگز نہ جانتے تھے کہ یہ ریچھ ہی بربادی کا سامان بنے گا۔

☆☆☆

زرتاشہ دروازے پر دستک دے دے کر تھک گئی مگر کوئی جواب ہی نہ آیا۔ اسے تشویش نے آ گھیرا تھا۔ جانے آپا دروازہ کیوں نہیں کھول رہی تھیں۔ دل میں طرح طرح کے وہم اور وسوسے لیے وہ گھر واپس آ گئی.... اور ماں کو

بتایا۔ ماں بھی تشویش میں مبتلا جیسے تیسے آپا کے گھر پہنچی۔ کمرے کے فرش پر آپا بے ہوش پڑی تھیں۔

''آپا، آپا......'' خالدہ آپا کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔ آپا نے آنکھیں تو نہ کھولیں پر خوف و دہشت سے چیخیں مارنے لگیں۔ خالدہ کا دل دکھ سے بھر گیا اور زرتاشہ اپنی آئیڈیل شخصیت کو اس کیفیت میں دیکھ کر رو پڑی۔ ماں نے کہا۔

''زرتاشہ! دیکھ بیٹا تیرا بڑا بھائی بیٹھا ہے۔ اسے کہہ کر ٹیکسی منگوالے۔ آپا کو شاید پھر سے دورہ پڑا ہے۔ اسپتال لے جانا پڑے گا۔''

زرتاشہ تیز قدموں سے گھر آئی، بھائی نہیں تھا۔ خود کو ہمت و حوصلہ بندھاتی مین روڈ پر آگئی اور ایک ٹیکسی لیے اپنی گلی تک آگئی۔ زرتاشہ اور خالدہ نے بڑی مشکل سے مل کر انہیں ٹیکسی میں جیسے تیسے سوار کیا۔

اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں نوجوان ڈاکٹروں کا مستعد گروپ مریضوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ آپا کو ایک جونیئر ڈاکٹر دیکھنے آیا جو بعد میں اپنے سینئر کو بلا لایا۔

''کیا خاتون کو پہلے بھی اس قسم کے دورے پڑتے ہیں؟'' ڈاکٹر پوچھ رہا تھا۔

''جی، ریچھ آکر ڈراتا تھا تو ڈر جاتیں مگر اس طرح چیخیں تو نہ مارتی تھیں۔'' خالدہ اٹک اٹک کر تفصیل بتانے لگی۔

''ہوں......ڈاکٹر ذوہیب نے فکر مندی سے دوسرے ڈاکٹر سے کہا۔ آپ مریض کو ریلیکس کریں۔''

سینئر ڈاکٹر جونیئر ڈاکٹر کو مرض سے متعلق اور متعلقہ دی جانے والی سکون آور ادویات کے بارے میں ہدایات دینے لگا۔

کچھ دیر بعد آپا کو دوا دی گئی۔ زرتاشہ اور خالدہ آپا کے سرہانے بیٹھیں دعائیں کرتی رہیں۔

آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر ذوہیب راؤنڈ پر آیا تو کہنے لگا۔

''آپ کے مریض کو وارڈ میں شفٹ کیے دیتے ہیں۔ جس طرح کی ان کی حالت ہے انہیں جامع علاج کی ضرورت ہے جو وارڈ میں ہی ممکن ہے۔''

چنانچہ آپا کو نفسیاتی امراض کے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔

☆☆☆

یہ سائیکاٹری وارڈ کا ڈیمانسٹریشن روم تھا۔ سائیکاٹرسٹ، سائیکالوجسٹ اور دیگر درجہ بدرجہ بیٹھے تھے اور ایک ڈاکٹر ہاتھ میں لیزر پین لیے سامنے وائٹ اسکرین کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ پروجیکٹر سے نکلتی روشنی وائٹ اسکرین پر پڑ رہی تھی اور اسکرین پر آپا کا چہرہ روشن تھا۔

ڈاکٹر اپنے ساتھیوں کو کیس ہسٹری بتانے لگا۔

''نائلہ یعقوب، عمر ساٹھ سال، غیر شادی شدہ یہ خاتون وحشت کی اس صورت میں تشریف لائی کہ بلا وقفہ بدحواسی سے چیخیں مارتی تھی اور سر ادھر سے ادھر پٹختی تھی۔ اس خاتون کو پچھلے کئی سالوں سے ایک بھورا ریچھ نظر آتا ہے۔ ریچھ خاتون کو کھانا تو نہیں چاہتا مگر کیا چاہتا ہے یہ خاتون صحیح طرح سے نہیں بتاتی۔ یہ OBSESSIVE DISORDER کا کیس ہے، رئیسہ......''

ڈاکٹر نے جونیئر میں سے ایک کا نام پکارا تھا۔

''جی سر!'' رئیسہ نے جواب دیا۔

''یہ پیشنٹ تمہارے ذمے ہے تم مکمل ورک اپ کرو گی۔ کاؤنسلنگ پر خاص توجہ دو گی۔ یہ مریض ٹھیک کرنا تمہاری ذمے داری ہے۔''

''مائی آنر سر!'' رئیسہ نے کھڑے ہو کر کہا۔

''اور ہاں اپنے ساتھ مذہبی رجحان رکھنے والے رضاکاروں کو بھی اپنی ٹیم میں شامل کر لینا۔ خاتون مذہبی سوچ کی حامل ہیں۔''

''اوکے سر!'' رئیسہ نے ایک بار پھر اثبات میں جواب دیا۔

☆☆☆

یعقوب علی بے حد خوش تھا۔ ٹوٹو کے آنے سے آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔ ریچھ لوگوں کے لیے ایک نئی چیز تھی۔ وہ لوگ جن کا دل بندر کا تماشا دیکھ دیکھ کر اوب چکا تھا، ریچھ کے کرتب شوق سے دیکھتے۔ چھ سو آسودگی نے ڈیرے ڈالنے شروع کر دیے۔ آج اس کا دوست مختار بھی اپنی بیوی کے ساتھ آیا تھا مٹھائی کا ڈبا لیے۔ مختار کی بیوی نے نیلی کو لپٹا لپٹا کر پیار کیا اور اپنے بڑے بیٹے ذوالقرنین کے لیے رشتہ مانگ لیا۔

مسرت تو عذرا کی ہر حرکت سے بھی عیاں ہوتی تھی۔ مہمانوں کے جانے کے بعد عذرا نے بلاوجہ ہی نیلی کو خود سے لپٹا لیا۔

نیلی چہرے پر مسکراہٹ سجائے سوچ رہی تھی۔

''جلدی سے شادی ہو اور اس گھر سے جان چھوٹے۔''

اور چند دن بعد یعقوب اور عذرا چھوٹی دونوں بیٹیوں کے ہمراہ نیلی کے متوقع سسرال جانے کی تیاری کرنے لگے۔

"گھر سے باہر ہرگز مت جانا۔" ہر بار کی طرح عذرا نے پُرزور تاکید کی تھی اور ہر بار کی طرح عثمان نے کان نہیں دھرے تھے۔

عثمان گھر میں بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تو باہر گلی میں کھیلنے کے لیے نکل گیا اور گھر میں نیلی پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

☆☆☆

چھوٹی ٹوکری میں چند جامن لیے وہ کھائے جاتی اور گنگناتی جاتی، وہ کچھ اکتا گئی تو کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔

"جانے گلشن حیدر آباد سے آئی ہوگی کہ نہیں۔" اکتاہٹ دور کرنے کا کوئی سامان ملتا نظر نہ آتا تھا۔

تبھی ٹوٹو کے کمرے سے گھنگرو کی آواز آنے لگی۔

ٹوٹو کو بھی پتا تھا کہ سر ہلانے سے گھنگرو بجتے ہیں اس لیے جب بھی بھوک لگتی تو سر ہی ہلاتا، نیلی نے باورچی خانے سے روٹی کے ٹکڑے اٹھائے اور ٹوٹو کے کمرے میں چل پڑی۔

بوبو پوری طرح تو نہ بھولا تھا۔ البتہ ٹوٹو کے آنے سے کم ہی یاد آتا۔ نیلی کمرے میں داخل ہوئی تو ٹوٹو یک ٹک نیلی کو دیکھنے لگا۔

"ٹوٹو! یہ جو مجھے اس طرح ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا ہے تو کبھی کبھار مجھے لگتا ہے کہ کھا ہی جائے گا۔" اپنی بات پر نیلی خود ہی ہنس دی اور روٹی کے ٹکڑے ٹوٹو کی طرف بڑھائے تو ٹوٹو نے پکڑ لیے۔

"ٹوٹو! اب سوچتی ہوں کہ اس مولوی کے ساتھ کچھ زیادہ ہی زیادتی ہوگئی۔" نیلی کھوئے کھوئے انداز میں باتیں کرنے لگی۔

زنجیر سے بندھا ٹوٹو بس نیلی کو دیکھ رہا تھا۔

"آ برآمدے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" نیلی بندر کو بھی کبھی کبھار برآمدے اور کمرے میں لے آتی تھی۔ ابھی نیلی نے ریچھ کو زنجیر سے آزاد ہی کیا تھا کہ ریچھ نے اسے اپنے پنجوں میں دبوچ لیا۔ نیلی کی چیخیں بلند ہوتی گئیں۔ ریچھ کے پرانے مالک نے یعقوب علی کو بتایا بھی تھا کہ بھورے ریچھ کی فطرت میں انسانوں کے لیے کشش موجود ہے۔ پر کتنا پاگل تھا یعقوب علی کہ اس نے اُس بات پر کان ہی نہ دھرے تھے۔

تبھی پڑوس سے صفیہ خالہ اپنی بہو کے ساتھ نیلی کی خیریت کے لیے چلی آئیں۔ اور انہوں نے جو منظر دیکھا اس نے انہیں سکتے میں ڈال دیا۔ دہشت سے گرتی پڑتی وہ گھر سے باہر آگئیں۔ بات اگرچہ صرف یہ تھی کہ ریچھ نے نیلی پر حملہ کردیا تھا مگر صفیہ خالہ کی غلط منظر کشی نے واقعے کو کچھ اور ہی رنگ دے ڈالا۔ جبکہ ہوش میں آنے کے بعد نیلی صفیہ خالہ کی بنائی ہوئی کہانی کو غلط ثابت کرنے کے لیے اپنی سچائی ثابت کرتی رہی مگر کسی نے اس کی باتوں پر یقین نہیں کیا جیسے کہ مولوی کی باتوں پر کسی نے اعتبار نہیں کیا تھا۔

صفیہ خالہ نے شور مچا کر مردوں کو اکٹھا کیا کہ کوئی جا کر نیلی کو اس ریچھ کے چنگل سے بچائے۔

☆☆☆

رئیسہ نئے زمانے کی خوب صورت لڑکی تھی۔ بھورے بالوں کو عموماً جوڑے کی شکل میں باندھ کر رکھتی۔ کم عمری میں یہی سوچتی تھی کہ سائیکالوجسٹ بن کر دنیا بدل دے گی۔

بہر حال خوش مزاج رئیسہ کا آج کل مقصد نائلہ یعقوب نامی بوڑھی عورت کو ٹھیک کرنا تھا اور اس کے لیے وہ گھنٹوں صرف کرنے کو تیار تھی۔ اس کی اور آپا کی عمروں میں دہائیوں کا فرق تھا۔ عموماً اسے اپنے ہم عمر مریضوں کی نفسیاتی گتھیاں سلجھانا آسان لگتا۔ بہر کیف...... اس وقت وہ آپا کو کاؤنسلنگ روم میں لیے بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ آپا کے انداز میں تھوڑی بے بسی اور بے چارگی تھی۔ انہیں یوں اجنبیوں سے گھلنے ملنے کی عادت نہ تھی۔

"لڑکپن کا زمانہ تو زندگی کا حسین زمانہ ہے۔ اپنے لڑکپن کی کوئی بات بتائیے جو آج بھی آپ کے ذہن پر خوشگوار اثر ڈالتی ہو۔" رئیسہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"خوشگوار......" آپا نے آنکھیں میچ لیں۔ رئیسہ نے کچھ دیر آپا کے بولنے کا انتظار کیا مگر جب کوئی جواب نہ ملا تو اس نے سوالنامے میں سے اگلا سوال کیا۔

"بچپن میں انسان کا کوئی نک نیم بھی ہوتا ہے آپ کا کوئی نام تھا؟" آپا چند لمحے تو یوں ہی خاموش بیٹھی رہیں پھر ان کے لب ہلے اور مدھم آواز میں سنائی دیا۔

"نیلی......"

"واؤ۔ نائلہ سے نیلی۔ ہاؤ کیوٹ...... آپ کی تو آنکھیں سبز ہیں۔ آپ کی سہیلیاں تو آپ کو سبز آنکھوں والی نیلی کہتی ہوں گی۔"

"کیا یہ باتیں ضروری ہیں؟

"کیا آپ علاج نہیں چاہتیں؟ کیا آپ چاہتی ہیں وہ بھورا ریچھ تمام عمر آکر آپ کو یونہی تنگ کرتا رہے؟ آپ بتائیں گی نہیں تو ہم آپ کی بیماری کی جڑ...... کس طرح پکڑ پائیں گے۔" رئیسہ نرم لہجے میں انہیں سمجھانے لگی اور آپا کا سر جھکا ہی رہا اور رئیسہ ایک طویل سانس بھر کر رہ گئی۔

"چلیں آج جامع مسجد کے مولوی صاحب مریضوں

کے لیے خصوصی بیان دینے آئے ہیں۔ آیئے میں آپ کو اس کمرے میں لے چلتی ہوں۔''

اس کمرے میں پردہ لگا ہوا تھا اور مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ انتظام تھا۔ آپا چپ چاپ عورتوں کے لیے مخصوص جگہ پر بیٹھ گئیں۔ مولوی صاحب ابھی نہیں آئے تھے۔ ساتھ بیٹھی خاتون جو بے حد باتونی تھیں اور کسی طور نفسیاتی عارضے کا شکار نہ لگتی تھیں، آپا سے باتیں کرنے لگیں۔

''بڑے نیک ہیں مولوی صاحب پچیس سال سے اسپتال کی جامع مسجد میں امامت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ سننے والوں پر وجد سا طاری کر دیتے ہیں۔''

آپا خاموشی سے سنتی رہیں۔ تبھی مولوی صاحب بھی آگئے اور حمد و ثنا کے بعد بیان کا آغاز کرنے لگے۔ نیلی انہیں دیکھنے لگی۔ چہرہ کچھ جانا پہچانا لگتا تھا مگر کہاں دیکھا تھا؟

اچانک ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا... اور دھند کے چھٹنے لگے۔ ماضی کا منظر واضح ہوا اور آپا کو یاد آ گیا مولوی صاحب کون تھے۔ مولوی صاحب کا نام محمد احمد تھا اور یہ وہی صاحب تھے جن پر نوعمری میں آپا نے تہمت لگائی تھی۔ جس کے بعد ان کے منہ پر کالک مل کر انہیں گاؤں بدر کر دیا گیا تھا۔

درد کی ایک لہر اٹھی اور آپا کے گرد گھیرا تنگ کرنے لگی۔

☆☆☆

ریچھ کو اسی وقت جان سے مار دیا گیا اور دور جنگل میں پھینک دیا گیا اور نیلی...... اس کے تار تار لباس کی جگہ صفیہ خالہ کی بہو نے نیا سوٹ پہنا دیا تھا۔ عذرا اور یعقوب آئے۔ جو کچھ خالہ صفیہ سے سنا، دل میں خواہش ابھری اس خبر کے سننے سے پہلے مر جاتے۔ نیلی کو ساتھ لپٹا کر دلاسے دینے کے بجائے عذرا ایک کونے میں بیٹھی خود دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اس کے گھر میں گاؤں بھر کی عورتیں یوں جمع ہوئیں جیسے فوتگی والے گھر میں جمع ہوتی ہیں۔

صفیہ کی بہو کہیں سے نیلی کا تار تار جوڑا لے آئی اور نئے سرے سے سارا واقعہ سنانے لگی۔

''میری ساس سے تو عذرا خالہ کی دوستی کس سے چھپی ہے اسی لیے تو عذرا خالہ جاتے ہوئے کہتی گئیں کہ نیلی گھر پر اکیلی ہوگی دو گھڑی خیریت دریافت کرنے چلی جانا اور ہم لوگ جب آئے تو کیا دیکھتے ہیں......''

''ہائے افسوس عذرا خالہ تو بیٹی کا بر دیکھنے گئی تھی مگر کیسا دن دیکھنا پڑا۔''

بات سے بات نکلتی رہی۔ لوگ نیلی اور عذرا کی آہیں سنتے رہے، تسلی کے بول دہراتے رہے مگر...... اور اس مگر کے آگے ایک بار پھر سب کچھ رک جاتا۔ گلی میں کھڑے مرد بھی افسوس کرتے ہوئے بار بار ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے اور سن رہے تھے کہ کیا ہوا۔ اور یہ صرف اسی گلی کی بات نہ تھی۔ ہر گلی کی چوکھٹ پر یہ تذکرہ تھا۔ ہر پگڈنڈی پر یہی بازگشت تھی۔ چودھری صاحب کے ڈیرے کا یہی موضوع سخن تھا۔

پنگھٹ پر اکٹھے ہوتے نوجوان یہی باتیں کر رہے تھے۔ گھاٹ پر بھی یہی تذکرہ تھا اور تو اور اس بات نے سڑک بھی پار کر لی اور دور کے گاؤں تک بھی جا پہنچی۔

کوئی عورت کسی مرد کی ہوس کا شکار ہو تو لوگ استغفراللہ استغفراللہ کہتے ہوئے منہ میں انگلیاں داب لیتے ہیں اور اسے عبرت کا نشان سمجھتے ہیں۔ یہاں تو نیلی ایک ریچھ کی وحشت کا نشانہ بنی تھی۔ کیا کہتے اور کیا سوچتے؟ لوگوں کی عقل واقعہ سن کر جیسے گم ہو جاتی۔

☆☆☆

آج رات آسمان پر چاند نہ تھا صرف ستارے تھے۔ کتنی عجیب بات تھی لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود ستارے ''صرف'' ستارے ہی تھے۔ عذرا آسمان کو تکے جاتی۔

کچھ دیر بعد عذرا نے مڑ کر ساتھ والی چارپائی پر لیٹے یعقوب کو دیکھا۔ آنکھیں بند تھیں پر پتا نہیں وہ سویا ہوا تھا کہ نہیں۔ عذرا چپکے سے اٹھی اور اندر کمرے میں چلی گئی۔ نیلی کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بعد وہ تینوں بیٹیوں کو اندر کمرے میں سلاتی۔ اندر سونا یا باہر سونا...... کچھ فرق تو نہ پڑتا تھا۔ مگر اس بات کی کیا منطق تھی عذرا خود بھی نہ جانتی تھی۔

نیلی کے ساتھ حادثہ پیش آئے چھ مہینے ہو چکے تھے مگر یہ چھ مہینے چھ صدیوں جتنے طویل لگتے۔ گاؤں کے لوگوں نے ان سے قطع تعلق نہ کیا تھا مگر جو کیا تھا وہ قطع تعلق سے بھی بدتر تھا۔ گاؤں کے مردوں نے اپنی عورتوں خصوصاً کنواری لڑکیوں کے اس گھر آنے جانے پر اعتراض کرنا شروع کر دیا تھا۔

عذرا اگر خود کہیں جاتی تو بس ایک ہی بات سننے کی خواہش کی جاتی۔ ہر بات میں اسی ریچھ، نیلی اور اس واقعے کا تعلق جوڑا جاتا۔ ہر عورت عذرا کو قصوروار ٹھہراتی کہ آخر

بھورے ریچھ کو انہوں نے گھر میں رکھا ہی کیوں۔

اور تو اور عورتیں اب یہ بھی کہنے لگی تھیں کہ شاید نیلی نے اس مولوی لڑکے پر تہمت لگائی تھی اسی لیے یہ عذاب مسلط ہوا۔ عذرا تردید کرنے جتنی ہمت بھی خود میں نہ پاتی تھی۔

یعقوب کے ساتھ بھی کچھ یہی صورت حال درپیش تھی اس نے تو گھر سے نکلنا بھی ترک کردیا۔ ایک مداری جس کے پاس نہ دھن تھا کہ کوئی اور کاروبار کر سکتا اور نہ ہنر بس ایک تماشا ہی دکھانا آتا تھا مگر اب تو جیسے خود اس کا بلکہ پورے خاندان کا تماشا بن گیا تھا۔

عثمان کے دوست جو ابھی بلوغت کو بھی نہ پہنچے تھے حیا سوز اشارے کرتے ہوئے ایسی باتیں کرتے کہ عثمان کا خون کھولنے لگتا۔ نتیجتاً اس نے بھی دوستوں سے ملنا چھوڑ دیا اور گھر پر ہی ماں سے لڑتا رہتا اور جب باپ تنگ آجاتا تو دو چار ہاتھ جڑ دیتا۔

ایک دن کی بات ہے کہ نیلی کے دل میں اپنے بچپن کی سہیلی گلشن سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ مہینے ہو گئے تھے۔ نیلی انتظار کرتے کرتے تھک گئی تھی کہ گلشن خود آکر تسلی کے دو بول، بول جائے مگر گلشن پھر بھی نہ آئی۔ آج بھی وہ عثمان کے ہاتھ پیغام بھیجنا چاہتی تھی مگر عثمان نے بدتمیزی سے انکار کردیا۔ نیلی کا دل ہولنے لگا۔ بوجھل دل سے اس نے ماں سے اجازت چاہی کہ گلشن سے مل آؤں۔

عذرا انکار کرنا چاہتی تھی اسے ممکنہ سلوک کا اندازہ تھا مگر وہ روک نہ پائی۔ نیلی چادر لیے گلشن کے گھر کی طرف چل پڑی پر اونچی منڈیر والوں نے دستک کے جواب میں دروازہ کھولنا بھی گوارا نہ کیا۔

''نیلی لوٹ جا۔ میری ماں کو تیرا تجھ سے ملنا پسند نہیں۔ تجھ پر عذاب نازل ہوا ہے۔ تو نے مولوی کا منہ کالا کروایا، اس کی ڈاڑھی منڈوائی، خدا نے تجھے پورے گاؤں میں رسوا کردیا۔''

نیلی نے سر اونچا کرکے دیکھا، منڈیر پر کھڑی سہیلی اونچی آواز میں کیا کہہ رہی تھی۔ نیلی کی سبز آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ نیلی سامنے خشک احاطے کے وسط میں آئی۔

''لوگو! میری بات سنو..... رکو لوگو۔'' نیلی پگڈنڈیوں پر سے گزرتے لوگوں کو اکٹھا کرنے لگی۔ اس سے نیلی کو یاد آیا کہ یہ وہی میدان ہے جہاں کبھی اس کا باپ بوبو کا تماشا کرتا تھا اور وہ منڈیر پر کھڑی تماشا دیکھتی تھی جب پہلی بار اس نے احمد کو دیکھا تھا۔

آن کی آن میں مجمع اکٹھا ہوگیا۔

''لوگو! میری طرف دیکھو..... مجھ پر خدا نے عذاب مسلط کیا ہے۔ میں نے اس مولوی لڑکے پر تہمت لگائی تھی۔ اس لڑکے نے مجھے کچھ نہ کہا تھا۔ لوگو مجھے مار ڈالو۔ میرے سر پر جوتیاں مارو۔'' نیلی روتی جاتی اور چلاتی جاتی، مجمع تماشا دیکھتے ہوئے چہ میگوئیاں کرتا جاتا۔ منڈیر پر کھڑی گلشن تاسف سے دیکھ رہی تھی۔

یعقوب تک بھی خبر پہنچ گئی۔ وہ گرتا پڑتا دوڑتا آیا۔ تب تک نیلی مجمعے کے درمیان بے ہوش ہوئی پڑی تھی۔ اس لمحے یعقوب کا دل چاہا کہ نیلی کبھی ہوش میں نہ آئے مر ہی جائے مگر......

اور اس مگر کے آگے ایک بار پھر سب کچھ رک گیا۔

اندر کمرے میں جا کر عذرا نے کمرا روشن کیا، نیلی جاگ رہی تھی۔ باقی دونوں لڑکیاں سو رہی تھیں۔ عذرا نے دروازے کے کواڑ بند کیے اور کمرے میں پڑے ایک صندوق کو کھولا۔ صندوق سے ایک پوٹلی نکالی۔ سرخ کپڑے کی یہ پوٹلی آکر نیلی کی گود میں رکھ دی اور رونے لگی۔ آنکھیں خشک ہونے کا نام نہ لیتی تھیں۔

''اس میں کچھ نقدی ہے میری شادی کے وقت کے سونے کے جھمکے ہیں اور ایک نتھ ہے گھر میں بس یہی کچھ ہے۔'' نیلی روتی ہوئی ماں کو یک ٹک دیکھنے لگی۔ سدرہ اور اقراء بھی اٹھ گئیں اور آکر ماں کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔

عذرا متواتر روتی رہی۔

''مجھے لگتا ہے کہ ان لڑکیوں کی بھی شادی نہ ہوگی۔'' عذرا کے شکوک کچھ ایسے غلط نہ تھے۔ ظاہری اسباب یہی بتاتے تھے۔ نیلی کا رشتہ مختار علی نے توڑ دیا تھا۔ یعقوب میں تو اس وقت رشتہ توڑنے کی وجہ پوچھنے کی بھی ہمت نہ تھی۔

''تو نہ ہوگی تو شاید کچھ بہتر ہو چلے۔'' نیلی کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ اس کی ماں کی خواہش تھی کہ وہ مرجائے، ہاں اسے مر ہی جانا چاہیے۔

''یہ لے جا، اس گاؤں سے دور کہیں اور جا کر دنیا بسا۔ سمجھ تو اس دنیا میں اکیلی تھی۔ ماں باپ بہن بھائی کوئی نہ تھے۔ کراچی چلی جا۔ بڑے شہر میں بسنا کم مشکل ہوگا۔'' روتے ہوئے عذرا کہے جارہی تھی۔ سدرہ اور اقراء بھی رونے لگیں تو نیلی کو پتا چلا اس کی ماں چاہتی ہے کہ وہ گھر چھوڑ کر چلی جائے۔ اس طرح تو کوئی ماں اپنے بیٹے کو بھی گھر سے جانے کا نہیں کہتی جس طرح عذرا اپنی بیٹی کو کہہ رہی تھی اور جب نیلی پوٹلی لیے گھر سے نکل رہی تھی تب یعقوب بھی جاگ رہا تھا مگر وہ یوں سوتا رہا، جیسے سچ سویا

ہوا ہو۔ گھر کا دروازہ پار کرنے کے بعد نیلی اندھیرے میں گم ہوتی چلی گئی۔ آسمان پر چاند نہ تھا صرف ستارے تھے۔

کتنی عجیب بات تھی لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود ستارے "صرف" ستارے ہی تھے۔

☆☆☆

کراچی جیسے بڑے شہر میں ضم ہونے میں زیادہ تکلیفیں نہ اٹھانی پڑیں اور جو اٹھائیں بھی وہ اس تکلیف کے سامنے خاک تھیں جس کا سامنا کر کے وہ آئی تھی۔ پہلے پہل وہ دارالامان میں رہی۔ ٹوٹی پھوٹی اردو لکھنا جانتی تھی۔ وہاں دارالامان کی سپرنٹنڈنٹ کے مشورے سے میٹرک کا داخلہ بھی بھیج دیا اور امتحان بھی دے دیے۔ پہلی کوشش میں تمام مضمون تو پاس نہ ہوئے البتہ دوسری بار میں پاس ہو ہی گئی۔ اسکول کی سرکاری ملازمت بھی شہر کے کسی کونے میں مل گئی اور وہاں کی علاقے میں کرائے پر گھر بھی لے لیا۔ پڑھاتے ہوئے خود پرائیویٹ ایف اے، بی اے بھی کر لیا اور پڑھاتے پڑھاتے زندگی گزار دی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد گریجویٹی میں ملے پیسوں سے وہ گھر خرید لیا جس کی وہ برسوں سے کرائے دار تھی۔ اور رہ گئی شادی، شاید قسمت میں تھی ہی نہیں۔ کبھی کہیں سے سندیسہ ہی نہ آیا اور زندگی اس قدر تیزی سے گزر گئی کہ سارے بال سفید ہو گئے اور چہرے پر بھی جھریوں کا جال بن گیا۔

"آپا، آپا......" زرتاشہ کی آواز آپا کو ماضی سے حال میں لے آئی اور وہ آنکھوں کے کونے صاف کرتی مسکرانے لگیں، یہاں اسپتال میں اچھی ماریہ نے تو اس کا خیال رکھا تھا۔ خالدہ نے تو ایک دو راتیں اس کے ساتھ گزاری تھیں مگر آپا نے خالدہ کی تکلیف کا خیال کرتے ہوئے پرزور اصرار کیا تو وہ رات نہ ٹھہرنے پر مانی مگر اب بھی دن کے پانچ چھ گھنٹے اس کے پاس گزار جاتی اور زرتاشہ بھی روز آتی۔

"آپا! آپ سے ایک مشورہ کرنا تھا۔" معمول کا حال احوال دریافت کرنے کے بعد زرتاشہ کہہ رہی تھی۔

"ہوں ......کہو۔" آپا نے محسوس کر لیا کہ وہ تھوڑی شرمائی اور گھبرائی ہوئی سی ہے۔

"آپا! آپ میری آئیڈیل ہیں اس لیے آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"ہوں کہو......" زرتاشہ کچھ لمحے نچلا لب کاٹتی رہی پھر گویا ہوئی۔

"وہ ہمسائے میں لڑکا آیا ہے نا رضا......وہ مجھے پسند کرتا ہے اور میں بھی......وہ رشتہ بھیجنا چاہتا ہے۔" زرتاشہ نے رک رک کر بات پوری کی اور سر جھکائے بیٹھی رہی۔

پان زدہ دانتوں اور کھلے گریبان والے رضا کا سراپا آپا کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تو ایک ناگوار سی لہر آپا کے گرد چھا گئی۔

"نہیں زرتاشہ......میرا جواب نہ ہے، رضا تمہارے لیے ہرگز موزوں نہیں۔"

زرتاشہ سر اٹھا کر حیران نظروں سے آپا کو دیکھنے لگی۔

"اگر میں تمہاری اتنی آئیڈیل ہوں تو میرا مان رکھو۔ رضا سے اگر کوئی رابطہ ہے بھی تو ختم کر دو۔ تم پھول ہو اور وہ کیچڑ، پھول کیچڑ میں گر جائے تو بھی وہ پھول ہی رہتا ہے مگر اپنی قدر کھو دیتا ہے۔" زرتاشہ بس آپا کو دیکھنے لگی۔ تبھی ریئسہ ہیل پہنے ٹک ٹک کرتی آپا کے بیڈ تک آئی۔ ریئسہ کو دیکھ کر زرتاشہ کھڑی ہو گئی۔

"ہاں تو محترمہ آپ کاؤنسلنگ سیشن کے لیے تیار ہیں؟"

آپا نے کوئی جواب نہ دیا اور جب کافی دیر ریئسہ کو کوئی جواب نہ ملا تو اس نے قدرے جھلا کر زرتاشہ کو مخاطب کیا۔

"تم اپنی آنٹی کو سمجھاتی کیوں نہیں۔ اگر یہ تعاون نہیں کریں گی تو ہم کیسے ان کا علاج کر پائیں گے۔ نفسیاتی عوارض میں محض ادویات اس قدر فعال نہیں ہوتیں۔ سائیکوتھراپی اور کاؤنسلنگ بھی ضروری ہوتی ہے۔" زرتاشہ نے ریئسہ کا لفظ لفظ دھیان سے سنا اور پھر آپا سے گویا ہوئی۔

"ٹھیک ہے آپا......میں آپ کی بات مانوں گی مگر آپ کو بھی میری بات ماننی ہوگی۔ میڈم جو کہیں وہ آپ کو ماننا پڑے گا۔" آپا نے نظر بھر کر زرتاشہ کو دیکھا جانے کیوں آپا کو لگا جیسے اگر اس کی بیٹی ہوتی تو یقیناً زرتاشہ جیسی ہوتی۔

"ٹھیک ہے۔ میں انہیں سب بتاؤں گی۔" زرتاشہ کے سامنے تو انہوں نے ہامی بھر لی۔ لیکن کاؤنسلنگ سیشن میں وہ کہہ رہی تھیں۔

"دیکھو بیٹی! جو مجھ پر بیتا وہ میں اپنے اور خدا کے درمیان رکھنا چاہتی ہوں۔ تم میری خیر خواہ ہو اور میں اس خیر خواہی کی احسان مند ہوں اور یقیناً تم چاہتی ہو میرا مرض رفع ہو اور میں اس ریچھ سے چھٹکارا پا سکوں تو ان مولوی صاحب سے میری ایک ملاقات کا انتظام کرا دو جو ہفتہ وار بیان دینے آتے ہیں۔ میں تنہا ان سے ملنا چاہتی ہوں۔"

☆☆☆

ریئسہ نے ملاقات کا انتظام کر ہی دیا۔ مولوی صاحب کا حجرہ اسپتال کی جامع مسجد کے پیچھے ہی تھا۔ ریئسہ نے اجازت کے بعد آپا کو وارڈ بوائے کے ساتھ مولوی صاحب

کے حجرے میں بھیج دیا۔

آپا کو وہ لمحہ یاد آ گیا جب نوجوانی میں وہ مولوی کے حجرے میں اسے بہکانے آئی تھیں۔ نم آنکھیں صاف کرتی وہ اندر آ گئیں۔ مولوی صاحب کی زوجہ خوش مزاج خاتون تھیں۔ بڑے اچھے سے ملیں۔ چائے کے ساتھ بسکٹ سجا کر لے آئیں۔

آپا نے چائے کا گھونٹ بھرا تو لگا ایسی چائے زندگی میں کبھی نہیں پی۔ مولوی صاحب بھی تشریف لے آئے۔ مولوی محمد احمد۔

"جی محترمہ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

مولوی صاحب کی زوجہ بھی کمرے میں مولوی صاحب کے ساتھ والے صوفے پر ہی براجمان تھیں۔ آپا کو سمجھ ہی نہ آئی کہ کیا کہیں۔ تبھی آنسوؤں کا گولہ سا حلق میں اٹکنے لگا۔

"میں آپ سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔" سر جھکائے بیٹھی آپا نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ کہا۔

"مگر کیوں؟"

تبھی آپا نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ مولوی صاحب نے ابھی تک دانستہ طور پر آپا کو نظر بھر کر نہ دیکھا تھا کہ انہیں نامحرم کو خدا کی طرف سے دیکھنے کی اجازت نہ تھی مگر یونہی نظر پڑی تو پتا چلا کہ سامنے بیٹھی عورت کی آنکھیں سبز ہیں۔

"میں وہ عورت ہوں جس نے آپ پر تہمت لگائی تھی اور آپ کو رسوا کر کے گاؤں سے نکلوایا تھا۔"

مولوی صاحب کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ بے اختیار دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ تب انہیں یاد آیا۔ ہاں اس لڑکی کی آنکھیں سبز تھیں جس کی وجہ سے انہوں نے زندگی میں بڑی ذلت سہی تھی۔

اور مولوی صاحب کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر آ گیا جب سر اور ڈاڑھی مونڈے منہ پر کالک مل کر لوگ ان کو جوتے مارتے ہوئے گاؤں سے دھکے دے کر نکال رہے تھے اور وہ اللہ کو پکار پکار کر تھک گئے تھے مگر اللہ کی مدد آ ہی نہ رہی تھی۔

کیسی آزمائش تھی۔ مولوی صاحب نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ ایسے جیسے برسوں کا سفر کر کے آئے ہوں اور مسافت پھر بھی باقی ہو۔ تبھی روتی ہوئی آپا نے مولوی صاحب کو دیکھا۔ ایسا پرنور چہرہ انہوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور یہ چہرہ جوانی کے دنوں میں بھی اتنا ہی پرنور تھا مگر آپا نے کیا کیا تھا؟

آپا کے رونے میں شدت آ گئی۔ یہاں تک کہ آنسو پونچھنا مشکل ہو گیا۔

"محترمہ! اللہ بہت مہربان اور معاف کرنے والا ہے اور وہ اپنے بندوں سے بھی یہی کہتا ہے کہ جب کوئی دوسرا شرمندہ ہو کر تم سے معافی مانگے تو تم معاف کر دو۔ آپ نے جو زیادتی میرے ساتھ کی اسے بھولے ہوئے مجھے دہائیاں گزر چکی ہیں۔ میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ خوش و خرم ہوں۔ میں اللہ کے لیے آپ کو معاف کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر مولوی صاحب رکے نہیں۔ اٹھ کر چلے گئے۔

☆☆☆

بس پھر کبھی ... آپا کو ریچھ خوف زدہ کرنے نہ آیا۔ آپا خوش و مطمئن رہتیں۔ پانچ وقت کے علاوہ چاشت، اشراق، اوابین اور تہجد بھی پڑھتیں۔ زرتاشہ کی بھی شادی ہو گئی اور جب بھی زرتاشہ میکے آتی، آپا سے ملنے ضرور آتی۔

اب آپا کے دل میں بس ایک ہی چاہت تھی کہ جا کر اپنا گاؤں دیکھ آئیں۔ گاؤں کیسا ہو گا؟ پگڈنڈیاں ہوں گی کہ شاید اب پکے گلیارے ہوں۔ پنگھٹ، گھاٹ، گلشن کا اونچی منڈیر والا گھر۔ کیا کیا یاد نہ آتا۔ پتا نہیں اب باقی بھی ہوں گے کہ نہیں اور اس سب سے زیادہ امی ابو اور بہن بھائی۔

وقت اس قدر گزر گیا تھا کہ امید ہی نہیں تھی کہ ماں باپ حیات ہوں گے مگر بہن بھائی تو ہوں گے۔ عثمان کاروبار زندگی کرنے کے لیے کیا کرتا ہو گا۔ جو بھی کرتا ہو، بس ایک مداری نہ ہو۔

سدرہ اور اقراء۔

پتا نہیں کتنے بچے ہوں گے، کیا پتا بچوں کے بھی بچے ہوں۔ یہ سوچ کر آپا ہنسنے لگ جاتیں اور ہنستے ہنستے آنکھوں سے آنسو بہہ جاتے اور پھر آپا نے پروگرام بنا لیا کہ کل صبح ہی گاؤں کے لیے روانہ ہوں گی۔

"مگر......"

اور اس مگر کے آگے ایک بار پھر سب کچھ رک گیا۔

رات کو تہجد کے وقت آپا اٹھیں۔ ابھی وضو کر رہی تھیں کہ سینے میں بائیں جانب درد شروع ہوا۔ درد اچانک شروع ہوا۔ ایسے جیسے سینہ لوہے کی سلاخوں سے پرویا جا رہا ہو۔ آپا درد سے بے حال ہوتی صحن کے بیچوں بیچ لڑھک گئیں۔ درد بڑھتا گیا، بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ جان لے کر گیا۔ آنکھیں ٹھہر گئیں اور جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔ جانے کب محلے والوں کو آپا کی موت کا پتا چلنا تھا اور کب تجہیز و تکفین ہوتی۔

محی الدین نواب

اکتیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاندستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادو باراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسادیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہوجائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ





گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دور جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمرو اور چاچی حنی کے ساتھ اندرون سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ گاؤں سے فرار ہوکر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کرچکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی بربادکرکے قتل کردیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کرکے اسے اپنی بیٹی ظاہر کرکے الزام مراد پر لگادیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف جج تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل وجان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابطہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کررہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ، بہرام اور روارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ ماروی، چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے۔ مراد نے ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیا۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کرکے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کرکے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوگیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جارہا تھا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بوبو کے ساتھ مل گیا۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آگئی۔ مراد مرینہ کے زیراثر آچکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کردیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ TMET فیبر بن گئی تھی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر نیکی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے لگا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست عبداللہ کبڈی بھی آگیا۔ ادھر مرینہ انڈیا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کرکے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجیکشن لگوادیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد اسرائیل پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر نیکی سن کے بیٹے ایمان سے ہوگئی۔ مرینہ بھی اسرائیل پہنچ گئی اور ایمان، مراد بن کر اسے اپنے پیچھے بھٹکانے لگا۔ مراد کو لندن والی فلائٹ میں میکی براؤن مل گیا۔ مراد کے پیچھے میکی براؤن کی بیٹی لگ گئی۔ ادھر مرینہ نے ایمان کو مراد سمجھ کے اس سے ملنا چاہا تاہم ایمان دشمنوں کی فائرنگ سے زخمی ہوکر اسپتال پہنچ گیا اور مرینہ جان گئی کہ یہ مراد نہیں ہے۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آگیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہوگئی اور پاکستان آگئی۔ ادھر مراد دوبارہ اپنا چہرہ تبدیل کرکے انڈیا پہنچ گیا اور میکی براؤن کی بیٹی کے پیچھے لگ گیا اور اسے اغوا کرلیا۔ تاہم بعد میں اسے چھوڑ دیا مگر میڈونا کو مرینہ سے بچانے کے لیے مراد اسے لے کر نکل پڑا لیکن مرینہ نے راستے میں اسے چھاپ لیا۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا۔ مراد اور مرینہ شدید زخمی ہوئے۔ دونوں علاج کے باعث چلنے پھرنے کے قابل ہوگئے۔ مرینہ اور مراد میں پھر صلح ہوگئی۔ مراد مرینہ سے نکاح پڑھانا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آرہی تھی۔ ادھر ماروی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماروی نے اپنے چہرے سرجری کے ذریعے تبدیل کرلیے۔ مراد نے ماروی کو طلاق نامہ بھجوادیا۔ ادھر ماسٹر مراد کو ڈھونڈنے انڈیا پہنچ گیا۔ تمام تنظیموں کے سربراہ ماسٹر کی موجودگی پر الرٹ ہوگئے اور وہاں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ ورگا نے مراد کو وہاں سے بحفاظت نکال لیا تاہم بشریٰ اور مرینہ کی لڑائی میں مرینہ سخت گھائل ہوگئی اور اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مراد لندن جانے کے لیے جس جہاز میں سوار ہوا اسے ہائی جیک کرلیا گیا۔ وہ طیارہ ریاست باب النساء میں اترتا تاہم مراد نے جان پر کھیل کے ہائی جیکرز کو زیر کرلیا۔ مراد ملکہ نگارا کا مہمان بن گیا۔ ملکہ نے مراد کی باتوں سے اندازہ لگالیا کہ وہ مراد ہی ہے۔ مراد نے بھی قبول کرلیا۔ ادھر مرینہ مراد کے غم میں چل بسی۔ مراد نے ملکہ نگارا سے نکاح پڑھوالیا اور بشریٰ اور بے کو اپنی سیکرٹ فورس میں شامل کرلیا۔ ماروی کا بھی محبوب سے نکاح ہوگیا۔ مراد اور نگارا میں اختلاف ہوگیا اور یہ اختلاف طلاق پر منتج ہوا۔ مراد برسرِاقتدار آگیا۔ بابا اجمیری کی دعاؤں سے مراد کو روحانی طاقت حاصل ہوئی اور وہ ایک سے دو ہو

گئے یعنی ایک مراد اور دوسرا اس کا ہم زاد، دونوں جب چاہتے نادیدہ ہو جاتے۔ مراد نے نادیدہ رہ کر دشمنوں کو ناکوں چنے چبوائے ادھر دشمن مراد کو پکڑنے کے لیے محبوب کو ماروی کے پیچھے پڑ گئے۔ تاہم مراد نے ان کی ہر سازش ناکام بنادی اور انہیں سبق سکھایا۔ مراد کو ایک لڑکی ماہ نور منگی پسند آ گئی۔ مراد نے اسے اپنی شریک حیات بنالیا۔ مراد کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا کہ اس کے تابع کئی جنات ہیں جن سے وہ دشمنوں کو زیر کرتا آرہا ہے۔ دشمن اس کا توڑ ڈھونڈنے میں لگ گئے۔ مراد اور ہم زاد کی نادیدہ صلاحیت ختم ہو گئی اب وہ دونوں اس صورتِ حال پر پریشان تھے۔ ادھر ہم زاد کو اس سے زیادہ اپنی محبوبہ جینی کے پاس نہ جانے کی پریشانی تھی، وہ اس کے بیٹے کی ماں بننے والی تھی۔ ادھر دشمن تنظیموں نے مراد کو دھمکی دی تھی کہ وہ ان کا سرپرست بن جائے ورنہ اپنے انجام کے لیے تیار رہے۔ مراد نے جیکی براؤن کو فون کیا اور اسے انجام سے خبردار کیا تو وہ مراد سے دشمنی سے باز آ گیا اور اس نے مراد کے دس دشمنوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ ادھر جینی کو ریاست ارضِ اسلام پہنچانے کے لیے جہاز میں سوار کیا گیا مگر حادثاتی طور پر جینی نے بچے کو جنم دیا اور خود جان کی بازی ہار گئی۔ وہ بچہ عجوبہ تھا۔ پیدا ہوتے ہی اس نے سب کو حیران کرنا شروع کر دیا۔ وہ کروٹ بھی لے رہا تھا اور دودھ کی فیڈر کو ہاتھوں سے پکڑ کر دودھ پیا تھا۔ جینی کی لاش کو جہاز کے ذریعے واپس یہودیوں کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ یہودی اس عجوبہ بچے (عابد علی منگی) کو حاصل کرنا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ان کے دین پر چلے اور وہ اسے حاصل کرنے کے لیے سازشوں میں مصروف ہو گئے۔ وقت گزرتا گیا اور عابی دس برس کا ہو گیا دس برس کا ہونے کے باوجود وہ نوجوان لگ رہا تھا۔ غیر معمولی طاقت کا حامل عابی کئی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ اس کا حافظہ بہت تیز تھا۔ عابی کو یہودیوں نے اغوا کرانے کے لیے اپنے آدمی بھیجے مگر عابی نے ان کو ٹھکانے لگا دیا۔ وہ اکیلا ایک فوج کے برابر تھا۔ وہ اغوا کاروں کو عابی نے زندہ رکھا اور خواہش کی کہ وہ دنیا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ خود چلا گیا مراد اور ہم زاد اس کے لیے پریشان تھے۔ انہیں پتا چل گیا تھا کہ عابی اغوا کاروں کے ساتھ اپنی مرضی سے گیا ہے۔ ادھر یہودی تنظیم فری میسن کے عہدیدار عابی کے اپنے پاس پہنچنے کے منتظر تھے اور اس کا برین واش کرنے کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

مراد اور ہم زاد کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ وہ بار بار سپر پاور سے اور ان بڑے ممالک سے رابطہ کر رہے تھے جو یہودیوں کے زیرِ اثر رہا کرتے تھے۔ ان سے کہہ رہے تھے کہ عابی کو چوبیس گھنٹوں کے اندر ریاست میں ان کے پاس نہیں پہنچایا جائے گا تو تمام یہودی تنظیموں کی اور ان کے اکابرین کی شامت آجائے گی۔

فری میسن کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے فون پر مراد سے کہا۔ ”اس کے اغوا ہونے پر ہمیں الزام نہ دو۔ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ تمہارا بیٹا اپنی مرضی سے کہیں جا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ وہ پوری دنیا کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا ہے۔“

مراد نے کہا۔ ”یہ جھوٹ ہے۔ وہ دنیا دیکھنے کے لیے اغوا کرنے والوں کے ساتھ نہیں جائے گا۔“

”ہم نہیں جانتے‘ وہ اغوا کرنے والے کون ہیں۔ ہمیں الزام نہ دو۔ بہتر ہے‘ ابھی انتظار کرو۔ وہ لوگ مالدوا کی طرف گئے ہیں۔ وہاں پہنچتے ہی وہ گرفت میں آئیں گے تو حقیقت معلوم ہوگی۔“

مراد نے کہا۔ ”میں ایک ریاست کا حکمران ہوں اور تم مجھے تم کہہ کر مخاطب کر رہے ہو۔ آئندہ ایک حکمران کے شایانِ شان گفتگو نہیں کرو گے تو میں تمہاری کوئی کال ریسیو نہیں کروں گا۔ اپنے غرور سے باز آجاؤ۔ کیوں مجھ سے دشمنی مول لینے کی حماقتیں کر رہے ہو؟“

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”کسی کی زمین پر یا کسی کی ریاست پر قبضہ کر کے اپنی حیثیت نہیں بدل سکو گے۔ ہماری نظروں میں ایک مغرور مجرم ہو، مجرم ہی رہو گے۔“

ادھر سے فون بند کر دیا گیا۔ ہم زاد نے کہا۔ ”سپر پاور نے اور دوسرے تمام ممالک نے ہمیں حکمران تسلیم کیا ہے اور یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ ہمارے خلاف نہ کوئی ثبوت ہے نہ ہمیں مجرم کہنے والا کوئی چشم دید گواہ ہے۔“

مراد نے کہا۔ ”ہماری جدوجہد کو ہمارے نیک مقاصد کو اور ہماری موجودہ شان و شوکت، رعب اور دبدبے کو تسلیم نہ کرنے والی یہ ایک یہودی لابی رہ گئی ہے۔ یہ بہت ٹیڑھے ہیں۔ انہیں سیدھا کرنے میں خاصا وقت لگے گا۔ ابھی تو ہمارے بیٹے ہی نے ہمیں الجھا رکھا ہے۔“

ایک گھنٹے بعد سپر پاور کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے مراد کو فون پر مخاطب کیا۔ ”یور ہائی نس! امیزنگ........ حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین رپورٹ ہے۔ آپ کے صاحبزادے عابی نے جو کیا ہے اسے سن کر یقین نہیں آرہا ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔“

مراد نے بے چینی سے پوچھا۔ ”ہوا کیا ہے؟ عابی نے ایسا کیا کیا ہے؟“

”اس نے دریائی سرحد کی آرمی چوکی کو تباہ کر دیا ہے۔ وہاں بتیس مسلح فوجی تھے۔ ہمیں یقین نہیں آرہا ہے کہ اس نے تنہا ان سب کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ اور یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ ہماری تو عقل دنگ رہ گئی ہے۔ رپورٹ ملی ہے کہ اس نے ایک بھی گولی نہیں چلائی تھی۔ ایک چھوٹا سا چاقو بھی اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ فوج کو

لانے لے جانے اور راشن سپلائی کرنے والا جو اسٹیمر تھا' پرنس نے اسے جلا کر خاک کر دیا ہے۔ وہاں صرف لوہے کا ڈھانچارہ گیا ہے۔"

مراد اور ہم زاد فون کال سن رہے تھے اور ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ دوسری طرف سے کہا جارہا تھا۔ "یور ہائی نس! دنیا کا کوئی ایک فرد بھی یقین نہیں کرے گا کہ گیارہ برس کے ایک لڑکے نے تنہا ایسی تباہی مچائی ہے۔"

مراد نے پوچھا۔ "کیا عابی سے رابطہ ہورہا ہے؟"

"نہیں۔ وہ ایک آدھ گھنٹے میں مالدوا کے کسی شمالی شہر میں پہنچیں گے تو ان سے باتیں ہوسکیں گی۔"

"کیا وہ تنہا ہے؟"

"نہیں۔ دو اغوا کرنے والے اس کے تابعدار بن گئے ہیں۔ ان میں سے ایک نے عابی سے دور جاکر جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر یہ تمام اطلاعات اپنے یہودی اکابرین کو پہنچائی ہیں۔ عابی نہ خود ہتھیار اور فون رکھتا ہے' نہ انہیں رکھنے دیتا ہے۔ اس اطلاع دینے والے نے ایک فون اپنے لباس میں چھپا کر رکھا ہے۔"

اس نے شدید بے قراری سے کہا۔ "میں اپنے بیٹے سے باتیں کرنے کے لیے تڑپ رہا ہوں۔ پلیز' اس سے جیسے ہی رابطہ ہو' مجھ سے فوراً بات کرائیں۔"

اس نے فون بند کرتے ہوئے ہم زاد سے کہا۔ "اسے دشمنوں کے ساتھ نہیں جانا چاہیے۔ وہ اس کے تابعدار بن کر اسے دھوکا دے رہے ہیں۔ بڑی رازداری سے اپنے آقاؤں کو اس کی خبریں پہنچا رہے ہیں۔"

وہ صوفے کے ہتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "وہ نالائق اپنے پاس فون نہیں رکھتا۔ ہم کیا کریں؟ کیسے اسے خطرے سے آگاہ کریں؟ وہ آستین میں سانپ پالتا جارہا ہے۔"

ہم زاد نے کہا۔ "وہ آگے جہاں بھی جارہا ہے، وہاں یہودی اپنی پلاننگ کے مطابق موجود ہوں گے۔ وہ بڑی مکاری سے اپنی طرف اسے مائل کرتے رہیں گے۔"

"صرف اس حد تک اطمینان ہے کہ وہ کچھ عرصے تک اسے جانی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ جب وہ اپنی ماں کے مذہب کی طرف مائل نہیں ہوگا، تب اس کا جینا حرام کردیا جائے گا۔"

"ایسے حالات پیش آنے سے پہلے ہی ہمیں کسی بھی طرح اسے واپس لانا ہوگا۔"

"اور واپس لانے کے لیے وہاں جانا ہوگا۔"

ہم زاد نے کہا۔ "مجھے فوراً مالدوا جانا چاہیے۔ وہ اسی ملک میں پہنچنے والا ہے۔"

مراد نے کہا۔ "وہ سر پھرا ہے۔ کیا بھول گئے کہ یہاں کھیل ہی کھیل میں کیسی الٹی سیدھی حرکتیں کیا کرتا تھا؟ کبھی حیران کرتا تھا' کبھی پریشان کردیتا تھا۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ وہ دریائی راستے سے مالدوا نہیں جائے گا۔ اگلے لمحوں میں ہمیں کچھ اور معلوم ہوگا۔"

"وہ پارہ صفت ہے۔ کہیں بھی راستہ بدل سکتا ہے۔ اسے کسی ایک جگہ پہنچنے دو۔ تب معلوم ہوگا کہ یہودیوں سے اس کی بن رہی ہے یا نہیں؟ فی الحال اس کی جان کو خطرہ نہیں ہے۔ اس کے بارے میں اگلی کال کا انتظار کرو۔"

وہ دونوں تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ سر جھکائے سنجیدگی سے سوچتے رہے پھر ہم زاد نے کہا۔ "ہمارا بیٹا یہودیوں کے درمیان رہے گا۔ پتا نہیں وہ اس کا برین واش کرنے کے لیے کیسے کیسے نفسیاتی حربے استعمال کریں گے۔ پتا نہیں ہمارا بیٹا ان کی چالبازیوں کو سمجھ پائے گا یا نہیں؟ اس کا دماغ پھر جائے گا تو وہ ہمارے دین کو بھی بھول جائے گا۔"

مراد نے تڑپ کر کہا۔ "مجھے یہی اندیشہ ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے بیٹے کو اپنے دین پر اپنے ایمان پر قائم رکھنے کے لیے ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔"

وہ بے چینی سے پہلو بدل کر ہم زاد سے بولا۔ "میں جاؤں گا، تم نہیں جاؤ گے۔ تم یہاں ریاست کی ذمے داریاں سنبھالو گے۔ میں سیدھا مالدوا جاؤں گا۔ عابی جہاں بھی ہوگا، میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔"

"ابھی تم کہہ رہے تھے' کال کا انتظار کرو گے؟"

"کال آئے گی تو تم باتیں کرو گے۔ اس کے بعد مجھے بتاؤ گے کہ عابی کے بارے میں اور کس حد تک معلومات حاصل ہورہی ہیں۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں عارضی میک اپ میں خشکی کے راستے موٹر سائیکل کے ذریعے جاؤں گا۔ ایک گھنٹے میں مالدوا کے کسی علاقے میں پہنچ جاؤں گا۔"

وہ عارضی میک اپ کے لیے چلا گیا۔ ہم زاد نے اطمینان کی سانس لی۔ عابی صرف ہم زاد کے لہو سے نہیں تھا، مراد کے لہو سے بھی تھا کیونکہ ہم زاد کوئی الگ وجود نہیں رکھتا تھا۔

وہ بظاہر دو الگ الگ جسم رکھتے تھے لیکن حقیقتاً وہ مراد کا باطن تھا۔ اس کے اندر سے نکلا تھا۔ بات اتنی سی تھی

کہ کسی کے ہم زاد کسی کو نظر نہیں آتے اور وہ دنیا والوں کو دکھائی دیتا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ کسی دن مراد کے اندر گم ہوجاتا۔ ابھی وہ باہر تھا۔ وہ جہاں جاتا تھا۔ گویا وہ نہیں مراد جاتا تھا۔

ایک کنیز نے آکر کہا۔ ”بیگم صاحبہ کی طبیعت ناساز ہے۔ آپ کو یاد فرمارہی ہیں۔“

وہ اپنی خواب گاہ میں آیا۔ محل کی لیڈی ڈاکٹر زیب النساء کا معائنہ کررہی تھی۔ وہ پچھلے چند دنوں سے بیمار رہنے لگی تھی۔ اس وقت اس پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔

”خوش خبری بھی ہے اور پریشانی بھی ہے۔ بیگم صاحبہ ماں بننے والی ہیں لیکن اچانک بہت کمزور ہوگئی ہیں۔ الٹرا ساؤنڈ سے کمزوری کی وجہ معلوم ہوسکے گی۔“

محل کے ایک حصے میں جینی کی آمد کے وقت ایک منی اسپتال قائم کیا گیا تھا۔ تقدیر نے جینی کو اس اسپتال تک پہنچنے کی مہلت نہیں دی تھی۔ اب زیب النساء کو وہاں پہنچایا گیا۔ اس اسپتال میں تمام جدید آلات اور مشینیں تھیں۔ فوراً ہی تجربہ کار ڈاکٹر اور نرسیں بھی پہنچ گئیں۔ پھر الٹرا ساؤنڈ کے نتائج نے سب کو حیران کردیا۔ وہ بچہ چھ ہفتے یعنی بیالیس دن کا تھا اور حمل ابھی ظاہر ہوا تھا۔ عابی کے وقت بھی یہی ہوا تھا۔

یہ بچہ بھی ویسا ہی تھا۔ صرف چھ ہفتے میں عابی کی طرح اس کا بھی ٹھوس وجود بننے لگا تھا۔ زیب النساء کے رحم میں ایک زاویے سے بچے کی ایک آنکھ ایک کان اور گوشت پوست کا وجود دکھائی دے رہا تھا اور وہ بچہ نہیں تھا۔ ایک بچی تھی۔ میڈیکل رپورٹ کہہ رہی تھی کہ وہ بھی عجوبہ ہے۔ پہلے فتنہ ہوا تھا اب قیامت آنے والی تھی۔

☆☆☆

عابی ان دونوں کے ساتھ مالدوا کے شمالی شہر فروزا پہنچ گیا۔ اس نے کہا۔ ”ہم کسی ہوٹل میں رات گزاریں گے۔“

ایک نے کہا۔ ”یہاں ایک کاٹیج میں تمہاری رہائش کے انتظامات کیے گئے ہیں۔ وہاں چلو۔“

اس نے گھور کر اس یہودی کو دیکھا پھر پوچھا۔ ”میرے لیے انتظامات کس نے کیے ہیں؟ انہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں دریائی راستہ چھوڑ کر اس شہر میں آنے والا ہوں؟“

وہ گھبرا گیا۔ باتیں بنانے لگا۔ ”وہ سر! وہ اغوا کرانے والے جانتے ہیں کہ ہم آپ کو لے کر اسی شہر میں آئیں گے۔“

”تم دریائی راستے سے لے جارہے تھے۔ میں نے [illegible]۔ پھر وہ کیسے جان گئے؟“

عابی اس کی گردن دبوچ کر لباس کی تلاشی لینے لگا۔

دوسرا یہودی یہ دیکھتے ہی وہاں سے سرپٹ بھاگا۔ کیونکہ فون اسی کے پاس تھا۔ وہ ایک گلی میں مڑ کر اس کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہی فون نکال کر دوڑتے دوڑتے نمبر پنچ کرنے لگا۔ ایک گلی کے بعد دوسری گلی پار کرنے لگا۔

اس نے رابطہ ہوتے ہی ہانپتے ہوئے کہا۔ ”ہم...... ہم مرنے والے ہیں۔ اسے معلوم ہوگیا ہے کہ میں اس سے چھپ کر مخبری کررہا ہوں۔ ہمیں بچاؤ۔ کسی طرح بچاؤ۔ ہم ابھی فروزا کے ایک محلے پاؤلی میں ہیں۔ ہمارے لیے گاڑی بھیجو...... اور...... اور ہتھیار بھیجو۔“

وہ بولتا جارہا تھا۔ دوڑتا جارہا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ عابی ستر میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑ لگاتا ہے۔ جب وہ گلیوں سے گزرتا ہوا دوڑتا ہوا ایک شاہراہ پر پہنچا تو یکلخت چیخ مارتا ہوا منہ کے بل گر پڑا۔

عابی دوسرے یہودی کو کاندھے پر لاد کر چھلانگیں لگاتا ہوا اس کے سامنے آگیا تھا۔ اس نے دوسرے کو کاندھے سے اتار کر اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ ”فون نکالو۔“

وہ لباس کے اندر سے فون نکال کر دیتے ہوئے گڑگڑانے لگا۔ ”مجھے ایک بار معاف کردو۔ پھر کبھی دھوکا نہیں دوں گا۔ آپ کے خلاف مخبری نہیں کروں گا۔ میں تمہارے خدا کا واسطہ دیتا ہوں۔ اس کے نام سے معاف کردو۔“

اس نے فون کو زمین پر دے مارا۔ وہ ٹکڑے ہوکر بکھر گیا۔ پھر اس نے کہا۔ ”تم نے میرے اللہ کا واسطہ دیا ہے۔ آخری بار بھروسا کروں گا۔ سچ بولو۔ تم نے کیا خبر پہنچائی ہے؟“

”میں نے کہا ہے کہ آپ کو ہماری مخبری کا علم ہوگیا ہے اور ہم ابھی پاؤلی کے علاقے میں ہیں۔“

ایک ٹیکسی وہاں سے گزر رہی تھی۔ عابی نے ہاتھ اٹھا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ رک گئی۔ اس نے یہودیوں سے کہا۔ ”ڈرائیور سے بات کرو۔ اس ملک کے دارالسلطنت کا نام کیا ہے؟ ہم وہاں جائیں گے۔“

اس نے کہا۔ ”کیپٹل کا نام کسناؤ ہے۔ ہم وہاں چار گھنٹے میں پہنچیں گے۔ آپ تھکے ہوئے ہیں۔ سونا چاہیں گے۔ کسی قریبی شہر میں چل کر آرام کرنا چاہیں گے۔“

”جہاں کہہ رہا ہوں وہاں چلو۔“

وہ ڈرائیور کے پاس جا کر باتیں کرنے لگا۔ دوسرے

نے کہا۔ ”ہم آپ کو دھوکا نہیں دیں گے۔ میں سچ کہتا ہوں۔ جہاں آپ جارہے ہیں وہاں ہمارے یہودی اکابرین ہیں۔ ان کے حکم سے ہی ہم آپ کو اغوا کرنے آئے تھے۔“

”پھر تو ضرور وہاں جاؤں گا۔“

وہ اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر آگیا۔ دوسرا ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ پھر وہ ٹیکسی وہاں سے چل پڑی۔ عابی نے ان دونوں سے کہا۔ ”مجھے اپنی عبرانی زبان سکھاتے ہوئے چلو۔ پہلے اس زبان کے حروف بولو۔“

وہ ایک ایک حرف بولنے لگے۔ پھر ان حروف سے الفاظ بنانے لگے۔ عابی ان کے ساتھ بولتا جارہا تھا۔ اس کی یادداشت حیرت انگیز تھی۔ اس کا دماغ کمپیوٹر تھا۔ جو اسے فیڈ کیا جارہا تھا، وہ اس کی میموری میں محفوظ ہوتا جارہا تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر ہی وہ ان کے ساتھ عبرانی زبان کے فقرے صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کرنے لگا۔ تین گھنٹے کے اندر وہ ان کی زبان کے سیکڑوں فقرے ادا کرنے لگا۔ وہ دونوں عبرانی میں سوالات کرنے لگے۔ وہ جوابات دینے لگا۔

ایک نے شدید حیرانی سے کہا۔ ”بائی گاڈ! آپ کا دماغ کمپیوٹر ہے۔ گاڈ نے آپ کو کیا بنایا ہے؟ ہماری زبان آپ کی میموری میں محفوظ ہو چکی ہے۔“

وہ چار گھنٹوں کے بعد شہر کس ناؤ میں داخل ہو گئے۔ ٹیکسی ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے سامنے رک گئی۔ ایک یہودی نے کرایہ ادا کیا۔ دوسرے نے کہا۔ ”یہاں ہم دو کمرے حاصل کریں گے۔ ہمارے پاس صرف تین ہزار ڈالرز ہیں۔ آگے بڑے اخراجات ہیں۔ کیسے گزارہ ہوگا؟“

عابی نے کہا۔ ”دو کمرے نہیں ایک ڈبل بیڈروم لو۔ تم دونوں چوبیس گھنٹے میری نظروں کے سامنے رہا کرو گے۔ اخراجات کی پروا نہ کرو۔ جتنی ضرورت ہوگی اتنی رقم مل جایا کرے گی۔“

وہ ایک بڑا کمرا حاصل کرنے کے لیے ہوٹل کے ریسپشن میں آئے۔ رات کا ایک بجا تھا۔ ہوٹل میں خاموشی اور ویرانی سی تھی۔ وہ گہری نیند سونے کا وقت تھا اس لیے بہت کم افراد نظر آرہے تھے۔

جب وہ کمرا حاصل کر کے فورتھ فلور پر جانے کے لیے لفٹ کے اندر آئے تو ایک شخص نشے کی مستی میں ایک حسینہ کے ساتھ آگیا۔ لفٹ کا دروازہ بند ہوا۔ وہ اوپر جانے لگی تو اس شخص نے حسینہ کو بازوؤں میں بھر کر اسے چومنا چاہا۔ عابی نے دونوں کو پکڑ کر ایک جھٹکے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

”یہاں نہیں، اپنے کمرے میں......“

وہ شخص اپنا بازو سہلانے لگا۔ عابی کی گرفت نے سمجھا دیا کہ اسے جھگڑنا نہیں چاہیے۔ وہ ذرا دور ہو کر بولا۔ ”ہمیں قانون نہیں روکتا۔ تم روکنے والے کون ہوتے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”میں مسلمان ہوں۔ میرا دین ایسی بے حیائی کی اجازت نہیں دیتا۔“

چوتھے فلور پر لفٹ رک گئی۔ دروازہ کھل گیا۔ عابی باہر نکل کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ جانے لگا۔ وہ شخص اس کے پیچھے آتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہیں دیکھ لوں گا۔ تم نہیں جانتے میں کون ہوں۔ میں یہاں کا سب سے بڑا صنعت کار ہوں۔ حکومت کو سب سے زیادہ ٹیکس دیتا ہوں۔ ابھی میری ایک کال پر پولیس آئے گی اور تمہیں اٹھا کر ہوٹل کے باہر کاغذ کے پرزے کی طرح پھینک دے گی۔“

عابی چلتے چلتے رک گیا۔ اس نے پیچھے پلٹ کر اسے دیکھا پھر اسے کھینچ کر دونوں بازوؤں میں اٹھا کر آگے بڑھتے ہوئے اس حسینہ سے پوچھا۔ ”اس کا کمرا کہاں ہے؟“

حسینہ نے کہا۔ ”میں ابھی آئی ہوں۔ میں نہیں جانتی۔“

یہ کہتے ہی وہ رونے لگی۔ وہ شخص اس کے بازوؤں میں تھا، وہاں سے نکلنے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ عابی نے پوچھا۔ ”کیوں رو رہی ہو؟“

وہ اپنے اسکارف سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ”میں بھی مسلمان ہوں۔ میں یہ نہیں چاہتی جو میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ میں لٹنے والی ہوں۔ میں مرنے والی ہوں۔“

یہ سنتے ہی عابی کی کھوپڑی گھوم گئی کہ وہ مسلمان ہے۔ اس نے صنعت کار کو فرش پر پھینک دیا۔ پھر اس دوشیزہ کے اسکارف کو اس کے سر پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”تم میری سسٹر ہو۔ آنسو پونچھ لو۔ اب تمہیں رلانے والے روئیں گے۔“

اس دوشیزہ نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ وہ گبرو جوان اسے بہن کہہ رہا تھا۔ وہ پہلی بار سسٹر کا لفظ سن کر رو پڑی۔ عابی اس شخص کو گردن سے دبوچ کر فرش سے اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”اپنے کمرے میں چلو۔“

وہ بری طرح سہم گیا تھا۔ اس کا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔ وہ اپنا بڑا پن اور غرور بھول کر لڑکھڑاتا ہوا آگے جا کر کمرے کے دروازے کو چابی سے کھولنے لگا۔ عابی نے ان یہودیوں سے کہا۔ ”تم دونوں یہاں کھڑے رہو گے۔ جو کمرا لیا ہے، وہاں جا کر ٹیلیفون کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤ گے۔“

پھر اس نے دوشیزہ اور اس شخص کے ساتھ کمرے میں آکر دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ اس کے بعد بولا۔ ”سسٹر! تمہارا نام کیا ہے؟ یہاں کیسے لائی گئی ہو؟“

وہ بولی۔ ''میرا نام ژونیرا ہے۔ والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ دو بھائی اور ایک بھابی ہیں۔ انہوں نے اس سرمایہ دار سے بیس ہزار ڈالرز لے کر مجھے ایک ماہ کے لیے بیچ دیا ہے۔''

عابی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''آگے کچھ نہ کہو۔''

پھر اس نے صنعت کار سے پوچھا۔ ''یہاں تمہارے پاس کتنی رقم ہے۔ اپنا بیگ دکھاؤ۔''

وہ اپنا بیگ اٹھا کر کھولتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنے پاس زیادہ کیش نہیں رکھتا۔ کریڈٹ کارڈ سے ہر ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔''

''میں تمہارے جیسے شیطان کو نصیحت نہیں کروں گا۔ نہ ہی یہ یقین کروں گا کہ میرے جانے کے بعد تم میری سسٹر کو عزت آبرو سے جینے دو گے۔ میں اپنی بہن کو لے جا رہا ہوں۔ یہ سمجھ سکتا ہوں کہ تم آئندہ کیسی مصیبتیں کھڑی کرو گے۔ میں ابھی تمہاری سانسیں چھین سکتا ہوں لیکن تم نے میری بہن کو ہاتھ لگایا ہے۔ اس لیے پہلے جرمانہ وصول کروں گا۔ کل بینک کھلنے کے بعد پورے سولا کھ ڈالرز میری سسٹر کے پاس پہنچا دینا۔ ورنہ کل کا ڈوبتا ہوا سورج نہیں دیکھ سکو گے۔ ہزار سیکیورٹی کے باوجود سیدھے جہنم میں پہنچ جاؤ گے۔''

پھر اس نے ژونیرا سے کہا۔ ''کم آن سسٹر!''

وہ اس کے ساتھ کمرے سے باہر آیا۔ وہاں وہ دونوں تابعدار کی طرح ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ اس نے کہا۔ ''اپنے کمرے کا دروازہ کھولو۔''

انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے کمرے میں آ کر ژونیرا سے پوچھا۔ ''بھائیوں کے علاوہ یہاں تمہارا کوئی ایسا رشتے دار ہے جس کی پناہ میں تم رہ سکو؟''

''یہاں ایسا کوئی نہیں ہے۔ صرف ایک چاہنے والا ہے۔ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں بھی اسے چاہتی ہوں۔ اس کا نام پاشا ہے۔''

''اسے کال کرو اور یہاں بلاؤ۔''

وہ اپنے پرس میں سے فون نکال کر نمبر پنچ کرنے لگی۔ عابی نے دونوں یہودیوں سے کہا۔ ''خوش ہو جاؤ۔ میں تمہیں آزاد کر رہا ہوں۔ میرے سامنے اپنے آقاؤں سے بات کرو اور مجھ سے بھی بات کراؤ۔ انہیں بتاؤ کہ ہم یہاں ہیں۔''

وہ دونوں فوراً ہی ٹیلیفون کے پاس گئے۔ پھر ایک نے ریسیور کو اٹھا کر نمبر پنچ کیے۔ وہ خوش ہو رہے تھے۔ عابی اپنی مرضی سے خود کو اغوا کرنے والوں کے حوالے کر رہا تھا۔

اس نے رابطہ ہوتے ہی کہا۔ ''سر! ہم دونوں زندہ ہیں۔ پرنس عابد علی منگی نے ہمیں آزاد کر دیا ہے۔ ہم ابھی فائیو اسٹار ہوٹل کے روم نمبر چار سو چالیس میں ہیں۔''

''دوسری طرف سے پوچھا گیا۔'' پرنس عابی کہاں ہے؟''

وہ اسی کمرے میں ہیں۔ ہم پر مہربان ہیں۔ آپ سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔''

''او گاڈ! یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔ فوراً بات کراؤ۔''

عابی نے ریسیور لے کر کان سے لگا کر کہا۔ ''ہیلو۔ عابی بول رہا ہوں۔''

دوسری طرف سے مسرتوں بھری آواز میں کہا گیا۔

''پرنس! آپ پر خدا کی رحمت ہو۔ ہم بڑی بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہماری محبت کا اندازہ لگائیں کہ رات کے دو بج رہے ہیں اور ہم آپ کے انتظار میں جاگ رہے ہیں۔''

عابی نے کہا۔ ''میں اپنی مرضی سے آ رہا ہوں۔ آنے سے پہلے چند شرائط پوری کریں۔''

''آپ کی تمام شرائط پوری کریں گے۔ آپ فرمائیں۔ کیا چاہتے ہیں؟ ابھی شرائط پوری کی جائیں گی۔''

اس نے کہا۔ ''کل صبح ایک مسلمان لڑکی اور لڑکے کا نکاح کسی مسجد میں پڑھایا جائے گا۔''

''ضرور پڑھایا جائے گا۔ یہ بہت معمولی شرط ہے۔''

''اپنے منسٹر سے بولیں کل ہی دُلہا دلہن کا پاسپورٹ جاری کرائیں اور انہیں ریاست ارضِ اسلام روانہ کریں۔''

''یہ بھی ہو جائے گا۔ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔''

''میں کل دوپہر تک یہاں کے ایک بہت بڑے صنعت کار سے سولا کھ ڈالرز وصول کروں گا۔ عدم ادائیگی کی صورت میں اسے قتل کر دوں گا۔ اس کے نتیجے میں میرے اور پولیس والوں کے درمیان ٹھن جائے گی۔ کل سے اس دارالسلطنت کا امن و امان غارت ہونے والا ہے۔ کیا ان حالات میں میری حمایت کر سکیں گے؟ کیا یہاں کی پولیس اور آرمی کو میرے خلاف ہتھیار اٹھانے سے روک سکیں گے؟ میں آپ کی سیکیورٹی کا محتاج نہیں ہوں۔ لیکن آپ کے پاس آنے کی شرط یہی ہے کہ پولیس اور آرمی یا کوئی اور دشمن مجھ پر گولی نہ چلائے۔ اور اگر گولیاں چل گئیں تو میں یہاں سے بچ کر کہیں دوسری طرف نکل جاؤں گا۔ آپ کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔''

''آپ نے ہمیں آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ کیا اس صنعت کار سے اتنی بڑی رقم وصول کرنا ضروری ہے؟''

"ہاں۔ اس نے میری ایک مسلمان بہن کو ہاتھ لگایا ہے۔ میں اسے زندہ چھوڑنے کے لیے جرمانہ وصول کروں گا۔ وہ ادائیگی کرے گا، ورنہ مرے گا۔"

"آپ اس صنعت کار کا نام بتائیں۔ ہم اس سے معاملات طے کریں گے۔ پلیز آپ اسے قتل کرنے کے ارادے سے باز آجائیں۔ یہاں کی پولیس اور آرمی آپ کو اس ملک سے باہر نہیں جانے دے گی۔ آپ کتنے ہی شہ زور کیوں نہ ہوں، آپ کسی ملک کی آرمی سے تنہا نہیں لڑسکیں گے۔"

"آپ میری فکر نہ کریں۔ اگر میں نے اس سے جرمانہ وصول کرلیا تو آپ کے پاس آجاؤں گا اور اگر اسے قتل کردیا تو آپ سے دور نہیں چلا جاؤں گا۔ انتظار کریں۔ ابھی آپ کو اس صنعت کار کا نام معلوم ہوجائے گا۔"

اس نے فون بند کرکے ایک یہودی سے کہا۔ "ہوٹل کے کاؤنٹر سے معلوم کرو۔ اُس روم میں کون ہے اور اُس کا نام کیا ہے۔ اپنے آقاؤں کو اس کا نام بتاؤ۔"

ژونیرا کا محبوب، عابی سے ملنے آیا۔ اس نے عابی کو بتایا کہ وہ اس شہر میں ایک مکینک کی حیثیت سے بہت مشہور ہے لیکن ژونیرا کے غنڈے بھائیوں کے مقابلے میں کمزور ہے۔ اسی لیے آج تک اس سے شادی نہیں کرسکا۔

عابی نے پوچھا۔ "کیا میری بہن سے شادی کرکے ریاست ارضِ اسلام جاکر سلامتی سے رہنا چاہو گے؟"

وہ عابی کے گھٹنوں کو چھوکر بولا۔ "میں اس اسلامی ریاست میں ضرور جاؤں گا۔ اگر کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔"

"انشاء اللہ کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی۔ کل صبح تم دونوں کا نکاح پڑھا دیا جائے گا۔ جاؤ اور کسی قاضی سے بات کرو اور ژونیرا سے فون پر رابطہ رکھو۔"

وہ اسکارف کو گھونگھٹ کی طرح سر پر رکھے عابی کے پاس بیٹھی تھی۔ پاشا نے اسے بڑی محبت سے دیکھا پھر عابی کا شکریہ ادا کرکے چلا گیا۔ ہوٹل کے باہر عابی کے خلاف فضا گرم ہورہی تھی۔ صیہونی تنظیم کے اکابرین بڑی تیزی دکھا رہے تھے۔ وہ لوگ اس ملک کے ایک منسٹر کے سائے میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے اس کے تعاون سے ہوٹل کے چاروں طرف مسلح پولیس کی ڈیوٹی لگادی۔

انٹیلی جنس کے افسران نے ہوٹل کے منیجر کو حکم دیا۔ "لفٹ بند کردو۔ سیڑھیوں سے نہ کسی کو فورتھ فلور پر جانے دیا جائے۔ نہ وہاں سے آنے دیا جائے۔"

پولیس اور انٹیلی جنس والے روم نمبر چار سو چالیس کی نگرانی کررہے تھے۔ وہ اس کمرے سے کسی کو باہر نکلنے کی اجازت نہ دیتے۔ یوں عابی کے چاروں طرف مضبوط جال بچھا دیا گیا تھا اور وہ بے خبر تھا کہ اس کی لاعلمی میں کیا کیا جارہا ہے۔

اس صنعت کار کا نام ماتھیو بونز تھا۔ حکومتی سطح پر اس سے گفتگو ہورہی تھی۔ منسٹر نے کہا۔ "مسٹر بونز! آپ نہیں جانتے کہ پرنس عابی کس قدر خطرناک ہے۔ اگر آپ نے مطلوبہ رقم ادا نہ کی تو پھر یقین کریں یا نہ کریں، اس کی طرف سے آنے والی موت کو کوئی روک نہیں سکے گا۔"

اس نے کہا۔ "آپ بچوں جیسی باتیں نہ کریں۔ کیا ہمارے ملک کی پولیس اور آرمی اتنی کمزور ہے کہ ایک تنہا نوجوان کو گرفتار کرکے سزا نہیں دے سکے گی؟"

"ہماری پولیس نے اس کے چاروں طرف سخت پہرا لگا دیا ہے۔ ہم بڑی محبت سے اور بڑی حکمت سے اسے اپنے زیر اثر لانا چاہتے ہیں۔ جب وہ محبت سے زیر نہیں ہوگا تو پھر زبردستی ہوگی، اسے گرفتار کرلیا جائے گا۔ ہمیں صرف ایک پرسنٹ اندیشہ ہے کہ وہ ہماری گرفت سے نکل جائے گا اور اگر وہ نکل جائے گا تو اس شہر میں قیامت آجائے گی پھر اس کی تخریب کاریوں کو روکنے کی ایک ہی صورت رہ جائے گی کہ آپ اس کی مطلوبہ رقم ادا کردیں۔ اس کے بعد وہ طوفان کسی دوسری سمت چلا جائے گا۔ بہر حال آپ بُرے وقت کے لیے سولاکھ ڈالرز کی پیمنٹ تیار رکھیں۔"

وہاں جو ہورہا تھا۔ اس کی تفصیلات ہم زاد تک پہنچ رہی تھیں۔ سپر پاور کے اکابرین اپنے وعدے کے مطابق فون کے ذریعے مراد کو بتارہے تھے کہ عابی مالدوا کے دارالسلطنت کس ناؤ کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ہے۔

"جناب عالی...... ! پرنس نے یہاں مسائل پیدا کردیے ہیں۔ اس نے ایک صنعت کار ماتھیو بونز سے سولاکھ ڈالرز وصول کرنے کے لیے چیلنج کیا ہے کہ بونز اسے رقم ادا نہیں کرے گا تو اس کے ہاتھوں سے مارا جائے گا۔"

مراد محل میں نہیں تھا۔ وہ چہرہ تبدیل کرکے ہتھیاروں سے لیس ہوکر ایک موٹر سائیکل پر خشکی کے راستے مالدوا کے شمالی علاقے میں پہنچ گیا تھا۔ اس کی جگہ ہم زاد مراد بن کر فون پر باتیں کررہا تھا۔ سپر پاور کے ایک حاکم نے کہا۔ "مالدوا کا ایک منسٹر اور دوسرے اعلیٰ عہدیدار عابی کو سمجھا رہے ہیں کہ وہ سولاکھ ڈالرز کے مطالبے سے باز آجائے۔ وہ حکمران ہم سے بھی کہہ رہے ہیں کہ ہم آپ کے ذریعے عابی کو سمجھائیں۔ عابی نہیں جانتا ہے کہ وہ اس ہوٹل سے باہر نہیں جاسکے گا۔ تقریباً پچاس مسلح سپاہیوں نے اس ہوٹل کو

چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔
"یور ہائی نس! مالدوا کے حکمران آپ سے دشمنی مول لینا نہیں چاہتے۔ انہوں نے آپ سے گزارش کی ہے کہ آپ اپنے صاحبزادے کو نادانیوں سے باز رکھیں۔ آپ اس ہوٹل کا فون نمبر نوٹ کریں اور خود اس سے باتیں کر کے اسے خطرات سے آگاہ کریں۔"
انہوں نے ہوٹل کا فون نمبر بتایا۔ ہم زاد نے فوراً ہی اس نمبر پر عابی کو مخاطب کیا۔ "ہیلو عابی! میرے بیٹے! تم ہمیں چھوڑ کر کیوں بھٹکنے کے لیے چلے گئے ہو؟ اس وقت تم جس ہوٹل میں ہو، اسے مسلح سپاہیوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے، تم نہیں جانتے کہ دشمن کیسی چالیں چل رہے ہیں۔ تمہیں کہیں سے فرار کا راستہ نہیں ملے گا۔"
اس نے کہا۔ "مجھے فرار نہیں ہونا ہے۔ میں خود ہی دشمنوں کے کاندھوں پر بیٹھنے جاؤں گا۔"
"یہ کیا کہہ رہے ہو؟"
"بابا! یہاں میری ایک مسلمان بہن ہے۔ اس کی عزت آبرو کی سلامتی اسی میں ہے کہ کل میں اس کی شادی کراؤں اور اسے شوہر کے ساتھ اپنی ریاست میں بھیج دوں۔ میرے دشمن اسے آسانی سے نہیں جانے دیں گے۔ یہاں کے ایک بہت بڑے تاجر ماتھیو یونر نے اس بے چاری کو اس کے بھائیوں سے بیس ہزار ڈالرز میں خرید لیا تھا۔ اس نے میری بہن کو ہاتھ لگایا ہے۔ میں نے اسے سزا سنائی ہے کہ وہ پورے سوا لاکھ ڈالرز جرمانے کے طور پر ادا کرے۔ ورنہ وہ کل شام تک زندہ نہیں رہے گا۔"
"بیٹے! تمہاری بہن میری بیٹی ہے۔ میں وہاں کے حکمرانوں سے بات کرتا ہوں۔ وہ کل ہی اپنے خاوند کے ساتھ یہاں آجائے گی۔ اس تاجر یونر سے جرمانہ وصول نہ کرو۔ بات نہ بڑھاؤ۔ صلح صفائی سے وہاں سے نکل آؤ۔"
"آپ کیا سمجھتے ہیں؟ یہودی مجھے نکلنے دیں گے۔ وہ یہاں کے حکمرانوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ ان کے اشاروں پر یہاں کی پولیس اور آرمی مجھے زندہ گرفتار کرنے کی ہر ممکن کوششیں کرے گی۔ آپ جانتے ہیں کہ یہودیوں کے مذہبی عقیدے کے مطابق میں ان کے لیے ضروری ہوں۔ لہٰذا میں ان کی ضرورت سے کھیلتا رہوں گا۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ میں دنیا دیکھنے کے لیے نکلا ہوں اور پہلے مرحلے میں ہی خوب دیکھ رہا ہوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ میں دو چار برسوں میں واپس آجاؤں گا۔"
"بیٹے! مجھ سے زیادہ تمہارے بابا جانی فکر مند ہیں۔ وہ تمہیں تلاش کرنے اور تمہارے ساتھ رہنے کے لیے مالدوا کے کسی شمالی علاقے میں پہنچ گئے ہیں۔ میں انہیں بتاؤں گا کہ تم دارالسلطنت کس ناؤ میں ہو۔ تم ان کا فون نمبر جانتے ہو، ان سے بات کرو۔ میں انہیں بھی ہوٹل کا نمبر دے رہا ہوں۔ وہ ابھی تم سے بات کریں گے۔ ان سے چھپنے کی حماقت نہ کرنا۔"
رابطہ ختم ہو گیا۔ عابی سوچ میں پڑ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے بابا جانی وہاں آئیں۔ وہ اپنی جنگ تنہا لڑنا چاہتا تھا۔ محبتوں بھری اور نفرتوں بھری دنیا کو دیکھنے کے لیے محل سے بھاگ آیا تھا لیکن بابا جانی پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے۔ اس کے پیچھے چلے آئے تھے۔
تھوڑی دیر بعد ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا پھر پوچھا۔ "ہیلو کون؟"
مراد کی آواز سنائی دی۔ "میں ہوں تمہارا باپ۔ یو نان سنس، محل سے بھاگ کر آئے ہو۔ بڑی جواں مردی دکھا رہے ہو۔ باپ کو دھوکا دے کر سمجھتے ہو کہ آزاد اور بے لگام ہو گئے ہو۔ میں آرہا ہوں۔ ایسے جوتے ماروں گا کہ..."
وہ بات کاٹ کر بولا۔ "بابا جانی! جوتے ٹوٹ جائیں گے۔ ہاتھوں سے ماریں گے تو آپ کی ہڈیاں دکھنے لگیں گی۔ ڈنڈے سے ماریں گے تو ڈھول کی طرح بجنے لگوں گا۔ گولی تو کبھی ماریں گے نہیں۔ پھر غصہ کیوں دکھا رہے ہیں؟"
"کیا شہ زور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بزرگوں کی نافرمانی کرو؟"
"خدا نہ کرے کہ میں کبھی نافرمان ہو جاؤں۔ میں تو آپ کے قدموں کی دھول ہوں۔ قدموں تلے ہی رہوں گا۔"
"باتیں نہ بناؤ۔ ایسے ہی خاکسار ہو تو مجھ سے اجازت لے کر کیوں نہیں گئے؟"
"آپ کبھی اجازت نہ دیتے۔ آپ کو ہمیشہ یہ اندیشہ رہے گا کہ یہودی مجھے ٹریپ کر لیں گے۔ بابا جانی! جس دل میں اللہ ہو، اس دل میں اندیشے نہیں ہوتے۔ اور آپ تو اللہ کی پاک ذات میں ڈوب کر عبادت کرتے ہیں پھر اندیشے کیسے؟"
"درست کہتے ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے شیطانیت سے محتاط رہنے کی تاکید کی ہے۔ اندھے کنوئیں کی گہرائی کو خطرات کو سمجھے بغیر کود پڑنا نادانی ہے اور تم دنیا کو سمجھے بغیر کود پڑے ہو۔ ابھی تم پورے گیارہ برس کے بھی نہیں ہو۔ میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ یا تو تم میرے ساتھ محل میں واپس جاؤ گے یا پھر مجبوراً مجھے تمہارے ساتھ رہنا ہوگا۔"

چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔

"یور ہائی نس! مالدوا کے حکمران آپ سے دشمنی مول لینا نہیں چاہتے۔ انہوں نے آپ سے گزارش کی ہے کہ آپ اپنے صاحبزادے کو نادانیوں سے باز رکھیں۔ آپ اس ہوٹل کا فون نمبر نوٹ کریں اور خود اس سے باتیں کر کے اسے خطرات سے آگاہ کریں۔"

انہوں نے ہوٹل کا فون نمبر بتایا۔ ہم زاد نے فوراً ہی اس نمبر پر عابی کو مخاطب کیا۔ "ہیلو عابی! میرے بیٹے! تم ہمیں چھوڑ کر کیوں بھٹکنے کے لیے چلے گئے ہو؟ اس وقت تم جس ہوٹل میں ہو، اسے مسلح سپاہیوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے، تم نہیں جانتے کہ دشمن کیسی چالیں چل رہے ہیں۔ تمہیں کہیں سے فرار کا راستہ نہیں ملے گا۔"

اس نے کہا۔ "مجھے فرار نہیں ہونا ہے۔ میں خود ہی دشمنوں کے کاندھوں پر بیٹھنے جاؤں گا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"بابا! یہاں میری ایک مسلمان بہن ہے۔ اس کی عزت آبرو کی سلامتی اسی میں ہے کہ کل میں اس کی شادی کراؤں اور اسے شوہر کے ساتھ اپنی ریاست میں بھیج دوں۔ میرے دشمن اسے آسانی سے نہیں جانے دیں گے۔ یہاں کے ایک بہت بڑے تاجر ماتھیو بونر نے اس بے چاری کو اس کے بھائیوں سے بیس ہزار ڈالرز میں خرید لیا تھا۔ اس نے میری بہن کو ہاتھ لگایا ہے۔ میں نے اسے سزا سنائی ہے کہ وہ پورے سولاکھ ڈالرز جرمانے کے طور پر ادا کرے۔ ورنہ وہ کل شام تک زندہ نہیں رہے گا۔"

"بیٹے! تمہاری بہن میری بیٹی ہے۔ میں وہاں کے حکمرانوں سے بات کرتا ہوں۔ وہ کل ہی اپنے خاوند کے ساتھ یہاں آجائے گی۔ اس تاجر بونر سے جرمانہ وصول نہ کرو۔ بات نہ بڑھاؤ۔ صلح صفائی سے وہاں سے نکل آؤ۔"

"آپ کیا سمجھتے ہیں؟ یہودی مجھے نکلنے دیں گے۔ وہ یہاں کے حکمرانوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ ان کے اشاروں پر یہاں کی پولیس اور آرمی مجھے زندہ گرفتار کرنے کی ہر ممکن کوششیں کرے گی۔ آپ جانتے ہیں کہ یہودیوں کے مذہبی عقیدے کے مطابق میں ان کے لیے ضروری ہوں۔ لہٰذا میں ان کی ضرورت سے کھیلتا رہوں گا۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ میں دنیا دیکھنے کے لیے نکلا ہوں اور پہلے مرحلے میں ہی خوب دیکھ رہا ہوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ میں دو چار برسوں میں واپس آجاؤں گا۔"

"بیٹے! مجھ سے زیادہ تمہارے بابا جانی فکر مند ہیں۔ وہ تمہیں تلاش کرنے اور تمہارے ساتھ رہنے کے لیے مالدوا کے کسی شمالی علاقے میں پہنچ گئے ہیں۔ میں انہیں بتاؤں گا کہ تم دارالسلطنت کس ناؤ میں ہو۔ تم ان کا فون نمبر جانتے ہو، ان سے بات کرو۔ میں انہیں بھی ہوٹل کا نمبر دے رہا ہوں۔ وہ ابھی تم سے بات کریں گے۔ ان سے چھپنے کی حماقت نہ کرنا۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ عابی سوچ میں پڑ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے بابا جانی وہاں آئیں۔ وہ اپنی جنگ تنہا لڑنا چاہتا تھا۔ محبتوں بھری اور نفرتوں بھری دنیا کو دیکھنے کے لیے محل سے بھاگ آیا تھا لیکن بابا جانی پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے۔ اس کے پیچھے چلے آئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا پھر پوچھا۔ "ہیلو کون؟"

مراد کی آواز سنائی دی۔ "میں ہوں تمہارا باپ۔ یو نان سنس، محل سے بھاگ کر آئے ہو۔ بڑی جواں مردی دکھا رہے ہو۔ باپ کو دھوکا دے کر سمجھتے ہو کہ آزاد اور بے لگام ہو گئے ہو۔ میں آرہا ہوں۔ ایسے جوتے ماروں گا کہ..."

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "بابا جانی! جوتے ٹوٹ جائیں گے۔ ہاتھوں سے ماریں گے تو آپ کی ہڈیاں دکھنے لگیں گی۔ ڈنڈے سے ماریں گے تو ڈھول کی طرح بجنے لگوں گا۔ گولی تو کبھی ماریں گے نہیں۔ پھر غصہ کیوں دکھا رہے ہیں؟"

"کیا شہ زور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بزرگوں کی نافرمانی کرو؟"

"خدا نہ کرے کہ میں کبھی نافرمان ہو جاؤں۔ میں تو آپ کے قدموں کی دھول ہوں۔ قدموں تلے ہی رہوں گا۔"

"باتیں نہ بناؤ۔ ایسے ہی خاکسار ہو تو مجھ سے اجازت لے کر کیوں نہیں گئے؟"

"آپ کبھی اجازت نہ دیتے۔ آپ کو ہمیشہ یہ اندیشہ رہے گا کہ یہودی مجھے ٹریپ کر لیں گے۔ بابا جانی! جس دل میں اللہ ہو، اس دل میں اندیشے نہیں ہوتے۔ اور آپ تو اللہ کی پاک ذات میں ڈوب کر عبادت کرتے ہیں پھر اندیشے کیسے؟"

"درست کہتے ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے شیطانیت سے محتاط رہنے کی تاکید کی ہے۔ اندھے کنوئیں کی گہرائی کو خطرات کو سمجھے بغیر کود پڑنا نادانی ہے اور تم دنیا کو سمجھے بغیر کود پڑے ہو۔ ابھی تم پورے گیارہ برس کے بھی نہیں ہو۔ میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ یا تو تم میرے ساتھ محل میں واپس جاؤ گے یا پھر مجبوراً مجھے تمہارے ساتھ رہنا ہوگا۔"

''بابا جانی! یہ مجھ پر ظلم ہوگا۔ میری ایک بات مان لیں۔ مجھے کچھ دنوں کے لیے تنہا چھوڑ دیں اور دور سے تماشا دیکھتے رہیں۔ اگر مجھ سے کوئی نادانی ہوگی، میری کمزوریاں ظاہر ہوں گی تو پھر آپ میرے کان پکڑ کر واپس گھر لے جائیں۔''

''میں ایک شرط پر تمہاری بات مانوں گا۔''

''آپ فرمائیں کیا چاہتے ہیں؟''

''تم آج سے موبائل فون اپنے پاس رکھو گے اور روز مجھے کال کرو گے اور میری کالیں اٹینڈ کیا کرو گے۔''

''آپ مجھے اچھی طرح دیکھتے سمجھتے آئے ہیں۔ میں اپنے پاس کوئی ہتھیار، کوئی اوزار نہیں رکھتا۔ گھڑی اور انگوٹھی بھی نہیں پہنتا۔ اپنے پاس کرنسی بھی نہیں رکھتا۔ موبائل فون میرے لیے بوجھ ہوگا۔ ویسے وعدہ کرتا ہوں۔ جہاں رہوں گا، وہاں سے آپ کو کال ضرور کروں گا اور روز آپ کی دعائیں لیا کروں گا۔ پلیز بابا جانی...!''

''ٹھیک ہے بیٹے! میں دیکھوں گا کہ تم کیا کرتے ہو۔ ویسے باپ کی جان! کیا تمہیں معلوم ہے کہ ابھی چاروں طرف سے گھرے ہوئے ہو۔''

''آپ پھر پریشان ہو رہے ہیں۔ میں نے یہودی اکابرین سے کہہ دیا ہے۔ اگر وہ صنعت کار ماتھیو بونز مطلوبہ رقم ادا کردے گا تو میں ان یہودیوں کے پاس رہنے کے لیے جاؤں گا ورنہ میں بونز کو ہلاک ضرور کروں گا۔ یہ ہوٹل کا محاصرہ کرنے والے مجھے روک نہیں سکیں گے۔''

''کیوں فساد برپا کرنا چاہتے ہو؟ اس نے تمہاری منہ بولی بہن کو ہاتھ لگانے کی غلطی کی۔ وہ توبہ کرے گا۔ اپنے کان پکڑے گا، اسے معاف کردو۔''

''نہیں بابا جانی! میں دنیا والوں کو دکھانا چاہتا ہوں کہ ایک مسلمان لڑکی کو میلی نظروں سے دیکھنے کی سزائیں کتنی سخت ہوتی ہیں۔ بھاری جرمانہ یا موت۔''

مراد نے دل میں کہا۔ ''یہ ضدی ہے۔ بہتر ہے اسے من مانی کرنے دوں۔ میں اس کی حفاظت کے لیے ابھی سیکرٹ فورس کے جانبازوں کو بلاؤں گا۔ وہ چند گھنٹوں میں یہاں آجائیں گے۔''

''چلو میں تمہارے معاملات میں نہیں بولوں گا اور تم وعدے کے مطابق روز مجھے کال کرتے رہو گے۔''

''یس بابا جانی! میں اپنے وعدے پر قائم رہوں گا۔'' باتیں ہو گئیں۔ عابی نے ریسیور رکھ کر بیڈ کی طرف دیکھا۔ ژونیرا سو گئی تھی۔ وہ قالین پر سو گیا۔ پھر دو گھنٹے بعد ہی فجر کی نماز کے لیے اٹھ گیا۔ ژونیرا وضو کر کے واش روم سے باہر آئی پھر عابی سے کہا۔ ''مجھے یہ بغیر آستین کا بلاؤز اور اسکرٹ پہننے پر مجبور کیا گیا تھا جبکہ بدن کو پوری طرح ڈھانپنا چاہیے۔ آپ بتائیں بھائی! کیا اس لباس میں نماز ہوگی؟''

عابی نے بیڈ کی چادر کو کھینچ کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا پھر کہا۔ ''یہ صاف اور بے داغ ہے۔ اسے لپیٹ لو۔''

وہ اسے چادر دے کر واش روم میں چلا گیا۔ جب واپس آیا تو وہ سر... سے پاؤں تک چادر میں چھپی ہوئی نماز کی ادائیگی میں مصروف تھی۔ وہ بھی عبادت میں مصروف ہو گیا۔

اس بند کمرے کے باہر دوستی بھی تھی اور دشمنی بھی۔ سلامتی بھی تھی اور موت بھی۔ اگر وہ باہر جا کر یہودیت کو گلے لگاتا تو اسے سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا۔ ورنہ وہ بدترین دشمن بن جاتے۔ یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ انکار کرے گا تو وہ اسے گولیوں سے چھلنی کر دیں گے۔

ہوٹل کے اندر اور باہر پولیس فورس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سیکڑوں سپاہی تھے۔ ان سے زیادہ گنیں تھیں اور لاکھوں بلٹس تھے۔ جبکہ گیارہ برس کے لڑکے کو مارنے کے لیے ایک ہی گولی کافی تھی۔

ژونیرا نے نماز کے بعد عابی کو بڑی محبت سے دیکھا۔ وہ ذرا فاصلے پر عبادت میں مصروف تھا۔ اس نے اپنے بھائی کے ماتھے پر پریشانی کی ایک شکن بھی نہیں دیکھی تھی۔ ایک وہ بھائی تھے جنہوں نے اسے بیس ہزار ڈالرز میں فروخت کر دیا تھا۔ ایک یہ تھا جو لہو کا رشتہ نہ ہونے کے باوجود بھائی بن کر آبرو کی سلامتی دے رہا تھا۔ اس کے محبوب سے اس کا نکاح پڑھوانے والا تھا۔ اسے شہرِ دشمناں سے دور ریاست ارضِ اسلام کو روانہ کرنے والا تھا اور خود سپاہیوں کے نرغے میں رہ کر نہ جانے کن حالات سے گزرنے والا تھا۔

اس کے دل سے اپنے اس بھائی کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں۔ وہ عابی کے پاس آکر فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے سلام پھیرنے کے بعد اسے دیکھا وہ اس کے شانے پر سر رکھ کر بولی۔ ''بھائی! یہ لوگ ہمیں باہر نکلنے نہیں دیں گے۔''

وہ بولا۔ ''مایوسی کفر ہے۔ تم یہاں سے بخیریت باہر جاؤ گی۔ پاشا کی دلہن بنو گی۔ تم دونوں کو آج ہی ہماری ریاست میں بھیج دیا جائے گا۔''

اس نے شانے سے سر ہٹا کر پوچھا۔ ''اور آپ؟ ان لوگوں نے آپ کو کیوں گھیرا ہے؟ میں اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ یہ آپ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔''

لیے چارٹرڈ کرائیں۔ وہ دلہا دلہن جتنی جلدی میری ریاست میں جائیں گے، اتنی ہی جلدی میں آپ کے قریب آؤں گا۔“

”اوکے۔ دلہا دلہن کے لیے پاسپورٹ ضروری نہیں ہوگا۔ میں ابھی انتظامات کراتا ہوں۔ وہ دو یا تین گھنٹے کے اندر یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔“

صیہونی تنظیم کے اکابرین نے احتیاطاً اس کا محاصرہ کیا تھا۔ ویسے عابی سے جو معاملات طے ہوگئے تھے، ان کے مطابق وہ عمل کررہے تھے تاکہ عابی سہولت سے ہاتھ آجائے۔

قاضی صاحب نے ہوٹل کے کمرے میں آکر ژونیرا سے نکاح قبول کرایا۔ پھر وہاں سے پاشا کے گھر چلے گئے۔ نکاح کے ایک گھنٹے بعد فون پر کہا گیا کہ دلہا دلہن کے لیے ایک ہیلی کاپٹر چارٹرڈ ہوگیا ہے، باہر گاڑی کھڑی ہے۔ ژونیرا یہاں سے پاشا کے گھر جائے گی پھر وہاں سے دونوں کو ہیلی پیڈ کی طرف لے جایا جائے گا۔

ژونیرا عابی کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ ”بھائی! میں آپ کو آخری سانسوں تک یاد کرتی رہوں گی۔“

عابی اسے تھپک کر بولا۔ ”وہ میری ریاست ہے۔ میں وہاں جلد ہی واپس آؤں گا۔ پھر یاد نہیں کروگی۔“

اس نے کمرے کا دروازہ کھول کر اسے رخصت کردیا۔ پھر فون کے ذریعے ہم زاد سے کہا۔ ”بابا! میری بہن ژونیرا اپنے شوہر کے ساتھ ہیلی کاپٹر میں آرہی ہے۔ آپ اس کا استقبال کریں اور اس کی رہائش کا انتظام کریں۔“

پھر اس نے مراد کو فون پر کہا۔ ”بابا جانی! اب تک امن وامان ہے۔ آگے نہ جانے کیا ہونے والا ہے؟“

مراد نے پریشان ہوکر پوچھا۔ ”کیا ہونے والا ہے؟“

”یہ تو صرف اللہ جانتا ہے۔ آپ کو ایک یا دو گھنٹے بعد معلوم ہوجائے گا۔“

”دیکھو عابی! مسائل پیدا نہ کرنا۔ صلح صفائی کے ذریعے پیچیدہ حالات سے نکلو۔“

”میں صلح صفائی سے کام نکالوں گا۔ وہ صنعت کار یونر مسائل پیدا کرے گا۔ جرمانہ ادا نہیں کرے گا تو امن وامان کو غارت کرے گا۔ ویسے یہودی اسے سمجھا رہے ہوں گے۔ آپ اگلی کال کا انتظار کریں۔“

ایک گھنٹے بعد ژونیرا نے فون پر کہا۔ ”بھائی آپ پر خدا کی رحمت ہو۔ میں پاشا کے ساتھ ہیلی کاپٹر میں آگئی ہوں۔ ابھی فون آف کررہی ہوں۔ ریاست میں پہنچ کر آپ کو کال کروں گی۔ اللہ آپ کو سلامتی دے۔“

پھر آدھے گھنٹے بعد ہم زاد نے فون پر کہا۔ ”تمہاری بہن، میری بیٹی اپنے مجازی خدا کے ساتھ آگئی ہے۔ اس کی طرف سے بےفکر ہوجاؤ۔ اپنے حالات بتاؤ۔ کیا ہورہا ہے؟“

”ابھی ہونے والا ہے۔ آپ کو جلد ہی معلوم ہوجائے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ آرام سے انتظار کریں۔ میری خیریت معلوم ہوتی رہے گی۔“

اس نے ریسیور رکھا تو گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے پھر ریسیور کو اٹھا کر کان سے لگایا۔ صیہونی تنظیم کے اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ ”آپ فون کے ذریعے اپنے فادر سے تصدیق کرسکتے ہیں۔ آپ کی سسٹر اپنے خاوند کے ساتھ ریاست میں پہنچ گئی ہے۔“

”شکریہ۔ میں تصدیق کرچکا ہوں۔ اب آخری شرط رہ گئی ہے، اس شرط کے مطابق ماتھیو یونر کو جرمانہ ادا کرنا ہے۔“

”آنرایبل پرنس! یہ آپ کا اور یونر کا معاملہ ہے۔ یہ معاملہ سہولت سے طے ہوجائے تو اچھا ہے۔ ہم چاہتے ہیں، آپ دونوں روبرو بیٹھ کر دوستی اور محبت سے لین دین کا مسئلہ حل کرلیں۔ بات نہ بگاڑیں۔“

”آپ کا مشورہ مناسب ہے لیکن بات وہی بگاڑ رہا ہے۔ بائی دا وے یونر سے کہاں ملاقات ہوگی؟“

”آپ ہمارے پاس آجائیں۔ یونر کو بھی یہاں بلایا جائے گا۔“

”سوری۔ آخری شرط کے مطابق وہ جرمانہ ادا کرے گا۔ اس کے بعد ہی آؤں گا۔ ورنہ آپ میرے سائے کو بھی نہیں پاسکیں گے۔“

”آل رائٹ۔ کیا آپ ہوٹل کے بینکویٹ ہال میں ملاقات کرنا پسند کریں گے؟“

”یہ منظور ہے۔“

”شکریہ پرنس! آپ ہم سے تعاون کررہے ہیں۔ جب یونر وہاں پہنچے گا تو آپ نیچے ہال میں آجائیں۔“

رابطہ ختم ہوگیا۔ وہ ریسیور رکھ کر بند کمرے میں ٹہلنے لگا۔ یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ یونر سولاکھ ڈالرز ادا نہیں کرے گا۔ ایسی صورت میں اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ اپنے چیلنج کے مطابق اسے موت کے گھاٹ اتار نہیں سکے گا۔ وہاں درجنوں گن مین ہوں گے۔ اسے یونر کے قریب جانے نہیں دیں گے۔

پھر جلد ہی فون پر کہا گیا۔ ”آپ نیچے تشریف لے

آئیں۔ مسلح باڈی گارڈز آپ کو بینکویٹ ہال میں پہنچادیں گے۔"

اس نے کہا۔"میں کسی باڈی گارڈ کے ساتھ نہیں آؤں گا۔ مجھے اپنی جان کا خطرہ نہیں ہے اور میں کوئی مجرم نہیں ہوں کہ سپاہیوں کے نرغے میں آؤں گا۔"

"ہم ابھی افسران کو حکم دیتے ہیں۔ کوئی آپ کے آس پاس نہیں رہے گا۔"

وہ تھوڑی دیر بعد کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آیا۔ کوریڈور میں ایک افسر اور چھ سپاہی کھڑے ہوئے تھے۔ وہ دور ہی رہے۔ اس کے پیچھے لفٹ تک نہیں آئے۔ انہیں اطمینان تھا کہ وہ کسی طرح بھی فرار نہیں ہوسکے گا۔ لفٹ نیچے جائے گی تو وہاں مسلح افسران اور سپاہی موجود ہوں گے۔ ہوٹل کے اندر اور باہر اتنے سپاہی تھے کہ اسے گولیوں سے چھلنی کردیتے۔

وہ تنہا لفٹ میں نیچے آیا۔ واقعی گراؤنڈ فلور میں مسلح سپاہیوں کا میلا لگا ہوا تھا۔ وہ بندوقوں اور بلٹس کی آتش بازی دکھانے آئے تھے۔ بینکویٹ ہال میں افسران زیادہ تھے۔ ان سب کے ریوالور ہولسٹر سے باہر نکلے ہوئے تھے۔

ایک کرسی پر صنعت کار ماتھیو یونر بڑی شان سے بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں بائیں اور پیچھے سپاہی اور افسران تھے۔ اس کے سامنے بھی چار افسران کھڑے ہوئے تھے۔ اس کے چاروں طرف بندوقیں تھیں۔ عابی ایسی مضبوط دیواروں کو توڑ کر یونر تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اس سے چھ میٹر دور عابی کے لیے کرسی رکھی ہوئی تھی۔ وہاں صیہونی تنظیم کے پانچ اکابرین تھے۔ وہ پہلی بار بڑی حیرانی اور بے یقینی سے ایسے جوان مرد کو دیکھ رہے تھے' جو عمر کے حساب سے گیارہ برس کا تھا۔

ایک عمر رسیدہ شخص نے اس کے سامنے آکر کہا۔"آنر ایبل پرنس عابد علی منگی کی عمر دراز ہو۔ میں فری میسن زونل آفس کا انچارج ہوں۔ آپ مجھے آواز سے پہچان سکتے ہیں۔ میں ہی فون پر آپ سے باتیں کرتا رہا ہوں۔"

پھر وہ دوسرے چار اکابرین کا تعارف کرانے لگا۔ وہ سب اس سے مصافحہ کرتے ہوئے بڑی مسرتوں کا اظہار کررہے تھے اور کہہ رہے تھے۔"جینٹیر جوزف عرف جینی' آپ کو جنم دینے والی ماں ہماری قوم کی بیٹی تھی۔ ماڈلنگ کے ذریعے لاکھوں ڈالرز کماتی تھی اور اپنی آدھی کمائی اپنے دین کی تبلیغ میں صرف کرتی تھی۔ آپ ایک سچی یہودی ماں کے فرزند ہیں۔"

ایک نے بڑے ادب سے پوچھا۔"کیا آپ اپنی عظیم والدہ کو کبھی یاد کرتے ہیں؟"

عابی نے کہا۔"میرے دل میں صرف بام کی ہی یادیں ہیں۔ اکثر سوچتا ہوں' ان کی صورت کیسی تھی؟ کتنی پیاری سی لگتی ہوں گی؟

"بابا جانی نے بتایا ہے' وہ پیرس کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتی تھیں۔ وہاں ان کی تصویریں ہوں گی۔ میں جلد ہی وہاں جاؤں گا اور ان کی تصویروں سے لپٹ کر انہیں خوب پیار کروں گا۔ بابا جانی نے کہا ہے' وہاں ان کے استعمال کی تمام چیزوں کو یادگار کے طور پر محفوظ رکھا گیا ہے اور اس اپارٹمنٹ کو ہمیشہ مقفل رکھا جاتا ہے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی دیوار پر لگی ہوئی ایک بڑی سی اسکرین روشن ہوگئی۔ اس اسکرین پر جینی مسکرا رہی تھی۔ زونل آفس کے ہیڈ نے کہا۔"یہ آپ کی والدہ محترمہ ہیں۔"

عابی کا دل یکبارگی تصویر کی طرف کھنچا چلا گیا۔ وہ پہلی بار اپنی ماں کو آنکھوں سے' دل سے اور دماغی کشش سے دیکھتا رہ گیا۔ چند لمحوں تک گم صم سا رہا۔ پھر تیزی سے آگے بڑھ کر اسکرین کے پاس آگیا۔ دونوں بازو پھیلا کر اپنی ماں پر اس طرح رکھ دیے جیسے اپنی... ماں سے لپٹ رہا ہو۔

بے شک یہودی ہتھیاروں سے نہیں' انسانی نفسیات سے کھیلتے ہیں۔ وہ ماں کو پیش کرکے بیٹے کے جذبات سے کھیل رہے تھے۔ اسے ماں کے رشتے کی اور ماں کی قربانیوں کی زنجیریں پہنا رہے تھے۔ جینی مختلف لباس میں مختلف زاویوں سے اسکرین پر نظر آرہی تھی۔ وہ ایک اور شاٹ میں ایک ایزی چیئر پر نیم دراز تھی۔ اس کا پیٹ پھولا ہوا تھا۔ وہ ماں بننے والی تھی۔

وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہی تھی۔"میرے بچے! میں بہت تکلیفوں سے گزر رہی ہوں۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق تمہاری جسامت عام بچوں سے زیادہ ہے۔ تمہیں دنیا میں لانے کے لیے مجھے خطرناک آپریشن سے گزرنا ہوگا۔ آہ! کیا میں زندہ رہ سکوں گی؟ میرے بچے! کیا میں تمہاری پیاری پیاری سی صورت دیکھ سکوں گی؟"

وہ بول رہی تھی اور عابی سن کر تڑپ رہا تھا۔ اسکرین پر اپنی ماں کے چہرے پر دونوں ہتھیلیاں پھیر رہا تھا۔

وہ بول رہی تھی۔"آہ! شاید میں یہ حسرت لے کر دنیا سے چلی جاؤں گی۔ جانے سے پہلے یہ ویڈیو فلم تیار کررہی ہوں۔ جب تم بڑے ہوجاؤ گے تو مجھے اس طرح بولتے

ہوئے سنو گے اور مجھے اپنے سامنے زندہ دیکھتے رہو گے۔ میرے بچے! ابھی ان لمحوں میں مجھے دیکھ رہے ہو نا؟''

وہ ماں ایسے جذباتی انداز میں بول رہی تھی کہ زندہ بیٹے کی روح مرحومہ کی طرف کھنچی جارہی تھی۔ وہ اسکرین میں گھس کر ماں کے وجود میں جذب ہوجانا چاہتا تھا۔

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولی۔ ''دوا کا اثر ختم ہورہا ہے پھر تکلیف شروع ہورہی ہے۔ میرے بیٹے! جب مجھے دیکھو تو وعدہ کرو۔ یہاں میرے اپارٹمنٹ میں آؤ گے۔ میں نے الماری میں ایک ڈائری رکھی ہے۔ اس ڈائری میں تم سے بہت ساری باتیں کرتی رہی ہوں۔ آہ...!''

وہ بولتے ہوئے تکلیف محسوس کررہی تھی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کیمرا مین سے کہا۔ ''کٹ کرو۔ ڈاکٹر کو بلاؤ...''

اچانک اسکرین تاریک ہوگئی۔ ماں گم ہوگئی۔ وہ چند لمحوں تک خاموش اسکرین کو تکتا رہا پھر یہودی اکابرین کی طرف پلٹ کر بولا۔ ''میں آج ہی مام کے اپارٹمنٹ میں جاؤں گا۔''

ایک عہدیدار نے خوش ہوکر کہا۔ ''وہ پیرس میں رہتی تھی۔ کوئی بات نہیں۔ آپ چارٹرڈ جہاز میں آج ہی جاسکیں گے۔ ہم آپ کی راہنمائی کے لیے ساتھ جائیں گے۔''

دوسرے عہدیدار نے کہا۔ ''وہ اپارٹمنٹ آپ کی مام کا ہے۔ اب آپ کا ہوگا۔ وہاں ان کی خوبصورت تصاویر، ملبوسات اور ان کے استعمال میں رہنے والی ہر چھوٹی بڑی چیز موجود ہے اور وہ سب آپ کے لیے ہے۔''

تیسرے نے کہا۔ ''جب آپ اس اپارٹمنٹ میں رہیں گے تو یوں لگے گا جیسے اپنی مام کی گود میں رہنے لگے ہیں۔''

عابی نے کہا۔ ''آپ جہاز چارٹرڈ کرائیں۔ میں آج ہی جاؤں گا لیکن...''

اس نے پلٹ کر صنعت کار ماتھیو بونر کو دیکھا پھر ناگواری سے کہا۔ ''میری زندگی میری دنیا میری مام ہیں۔ لیکن میں جذبات میں بہہ کر فرائض کو نہیں بھولتا۔ میں نہیں بھولوں گا کہ اس نے میری بہن کی قیمت لگائی تھی، اسے ہاتھ لگایا تھا۔ میری سنائی ہوئی سزا اٹل ہے۔''

وہ بونر کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ ''جرمانہ یا موت۔''

پولیس کے ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ ''آنر ایبل پرنس! یہ ہمارا ملک ہے اور ہمارے قوانین کے مطابق محترم ماتھیو بونر نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ یہاں نہ آپ کی عدالت ہے، نہ آپ کا قانون۔ سوری ٹو سے۔ یہاں آپ کی سنائی ہوئی سزا پر عمل درآمد نہیں ہوگا اور نہ ہی ہونے دیا جائے گا۔''

یہودی اکابرین میں سے ایک نے اس اعلیٰ افسر سے کہا۔ ''پرنس ہماری جینی کے فرزند ہیں۔ ہماری قوم کا سرمایہ ہیں۔ بے شک آپ کے ملکی قوانین کی اہمیت ہے لیکن ہم چاہیں گے کہ آپ اپنے فرائض کی ادائیگی میں لچک پیدا کریں۔ مسٹر بونر کو رقم ادا کرنے پر راضی کریں۔''

ماتھیو بونر نے کہا۔ ''اگر یہ پرنس مجھ سے سولاکھ ڈالرز مانگتا تو میں خیرات کے طور پر دے دیتا لیکن میں مجرم نہیں ہوں۔ جرمانہ ادا کرنا میری توہین ہوگی۔''

عابی نے کہا۔ ''تم مجھے خیرات دینے کی بات کررہے ہو۔ میں تمہاری بوٹی بوٹی کاٹ کر چیل کوؤں کو خیرات کروں گا۔''

پھر اس نے یہودی اکابرین سے کہا۔ ''آپ ایک آخری کوشش کریں کہ یہ بدبخت اپنے بیوی بچوں کے لیے زندہ رہ جائے۔ میں اوپر اپنے کمرے میں جارہا ہوں۔ آپ مجھ سے فون پر بات کریں۔''

وہ پلٹ کر جانے لگا۔ دروازے پر کھڑے ہوئے سپاہی فوراً ہی دور ہٹ گئے۔ کسی نے اسے جانے سے نہیں روکا۔ ہوٹل کے اندر اور باہر اتنا سخت پہرا تھا کہ وہ فرار نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ سب ہی مطمئن تھے۔

ایک یہودی اعلیٰ عہدیدار فون پر منسٹر سے کہہ رہا تھا۔ ''پرنس عابی بہت ذہین ہے۔ ہم سے راضی ہے۔ ہمارے ساتھ آج ہی پیرس جانے والا ہے۔ لیکن ماتھیو بونر پرابلم بن گیا ہے۔ اس کے لیے سولاکھ ڈالرز کوئی اہمیت نہیں رکھتے لیکن یہ ادائیگی سے انکار کررہا ہے۔ پلیز آپ اسے راضی کریں۔''

ماتھیو بونر نے چیخ کر کہا۔ ''میں مرجاؤں گا لیکن جرمانہ ادا نہیں کروں گا۔ یہ میری اور میرے ملکی قوانین کی توہین ہوگی۔''

منسٹر نے کہا۔ ''بونر پہلے بھی کہہ چکا ہے اور ہم بھی کہتے ہیں۔ ہمارے قوانین اور ہمارے عدالتی فیصلے کے مطابق بونر مجرم ثابت نہیں ہوگا۔ مسٹر ڈیوڈ! ہم ہر معاملے میں یہودیوں کا ساتھ دیتے ہیں لیکن سوسوری۔ ہم اپنے عدالتی قوانین کے خلاف آپ کا ساتھ نہیں دیں گے۔''

عابی نے کمرے میں آکر فون کے ذریعے اس یہودی سے رابطہ کیا جس کی بیٹی کا نام ڈائنا تھا اور جو عابی کی بڑی بہن بن کر اس سے باتیں کرچکی تھی۔

وہ فون کو کان سے لگا کر بولی۔ ''ہیلو کون؟''

وہ بولا۔ ''سسٹر! میں ہوں عابی۔''

وہ خوش ہوکر بولی۔ ''ہائے میرے پرنس بھائی! تم

نے مجھے یاد کیا ہے۔ آئی لو یو۔"
عابی نے کہا۔ "کیا ابھی تمہارے پاس آجاؤں؟"
وہ خوشی سے چیخ پڑی۔ "مائی گڈنس۔ ابھی آؤ گے؟ کیسے آؤ گے جلدی بتاؤ؟"
"پہلے تو خوشی سے چیخنا بند کرو۔ یہ بتاؤ، میں تمہارے گھر میں رازداری سے چھپ کر رہ سکوں گا؟"
"بھائی! میں تمہیں دل میں چھپا کر رکھوں گی۔ آجاؤ۔"
"ایک پرابلم ہے۔ میں یہاں کے راستے گلیاں اور علاقے نہیں جانتا ہوں۔ کوئی ایسی نمایاں جگہ بتاؤ جہاں میں آسانی سے پہنچ جاؤں۔"
"نو پرابلم۔ میں ایسی جگہ بتا رہی ہوں جسے ہر انسان کو اپنی زندگی میں ضرور یاد رکھنا چاہیے۔ کبھی بھولنا نہیں چاہیے اور وہ جگہ ہے قبرستان۔ عیسائیوں کا وہ قبرستان دور تک پھیلا ہوا ہے۔ دور ہی سے تمام قبروں کے سرہانے سفید صلیب سر اٹھائے دکھائی دیتے ہیں۔"
"یہ بتاؤ۔ میں جس ہوٹل میں ہوں وہاں سے قبرستان کس سمت میں ہے؟"
"وہ ہوٹل سے جنوب کی سمت میں ہے۔ میں قبرستان کے باہر بلو کلر کی ایک سیکنڈ ہینڈ کار کے پاس نظر آؤں گی۔"
"میں آدھے گھنٹے میں آرہا ہوں۔ ایک بات یاد رکھو۔ بھائی کے سامنے پورے لباس میں رہنا۔"
"مائی گاڈ! میں ہمیشہ پورا لباس پہنتی ہوں۔ بے حیا لڑکیوں سے نفرت کرتی ہوں۔"
عابی نے شاباش کہہ کر فون بند کر دیا۔ دو منٹ کے بعد ہی ایک یہودی اعلیٰ عہدیدار نے اسے کال کی پھر کہا۔ "آنر ایبل پرنس! بڑی مشکل ہے۔ یہ جرمانہ ادا نہیں کرے گا۔ پلیز کوئی ایسی صورت نکالیں کہ۔۔۔"
عابی نے کہا۔ "بس سمجھ گیا۔ آگے نہ بولیں۔ مشکل حوصلہ مندوں کے لیے نہیں، بزدلوں اور کمزوروں کے لیے ہوتی ہے۔ آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے؟"
جن یہودیوں نے اسے اغوا کرایا تھا فی الحال وہی معاون اور مددگار بن گئے تھے۔ آئندہ اس کے کام آنے والے تھے اور وہی اسے پیرس میں اس کی ماں کے اپارٹمنٹ تک پہنچانے والے تھے۔
وہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ تمام سپاہی الرٹ ہو گئے لیکن کسی نے اسے لفٹ کی طرف جانے سے نہیں روکا۔ یہ یقین تھا کہ وہ گراؤنڈ فلور میں ہی جائے گا۔ کہیں سے فرار ہونے کا راستہ نہیں تھا۔
وہ لفٹ کے اندر گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ پھر تمام سپاہی چونک گئے۔ لفٹ کے بند دروازے کے اوپر بدلتے ہوئے نمبر بتا رہے تھے کہ وہ نیچے گراؤنڈ فلور کی طرف نہیں جا رہا ہے۔ وہ لفٹ اوپر جا رہی تھی۔
وہ سب ہڑبڑا گئے۔ ایک افسر نے فوراً ہی فون پر کہا۔ "سر! وہ لفٹ میں اوپر گیا ہے۔ وہ لفٹ ناینتھ فلور پر رک گئی ہے۔ اس کے بعد چھت ہے وہ فرار نہیں ہو سکے گا۔ کیا ہمیں اوپر جانا چاہیے؟"
حکم دیا گیا۔ "جاؤ اور دیکھو۔ وہ وہاں کیوں گیا ہے؟"
وہ افسر سپاہیوں کے ساتھ دوڑتا ہوا دوسری لفٹ کے اندر گیا۔ عابی نویں فلور پر پہنچ کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا چھت پر آگیا۔ وہ ہوٹل چار ہزار گز کے رقبے تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا جنوب کی سمت چھت کے کنارے آیا۔
اسے اسی سمت جانا تھا۔ ڈانا قبرستان کے گیٹ کے سامنے انتظار کر رہی ہوگی۔ اس چھت کی بلندی سے بہت دور پستی میں ہوٹل کی باؤنڈری نظر آرہی تھی۔ وہاں مسلح سپاہی ڈیوٹی پر تھے۔ باؤنڈری کے باہر شاہراہ پر گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ شاہراہ کے دوسری طرف چھوٹی بڑی عمارتوں کی چھتیں دکھائی دے رہی تھیں۔
ہوٹل کے احاطے سے ایک چھ منزلہ عمارت منسلک تھی۔ اسی طرح چار منزلہ، چھ منزلہ اور آٹھ منزلہ عمارتیں ایک قطار میں تھیں۔ عابی نے دور تک جائزہ لیا۔ وہاں سے صرف چالیس فٹ نیچے چھ منزلہ عمارت کی چھت پر پہنچنا تھا اور یہ اس کے لیے معمولی سی بات تھی۔
وہ پیچھے ہٹ کر جوگنگ کرنے لگا۔ دونوں پنجوں کے بل اچھلنے لگا پھر اس نے دوڑ لگائی۔ ایسے وقت افسر اور سپاہی چھت پر آگئے تھے۔ اس نے دوڑتے ہوئے چھت کے کنارے پہنچتے ہی چھلانگ لگائی اور ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ سب نے چیخ کر کہا۔ "ارے وہ خودکشی کر رہا ہے۔"
اتنی بلندی سے چھلانگ لگانے کا مطلب خودکشی ہی ہوتا ہے۔ انہوں نے دوڑتے ہوئے چھت کے کنارے آکر دیکھا۔ وہ سامنے چھ منزلہ عمارت کی چھت پر نظر آیا۔ وہ خودکشی کرنے والا زندہ تھا۔
شدید حیرانی کی بات تھی۔ مزید حیران کرنے والا تماشا یہ ہوا کہ اس نے اس دوسری چھت پر سے بھی چھلانگ لگائی تھی۔ معروف شاہراہ کے دوسری طرف پہنچ کر فٹ پاتھ سے گزرنے والوں کے اوپر بھی قلابازیاں لگا رہا تھا۔ کبھی

لمبی چھلانگیں لگا رہا تھا۔

یہ ایسا تماشا تھا کہ فٹ پاتھ پر چلنے والے ایک طرف سمٹ گئے تھے۔ چوراہے پر گاڑیاں رک گئی تھیں۔ لوگوں نے گاڑیوں سے باہر نکل کر دیکھا، اس نے ایک اونچی چھلانگ لگائی تھی۔ ایک چار منزلہ عمارت کی چھت پر پہنچ کر سب کی نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا۔

ہوٹل کا محاصرہ کرنے والے سپاہی ادھر دوڑتے ہوئے گئے۔ ان کی گاڑیاں بھی مختلف راستوں پر اور گلیوں میں دوڑ لگا رہی تھیں۔ اگر وہ کہیں زمین پر ہوتا تو انہیں نظر آتا۔ وہ تو ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری چھتوں پر پہنچتا ہوا دور نکلتا جارہا تھا۔ زمین پر دوڑنے والے سپاہی اور گاڑیاں پورے شہر میں بھٹک رہی تھیں۔

پھر اسے ایک چھت کی بلندی سے کچھ فاصلے پر عیسائیوں کا قبرستان نظر آیا۔ گیٹ کے سامنے ایک کار دکھائی دی۔ ایک نوجوان لڑکی اس کار سے لگی کھڑی تھی۔ وہ چھت کی بلندی سے چھلانگ لگا کر زمین پر آیا۔ پھر دوسری چھلانگ میں ڈائنا کے پاس آیا تو وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی پھر اس نے پوچھا۔ ''تم پرنس ہونا؟''

''ہاں۔ فوراً یہاں سے چلو۔ شکاری کتے کسی وقت بھی میرے قریب آسکتے ہیں۔''

وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آکر کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولی۔ ''تم اچانک ایسے پہنچ گئے جیسے آسمان سے ٹپکے ہو۔ میں تو ڈر گئی تھی۔''

''ڈر تو اب شروع ہوگا۔ میں تمہارے گھر میں پناہ لوں گا۔ کسی وقت بھی گرفتاری کا اندیشہ ہوگا۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''کوئی تمہیں گرفتار کرنے آئے گا تو بڑا مزہ آئے گا۔ تم ان کی پٹائی کرو گے۔ میں تالیاں بجاؤں گی۔''

اس نے گاڑی کی رفتار بڑھادی۔ ہوٹل کا محاصرہ کرنے والی پولیس فورس شہر میں دوڑتی پھر رہی تھی۔ شہر سے اور اس ملک سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکا بندی کی جارہی تھی۔

ایک یہودی عہدیدار نے کہا۔ ''وہ بہت ضدی ہے۔ یہ لکھ لو کہ ماتھیو بونر کی موت اٹل ہے۔ وہ اسے ہلاک کرنے کے لیے ہی یہاں سے فرار ہوا ہے۔''

پولیس کے اعلیٰ افسر نے کہا۔ ''ہم مسٹر بونر کے چاروں طرف فولادی قلعہ بن جائیں گے۔ اس کا باپ بھی ہماری مضبوط سیکیورٹی کو توڑ نہیں سکے گا۔''

''اس کا باپ کس قدر خطرناک ہے، یہ دنیا جانتی ہے۔ آپ بیٹے سے ہی نمٹ کر دکھادیں۔''

ماتھیو بونر نے اعلیٰ افسر سے کہا۔ ''آپ سیکیورٹی کے مضبوط ہونے کا دعویٰ کررہے ہیں اور وہ ابھی آسانی سے نکل بھاگا ہے۔ عقل تسلیم نہیں کرتی ہے کہ وہ نائنتھ فلور کی چھت سے کود کر فرار ہوا ہے۔''

ایک یہودی نے کہا۔ ''ہمارے پولیس افسران یہ بھول گئے تھے کہ وہ عجوبہ ہے۔ وہ اسی ملک کی آرمی کے بتیس مسلح جوانوں سے اور افسران سے تنہا لڑتے ہوئے انہیں موت کے گھاٹ اتار کر یہاں آیا ہے۔''

دوسرے یہودی نے کہا۔ ''ہمارا نیک مشورہ ہے۔ اپنے سپاہیوں کی جان کی امان چاہیں۔ درجنوں سپاہیوں کی عورتوں اور بچوں کو بیوہ اور یتیم نہ بناؤ۔ وہ ماتھیو بونر کو سزا دینا چاہتا ہے۔ اپنی ضد پوری کرکے اسے جانے دو۔ پھر وہ تمہارے ملک میں نہیں آئے گا۔ عقل سے سوچو۔ تمہارے سپاہی اس کے لیے ریت کی دیوار ہیں۔''

افسر نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ آپ اس سے رابطہ کریں۔ اسے یہاں بلائیں۔ مسٹر بونر اسے سوا لاکھ ڈالرز ادا کریں گے۔ اس کے بعد وہ ہمارے ملک سے چلا جائے گا۔''

''وہ نادان نہیں ہے کہ یہاں گرفتار ہونے آئے گا۔ آپ جرمانے کی رقم ریاست ارضِ اسلام روانہ کردیں۔''

''اس سے لین دین روبرو ہوگا۔ اسے یہاں آنے کو بولیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں۔ اسے گرفتار نہیں کریں گے۔''

''سوری۔ ہم پرنس کو یہاں آنے کا احمقانہ مشورہ نہیں دیں گے۔ وہ ہمارا سرمایہ ہے۔ ہم اس کی حفاظت کریں گے۔''

دوسرے یہودی نے کہا۔ ''اگر مسٹر بونر سمجھوتا کررہے ہیں، وہ مطلوبہ رقم ادا کرنے کے لیے راضی ہیں تو پھر کوئی جھگڑا نہیں رہے گا۔ پرنس کو گرفتار کرنے کا ارادہ ترک کردیں۔''

اعلیٰ افسر نے کہا۔ ''حقیقت یہ ہے کہ پرنس عابی ہمارے ملک میں ایک خطرناک مجرم ہے۔ اس نے ہماری آرمی کے بتیس افسران اور سپاہیوں کو ہلاک کیا ہے۔ ہم اسے گرفتار کرکے عالمی عدالت میں پیش کریں گے کیونکہ ہماری عدالت اسے سزائے موت دے گی تو مراد علی منگی ہم پر چڑھ دوڑے گا۔ ہم اس کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔ اس لیے اقوام متحدہ اور عالمی عدالت سے انصاف چاہیں گے۔ جو انصاف کا تقاضا ہے اس پر عمل کریں گے۔''

یہودی اکابرین نے بُرے وقت کے لیے اپنے شوٹر اور فائٹر تیار رکھے تھے۔ انہیں رازداری سے فون پر حکم دیا گیا کہ ایکشن میں آئیں اور ایسی واردات کریں جنہیں دیکھ کر یقین ہوجائے کہ عابی اپنے طریقۂ جنگ کے مطابق گولی چلائے بغیر پھر ایک بار ان کی موت بن رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ہی یہ خبر ملی کہ پولیس کے دو افسران ہوٹل کے ایک کمرے میں مردہ پڑے ہیں۔ وہاں آکر دیکھا گیا۔ ان پر گولیاں نہیں چلائی گئی تھیں۔ ان کے قریب شراب کی دو ٹوٹی ہوئی بوتلیں تھیں۔ ان بوتلوں سے ان پر حملہ کیا گیا تھا۔ وہ مرنے والے شراب کے نشے میں تھے۔ انہیں اپنی گن استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

سب ہی کے ذہنوں میں سوال پیدا ہوا۔ ''کیا عابی ہوٹل میں واپس آگیا ہے؟''

یہ سب ہی کہہ رہے تھے۔ ''نہیں۔ وہ مرنے کے لیے واپس ہوٹل میں نہیں آئے گا۔''

تمام بڑے ہوٹلوں میں ایمرجنسی سیڑھیاں ہوتی ہیں تاکہ ہنگامی حالات میں اپنی سلامتی کے لیے ان سیڑھیوں سے باہر نکل سکیں۔ پندرہ منٹ کے بعد چار سپاہی ان سیڑھیوں کے اوپر نیچے بے جان پڑے ہوئے دکھائی دیے۔ ان سب کے دانت ٹوٹ گئے تھے اور چہروں کی جلد پھٹ گئی تھی۔

پھر تو یقین ہوگیا کہ عابی ان سب کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے ہوٹل میں واپس آگیا ہے۔ یکبارگی افراتفری پھیل گئی۔ گراؤنڈ فلور سے ناکتھ فلور کی چھت تک تمام افسران، سپاہی اور سراغ رساں اسے تلاش کرنے لگے۔ ہوٹل کے تمام کمروں میں گھس کر ایک ایک گوشے میں اسے ڈھونڈا جا رہا تھا۔

یہودی اکابرین نے کہا۔ ''وہ چھلاوا ہے۔ گرفت میں نہیں آئے گا۔ وہ مسٹر بونر کو ہلاک کرنے کے لیے واپس آگیا ہے۔''

ماتھیو بونر خوف سے لرز رہا تھا۔ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ''آنریبل پرنس! میں ابھی رقم ادا کروں گا۔ ابھی آکر لے جاؤ یا مجھے بتاؤ اس رقم کو کہاں ٹرانسفر کرنا ہے؟''

یہودی اکابرین بھی ہوٹل کے مختلف حصوں میں جاکر کہہ رہے تھے کہ پرنس اس صنعت کار ماتھیو بونر کو معاف کردے۔ ان سے رابطہ کرے۔ وہ اسے بارڈر پار کرائیں گے اور اسے پیرس لے جائیں گے۔

ایسے ہی وقت صیہونی تنظیم کے اعلیٰ عہدیدار کے فون سے رنگ ٹون ابھری۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ ایک ربی کی آواز سنائی دی۔ ''خدائے عزوجل ہم پر مہربان ہے۔ پرنس عابی اس وقت میری پناہ میں ہے۔''

یہودی خوشی سے کھل گئے۔ ''محترم آپ بہت بڑی خوش خبری سنا رہے ہیں۔ ہم حیران ہیں۔ وہ آپ کے پاس اچانک ہی کیسے پہنچ گیا ہے؟''

''اسے ڈائنا لے کر آئی ہے۔ جب بھی پولیس یا آرمی والے ادھر آئیں گے تو پرنس سینا گوج کے تہ خانے میں چلے جائیں گے۔''

''پلیز۔ آپ پرنس سے میری بات کرائیں۔''

پھر عابی کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو۔ میں بول رہا ہوں۔ اس خبیث ماتھیو بونر سے جلد از جلد نمٹ کر پیرس جاؤں گا۔''

''آپ کی مام کی روح پیرس کے اپارٹمنٹ میں بے چین ہے۔ اپنے لاڈلے کی منتظر ہے۔ اب آپ کو بونر سے نمٹنا نہیں ہوگا۔ وہ جرمانہ ادا کررہا ہے۔ ہم سولاکھ ڈالرز آپ کے نام ارض اسلام ٹرانسفر کرادیں گے۔ پرابلم یہ ہے کہ آپ کو اس ملک کی سرحد کیسے پار کرائیں؟ آپ نے کیا سوچا ہے؟''

''میں نے سوچ لیا ہے۔ میری فکر نہ کریں۔ پہلے آپ یہاں سے پڑوسی ملک رومانیہ جائیں۔ میں اپنا راستہ بنا کر وہاں پہنچ جاؤں گا۔''

''پرنس فار گاڈ سیک، ہماری یہ بات مان لیں۔ رومانیہ پہنچنے تک ایک موبائل فون اپنے پاس رکھیں۔''

''سوری۔ یہ ضروری نہیں ہے۔ آپ ابھی بتادیں۔ مجھے کہاں سے بارڈر کراس کرنا چاہیے؟ پھر وہاں سے میں کہاں پہنچوں گا اور آپ حضرات کہاں ملیں گے؟ یہاں مالدوا اور رومانیہ کا سرحدی نقشہ رکھا ہوا ہے۔ میں آسانی سے سمجھ کر ٹھیک اس جگہ آکر آپ سے ملوں گا۔''

وہ اعلیٰ عہدیدار اسے سمجھانے لگا۔ یہ طے پایا کہ وہ یہودی اکابرین شام چھ بجے باقاعدہ پاسپورٹ کے ذریعے خشکی کے راستے رومانیہ جائیں گے۔ وہ مالدوا کے جنوب مغرب میں کومراٹ سٹی جائے گا۔ وہاں سے سرحد قریب ہے۔ وہ سرحد پار کرکے رومانیہ کے شہر برلاڈ پہنچے گا۔

مزید آدھے گھنٹے بعد اطلاع ملی کہ پولیس ہیڈکوارٹر میں تین افسران اور پندرہ سپاہی مارے گئے۔ ان کی لاشیں دیکھ کر معلوم ہوا کہ ان پر بھی گولیاں نہیں چلائی گئی تھیں۔ کسی کی ناک کی ہڈی اور دانت ٹوٹ گئے تھے۔ چہرے کی جلد پھٹ

گئی تھی۔ کسی کی گردن ٹوٹ گئی تھی اور کسی کا سر پھٹ گیا تھا۔

یہ ثابت ہوگیا کہ عابی نے تنہا یہ واردات کی ہے اور وہ چھپ کر گوریلا وار کے طریقہ کار سے جنگ لڑ رہا ہے۔ شہر میں اچانک آرمی کے ہزاروں سپاہی دندناتے آگئے تھے۔ کرفیو نافذ کردیا گیا تھا۔ بڑی سختی سے ہر گھر کی ہر عمارت کی تلاشی لی جارہی تھی۔

عابی نے ڈائنا کا فون لے کر مراد سے رابطہ کیا۔ "ہیلو بابا جانی! میں بول رہا ہوں۔ پولیس ہیڈ کوارٹر میں آپ نے لاشیں گرائی ہیں۔ اب دیکھیں کہ آرمی آگئی ہے۔ پلیز آپ خطرات مول نہ لیں۔ ویسے بھی وہ صنعت کار جرمانہ ادا کررہا ہے۔ میرا یہاں کا جھگڑا ختم ہوچکا ہے۔ میں دو گھنٹے بعد سرحد پار کر کے رومانیہ چلا جاؤں گا۔"

مراد نے کہا۔ "اگر تم پہلے ہی فون پر کہہ دیتے کہ جھگڑا ختم ہوچکا ہے تو میں ہنگامے نہ کرتا۔ بائی داوے تم تو اپنی مام کے اپارٹمنٹ میں پیرس جانے والے تھے؟"

"میں رومانیہ سے جلد ہی پیرس جاؤں گا۔ خدا کے لیے آپ واپس جائیں۔ آرام کریں۔ مجھے کوئی پریشانی ہوگی تو میں سب سے پہلے آپ کو پکاروں گا۔"

"بیٹے! تم نے الجھا کر رکھ دیا ہے لیکن یاد رکھو۔ تم ہر روز فون کرو گے۔ اگر فون پر بھی بات نہیں کرو گے تو میں پھر تمہارے پاس چلا آؤں گا۔"

عابی نے وعدہ کیا کہ وہ ہر روز اپنے بابا سے اور بابا جانی سے فون پر باتیں کرے گا۔ اس نے فون پر بابا جانی کا بوسہ لیا پھر رابطہ ختم کردیا۔ وہ یہودیوں کی عبادت گاہ سینا گوگ کے پچھلے حصے میں ڈائنا کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ربی نے آکر اپنا فون اس کی طرف بڑھا کر کہا۔ "لو۔ باتیں کرو۔ وہ لوگ یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ تم اپنا پروگرام بتاؤ۔"

صیہونی تنظیم کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے فون پر کہا۔

"ہم یہاں سے روانہ ہوچکے ہیں۔ دو گھنٹے بعد کومراٹ کے سرحدی شہر میں پہنچیں گے۔ شام سات بجے تک سرحد پار چلے جائیں گے۔ وہاں سے رومانیہ کا قریبی شہر برلاڈ ہے۔ ہم رات دس بجے تک اس شہر میں پہنچ سکیں گے۔ آپ بتائیں کس وقت سرحد پار کریں گے؟"

عابی نے کہا۔ "آپ وہاں جائیں۔ میں آرہا ہوں۔"

اس نے فون ربی کو واپس کردیا۔ ڈائنا نے کہا۔

"تمہاری یہ بری عادت ہے۔ فون اپنے پاس کیوں نہیں رکھتے؟ رومانیہ پہنچنے تک یہ تمہارے لیے ضروری ہے۔ میرا فون رکھ لو۔"

وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "ادھر بابا جانی بھی بہت ضد کررہے تھے۔ مجھ پر بھروسا کرو سسٹر! میں فون کے بغیر ہی سرحد پار کر کے اپنے اکابرین کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ میرے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"باہر فوجی تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ یہاں سے کیسے نکلو گے؟"

"میری فکر نہ کرو۔ یہاں سے مجھے کیسے جانا ہے، کہاں کہاں سے گزرنا ہے، مالدوا اور رومانیہ کا پورا نقشہ میرے ذہن میں نقش ہوگیا ہے۔"

"سرحد یہاں سے دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ کسی گاڑی کے بغیر اتنی دور کیسے جاؤ گے؟"

"میں ایک سو چالیس کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑ لگا کر پہنچ جاؤں گا اور اپنے اکابرین سے پہلے وہاں پہنچوں گا۔"

"پرنس! میں تمہیں بہت مس کروں گی۔ کیا تم مجھے یاد کرو گے؟ مجھے کبھی کال کرو گے؟"

"تم میری بہت ہی محبت کرنے والی سسٹر ہو۔ اس لیے نہ تمہیں یاد کروں گا، نہ کال کروں گا۔"

اس نے گھور کر دیکھا۔ عابی نے ہنستے ہوئے اس کے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں میں لیا پھر پیشانی کو چوم کر بولا۔ "میں یہاں سے جاتے ہی تمہیں اپنے پاس بلاؤں گا۔ وہاں اپارٹمنٹ میں مام کی تصویروں سے کہوں گا کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ مام کی ایک بیٹی بھی ہے۔ میری پیار کرنے والی بہن ہے۔"

وہ خوش ہوکر عابی کے گلے لگ گئی۔ بے شک وہ بڑی محبتیں دے رہی تھی۔ اس نے بڑی بہن کی حیثیت سے اسے ایک خفیہ پناہ گاہ میں پہنچایا تھا۔ آئندہ اس کی سلامتی کے لیے دن رات ایک کرسکتی تھی۔ وہ اس کے لیے جان لڑا رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ یہودیوں پر بھروسا کر کے ان کی سوسائٹی اور ان کے ماحول میں رہنے والا تھا۔ جس دن وہ یہودیوں سے پھر جاتا۔ شاید اس دن یہودی بہن کی محبت بھی دم توڑ دیتی۔

شاید وہ سچی اور کھری تھی۔ اس لیے کہ عابی نے اس کے باپ کو ہلاک نہیں کیا تھا اور اسے یتیم ہونے سے بچا لیا تھا۔ شاید وہ اپنے بھائی کی غیر معمولی صلاحیتوں پر دل سے فخر کررہی تھی۔ تمام یہودی مکار اور بے ایمان نہیں ہوتے۔ آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ وہ بہن ہے یا بہروپیا ہے۔

وہ ربی سے رخصت ہوکر ڈائنا کو دونوں بازوؤں میں

اٹھا کر عبادت گاہ سے باہر آیا پھر اسے زمین پر اتار کر بولا۔ ”تم مجھے بہت چاہتی ہو نا...؟“

وہ اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر بولی۔ ”میرے پہاڑ جیسے ننھے منے بھائی! مجھ سے نہ پوچھو اور مجھ پر بھروسا بھی نہ کرو۔ میں یہودی ہوں۔ مجھے چپ چاپ آزماتے رہو۔“

اس نے بہن کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر کہا۔ ”میں مسلمان ہوں۔ تمہارے مزاج کے خلاف یہ نہیں کہوں گا کہ مسلمان بہن بن جاؤ لیکن ایک مسلمان بھائی کی زبان سے تمہیں آپی کہا کروں گا۔“

اچانک ہی ڈائنا کا اجلا گلابی چہرہ یوں تمتمانے لگا جیسے اس کی طرف کھنچی جا رہی ہو۔ پھر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ آنسو آتے آتے ٹھہر گئے تھے۔ عابی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ”بھائی! پیچھے دروازے پر ربی کھڑے ہیں۔ میں کچھ زیادہ بول نہیں سکوں گی۔ کان قریب لاؤ۔“

وہ اس کے چہرے کے قریب جھک گیا۔ ربی دور کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا۔ دل میں کہہ رہا تھا۔ ”جیو ڈائنا... اتم بڑی کامیابی سے ٹریپ کر رہی ہو۔“

ڈائنا نے اس کے کان میں کہا۔ ”میرے بھائی...! میں تمہیں اس طرح گرفتار کرنا چاہتی ہوں کہ تمام عمر تم میری گرفت سے نہیں نکل سکو گے۔ لو میرے دل کی آواز سنو۔“ اس نے کلمہ پڑھا۔

یہ کلمہ تو کسی بھی مسلمان کو لوٹ لیتا ہے۔ عابی ایک یہودی بہن کے منہ سے اعتراف توحید سن کر خوشی سے پاگل ہو گیا۔ اس نے کبھی کسی عورت کو اپنے قریب نہیں آنے دیا تھا۔ کسی لڑکی کو اجازت نہیں دی تھی کہ وہ اسے ہاتھ لگائے۔ اس وقت اس نے بے اختیار اسے سینے سے لگا کر اس کی پیشانی کو چوم لیا۔

وہ بولی۔ ”تم کسی یہودی کو نہیں، اپنی مسلمان بہن کو آپی کہا کرو گے۔ لیکن عابی یہ بھید ابھی نہ کھولنا۔ ورنہ یہ لوگ مجھے تم سے دور کر دیں گے اور مجھے زندہ بھی نہیں رہنے دیں گے۔“

”میں حالات سازگار ہونے تک اپنی بہن کو دل میں چھپا کر رکھوں گا۔“

ادھر ربی خوشی کے مارے ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ فون پر یہودی اکابرین سے کہہ رہا تھا۔ ”ہاں، ہاں۔ یقین کریں۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ پرنس.... اسے سینے سے لگا کر اسے چوم رہا تھا۔ ابھی وہ چلا جائے گا تو میں ڈائنا سے آپ حضرات کی بات کراؤں گا۔“

وہ دوسری طرف کی باتیں سننے کے بعد بولا۔ ”ہاں۔ یہی کہنا چاہیے۔ ڈائنا نے کمال کیا ہے۔ آپ لوگوں کے مقابلے میں چھکا مارا ہے۔“

پھر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ پرنس وہاں سے جا چکا تھا۔ ڈائنا عبادت گاہ میں واپس آ رہی تھی۔ ربی نے مسرتوں بھری ایک سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”وہ جا چکا ہے۔ یہ آ رہی ہے۔ میں ابھی بات کراتا ہوں۔“

وہ دروازے سے اندر آئی تو اس نے بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”خدا تمہیں لمبی عمر اور سلامتی دے۔ تم تو پرنس کے دل میں گھس گئی ہو۔ میں دیکھ رہا تھا۔ وہ تمہیں سینے سے لگا کر چوم رہا تھا۔ مرد ایک بار پھسل جائے تو پھر پھسلتا ہی چلا جاتا ہے۔ لو... اپنے اکابرین سے باتیں کرو۔“

اس نے فون اس کی طرف بڑھایا۔ وہ جھینپ رہی تھی۔ پریشان ہو رہی تھی۔ اس نے فون لے کر اسے کان سے لگایا پھر بولی۔ ”ہیلو...!“

دوسری طرف سے ایک اعلیٰ عہدیدار کی فاتحانہ چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”زبردست ڈائنا...! تمہیں صیہونی تنظیم کی وی آئی پی بنا لیا جائے گا۔ تم کو اور تمہارے ماں باپ کو زندگی کی تمام سہولتیں حاصل ہوتی رہیں گی۔ یہ رومانٹک گیم جاری رکھو۔“

وہ الجھ رہی تھی۔ اس کے اکابرین بھائی بہن کے رشتے کو اپنی نیت اور اپنے مقاصد کے مطابق سمجھ رہے تھے اگر وہ وضاحت کرتی تو اسے سر پر چڑھانے والے ٹھوکروں میں اڑا دیتے۔ یہ کبھی نہ مانتے کہ وہ بہن بن کر پرنس کے لیے ہمیشہ اہم رہے گی۔ اہمیت صرف بدن کی سوغات دیتے رہنے والی کی ہوتی ہے اگر وہ بھائی بہن کے مقدس رشتے پر قائم رہنے کی بات کرتی تو اسے عابی سے دور رکھ کر جوانی کا سحر پھونکنے والیوں کو پرنس کے قریب پہنچایا جاتا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بھائی کی معصومیت اور شرافت سے کھیلا جائے۔

وہ بولی۔ ”جناب عالی! میں پرنس سے دور نہیں رہنا چاہتی۔ کیا ان سے فون پر رابطہ رکھ سکتی ہوں؟“

”رابطہ ضرور رہنا چاہیے۔ دن رات رہنا چاہیے۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟“

"ایک اور بات کہنا چاہتی ہوں۔ان کے ساتھ پیرس کے اپارٹمنٹ میں رہنا چاہتی ہوں۔"

"یہ تو ہم پہلی فرصت میں چاہتے ہیں لیکن تمہیں ماں باپ کو چھوڑ کر اس کے ساتھ رہنا ہوگا۔"

"آپ جو حکم دیں گے میں تعمیل کروں گی۔"

"شاباش...اسفر کی تیاری کرو۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔اس نے فون بند کرکے عبادت گاہ کے دروازے کے باہر دیکھا پھر دل میں کہا۔"میرے منے بھیا...!عجیب حالات پیدا ہوگئے ہیں۔تمہاری آپی کو ڈبل رول پلے کرنا ہوگا۔"

☆☆☆

ڈوبتی ہوئی شام کی ملگجی روشنی میں شہر ویران تھا۔ کرفیو کے باعث نہ گاڑیاں تھیں، نہ پیدل چلنے والے تھے۔یہ حکم سنایا گیا تھا کہ پرنس عابی کے گرفتار ہونے تک کوئی گھر سے باہر نہ نکلے اور وہ نکل آیا تھا۔

سینا گوج سے بہت دور آنے تک کسی نے اسے نہیں دیکھا۔سڑکوں پر فوجی گاڑیاں گشت کررہی تھیں۔ایک گاڑی اسے دیکھتے ہی رک گئی۔اسے صورت سے وہی لوگ پہچانتے تھے جنہوں نے اسے ہوٹل میں دیکھا تھا۔اس شہر میں سب ہی اسے نہیں پہچانتے تھے۔

دو سپاہیوں نے گاڑی سے اتر کر اسے نشانے پر رکھتے ہوئے پوچھا۔"ہالٹ۔کون ہو تم؟"

عابی نے فضا میں چھلانگ لگائی۔گولیاں چلیں لیکن اس نے ہوا میں قلابازی کھاتے ہوئے ان دونوں کے سروں پر دو پاؤں رکھے تو اس کے وزن سے گردنیں جھک گئیں۔وہ زمین پر گر کر اپنے اپنے سروں کو تھام کر تڑپنے لگے۔

وہ گاڑی کی چھت پر آگیا تھا۔تمام سپاہی پھرتی سے باہر آتے ہوئے چیخ رہے تھے۔"یہ وہی ہے۔یہ وہی ہے۔گولی مارو۔زخمی کرو۔اسے زندہ پکڑو۔"

گولیاں چلنے لگیں۔اس سے پہلے ہی وہ گاڑی کی چھت سے چھلانگیں مارتا ہوا شوٹنگ رینج سے دور نکل گیا تھا۔انہوں نے اس کے پیچھے دوڑ لگائی لیکن وہ رینج سے باہر تھا۔ایک ہی چھلانگ میں سو میٹر سے آگے نکل جاتا تھا۔

پھر وہ اونچی چھلانگ لگا کر ایک عمارت کی چھت پر پہنچ گیا۔وہاں پہنچتے ہی آگے بھاگتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ایسے وقت اور دو فوجی گاڑیاں آگئی تھیں۔سب ہی چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔"وہ ایک چھت سے

دوسری تیسری چھتوں پر جائے گا۔ ان عمارتوں کے دائیں بائیں اور پیچھے چلو۔"

وہ گاڑیاں دوڑانے لگے۔ فون کے ذریعے مزید فوجیوں کو طلب کرنے لگے۔ اونچی عمارتوں کا ایک سلسلہ تھا۔ وہ تمام گاڑیاں ایک آدھ کلومیٹر کے چکر لگا کر اس سلسلے کے اختتام تک پہنچتی تھیں۔ بڑی مشکلات تھیں۔ ادھر سے عمارتوں کا دوسرا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

وہ اسی طرح دوڑ لگاتے ہوئے سرحدی شہر کومراٹ پہنچنے والے تھے۔ ان سے بہت پہلے ہی وہ پہنچ گیا۔ اس شہر سے گزر کر سرحدی تار کانٹوں کی طرف آیا۔ سرحد کے دونوں طرف ان ملکوں کے فوجی بڑی مستعدی سے ڈیوٹی پر تھے۔ خشکی کے راستے رومانیہ جانے والوں کے کاغذات دیکھ رہے تھے۔ ان کے سامان چیک کر رہے تھے۔

یہودی اکابرین کی گاڑیاں بھی چیکنگ کے مراحل سے گزر کر رومانیہ میں داخل ہو گئی تھیں۔ اس وقت رات کی تاریکی پھیل گئی تھی۔ سرچ لائٹ کی روشنی سے سرحدیں روشن تھیں لیکن وہ روشنیاں ایک حد تک تھیں۔ اس کے بعد رات کا اندھیرا تھا۔ ذرا دور تک فوجی گاڑیاں گشت کر رہی تھیں۔

عابی ایک ویران اور تاریک مقام سے تار کانٹوں کو پھلانگ کر ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچ گیا۔ ایسے وقت نہ کوئی گاڑی گشت کرتی ہوئی آئی تھی اور نہ ہی وہ سرچ لائٹ کے بغیر تاریکی میں دیکھا جا سکتا تھا۔

وہ اسی کلومیٹر فی گھنٹے کے حساب سے دوڑتا ہوا اس پختہ سڑک پر آ گیا جہاں یہودی اکابرین کی گاڑیاں رکی ہوئی تھیں۔ وہ ربی کے فون نمبر پر رابطہ کر رہے تھے۔ انہیں جواب مل رہا تھا کہ پرنس عابی وہاں سے جا چکا ہے اور ان کے پاس پہنچنے والا ہے۔

پھر ایک نے چیخ کر کہا۔ "وہ دیکھو۔"

گاڑی کی ہیڈ لائٹس دور تک سڑک کو روشن کر رہی تھیں اور عابی بیچ سڑک پر دونوں ہاتھ کمر پر رکھے کھڑا تھا۔

وہ سب خوشی سے چیخ پڑے۔ گاڑیوں سے نکل کر دوڑتے ہوئے اس کے پاس آ گئے۔ اسے اٹھا کر اپنے کاندھوں پر بٹھا کر گاڑیوں تک لے جانا چاہتے تھے۔

پہلے دو افراد نے اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ پھر اٹھانے والے چار ہو گئے۔ وہ جوں کا توں خاموش کھڑا تھا۔ انہیں یوں لگ رہا تھا کہ ایک آہنی ستون زمین میں گڑا ہوا ہے۔

وہ ہانپنے لگے۔ ایک نے کہا۔ "تم پر خدا کی رحمت ہو۔ پہاڑ کو کوئی اٹھا نہیں سکتا۔ آؤ گاڑی میں بیٹھو۔"

وہ ایک گاڑی کی پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ قافلہ وہاں سے آگے چل پڑا۔ انہوں نے آگے جا کر قیام کرنے کے لیے برلاڈ شہر کا انتخاب کیا تھا۔ اس شہر میں یہودیوں کی آبادی زیادہ تھی۔ وہ جنگِ عظیم اول سے وہاں آباد ہوتے آئے تھے۔ ان کی ایک طویل تاریخ تھی کہ انہوں نے بدلتے ہوئے حالات میں ذلتیں اٹھائی تھیں۔ جان و مال کی قربانیاں دی تھیں۔ آج وہ پوری دنیا کی معیشت پر چھائے ہوئے تھے۔

برلاڈ شہر میں ان کے بڑے بڑے کارخانے، ملیں اور فیکٹریاں تھیں۔ وہاں گیہوں کی فصل زیادہ ہوتی ہے۔ ان کی کئی فلور ملز تھیں اور گیہوں کو برآمد کرنے کے لائسنس بھی ان یہودیوں کے پاس تھے۔

وہ تقریباً آدھی رات کو وہاں پہنچے۔ یہ خبر پہلے پہنچا دی گئی تھی کہ مایہ ناز یہودی شہزادی جینیفر عرف جینی کا فرزند پرنس عابد علی منگی عرف عابی آ رہا ہے۔ اس کا استقبال کرنے کے لیے پورے شہر میں چراغاں کیا گیا تھا۔ جہاں نظر جاتی تھی وہاں جلتے بجھتے رنگا رنگ قمقمے دکھائی دے رہے تھے۔

وہ شہر میں داخل ہوا تو ہزاروں رائفلوں سے ہوائی فائر ہونے لگے۔ تاریک آسمان پر آتش بازی کا مظاہرہ ہونے لگا۔

شہر میں داخل ہوتے ہی اسے ایک کھلی اسپورٹس کار میں بٹھایا گیا تھا۔ مقامی ٹی وی چینل کے کیمرا مین اسے ٹی وی اسکرین پر لائیو پیش کر رہے تھے۔ تمام مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے اس خوبرو پرنس کو دیکھ رہے تھے۔

کمنٹری کرنے والا کہہ رہا تھا۔ "ہمارے پیشوائے اعظم کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی ہے۔ دجالِ معظم سے پہلے ان کا یہ نمائندہ ہمارے معاشی اور سیاسی استحکام کے لیے آیا ہے۔ یہودی ماؤ! فخر کرو کہ پرنس عابد علی منگی کو ایک یہودی ماں نے جنم دیا ہے۔ آپ اس بھرپور گبرو جوان کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ ابھی صرف گیارہ برس کا ہے۔ یہ بات ناقابلِ یقین ہے۔ لیکن کسی شک و شبہے کے بغیر درست ہے۔"

ایک محل نما بنگلے میں اس کی رہائش کے انتظامات کیے گئے تھے۔ انہوں نے راستے میں رات کا کھانا کھایا تھا۔ اس لیے عابی نے پرتکلف کھانوں سے انکار کر دیا۔ وہ تھکنا نہیں جانتا تھا۔ لیکن تنہا رہنے کے لیے کہہ دیا کہ آرام کرنا چاہتا ہے۔

تمام اکابرین اس سے رخصت ہو گئے۔ اس کی

خدمت کرنے کے لیے حسین کنیزیں اور خدام رہ گئے۔ اس نے حکم دیا۔ ”جب تک میں کال نہ کروں کوئی میرے دروازے پر نہ آئے۔ میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کروں گا۔“

وہ دروازے کو اندر سے بند کر کے ایک الماری کو کھول کر دیکھنے لگا۔ وہاں کئی ریڈی میڈ ملبوسات رکھے ہوئے تھے۔ وہ ایک سادہ سا لباس لے کر باتھ روم میں چلا گیا۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر اس نے عشا کی نماز ادا کی۔ پھر وہاں رکھے ہوئے فون کے ذریعے مراد سے باتیں کیں۔ ”بابا جانی! میں رومانیہ کے ایک شہر برلاڈ میں خیریت سے ہوں۔“

مراد نے کہا۔ ”بیٹے! وہ شہر یہودیوں کا گڑھ ہے۔ میں تمہیں کوئی نصیحت نہیں کروں گا۔ یہ یقین کامل ہے کہ میرا بیٹا جان سے جائے گا، ایمان سے کبھی نہیں جائے گا۔ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ یہودیوں کی اصل ہسٹری جس حد تک معلوم کر سکتے ہو، کرتے رہو۔“

”بابا جانی! میں یہی کروں گا۔ یہاں تمام یہودی بہت خوش ہیں اور میرے متعلق کچھ زیادہ ہی خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ میں فی الحال ان کا دل نہیں دکھاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے بیٹے! بہت رات ہو چکی ہے۔ بہت لمبے سفر سے آئے ہو، آرام کرو اور سو جاؤ۔“

وہ تھوڑی دیر کے بعد ہی لائٹ آف کر کے سو گیا۔

☆☆☆

سیکرٹ فورس کا ایک جاں نثار اچانک ہی بیمار ہو گیا تھا۔ اسے ایک اسپتال میں داخل کیا گیا۔ مراد نے دو جاں نثاروں کو وہاں رکنے کے لیے کہا۔ باقی وفاداروں کو ریاست میں واپس جانے کا حکم دیا۔ وہ چلے گئے۔ اس وقت رات کی تاریکی پھیل گئی تھی۔ جو شدید بخار اور نزلے میں مبتلا تھا، اس کی طبیعت سنبھل رہی تھی۔ امید تھی کہ صبح تک صحت بحال ہو جائے گی۔ مراد اسپتال کے قریب ہی ایک ہوٹل میں رات گزار رہا تھا۔ وہ عابی سے دور ہو کر پریشان تھا۔ بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔

ابھی تک اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ عابی کو اتنی کم عمری میں دشمنوں کے درمیان چھوڑ دے۔ یہ مسئلہ بھی پریشان کر رہا تھا کہ پاسپورٹ اور ضروری کاغذات کے بغیر ایک ملک سے دوسرے ملک نہیں جا سکے گا۔

رات کے تقریباً ایک بجے ایک جاں نثار نے آ کر کہا۔ ”فوراً اسپتال کے پیچھے مردہ خانے کی طرف چلیں۔ وہاں سے لاشیں چرائی جا رہی ہیں۔“

وہ فوراً ہی ریوالور کو لباس میں چھپا کر اس کے ساتھ تیزی سے ادھر جانے لگا۔ جاں نثار کہہ رہا تھا۔ ”میں بڑی دیر سے وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں چار افراد تھے۔ ان میں ایک مردہ خانے کا چوکیدار تھا۔ وہ آپس میں کسی بات پر بحث کر رہے تھے۔ پھر ایک شخص نے اپنی جیب سے دو کرنسی نوٹ نکال کر دیے۔ دوسرا شخص اسپتال کے احاطے سے باہر جا کر ایک گاڑی لے آیا۔ اس گاڑی کے پچھلے حصے کو کھولا گیا تو وہاں برف کی بڑی بڑی سلیں رکھی ہوئی تھیں۔ میں تاریکی میں چھپ کر دیکھ رہا تھا اور وہ تاریکی سے فائدہ اٹھا کر مردہ خانے کے اندر سے ایک لاش اٹھا کر گاڑی کے پچھلے حصے میں لے آئے تھے۔“

مراد اس کی باتیں سنتا ہوا مردہ خانے کے سامنے پہنچ گیا۔ اس وقت وہ دوسری لاش کو گاڑی کے پچھلے حصے میں برف کی سل پر رکھ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر سہم گئے۔

مراد نے ریوالور نکال کر پوچھا۔ ”کیا ہو رہا ہے؟ ان لاشوں کو کہاں لے جا رہے ہو؟“

ایک نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ہم ان کے لواحقین کے گھروں میں پہنچانے جا رہے ہیں۔“

مراد نے کہا۔ ”میں بھی چلوں گا۔ دیکھوں گا کہ آدھی رات کے بعد مُردے کہاں ٹرانسفر کیے جا رہے ہیں؟“

ایک نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”آپ کون ہیں؟ ہمیں جانے دیں۔ ہم نے چوکیدار کو دو ہزار روپے ہیں۔ آپ کو بھی دیں گے۔ پلیز ہمیں جانے دیں۔“

”میں رقم نہیں لوں گا۔ جانے دوں گا۔ سچ سچ بتاؤ انہیں کہاں پہنچانے جا رہے ہو؟“

”ہم انہیں سرحد پار رومانیہ لے جائیں گے۔“

مراد نے اپنے جاں نثاروں کو دیکھا۔ ایک نے کہا۔ ”سر! آپ بھی وہیں جانا چاہتے تھے۔ راستہ کھل رہا ہے۔“

مراد نے ان سے پوچھا۔ ”سرحد کیسے پار کرو گے؟“

وہ بولا۔ ”وہاں معاملات طے ہو چکے ہیں۔ ہمیں کوئی نہیں روکے گا۔ پلیز آپ ہمیں نہ روکیں۔“

مراد نے کہا۔ ”ایک ہی شرط پر جا سکو گے۔ مجھے سرحد پار جانا ہے۔ میں بھی ساتھ چلوں گا۔“

وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے پھر ایک نے کہا۔ ”ہم اکثر سرحد پار جاتے ہیں۔ ہمارے آقا نے صرف تین بندوں کی پیمنٹ وہاں کی ہے۔ ہم تین ہیں، سرحدی چوکی میں چوتھے کو روک دیا جائے گا۔“

ایک جاں نثار نے کہا۔ ”ہم تم میں سے ایک کو گولی مار دیں گے۔ اس کے بعد تین کی گنتی پوری رہے گی۔“

ایک نے سہم کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”پولٹو! تو یہاں رہ جا۔ ہم اسے ساتھ لے جائیں گے۔“

وہ بولا۔ ”مجھے گولی نہیں کھانی ہے۔ اسے لے جاؤ۔“

مراد نے جاں نثار سے کہا۔ ”تم جاؤ۔ صبح ہمارے ساتھی کو اسپتال سے چھٹی مل جائے گی، اس کے ساتھ ریاست میں واپس چلے جاؤ۔“

پھر اس نے پوچھا۔ ”تم لوگ بارڈر پار کہاں جاؤ گے؟“

ایک نے کہا۔ ”ہمیں برف پگھلنے سے پہلے برلاڈ پہنچنا ہے۔ یہ لاشیں تازہ ہیں۔ انہیں تازہ رکھنا ہے۔“

مراد ڈرائیو کرنے والے کے ساتھ اگلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ دوسرا شخص پچھلے حصے میں لاشوں کے پاس چلا گیا۔ پھر گاڑی وہاں سے چل پڑی۔ وہ ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔ ”ہم اپنے پاس اسلحہ نہیں رکھتے ہیں۔ بارڈر پولیس چھین لیتی ہے۔“

”کیا وہ تمہاری تلاشی لیتے ہیں؟“

”نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ہمارے پاس اسلحہ نہیں ہوتا لیکن تم نئے ہو۔ وہ تم پر شبہ کریں گے۔“

”میں سیٹ کے نیچے چھپا دوں گا۔ ان سے کیا کہو گے کہ میں کون ہوں؟“

”میں کہوں گا، تیسرا ساتھی بیمار ہے۔ اس لیے نئے ساتھی سے کام لے رہے ہیں۔ ہمارے آقا کا بڑا ہولڈ ہے۔ وہ ہمیں نہیں روکیں گے۔“

”کون ہے تمہارا آقا؟“

”ہم نے کبھی اسے دیکھا نہیں ہے۔ اسے بگ ہنٹر کہا جاتا ہے۔ وہ زندہ اور مردہ انسانوں کا شکاری ہے۔ ہم اس کے لیے یہ دو مردہ شکار لے جا رہے ہیں۔ وہ ہمیں اچھی پیمنٹ کرتا ہے اور قانون کے محافظوں سے بھی بچائے رکھتا ہے۔“

مراد نے کہا۔ ”میں سمجھ گیا۔ وہ انسانی آنکھیں، دل اور گردے نکال کر فروخت کرتا ہے۔“

اس نے کہا۔ ”ہماری دنیا میں دولت کمانے کے عجیب اور خوفناک دھندے ہیں۔ یہ سائنسی ترقی کا دور ہے۔ اب انسان کو مرنے کے بعد قبروں میں پھینکا نہیں جاتا۔ اس کے جسم کے ایک ایک عضو کی تجارت کی جاتی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ انسانی جسم کی کھالوں اور ہڈیوں سے بھی منافع کمایا جاتا ہے۔“

مراد کی دلچسپی بڑھ گئی۔ اس نے پوچھا۔ ”شہر پہنچ کر ان لاشوں کو کہاں پہنچاؤ گے؟“

”اس شہر کے مضافات میں فزیشن اینڈ سرجن کا ایک بہت بڑا انسٹیٹیوٹ ہے۔ اس عمارت کے احاطے میں کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ وہاں صرف بڑے تجربہ کار ڈاکٹرز اور ان کے معاونین طبی معاملات میں ریسرچ کرتے ہیں۔“

”تم ان لاشوں کی ڈیلیوری کیسے دیتے ہو؟“

”وہاں کا سیکیورٹی افسر ہمیں پہچانتا ہے لیکن بہت سخت ہے۔ ہمیں احاطے میں داخل ہو کر صرف مردہ خانے تک جانے کی اجازت دی جاتی ہے۔ ہم لاشوں کو وہاں پہنچا کر اپنی گاڑی احاطے سے باہر لے آئیں گے۔“

”کیا فوراً واپس چلے جاتے ہو یا اس شہر میں رہتے ہو؟“

”اس انسٹیٹیوٹ سے کچھ دور ماتحت ورکرز کے لیے رہائشی کوارٹرز بنے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک کوارٹر میں ہم دو چار دن رہتے ہیں پھر واپس چلے جاتے ہیں۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ وہاں رہوں گا۔ یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ میرے خلاف کسی سے کچھ بولو گے یا وہاں کے سیکیورٹی گارڈز مجھے گرفتار کرنا چاہیں گے تو اس سے پہلے ہی تم دونوں کو گولی مار دوں گا۔“

وہ رات کے تین بجے برلاڈ پہنچے۔ شہر میں داخل ہونے سے پہلے ہی فزیشن اینڈ سرجن انسٹیٹیوٹ کی عمارت تھی۔ وہ اس کے احاطے کے باہر دائیں طرف مڑ کر مین گیٹ پر پہنچے۔ انہیں وہاں رکنے کا حکم دیا گیا۔ ایک اور گاڑی اندر گئی ہوئی تھی۔ جب وہ ایک لاش کی ڈیلیوری دے کر باہر آئی۔ تب انہیں اندر جانے کی اجازت دی گئی۔ احاطے میں مدھم سی روشنی تھی۔ اندھیری رات میں وہ عمارت بہت پراسرار لگ رہی تھی۔

گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ ایک جونیئر ڈاکٹر اور دو مسلح گارڈز نے گاڑی کے پچھلے حصے میں آ کر ان دو لاشوں کا معائنہ کیا۔ یہ دیکھا جاتا تھا کہ لاشیں کس حالت میں ہیں۔ انہیں مردہ خانے میں بھیجنا ہے یا فوراً آپریشن تھیٹر میں پہنچانا ہے؟

جونیئر ڈاکٹر نے کہا۔ ”انہیں مردہ خانے میں لے جاؤ۔“

گاڑی اسٹارٹ ہو کر عمارت کے ایک طرف سے گھوم کر مردہ خانے میں پہنچ گئی۔ مراد ان دونوں کے ساتھ گاڑی کے پچھلے حصے کو کھول کر ان لاشوں کو مردہ خانے کے اندر لے جانے والا تھا۔ ایسے ہی وقت وہ سب چونک گئے۔

عمارت کے اندر سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ رات کی خاموشی میں وہ آواز ایک بم دھماکے کی طرح گونجی تھی۔

باہر چار مسلح گارڈز ہوتے تھے۔ ان میں سے دو اندر تھے۔ باقی دو بھی دوڑتے ہوئے جانے لگے۔ مراد کے اعصاب تن گئے۔ ایک گولی کی آواز سنتے ہی اس کے اندر کا خطرناک شوٹر بڑبڑا کر بیدار ہوگیا تھا۔

باہر کوئی گن مین نہیں رہا تھا۔ وہاں صرف چار مسلح گارڈز تھے وہ اندر چلے گئے تھے۔ وہ بھی دوڑتا ہوا دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ رات کے پچھلے پہر میں وہ عمارت ویران تھی۔ اندر کوئی ملازم بھی نہیں تھا۔ وہ دوڑتا ہوا ایک وسیع برآمدے سے گزرتا ہوا ایک بڑے ہال میں پہنچا۔ اس ہال کے دائیں بائیں دو بڑے دروازے تھے۔ ایک دروازے پر آپریشن تھیٹر لکھا ہوا تھا۔

اسی وقت اندر سے فائر کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی کسی نے چیخ کر کہا۔ ”اپنی گن پھینک کر سامنے آجاؤ۔ یہاں سے زندہ نہیں جاسکو گے۔“

پھر ایک گولی چلی تو بولنے والے کے حلق سے کراہ نکلی۔ پھر شاید وہ ہمیشہ کے لیے بولنا بھول گیا۔ اسی وقت آپریشن تھیٹر کا بڑا سا دروازہ ایک دھڑاکے سے کھلا۔ ایک ڈاکٹر اور دو گارڈز دوڑتے ہوئے باہر آئے۔ وہ چھپنے کے لیے ادھر ادھر بھٹک رہے تھے۔ دونوں گارڈز نے دو بڑی مشینوں کے پیچھے پناہ لی۔ ڈاکٹر پناہ لینے کے لیے بھاگ رہا تھا۔ اچانک ہی فائرنگ کی آواز کے ساتھ اچھل کر فرش پر گر پڑا۔

اس کے ایک پاؤں میں گولی لگی تھی۔ دونوں گارڈز مشینوں کے پیچھے محفوظ تھے۔ ان میں سے ایک مشین کے اوپر مراد سکڑ کر لیٹا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی رائفلوں کا رخ آپریشن تھیٹر کے دروازے کی طرف کرتے ہوئے کسی کو للکارا۔ ”ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں، تم یہاں سے زندہ نہیں جاسکو گے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”تم مردہ بن کر ہمیں دھوکا دے کر یہاں تک پہنچ گئے ہو۔ اب مردہ ہی رہو گے۔“

مراد کسی حد تک سمجھ رہا تھا۔ ان پر عذاب بن کر آنے والا شخص کوئی جاسوس ہوگا، یا ان کا دشمن ہوگا۔ ان کی پراسرار خفیہ تجارت کا راز معلوم کرنے آیا ہوگا۔ بات یہی تھی۔ ان کا ایک جانی دشمن اس عمارت کے اندر گھس آیا تھا۔ اندر کوئی آنہیں سکتا تھا۔ آبھی جائے تو یہ معلوم نہیں کرسکتا تھا کہ آدھی رات کے بعد وہاں کیا ہوتا ہے۔

مراد جس گاڑی میں آیا تھا، اس سے پہلے ایک اور گاڑی کسی کی لاش لے کر آئی تھی۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق وہ لاش تازہ تھی۔ اس کا دل نکال کر میڈیکل پروسس کے مطابق اسے محفوظ کیا جاسکتا تھا۔ اس کی دونوں آنکھیں اور دونوں گردے بھی فوراً ہی نکالے جاسکتے تھے۔

اس لاش کو اسی وقت آپریشن تھیٹر کے بیڈ پر لاکر رکھا گیا تھا۔ چیر پھاڑ کے لیے تمام ضروری چھریاں اور قینچیاں لاکر رکھی گئی تھیں۔ ایسے ہی وقت اس لاش نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر ایک چھری اٹھا کر چھلانگیں مارتا ہوا ایک گارڈ کے پاس پہنچ گیا تھا۔

اس نے حیرانی اور پریشانی کے چند لمحات میں کام دکھایا۔ ایک گارڈ کے بازو میں چھری گھونپ کر اس کی گن چھین کر ایک بڑے فریزر کے پیچھے چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ایک گولی چلائی تو دوسرا گن مین مارا گیا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ دو مسلح گارڈز جو باہر تھے، وہ دوڑتے ہوئے آگئے تھے۔

اندر فائرنگ کے باعث ایک جونیئر ڈاکٹر مارا گیا تھا۔ اس زندہ ہونے والے شخص نے کہا۔ ”ڈاکٹر! میں تمہیں زندہ رکھوں گا۔ تم تحریری بیان دو گے کہ یہاں مرنے والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے...... انکار کرو گے، بیان نہیں دو گے تو حرام موت مارے جاؤ گے۔“

زخمی ہونے والے گارڈ نے چیخ کر کہا۔ ”اپنی گن پھینک کر سامنے آجاؤ۔ یہاں سے زندہ نہیں جاسکو گے۔“

پھر ایک گولی چلی تو اس زخمی کے حلق سے کراہ نکلی۔ وہ ہمیشہ کے لیے بولنا بھول گیا۔ اس کا انجام دیکھ کر ڈاکٹر اور دو گارڈز بھاگتے ہوئے آپریشن تھیٹر سے باہر آئے۔ وہاں مراد ایک مشین کے اوپر سکڑا ہوا لیٹا ان کی بھاگ دوڑ کا اور ان کی زندگی اور موت کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ ان کی باتیں سن کر اندازہ کر رہا تھا کہ وہاں اب تک کیا ہوتا رہا ہے۔

ڈاکٹر کے ایک پیر میں گولی لگی تھی۔ وہ فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ دروازے کے پیچھے چھپے ہوئے شخص کے نشانے پر تھا۔ وہاں سے ہل نہیں سکتا تھا۔ دو گارڈز مشینوں کے پیچھے زندہ سلامت تھے۔ اسے للکار رہے تھے کہ اسے زندہ نہیں جانے دیں گے۔

وہ بھی ایک پکا کھلاڑی تھا۔ ان کی کمزوریوں کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”اگر تم دونوں میرے سامنے ہتھیار نہیں پھینکو گے تو میں ڈاکٹر کو گولی ماردوں گا۔“

ایک نے کہا۔ ”مار ڈالو۔ دوسرے ڈاکٹرز آجائیں گے۔ لیکن تم یہاں کا راز باہر نہیں لے جاسکو گے۔“

ڈاکٹر نے غصے سے چیخ کر گارڈز کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا بکواس کر رہے ہو؟ مجھے مار ڈالنے کو کہہ رہے ہو؟ کیا میری خدمات کا یہی صلہ ہے؟"

گارڈ نے کہا۔ "سوری ڈاکٹر! تمہاری جان سے زیادہ یہاں کا راز اہم ہے۔ تم زندہ رہو گے تو یہ تم سے زبردستی تحریری بیانی لکھوائے گا۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اسے مار ڈالیں یا پھر وہ تمہیں مار ڈالے گا۔ جو ہوتا ہے ہونے دو۔ ہم اسے کسی قیمت پر یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔"

مراد نے دیکھا کہ وہ شخص آپریشن تھیٹر کے اندر قیدی بن گیا تھا۔ باہر نہیں نکل سکتا تھا اور وہ گارڈز اپنے آقا کے راز دار تھے۔ ڈاکٹر کی زندگی کو بھی داؤ پر لگا کر وہاں کے خفیہ دھندے کا چرچا باہر ہونے سے روک رہے تھے۔

وہ دونوں سمجھ رہے تھے کہ مشینوں کے پیچھے محفوظ ہیں۔ مراد نے باری باری دونوں کا نشانہ لے کر گولیاں چلائیں۔ دونوں کو زخمی کیا تو ان کے ہاتھوں سے رائفلیں چھوٹ کر فرش پر پہنچ گئیں۔ اس نے اوپر نیچے بیٹھے وارننگ دی۔ "خبردار! اپنے ہتھیاروں کو نہ اٹھانا۔ پیچھے سے نکلو اور اس جیالے کے سامنے ہو جاؤ۔"

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے ڈگمگاتے ہوئے اس ہال کے وسط میں آگئے۔ اس شخص نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟ اچانک کہاں سے آگئے ہو؟"

مراد نے کہا۔ "تمہاری طرح ایک لاش بردار گاڑی میں آیا ہوں۔ میں بھی یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ دھندا کون کر رہا ہے اور اس کی جڑیں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں؟"

وہ آپریشن تھیٹر کے دروازے کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ اپنی گن سنبھالتا ہوا پیچھے سے نکل کر سامنے ہال میں آگیا۔ وہ ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔ سر کے اور ڈاڑھی کے بالوں میں سفیدی آگئی تھی لیکن وہ بوڑھا ہونے کے باوجود کمزور نہیں تھا۔ خاصا صحت مند دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے مراد کو دیکھ کر کہا۔ "شکریہ جوان! تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔ ان لوگوں نے میرے جوان بیٹے کی لاش غائب کر دی ہے۔ میں یوکرائن میں تھا۔ میرا بیٹا یہاں کار کے حادثے میں مارا گیا تھا۔ میں یہاں پہنچا تو معلوم ہوا اس کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے یہاں لایا گیا تھا۔"

اس نے غصے سے ڈاکٹر اور گارڈز کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے یہاں آکر پوچھا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ میرے بیٹے کی لاش یہاں نہیں لائی گئی تھی۔ میں یوکرائن میں ایک ریٹائرڈ پولیس افسر ہوں۔ وہاں سنا تھا کہ رومانیہ کے اس شہر میں انسانی اعضا کو فروخت کرنے کا دھندا ہوتا ہے۔"

وہ بڑے کرب سے بولا۔ "مجھے پورا یقین تھا کہ میرے بیٹے کے جسمانی اعضا فروخت کیے گئے ہیں۔ میں نے ایک شناسا ڈاکٹر کو اپنے اعتماد میں لیا۔ بیمار ہو کر اس کے اسپتال میں پہنچا اور اس ڈاکٹر کو اپنا راز دار بنا کر مر گیا۔ اس نے میری موت کا سرٹیفکیٹ لکھ دیا۔

"میں حبس دم کا ماہر ہوں۔ حسب ضرورت معائنے کے وقت سانس روکتا رہا۔ چونکہ یہاں میرا کوئی عزیز رشتے دار نہیں ہے۔ اس لیے میری لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے یہاں ان کتوں کے پاس بھیج دیا گیا۔ میں نے یہاں کئی بار آنے کی کوششیں کی تھیں اور مجھے احاطے کے اندر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ میں ابھی مردہ بن کر آیا تھا اب ان زندہ درندوں کی اصلیت معلوم کر رہا ہوں۔ یہ سیکیورٹی گارڈز ایک درندے آقا کے غلام ہیں۔ یہ اس دھندے کی تفصیل کبھی نہیں بتائیں گے۔ اس لیے انہیں حرام موت مرنا چاہیے۔ ان کے جسمانی اعضا بھی ان کا آقا فروخت کر دے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے دونوں کو دو گولیوں میں اوپر پہنچا دیا۔ ڈاکٹر بری طرح سہما ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "مجھے نہ مارو۔ وعدہ کرو زندہ رہنے دو گے تو میں تحریری بیان دوں گا۔"

اس بوڑھے نے کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں۔ تمہیں ہلاک نہیں کروں گا۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں، میرے بیٹے کی آنکھیں، دل اور گردے کہاں پہنچائے گئے ہیں؟"

ڈاکٹر فرش سے اٹھ کر لنگڑاتا ہوا ایک میز کے پاس آکر بیٹھ گیا پھر اپنے نام کے لیٹر پیڈ پر لکھنے لگا۔ "میں فزیشن اینڈ سرجن انسٹیٹیوٹ کا ڈاکٹر اینڈرسن پورے ہوش و حواس میں رہ کر کسی کے دباؤ میں آئے بغیر یہ اعتراف کر رہا ہوں کہ برلاڈ کے فزیشن اینڈ سرجن انسٹیٹیوٹ سے در پردہ انسانی اعضا کے فروخت کا خفیہ کاروبار ہوتا ہے۔

"مجھ جیسے چار سینئر اور چھ جونیئر ڈاکٹر یہاں آنے والی لاشوں کو چیر پھاڑ کر ان کے دل، گردے اور آنکھیں نکال لیتے ہیں۔ مرنے کے بعد بھی انسانی کھال اور ٹشوز کو ڈینٹل سرجری اور بون میرو کے معاملات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر لوگ وصیت لکھ دیں تو موت کے بعد ان کے اعضا کسی زندہ ضرورت مند کو عطیے کے طور پر دیے جاتے ہیں پھر بعد از مرگ ان کے اعضا کو جسم سے نکال کر کسی دوسرے

کے جسم میں منتقل کرنا جرم نہیں ہے بلکہ نیکی ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ آنکھوں کا عطیہ دینے سے ایک اندھے کو بینائی مل جاتی ہے۔ جس کا دل ناکارہ ہوجائے اسے مرنے والے کا دل ایک نئی زندگی دیتا ہے۔ انسانی ٹشوز گوشت کو ہڈیوں کے ساتھ جوڑے رکھتے ہیں۔ جسم کے اندر پھیلی ہوئی مختلف رگوں کو ان کی جگہ قائم رکھتے ہیں۔ مردہ انسان کی کھالیں اور ٹشوز بھی زندہ انسانوں کو صحت اور توانائی دیتی ہیں۔ طبی سائنس کا یہ پہلو نہایت ہی بندہ پرور ہے۔

"لیکن... اس تصویر کا دوسرا بھیانک رخ یہ ہے کہ مرنے والے اپنے جسمانی اعضا کا عطیہ دیں یا نہ دیں، ان کی لاشوں کو چور راستوں سے حاصل کرلیا جاتا ہے۔ انسانی اعضا کی تجارت بہت ہی منافع بخش ہے۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لیے اکثر زندہ انسانوں کو اغوا کرکے ان کے دل، گردے اور آنکھیں نکال کر فروخت کی جاتی ہیں اور ایسے تاجر قانون کی گرفت میں نہیں آتے۔ اس لیے کہ فزیشن اینڈ سرجن انسٹیٹیوٹ جیسے بے شمار ادارے بظاہر بڑے نیک نام ہوتے ہیں۔ یہی کہا جاتا ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی میں اپنے جسمانی اعضا کا عطیہ دیتے ہیں صرف ان کے اعضا قانون کے مطابق دوسرے مریضوں میں ٹرانسفر کیے جاتے ہیں۔ کبھی یہ انکوائری نہیں ہوتی کہ وہ اعضا عطیات کے ذریعے آئے ہیں یا چور راستوں سے؟ میں نے اس ادارے کے مالک کو کئی بار دیکھا ہے۔ سب اسے بگ ہنٹر کہتے ہیں۔ اس کا نام ڈی جان ہنٹر ہے۔ وہ لنگڑا کر چلتا ہے کیونکہ اس کے ایک گھٹنے کی مرمت بون میرو کے ذریعے کی گئی ہے۔ اس کا ایک گردہ بھی اپنا نہیں ہے۔ کسی مُردے کا ہے اور وہ کسی مردے کی آنکھوں سے دنیا کو دیکھ رہا ہے۔ دیکھا جائے تو وہ مرچکا ہے لیکن چند مُردوں نے اس خبیث کو زندہ رکھا ہے۔ ہم مُردوں کو کچھ دے تو نہیں سکتے۔ آخری وقت ان کی قبروں پر پھول بچھاتے ہیں اور گلاب کا عرق چھڑکتے ہیں۔ ڈی جان ہنٹر بھی مردہ ہوکر خوشبوؤں کا دلدادہ ہے۔ اس لیے خوشبوؤں کے شہر پیرس میں رہتا ہے۔ کبھی اہم ضرورت کے وقت یہاں آجاتا ہے۔ میں اس کا صحیح پتا ٹھکانا جانتا تو یہاں لکھ دیتا۔ ویسے وہ شیطان کی طرح مشہور ہے۔ اس کے دروازے تک آسانی سے پہنچا جاسکتا ہے۔ ایک ہفتہ پہلے سلمان نامی ایک نوجوان کار کے حادثے میں ہلاک ہوگیا تھا۔ اس کی لاش کسی کاغذی کارروائی کے بغیر یہاں پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجی گئی تھی۔ چونکہ اس لاش کا کوئی دعویدار نہیں تھا۔ اس کے تمام جسمانی اعضا نکال کر میڈیکل پروسس کے ذریعے انہیں محفوظ کردیا گیا۔ پھر یہ اعضا کہاں بھیجے جاتے ہیں، میں نہیں جانتا اور نہ ہی مجھے کبھی بتایا گیا ہے۔ اس انسٹیٹیوٹ کا منتظم اعلیٰ ڈیوڈ فرنانڈو ہے۔ وہ بہت کچھ جانتا ہے اور یہیں برلاڈ شہر میں رہتا ہے۔ میں جس حد تک جانتا ہوں۔ وہ سب یہاں لکھ چکا ہوں۔ مزید معلومات ڈیوڈ فرنانڈو سے حاصل کی جاسکیں گی۔"

ڈاکٹر نے اس تحریری بیان کے نیچے اپنے دستخط کرکے تاریخ لکھ کر اس بوڑھے شخص سے کہا۔ "یہ میرا تحریری بیان ہے اگر تم وعدے کے مطابق زندہ چھوڑ دو گے تو آئندہ کبھی قانون کے خلاف انسانی جسم کی چیر پھاڑ اور سرجری نہیں کروں گا اور یہ انسٹیٹیوٹ چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

اس شخص نے پوچھا۔ "میرے بیٹے کے اعضا نکالنے کے بعد اس کا باقی جسم کہاں گیا؟"

وہ بولا۔ "میں اپنا کام کرنے کے بعد یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ میں نے کہا نا کہ یہاں کے منتظم اعلیٰ ڈیوڈ فرنانڈو سے بہت کچھ معلوم کرسکو گے۔"

وہ بوڑھا تھکے ہوئے انداز میں بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ بولا۔ "وہ میرا ایک ہی بیٹا تھا۔ مرنے کے بعد اس کے ساتھ کیسی درندگی کی گئی ہے۔ سب کچھ تو منڈی میں فروخت ہوچکا ہوگا۔ اب کیا بچا ہوگا؟ میں اس کا منہ نہیں دیکھ سکوں گا۔ کبھی معلوم نہیں کرسکوں گا کہ وہ کن زندہ انسانوں کے وجود میں جاکر چھپ گیا ہے۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مراد نے کہا۔ "تمہیں جو زخم لگے ہیں۔ ان کا کوئی مرہم نہیں ہے۔ تمہیں صبر کرنا ہوگا۔"

وہ ڈاکٹر کو دیکھ کر غصے سے بولا۔ "اس ذلیل کے ہاتھوں نے میرے معصوم بچے کے ٹکڑے، ٹکڑے کیے ہیں۔ جی چاہتا ہے اس کے بھی ٹکڑے، ٹکڑے کردوں۔ لیکن میں نے زبان دی ہے کہ اسے ہلاک نہیں کروں گا۔ میں مسلمان ہوں۔ زبان سے نہیں پھروں گا۔ یا اللہ...! میں کیا کروں؟ انتقام لیے بغیر مجھے سکون نہیں ملے گا۔"

ڈاکٹر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "ایک طرح سے سکون حاصل ہوجائے گا۔ مجھے تھوڑی سی مہلت دو۔ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھو اور دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔ اس کے بعد بھی سکون نہ ملے تو مجھے قتل کردینا۔"

وہ وہاں سے ایک سمت جانے لگا۔ مراد اور وہ بوڑھا

اس کے پیچھے چلنے لگے۔ اس نے عمارت کے باہر ایک گیراج میں آکر پیٹرول کے دو کین اٹھائے۔ پھر عمارت کے اندر آکر اس کے ایک ایک حصے میں پیٹرول چھڑکتے ہوئے بولا۔ ''جب یہ انسٹیٹیوٹ ہی نہیں رہے گا تو کوئی ڈاکٹر یہاں آکر قصائی نہیں بنے گا۔ آج کے بعد یہاں سے منافع خوری ختم ہوجائے گی۔''

بوڑھے نے اس کے تحریری بیان کو تہ کرکے رکھ لیا تھا۔ پھر ماچس کی ایک تیلی نے آگ بھڑکا دی۔ وہ تینوں باہر آگئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے بھیانک شعلے اس پوری عمارت سے باہر آکر آسمان کی طرف لپکنے لگے۔

وہ تینوں وہاں سے دور چلے آئے۔ بوڑھے نے ڈاکٹر سے کہا۔ ''مجھے ایک ذرا تسلی ہورہی ہے۔ تم اس جگہ کو جلا کر راکھ کررہے ہو، جہاں میرے بیٹے پر ظلم کیا گیا تھا۔ جاؤ یہاں سے بھاگ جاؤ پھر کبھی میرے سامنے نہ آنا۔''

وہ سر جھکا کر وہاں سے چلا گیا۔ اس بوڑھے نے مراد سے کہا۔ ''تم میری مدد کو نہ آتے تو وہ مجھ پر غالب آجاتے۔ مجھے مار ڈالتے۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں یہاں سے جارہا ہوں۔ اس ملک میں کبھی نہیں آؤں گا۔''

وہ بھی سر جھکا کر چلا گیا۔ مراد جن کے ساتھ گاڑی میں آیا تھا وہ کہیں چلے گئے تھے۔ اس عمارت سے بھڑکنے والے شعلے آسمان کی طرف لپک رہے تھے۔ آس پاس کے علاقوں میں شور اٹھ رہا تھا۔ سونے والے جاگ رہے تھے اور جلتی ہوئی عمارت کی طرف دوڑے آرہے تھے۔ مراد وہاں سے دور ہوتا چلا گیا۔

وہ شہر انجانا تھا۔ اس نے ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک بی کلاس ہوٹل میں کمرا کرائے پر لیا۔ موبائل فون کی گھڑی نے بتایا کہ فجر کی نماز کا وقت ہورہا ہے۔ وہ وضو کرکے نماز کے لیے کھڑا ہوگیا۔

عابی محل نما بنگلے میں تھا۔ وہ بھی نماز ادا کررہا تھا۔ اس روز شہر کے تمام لوگ منہ اندھیرے اٹھ بیٹھے تھے۔ یہ خبر مل رہی تھی کہ فزیشن اینڈ سرجن انسٹیٹیوٹ کی وسیع و عریض عمارت جل کر کھنڈر ہورہی ہے۔ فائر بریگیڈ کا عملہ آگ بجھا رہا تھا۔ سب ہی ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ وہاں آگ کیسے لگی ہے؟ کس نے لگائی ہے؟

ان سوالات کا جواب دینے والے گولیاں کھا کر وہاں مردہ پڑے تھے۔ عابی کو نماز کے بعد ایک ملازم نے آگ لگنے کی اطلاع دی۔ اسے اس عمارت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کر مراد کے نمبر پنچ کیے۔ وہ جانتا تھا کہ بابا جانی نماز سے فارغ ہوگئے ہوں گے۔

اس نے فون پر نمبر پنچ کیے تو رابطہ نہ ہوسکا۔ ملک اور شہر بدلنے سے کوڈ نمبر بدل چکا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ ''شاید بابا جانی ریاست میں واپس چلے گئے ہیں۔''

اس نے ریاست کے کوڈ نمبر پنچ کیے پھر بھی رابطہ نہ ہوا۔ دماغ میں بات آئی۔ ''بابا جانی بہت ضدی ہیں۔ وہ واپس نہیں گئے ہیں۔ میرا پیچھا کررہے ہیں۔''

اس نے شہر برلاڈ کے کوڈ نمبر پنچ کیے تو دوسری طرف بیل کی آواز جانے لگی۔ پھر مراد کی آواز سنائی دی۔ ''اللہ کا شکر ہے۔ تمہیں باپ کی پریشانیوں کا خیال رہتا ہے۔''

اس نے کہا۔ ''السلام علیکم۔''

مراد نے کہا۔ ''وعلیکم السلام۔ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ یہاں آگیا ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''آپ کی خوشبو مل جاتی ہے۔ آپ تو اپنی ریاست میں واپس جانے والے تھے۔ آپ نے کہا تھا میرا پیچھا نہیں کریں گے۔''

''تم اپنی ضد سے مجبور ہوکر مجھ سے دور بھٹک رہے ہو۔ میں اپنے دل سے مجبور ہوکر تمہارے پیچھے آرہا ہوں۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ یہودیوں کا شہر ہے۔ یہاں عیسائی اور دوسرے مذاہب کے لوگ بہت کم ہیں۔ مسلمان تو شاید ہیں ہی نہیں۔ میں نے دور سے بھی اذان کی آواز نہیں سنی ہے۔ یہاں ایک بھی مسجد نہیں ہوگی۔''

''آپ نے ایک بار کہا تھا۔ مسجد کے معنی ہیں سجدے کی جگہ۔ لہٰذا مسلمان جہاں سجدہ کرتا ہے وہ جگہ مسجد ہوجاتی ہے۔ یہودیوں کا یہ بنگلا جہاں میں ہوں یہ میرے لیے مسجد بن گیا ہے۔ ابھی میں نے سکون سے دو رکعت سنت اور دو رکعت فرض کے سجدے کیے ہیں۔''

''خوش رہو بیٹے سلامت رہو۔ تم نے سنا ہوگا کہ یہاں ایک عمارت میں آگ لگی ہے۔''

''جی ہاں۔ ایک ملازم نے مجھے بتایا ہے۔''

وہ عابی کو اس عمارت کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ پھر اس نے کہا۔ ''انسانی اعضا کی تجارت سری لنکا میں بھی ہوتی ہے لیکن وہاں سے مجرمانہ طریقہ کار کی رپورٹ کبھی موصول نہیں ہوئی۔ عیسائی ممالک میں بھی یہ کاروبار ہوتا ہے لیکن یہ بات سب سے اہم ہے کہ پوری دنیا کے کسی بھی اسلامی ملک میں یہ غیر انسانی تجارت نہیں ہوتی ہے اگرچہ اس کے کئی فوائد ہیں۔ بیمار اور لاچار انسانوں کو نئی

زندگی ملتی ہے۔ لیکن ان فوائد کے پیچھے منافع خوری جرائم کو ہوا دیتی ہے۔ انسانی اعضا کے عطیات سے دوسروں کو ضرور نئی زندگی ملنی چاہیے۔ لیکن ایسے کاروبار پر قانون کی گرفت بہت ہی کمزور ہے۔"

"بابا جانی! مجھے یہ نئی معلومات حاصل ہو رہی ہیں۔"

"ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟ دنیا دیکھنے نکلے ہو تو آئندہ اور نئی عجیب وغریب معلومات حاصل ہوتی رہیں گی۔ فی الحال یہ سمجھو کہ یہودی اس لعنتی تجارت میں پیش پیش ہیں۔ یہ انسٹیٹیوٹ جو جل کر راکھ ہو رہا ہے، اس کے کرتا دھرتا تمہارے میزبان یہودی ہیں۔ یہ ایک عمارت کا نقصان برداشت کرلیں گے۔ کیونکہ موجودہ معلومات کے مطابق ان کا ہیڈ آفس پیرس میں ہے۔ اس تجارتی ادارے کی کئی شاخیں کئی ملکوں میں ہوں گی۔ جو یہ کاروبار چلا رہا ہے اس کا نام ڈی جان ہنٹر ہے۔"

مراد اسے معلومات فراہم کر رہا تھا۔ "اس انسٹیٹیوٹ کے منتظم اعلیٰ کا نام ڈیوڈ فرنانڈو ہے۔ وہ اسی شہر میں رہتا ہے۔ وہ اس تجارت کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ اس سے تمام معلومات اگلوا سکتے ہو۔"

"ان کا ہیڈ آفس میری مام کے شہر میں ہے۔ میں اس غیر انسانی تجارت کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کروں گا۔ بائی دا وے، آپ ابھی کہاں ہیں؟"

"میں ایک معمولی سے ہوٹل کے کمرے میں ہوں۔"

"اور میں ایک پُرآسائش بنگلے میں ہوں۔ یہ مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"

"بیٹے! ہم دونوں گھر سے بے گھر ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ کہاں کہاں بھٹکنا ہے اور کن حالات سے گزرتے رہنا ہے۔ آئندہ ہو سکتا ہے کہ میں کسی پُرآسائش محل میں پہنچ جاؤں اور تم کسی جھونپڑی میں پڑے رہو۔ تب مجھے بھی اچھا نہیں لگے گا۔ لیکن برداشت کرنا ہوگا۔"

"بابا جانی! کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ ہم ساتھ رہ سکیں۔"

"ساتھ رہنے سے اندیشہ ہے۔ باپ بیٹے کا رشتہ ظاہر ہو جائے گا۔ پھر بھی ہم کوشش کریں گے۔ کوئی ایسی سچویشن پیدا کریں گے کہ کسی کو شبہ نہیں ہوگا۔ ہم ایک دوسرے کے یار و مددگار نہیں سمجھے جائیں گے۔"

انہوں نے فون بند کر دیا۔ اور اپنی اپنی جگہ سر جھکا کر سوچنے لگے۔

☆☆☆

عمارت کے اندر اور باہر آگ ایسی لگی تھی کہ بجھائے نہیں بجھ رہی تھی۔ فائر بریگیڈ والوں نے مسلسل چھ گھنٹوں تک عرق ریزی کرنے کے بعد عمارت کو ٹھنڈا کیا۔ سب ہی نے بڑے دکھ سے دیکھا۔ وہاں جلی ہوئی سیاہ دیواروں اور چھتوں کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔

میڈیکل کے تمام اوزار اور لاکھوں ڈالرز کی مشینیں ناکارہ ہوگئی تھیں۔ آگ ائیر کنڈیشنڈ تہ خانے تک پہنچی تھی۔ وہاں انسانی اعضا طبی پروسس کے مطابق بڑی حفاظت سے رکھے جاتے تھے۔ وہ سب تباہ ہوگئے تھے۔

پولیس اور انٹیلی جنس والوں نے وہاں ایک جونیئر ڈاکٹر اور چار گارڈز کی لاشیں دیکھیں۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ انہیں گولیاں ماری گئی تھیں۔ اس کے بعد ان کی لاشیں جل گئی تھیں۔ اس طرح یہ رائے قائم کی جا رہی تھی کہ کسی نے باقاعدہ پلاننگ کے تحت وہاں جاکر قتل کرنے اور آگ لگانے کی واردات کی ہے۔

کس نے ایسا کیا ہے؟ وہاں کون آیا تھا؟ وہ ایک ہی تھا یا کئی تھے؟ اس انسٹیٹیوٹ کے دشمن کہاں سے پیدا ہو گئے تھے؟ ان سوالات کے جوابات مشکل سے ہی ملنے والے تھے۔ کسی کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہاں ایک اور سینئر ڈاکٹر تھا۔ اسی نے آگ لگائی تھی۔ وہ ایک خاموش تماشائی کی طرح وہاں موجود تھا۔

ڈیوٹی پر حاضر ہونے والا رجسٹر بھی جل گیا تھا۔ اس لیے ثابت نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ واردات کے وقت وہاں موجود تھا اور اسی نے پیٹرول چھڑک کر آگ لگائی تھی۔

یہودی اکابرین پریشان ہو گئے تھے۔ انہوں نے انسٹیٹیوٹ کے منتظم اعلیٰ ڈیوڈ فرنانڈو کو بلا کر کہا۔ "آگ ایسے وقت لگی ہے جب ہم پرنس جانی کو یہاں لائے ہیں۔ تمہیں بہت محتاط رہنا ہے۔ پرنس کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہاں انڈر گراؤنڈ کیا ہوتا رہا ہے۔ دوسرے ڈاکٹروں پر اعتماد ہے کہ وہ بھید نہیں کھولیں گے پھر بھی ان پر کڑی نظر رکھو۔"

ان اکابرین میں سے ایک نے فون پر پوچھا۔

"پرنس کہاں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟"

"سر! وہ ناشتے کی میز پر ہیں۔"

"کیا وہ جلنے والی عمارت کے متعلق کچھ پوچھ رہے تھے؟"

"نو سر! میں نے انہیں یہ خبر سنائی تھی کہ آج فزیشن اینڈ سرجن انسٹیٹیوٹ کی عمارت میں آگ لگ گئی ہے۔ انہوں نے اس خبر کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ فون پر کسی سے

باتیں کرنے میں معروف رہے تھے۔"

"کیا باتیں کر رہے تھے؟"

"سر! وہ انڈین فلموں والی زبان میں بول رہے تھے۔ میں انڈین فلمیں شوق سے دیکھتا ہوں۔ مگر وہ کیا بولتے ہیں' یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

وہ ملازم کی باتوں سے سمجھ گیا کہ بیٹا اپنے باپ مراد علی منگی سے ہندی یا اردو زبان میں باتیں کر رہا تھا۔ ان کی معلومات کے مطابق مراد اس وقت اپنی ریاست میں تھا۔

اس نے کہا۔"پرنس سے بات کراؤ۔"

تھوڑی دیر بعد رابطہ ہو گیا۔ اس کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو آپ کون ہیں؟"

"میں آپ کا میزبان ہوں۔ مالدوا سے آپ کے ساتھ آیا ہوں۔ میرا نام کریگ ہوسٹن ہے۔ کیا آپ وہاں آرام سے ہیں' کسی چیز کی کمی تو نہیں ہے؟"

"شکریہ مسٹر ہوسٹن! میں آرام سے ہوں۔ میری ہر ضرورت پوری ہو رہی ہے۔ اب اس چار دیواری سے نکل کر اس شہر کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"بے شک آپ کو آؤٹنگ کے لیے نکلنا چاہیے۔ میں گاڑی لے کر آرہا ہوں۔ آپ سے ایک گزارش ہے۔"

"فرمائیے کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"آپ کی مام یہاں دوبار آچکی ہیں۔ جب بھی آتی تھیں تو اپنے مذہبی پیشوا ربی آرتھر کے پاس پہلے جاتی تھیں اور ان کے ہاتھ کو بوسہ دیتی تھیں۔"

"آپ آجائیں۔ میں پہلے وہاں ضرور جاؤں گا' جہاں مام جایا کرتی تھیں۔"

کریگ ہوسٹن نے فون بند کر کے دوسرے اکابرین سے کہا۔"وہ ماں کا دیوانہ ہے۔ جو ماں کرتی رہی ہے' وہی یہ بھی کرتا رہے گا۔"

ایک نے کہا۔"جو ماں کا مذہب ہے' وہ مذہب قبول کر لے تب ثابت ہو گا کہ ماں کا دیوانہ ہے۔"

ہوسٹن نے کہا۔"رفتہ رفتہ ضرور قبول کرے گا۔ اپنی پیاری پیاری مام کی طرح کٹر یہودی بنے گا۔ یہ دجال معظم کا نمائندہ ہے۔ ہماری قوم کے لیے دنیا میں آیا ہے۔ یہ لوح مقدر میں لکھا ہے۔ یہ ہمارا ہی ہو کر رہے گا۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا۔"میں جا رہا ہوں۔ آپ ربی کو اطلاع دیں کہ پرنس ایک گھنٹے کے اندر آرہا ہے۔"

وہ اس بنگلے سے باہر آکر ایک کار میں بیٹھ گیا۔ ڈیوڈ فرنانڈو اپنے کان سے فون لگائے تیزی سے چلتا ہوا آیا پھر بولا۔"پیرس سے کال ہے۔ ڈی جان ہنٹر بول رہے ہیں۔"

ہوسٹن نے فون لے کر اسے کان سے لگا کر کہا۔

"ویل مسٹر ہنٹر! ہمیں اندازہ ہے۔ آپ کو صدمہ پہنچ رہا ہوگا۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ آگ کس نے لگائی ہے۔"

ادھر سے ڈی جان ہنٹر نے گرجتے ہوئے کہا۔

"میرے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔ غصے کی یہ آگ نہیں بجھے گی۔ یہ کن کتوں نے میری طرف منہ اٹھا کر بھونکنے کی جرأت کی ہے۔ میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میرے وہ دشمن شام تک گرفتار نہیں ہوں گے تو میں وہاں آؤں گا اور سانپوں کو ان کے بل سے نکال لاؤں گا۔"

"نو مسٹر ہنٹر! یہاں آنے کی غلطی نہ کرنا۔ ہم یہاں پرنس جابی کو لائے ہیں۔ اسے آپ کے دھندے کی ذرا سی بھی بھنک ملے گی تو آپ کے ساتھ ہم بھی بے نقاب ہو جائیں گے۔ پلیز اپنے غصے کو کنٹرول کریں۔ میں ابھی بہت ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ پھر کسی وقت آپ کو کال کروں گا۔"

اس نے فون بند کر کے ڈیوڈ فرنانڈو کو دیتے ہوئے دوسرے اکابرین کو دیکھا پھر کہا۔"مسٹر ہنٹر پاگل ہو رہے ہیں۔ ان سے اسکائپ پر رابطہ کریں۔ انہیں کسی طرح ٹھنڈا کرتے رہیں۔ یہاں نہ آنے دیں۔"

وہ کار اسٹارٹ کر کے ڈرائیو کرتا ہوا جابی کے پاس آگیا۔ وہ لان میں ٹہل رہا تھا۔ کار کی اگلی سیٹ پر اس کے برابر آکر بیٹھ گیا۔ وہ کار وہاں سے چل پڑی۔ کریگ ہوسٹن نے کہا۔"ہم اپنے مذہبی پیشوا کی ہر ہدایات پر سر جھکا کر عمل کرتے ہیں۔ آپ ایک یہودی ماں کے فرزند ہیں۔ آپ سے توقع ہے کہ آپ ہمارے ربی کی ہدایات پر عمل کریں گے اور ان کے ساتھ عبادت کریں گے۔"

"بے شک میں ان کی نیک ہدایات پر عمل کروں گا۔ ان کے ساتھ عبادت بھی کروں گا۔ وہ اپنے طریقے سے عبادت کریں گے' میں اپنے طریقے سے نماز پڑھوں گا۔"

"پلیز آنر ایبل پرنس! ہماری عبادت گاہ میں نماز نہیں پڑھی جاتی ہے۔"

"کوئی بات نہیں' نماز نہیں پڑھوں گا۔ آپ کے طریقوں سے عبادت بھی نہیں کروں گا۔ ربی کی جو ہدایات قابل قبول ہوں گی' ان پر ضرور عمل کروں گا۔"

"کیا آپ کی مام جو کرتی تھیں' وہ نہیں کریں گے؟ وہ اپنے طریقوں سے عبادت کرتی تھیں۔"

"اس لیے کہ وہ ایک یہودی باپ کی بیٹی تھیں۔ میں مسلمان باپ کا بیٹا ہوں۔ اگر وہ زندہ ہوتیں تو میں انہیں جبراً نماز پڑھنے کے لیے نہ کہتا۔ وہ جو کہتیں، میں مان لیتا۔ اپنی ماں کے لیے جان دے دیتا لیکن ان کے آنچل کی چھاؤں میں نماز کبھی نہ پڑھتا۔"

ایسا صاف اور سیدھا جواب تھا کہ ہوسٹن کا منہ لٹک گیا۔ وہ دل میں کہنے لگا۔ "او گاڈ! بڑی محنت کرنی ہوگی۔ اس لڑکے کو کنورٹ کرنے میں بڑا وقت لگے گا۔"

کار سینا گوگ کے احاطے میں داخل ہو کر ہرے بھرے باغیچے سے گزرتی ہوئی صدر دروازے کے سامنے رک گئی۔ وہ کار سے باہر آئے۔ عبادت گاہ کے خادم نے ان کے لیے صدر دروازے کو کھولا۔ اندر اے سی کی ٹھنڈک تھی۔ ربی آرتھر ایک اونچی سی شاہانہ طرز کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

کریگ ہوسٹن نے اس کے سامنے آ کر گھٹنے ٹیک دیے۔ عبرانی زبان میں ربی کی عظمت کا قصیدہ پڑھتے ہوئے اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ پھر ہتھیلی کی پشت کا بوسہ لیتے ہوئے بولا۔ "محترم ربی! یہ ہیں ہماری جینیفر کے فرزند آنز ایبل پرنس عابد علی منگی۔"

عابی نے سر جھکا کر کہا۔ "آداب...!"

ربی نے مسکرا کر کہا۔ "خوش رہو۔ سلامت رہو۔"

وہ ذرا اور قریب ہو کر بولا۔ "میں نے سنا ہے، میری ماں آپ کے پاس آتی تھیں۔ پلیز مجھے بتائیں، وہ آپ کے کس ہاتھ کو تھام کر چوم لیتی تھیں؟"

ربی نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ عابی نے بڑی عقیدت سے اس ہاتھ کو تھام کر اپنی پیشانی سے لگایا۔ پھر ہتھیلی کی پشت کو چوم کر آنکھیں بند کر لیں۔ اپنی ماں کو بند آنکھوں کے پیچھے دیکھنے لگا۔

ربی نے کہا۔ "جینی اگرچہ ماڈلنگ کرتی تھی لیکن اس کا دل اور دماغ اپنے دین کی طرف لگا رہتا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔ نیک کام کرنے کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے؟ میں نے کہا تھا۔ تم پر خدا کی رحمت ہو۔ جو بیمار ہیں، ان کا علاج کرانا، جو اندھے ہیں، انہیں کہیں سے آنکھوں کا عطیہ دلانا۔ دل اور گردوں کے ٹرانسپلانٹیشن سے بے شمار لوگوں کو نئی زندگی دینا بہت بڑی نیکی ہے۔ تمہاری ماں کا دل انسان کی سلامتی اور انسانیت کی بہتری کے لیے دھڑکتا رہتا تھا۔ اس نے ایک لاکھ ڈالرز دے کر کہا تھا کہ اس کے بعد بھی رقم دیتی رہے گی۔ اس رقم سے دل، گردے اور آنکھیں خرید کر ضرورت مندوں کو دی جائیں۔ وہ انسانوں سے محبت کرنے والی ایک رحم دل لڑکی تھی۔ اس نے دو ماہ بعد مزید ایک لاکھ ڈالرز ارسال کیے تھے۔ ہمارا دین اپنی ذات سے زیادہ دوسروں سے محبت کرنا اور ان کے کام آنا سکھاتا ہے۔ جینی دینی احکامات پر عمل کرتی تھی اور دوسروں کے کام آتی رہتی تھی۔"

"مجھے فخر ہے کہ میں انسانیت کی خدمت کرنے والی ماں کا بیٹا ہوں لیکن افسوس کہ میری ماں کی نیک دلی اور معصومیت سے کھیلا گیا ہے۔ انہیں دھوکا دیا گیا ہے۔"

ربی نے اور کریگ ہوسٹن نے اسے چونک کر دیکھا۔ ربی نے کہا۔ "میرے بچے! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "انسانی اعضا کی پیوند کاری ایک اچھا طریقہ کار ہے۔ اس کے ذریعے بیمار اور مفلوج انسانوں کو ایک نئی زندگی ملتی ہے۔ لیکن انسانی اعضا کو حاصل کرنے کے سلسلے میں جرائم پرورش پا رہے ہیں۔ عطیات کے ذریعے صرف پانچ فیصد اعضا حاصل ہوتے ہیں۔ باقی پچانوے فیصد جرائم کے چور راستوں سے حاصل کیے جاتے ہیں۔"

ہوسٹن نے کہا۔ "او نو پرنس! یہ انتہائی نیکیاں کمانے والی تجارت ہے۔ میرا خیال ہے، کسی نے آپ کو اس تجارت کے خلاف بھڑکایا ہے۔"

"مجھے کون بھڑکائے گا؟ جب کہ میں کسی سے ملتا نہیں ہوں۔ صرف اپنے بابا جانی سے فون پر باتیں کرتا ہوں۔ آج جس انسٹیٹیوٹ کو آگ لگائی گئی ہے، وہاں مختلف شہروں سے اور مختلف ملکوں سے لاشیں چرا کر لائی جاتی تھیں یا زندہ انسانوں کے علاج کے دوران انہیں بے ہوش کر کے ان کے دل، آنکھیں اور گردے نکال لیے جاتے تھے۔"

"آنز ایبل پرنس! یہ جھوٹ ہے۔ ہمارے انسٹیٹیوٹ میں ایسا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ آپ کو غلط فہمی..."

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "جہاں میں پہنچتا ہوں وہاں جھوٹ کو آگ لگ جاتی ہے۔ یہ آگ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔"

ان کے منہ حیرت سے کھل گئے۔ ان کے کچھ کہنے سے پہلے عابی نے کہا۔ "آپ نہ پوچھیں کہ اس انسٹیٹیوٹ کے راز ہائے نہاں کیسے جانتا ہوں اور نہ ہی میں کبھی بتاؤں گا۔ بس مجھے افسوس ہے۔ یہ صدمہ ہے کہ میری ماں دھوکا کھاتی رہیں۔ عطیات کے طور پر دیے ہوئے ان کے دو لاکھ ڈالرز سے ناجائز کاروبار کو فروغ حاصل ہوتا رہا۔"

اتنا کہہ کر وہ ربّی اور ہوسٹن کی طرف سے منہ پھیر کر جانے لگا۔ کریگ ہوسٹن تیزی سے چلتا ہوا اس کے پیچھے آیا۔ عابی نے اس کے ساتھ کار میں بیٹھ کر کہا۔ ''مجھے انسانی اعضا کی تجارت کرنے والوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں کوئی بات نہ کریں۔ میں آج کا یہ دن اور یہ رات اس شہر میں گزاروں گا۔ آپ کل تک مجھے پیرس پہنچا دیں۔''

''ہم آپ کا پاسپورٹ اور ضروری کاغذات تیار کرا رہے ہیں۔ پھر آپ قانون کے مطابق ایک ملک سے دوسرے ملکوں میں جا سکیں گے۔''

وہ سر ہلا کر بولا۔ ''پاسپورٹ اور دیگر اہم کاغذات بن جائیں تو بہتر ہوگا۔''

''کیا آپ ابھی اس شہر کو دیکھنا چاہیں گے؟''

''میں ابھی آرام کروں گا۔ نمازِ ظہر کے بعد تنہا کار ڈرائیو کرتا ہوا آزادی سے گھومتا پھرتا ہوا اس شہر کو دیکھوں گا۔ آپ میرے لیے ایک کار بھیج دیں۔''

وہ بنگلے کے احاطے میں پہنچ کر کار سے اتر گیا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ ''میں ایک ایسا ملازم رکھنا چاہتا ہوں جو میرے مزاج کے مطابق میرا خدمت گار بن کر رہے۔''

''آپ جیسا ملازم چاہیں گے یہاں پہنچ جائے گا۔''

''یہاں نہیں۔ پیرس میں چاہوں گا۔ میں خود اس کا انٹرویو لوں گا۔ اس میں یہ خصوصیات ضروری ہیں کہ وہ تعلیم یافتہ ہو۔ انگریزی کے علاوہ میری مام کی فرنچ لینگویج بھی جانتا ہو۔''

''ہم پیرس کے اخبارات میں اشتہار دیں گے۔ آپ کی پسند اور مزاج کے مطابق کئی خدمت گار مل جائیں گے۔''

وہ اپنے بنگلے کے اندر آگیا۔ کریگ ہوسٹن نے وہاں سے واپس جاتے ہوئے سوچا۔ یہ اچھا موقع ہے۔ ہم اشتہارات کے ذریعے آنے والے ایسے خدمت گاروں کو عابی کے پاس انٹرویو کے لیے بھیجیں گے جو یہودی نواز ہوں۔ بے شمار مسلمان ہمارے احسان مند ہیں اور ہمارے زیرِ اثر رہتے ہیں۔ عابی ضرور کسی مسلمان کو اپنی خدمت گزاری کے لیے منتخب کرے گا۔ اور ہم چاہیں گے کہ جو بھی خدمت گار منتخب ہو وہ اردو زبان جانتا ہو۔ وہ ہمیں رازداری سے بتایا کرے گا کہ باپ بیٹے کے درمیان کیا گفتگو ہوتی رہتی ہے؟

ہوسٹن نے اپنی رہائش گاہ میں پہنچ کر دوسرے عہدیداروں کو بلایا۔ اس نے فون پر کہا۔ ''فوراً تشریف لائیں۔ بہت اہم معاملات ہیں۔''

وہ چار عہدیدار آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے۔ ہوسٹن نے انہیں ربّی اور عابی کی ملاقات کے متعلق بتایا پھر کہا۔ ''یہ بات بڑی تشویش ناک ہے کہ وہ ہمارے انسٹیٹیوٹ کی انڈر گراؤنڈ تجارت کا راز جانتا ہے۔ عقل حیران ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے جانتا ہے؟''

ایک عہدیدار نے کہا۔ ''وہ پیدائشی عجوبہ ہے۔ وہ اب تک ایسی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر چکا ہے جنہیں سن کر اور دیکھ کر عقل دنگ رہ گئی ہے۔ اب یہ نئی بات معلوم ہوئی ہے کہ وہ ڈھکے چھپے رازوں تک بھی پہنچ جاتا ہے۔''

دوسرے عہدیدار نے کہا۔ ''بے شک وہ عجوبہ بڑی سے بڑی فوج کے مقابلے میں تنہا فاتح شہسوار ہے۔ ناقابلِ یقین کرامات دکھاتا ہے لیکن وہ جادوگر نہیں ہے اور نہ ہی ٹیلی پیتھی جانتا ہے کہ ہمارے دماغوں میں گھس کر اندر کے راز معلوم کر لے۔ آج ضرور کسی نے ہمارے انسٹیٹیوٹ کے بارے میں اندر کی بات بتائی ہے۔''

''اور بتانے والا وہی ہوگا جس نے اس عمارت کو آگ لگائی ہے۔''

ہوسٹن نے کہا۔ ''ملازم نے بتایا ہے کہ آج صبح پرنس کسی سے فون پر باتیں کر رہا تھا۔ ملازم اردو زبان نہیں جانتا ہے۔ یہ سمجھ نہ سکا کہ پرنس کیا باتیں کر رہا تھا اور کس سے کر رہا تھا؟''

ایک نے کہا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ وہ اپنے باپ سے باتیں کر رہا تھا۔''

''نہیں۔ باپ تو ریاست میں بیٹھا ہے۔ وہ یہاں کے حالات نہیں جانتا ہے۔ کوئی ہم سے عداوت رکھنے والا مخبر ہے۔ اس نے انسٹیٹیوٹ کا راز پرنس کو بتایا ہے اور وہ بتانے والا اور اردو زبان بولنے والا ضرور کوئی پاکستانی یا ہندوستانی ہوگا۔''

وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ مراد علی منگی ریاست کی حکمرانی چھوڑ کر ہزاروں میل دور بیٹے کے آس پاس کہیں رہنے کے لیے آگیا ہے۔ ہوسٹن نے انہیں بتایا کہ پرنس پیرس پہنچ کر وہاں اپنا ایک ذاتی خدمت گار رکھنا چاہتا ہے۔ یہ ان کے لیے اچھا موقع تھا۔ وہ آپس میں مشورے کرنے لگے۔ ان کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ وہ اپنے زیرِ اثر رہنے والے ایسے مسلمان خدمت گاروں کو عابی کے پاس انٹرویو کے لیے بھیج سکیں گے جو اردو زبان جانتے ہوں۔

ایک عہدیدار نے کہا۔ ''یہی کرنا ہوگا۔ اس طرح ہمیں معلوم ہوتا رہے گا کہ پرنس کن لوگوں سے فون پر رابطہ رکھتا ہے اور ان سے کیا باتیں کرتا ہے؟''

ایک اور عہدیدار نے کہا۔ ''ابھی تو یہ مسئلہ ہے کہ وہ ہمارے ایک غیر قانونی اور غیر انسانی دھندے کے متعلق جان گیا ہے۔ ہمارے ربی کو یہ ہرگز نہیں کہنا چاہیے تھا کہ جینی انسانی اعضا کے ٹرانسپلانٹیشن کے لیے لاکھوں روپے دیا کرتی تھی۔ اس طرح عابی کو معلوم ہوگیا ہے کہ اس انسٹیٹیوٹ سے ہمارا گہرا تعلق ہے۔''

''ربی آرتھر سے غلطی ہوگئی ہے۔ میں نے راستے میں عابی سے کہا ہے کہ ہم بھی دھوکا کھاتے رہے ہیں۔ ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ وہاں درپردہ کیا ہوتا رہا تھا۔ میں نے پرنس کے دل سے میل دھونے کی کوشش کی ہے۔''

''ہم بھی آئندہ یہی کوشش کریں گے۔ اسے یقین دلائیں گے کہ ہم کسی غیر قانونی دھندے سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ ہم ابھی ڈیوڈ فرنانڈو کو حکم دیں گے کہ وہ ہم سے دور رہے۔ صرف فون پر ضروری باتیں کرے۔''

دوسری طرف عابی فون پر کہہ رہا تھا۔ ''بابا جانی! میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔ کیا یہ مناسب ہوگا کہ آپ ایک خدمت گار کی حیثیت سے میرے قریب آجائیں۔ پھر ہم باپ بیٹے دن رات ساتھ رہا کریں گے۔''

مراد نے کہا۔ ''میں نے اس پہلو سے سوچا تھا لیکن میں ملازمت کے لیے تمہارے پاس آؤں گا۔ تم مجھے اپنی خدمت کے لیے رکھو گے تو وہ شبہ کریں گے۔''

''شبہ نہیں کریں گے۔ وہ خود ہی پیرس کے اخبارات میں ایک تعلیم یافتہ خدمت گار کے لیے اشتہار شائع کرائیں گے۔ آپ یہ اشتہار پڑھ کر دوسرے امیدواروں کی طرح انٹرویو کے لیے آئیں گے تو میں آپ کو سلیکٹ کرلوں گا۔''

''ہاں۔ اس طرح انہیں کبھی شبہ نہیں ہوگا کہ ہمارا آپس میں کوئی رشتہ ہے۔''

''لیکن بابا جانی! یہ سراسر گستاخی ہوگی۔ آپ بیٹے کے خدمت گار بن کر رہیں گے۔ مجھے شرمندگی ہوگی۔''

''جذباتی نہ بنو۔ یہ فضول سی سوچ ہے۔ میں تمہارا باپ ہوں باپ ہی رہوں گا۔ ایک خدمت گار کی حیثیت سے بیٹے کا محافظ بن جاؤں گا۔ تنہائی میں پاس بیٹھنے والے بیٹے کے کان پکڑتا رہوں گا۔''

وہ ہنسنے لگا، پھر بولا۔ ''آپ جلد سے جلد پیرس جائیں اور چور دروازوں سے وہاں کے شہری بننے کے لیے اہم کاغذات تیار کرائیں۔ یہودی اکابرین کو یقین دلانا ہوگا کہ آپ وہاں کے باشندے ہیں۔''

''میں آج ہی یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں گا۔''

بیٹے سے باتیں کرنے کے بعد اس نے ماسٹر کو یو یو کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر ماسٹر نے کہا۔ ''میرے فون پر رومانیہ کا کوڈ نمبر آرہا ہے۔ کیا تم ریاست میں نہیں ہو؟''

''میں رومانیہ کے شہر برلاڈ میں ہوں۔ یہاں سے آج ہی پیرس جانا چاہتا ہوں۔ پرابلم یہ ہے کہ میرے پاس پاسپورٹ وغیرہ نہیں ہیں۔''

''رومانیہ کے دارالسلطنت بخارسٹ میں میرے چار ماتحت ہیں۔ میں ابھی ان سے بات کرکے تمہیں کال کروں گا۔ ذرا انتظار کرو۔''

وہ فون بند کرکے انتظار کرنے لگا۔ پیرس وہاں سے بہت دور تھا۔ رومانیہ سے ہنگری، آسٹریلیا پھر سوئٹزرلینڈ چار ملکوں کی سرحدیں پار کرنا تھیں اور یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد ماسٹر نے فون پر کہا۔ ''بیٹے! چار ملکوں کی سرحدیں پار کرنا ہیں۔ بھاری رشوتیں دے کر تمہارا پاسپورٹ اور دیگر اہم کاغذات بنوانے ہوں گے۔ تم میرے ایک ماتحت کے پاس بخارسٹ پہنچو۔ وہ چوبیس گھنٹے کے اندر تمہارے تمام ضروری کاغذات تیار کرائے گا اور پیرس کے لیے کسی فلائٹ میں سیٹ او کے کراسکے گا۔''

''تھینک یو ماسٹر! میں ابھی یہاں سے نکل رہا ہوں۔ شام تک بخارسٹ پہنچ جاؤں گا۔''

اس نے رابطہ ختم کرکے عابی سے فون پر کہا۔ ''مجھے پیرس پہنچنے میں دو دن لگیں گے۔ تم کل تک یہاں رہو۔ پرسوں پیرس کے لیے نکلو۔''

''او کے بابا جانی!''

عابی نے فون بند کرکے ظہر کی نماز ادا کی۔ پھر ڈائنا کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے خوش ہوکر کہا۔ ''ہزار برس جیو۔ کہاں ہو؟ کیا کررہے ہو؟''

''برلاڈ میں ہوں۔ تفریح کرنے شہر دیکھنے گھر سے نکل رہا ہوں۔ تم اپنی سناؤ۔''

''میں بہت خوش ہوں۔ میرے تمام اکابرین مجھ سے بہت خوش ہیں۔ وہ سب اپنی بدنیتی سے یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں نے تم پر عشق و محبت کا جال پھینک کر پھانس لیا ہے۔ میں ان کے لیے وی آئی پی ہوگئی ہوں۔ مجھ کو اور میری ممی پاپا کو انعامات سے نوازا جارہا ہے۔ میں آج شام کی فلائٹ سے پیرس جارہی ہوں۔ تمہاری مام کے

اپارٹمنٹ میں رہوں گی۔‘‘

وہ خوش ہو کر بولا۔ ’’پھر تو ہماری دلی مرادیں پوری ہو رہی ہیں۔ سچ کہتا ہوں آپی۔۔۔ ! تمہارے ساتھ رہ کر مجھے ماں کی ممتا ملتی رہے گی۔‘‘

’’اللہ نے چاہا تو یہ آپی تمام عمر تمہارے ساتھ رہے گی۔‘‘

’’آپی! تم نے میرے کان میں کلمہ پڑھا تھا۔ تم دل سے دین اسلام کو قبول کر رہی ہو نا؟‘‘

’’میرے منے بھائی! تمہارے اس سوال کا جواب محفوظ رہے گا۔ جب پیرس آؤ گے تو تمہیں زبردست سرپرائز دوں گی۔ ابھی کچھ نہ پوچھو۔‘‘

وہ تھوڑی دیر تک پیار بھری باتیں کرتے رہے پھر رابطہ ختم کر دیا۔ اس نے کریگ ہوسٹن سے کہا تھا کہ وہ شہر میں گھومنے کے لیے بغیر چھت کی کھلی کار ڈرائیو کرے گا۔ اس کی خواہش کے مطابق باہر ایک اسپورٹس کار آگئی تھی۔

وہ اسے ڈرائیو کرتا ہوا بنگلے کے احاطے سے باہر آیا۔ پھر ایک سڑک پر دھیمی رفتار سے جانے لگا۔ انجانا شہر تھا۔ اسے کسی بھی راستے پر چلتے ہوئے شہر کو اور وہاں کے لوگوں کو دیکھنا تھا۔

دو چار منٹ تک تو کسی نے توجہ نہیں دی۔ پھر ایک نے حیرانی سے چیخ کر کہا۔ ’’وہ دیکھو پرنس عابی جا رہے ہیں۔‘‘

اس آواز کے ساتھ ہی ہلچل سی پیدا ہوئی۔ ہر سمت سے شور اٹھا کہ پرنس اپنی کار میں جا رہے ہیں۔

بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ سب ایک دوسرے کو دھکے مار کر آگے آ کر عابی سے باتیں کرنا چاہتے تھے۔ پچھلی رات انہوں نے اس کی آمد پر جشن منایا تھا۔ اسے ٹی وی اسکرین پر دیکھا تھا۔ اب اپنے سامنے اسے راستے پر دیکھ رہے تھے۔

اس نے کار روک دی۔ سیٹ پر کھڑا ہو گیا تاکہ دور تک لوگ دیکھ سکیں۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ ان کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔ ’’میں برلاڈ کی تمام ماؤں، بہنوں، بھائیوں اور بزرگوں کو سلام کرتا ہوں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ سب میرے قریب آنے کے لیے ایک دوسرے کو دھکے مارتے ہوئے ایک دوسرے کو گراتے ہوئے زخمی کریں۔ فار گاڈ سیک! آپ لوگ جہاں ہیں وہیں رک جائیں۔ میرے قریب نہ آئیں۔ میں آپ کے قریب آؤں گا۔‘‘

وہ سب اپنی اپنی جگہ رک کر تالیاں بجانے لگے۔ سڑک پر تمام گاڑیاں رک گئی تھیں۔ اس نے کہا۔ ’’آپ ایک دوسرے سے فاصلہ رکھ کر کھڑے رہیں۔ میرے گزرنے کا راستہ رکھیں۔ میں ہزاروں افراد سے مصافحہ نہیں کر سکوں گا۔ اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ میں قریب آؤں تو مجھ سے فاصلہ رکھیں۔ مجھے پریشان نہ کریں۔‘‘

وہ سب دور ہو کر دو قطاروں میں کھڑے ہونے لگے۔ عابی کار سے باہر آ کر دو قطاروں کے درمیان سے گزرنے لگا۔ وہ مسکراتے ہوئے ان کے درمیان سے گزرتا جا رہا تھا۔ بہت دور ایک بوڑھی عورت دکھائی دی۔ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ وہ لاٹھی ٹیک کر ٹھہر ٹھہر کر آ رہی تھی۔ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ عابی نے اس کی طرف دوڑ لگائی۔ ایک لمبی چھلانگ میں اس کے پاس آ کر بولا۔ ’’آپ چل نہیں پا رہی ہیں۔ ایسی حالت میں کہاں جا رہی ہیں؟‘‘

وہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ’’تمہارے پاس آئی ہوں۔ کل سے سن رہی ہوں کہ تم ہمارے نجات دہندہ دجال معظم کے نمائندے ہو۔ تم جسے چھو لو گے، اس کی بیماریاں دور ہو جائیں گی۔ اس کا بڑھاپا ختم ہو جائے گا۔‘‘

وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولی۔ ’’مجھے چھو لو۔ یہ دکھ بیماریاں برداشت نہیں ہو رہی ہیں۔ مجھے شفا دو۔‘‘

وہ بولا۔ ’’شفا دینے والا صرف اللہ ہے۔ میں اس معبود کا ایک ناچیز بندہ ہوں۔‘‘

’’تم تمام بندوں سے اعلیٰ و افضل ہو۔ میں بوڑھی رہ کر مرنا نہیں چاہتی۔ مجھے چھو لو۔ پہلے کی طرح جوان بنا دو۔‘‘

عابی نے اس کے ہاتھ سے لاٹھی لے کر ایک طرف پھینک دی۔ اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔ وہ خوشی سے کانپ رہی تھی۔ لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ عابی محسوس کر رہا تھا کہ خوشی کے مارے اس کی سانس اکھڑ رہی ہے۔

وہ اس کے کان میں بولا۔ ’’خود کو سنبھالو۔ تمہاری بیماریاں دور ہو رہی ہیں۔ تمہارا عقیدہ ہے کہ میں ایک نجات دہندہ کا نمائندہ ہوں۔ اپنے عقیدے پر قائم رہو۔ محسوس کرو کہ میرے بازوؤں میں آ کر صحت یاب ہو گئی ہو۔‘‘

وہ اٹک اٹک کر تھرتھراتی ہوئی بولی۔ ’’ہاں۔ میری بیماریاں دور ہو گئی ہیں۔‘‘

وہ اسے بازوؤں میں اٹھائے لوگوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ پھر اس کے کان میں بولا۔ ’’تمہیں پتا ہے، تم جوان ہو گئی ہو؟‘‘

جوانی جا کے نہیں آتی۔ اسے لگا کہ وہ واقعی جوان ہو گئی ہے۔ یہ ہر مرد، ہر عورت کی ازلی خواہش ہے کہ پھر ایک بار جوانی مل جائے۔ وہ خوشی سے لرزتی ہوئی بولی۔ ’’مجھ سے

شادی کرو گے؟ بولو مجھ سے شادی کرو گے؟''

وہ لوگوں کے ہجوم میں چاروں طرف گھومتے ہوئے گونجتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''سنو لوگو سنو! یہ جوان ہوگئی ہے۔ میں بھی بچہ نہیں رہا جوان ہوگیا ہوں۔ میں تم سب کی موجودگی میں اس نوخیز لڑکی سے شادی کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔''

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ مارے خوشی کے اس کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ پھر وہ دوسری سانس نہ لے سکی۔ عابی نے محسوس کیا کہ اس کے بوڑھے اور لاغر جسم نے جھٹکا کھایا تھا پھر ساکت ہوگیا تھا۔

وہ سر جھکا کر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ لوگ شادی کا اعلان سن کر تالیاں بجا رہے تھے۔ ایک نے پوچھا۔ ''پرنس! آپ اس سے کب شادی کریں گے؟''

وہ ایک سمت چلتے ہوئے بولا۔ ''شادی ہوگئی۔''

وہ ایک لمحے کی شادی تھی اور خیالی ازدواجی زندگی کی مسرتیں تھیں۔

وہ اس بے جان بوڑھی کو ایک اونچے چبوترے پر لٹاتے ہوئے اونچی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''بچپن کھو جاتا ہے۔ جوانی غارت ہوجاتی ہے۔ بڑھاپا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دیتا ہے۔ بول رے انسان! پھر کیا رہ جاتا ہے؟ اللہ رہ جاتا ہے۔'' اس نے دور تک ہجوم پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میری دلہن کو آخری رسومات کے لیے لے جاؤ۔''

اس نے کار کو وہیں چھوڑ دیا تھا۔ پیدل جا رہا تھا۔ آگے لوگ جوق در جوق آرہے تھے۔ وہ ان سے باتیں کرتا جا رہا تھا وہ اسے اپنے دجال کا اوتار سمجھ رہے تھے۔ جو اس کے آگے عقیدت سے جھکنا چاہتے تھے انہیں وہ منع کرتا تھا۔ اپنے سامنے سے ہٹا دیتا تھا لیکن وہ عقیدت کے مارے تھے۔ اس کی بات نہیں مان رہے تھے۔

اس نے دیکھا مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے سیکڑوں کی تعداد میں جھک رہے تھے۔ وہ جہاں سے گزر رہا تھا وہاں کی مٹی اٹھا کر اپنے سروں پر ڈال رہے تھے۔

وہ ان سب کو روک نہیں سکتا تھا۔ فوراً ہی پلٹ کر دوڑتا ہوا اپنی کار کی طرف جانے لگا۔ آگے راستہ بنانے کے لیے انہیں دونوں ہاتھوں سے ہٹاتا جا رہا تھا اگرچہ وہ نرمی سے ہاتھ لگا رہا تھا لیکن لوگ دھکے کھا کر گرتے جا رہے تھے۔ اس نے کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر آکر اسے اسٹارٹ کیا پھر اسے آگے بڑھایا تو لوگ پیچھے ہٹنے لگے۔ بھیڑ چھٹنے لگی۔

وہ راستہ بناتا ہوا تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا ایک راستے سے دوسرے راستے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں پہنچا۔ لوگ پیچھے رہ گئے تھے۔ وہ اور دور نکلتا جا رہا تھا۔ آگے بھی جو دیکھ رہا تھا۔ اسے پہچان کر پیچھے آنا چاہتا تھا لیکن وہ تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔ اس لیے بھیڑ نہیں لگ رہی تھی۔ پھر اسے اپنے پیچھے ایک سریلی ہنسی سنائی دی۔ اس نے فوراً ہی کار کو روکا۔ سر کو گھما کر دیکھا۔ ایک جوان لڑکی آگے پیچھے کی سیٹوں کے درمیان سے ابھرتی ہوئی ہنستے ہوئے بولی۔ ''تم پوری دنیا سے پیچھا چھڑا سکتے ہو۔ مجھ سے بچ کر نہیں جاسکتے۔''

وہ اگلی سیٹ پر آکر بولی۔ ''فوراً گاڑی چلاؤ۔ دیر نہ کرو۔ ورنہ یہاں بھی تماشا بن جاؤ گے۔ میں نہیں چاہتی کوئی اور تمہارے قریب آئے۔''

وہ دونوں بانہیں پھیلا کر اس سے لپٹنے آئی تو عابی نے ایک ہاتھ سے اس کی کمر کو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے اسے سر سے اونچا کیا۔ اسے خوف زدہ ہونا چاہیے تھا۔ وہ خوش ہوکر بولی۔ ''واؤ۔ کتنے شہ زور ہو۔ مجھے کھلونے کی طرح اٹھا لیا ہے۔ ہائے بازوؤں میں لوگے تو جانے کتنی مسرتیں دو گے۔''

وہ بولا۔ ''میں تمہیں سڑک پر پھینک سکتا ہوں۔ لیکن لڑکی ہو اس لیے رعایت کر رہا ہوں۔''

اس نے پچھلی سیٹ پر اسے پھینک کر کہا۔ ''گاڑی سے اترو اور یہاں سے بھاگو۔''

وہ سیٹ پر سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''اگر اچھے اور سچے مرد ہو تو عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاؤ گے۔ ایک لڑکی پر ظلم نہیں کرو گے۔ اپنی طاقت دشمنوں کے لیے سنبھال کر رکھو۔ نیک انسان کی طرح مجھے میرے گھر پہنچاؤ۔''

اس نے غور کر پوچھا۔ ''کہاں رہتی ہو؟''

''کار اسٹارٹ کرو اور ڈیوڈ اسٹریٹ چلو۔''

اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ ڈیوڈ اسٹریٹ کہاں ہے؟ کتنی دور ہے؟''

وہ پھر اگلی سیٹ پر آتے ہوئے بولی۔ ''بہت دور ہے۔ میں راستہ بتاتی رہوں گی۔ پتا ہے وہ اسٹریٹ میرے پاپا کے نام سے منسوب ہے۔ میرے پاپا کا نام ڈیوڈ فرنانڈو ہے۔''

عابی نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اس مردود کے پاس جانے والا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا اسی کی بیٹی ہو جو فزیشن اینڈ سرجن انسٹیٹیوٹ کا مختتم اعلیٰ ہے؟''

وہ بڑے فخر سے سینہ تان کر بولی۔ ''ہاں۔ میرے پاپا کو پورا شہر جانتا ہے۔''

''تمہارے پاپا ایسا کیا کارنامہ انجام دیتے ہیں کہ پورے شہر میں مشہور ہوگئے ہیں؟''

وہ سیٹ پر دوزانو ہو کر اس کی طرف رخ کرتے ہوئے بولی۔ "وہ اندھوں کو آنکھوں کی روشنی دیتے ہیں۔ دنیا دکھاتے ہیں۔ جن کے گردے فیل ہو جاتے ہیں، انہیں نئے گردے دیتے ہیں اور......"

عابی نے کہا۔ "اور یہ آنکھیں اور گردے دوسروں کے جسم سے نوچ کر لے آتے ہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کئی ملکوں سے جسمانی اعضا کے عطیات آتے رہتے ہیں۔ ان عطیات کے ذریعے بیمار اور مفلوج افراد کو نئی زندگیاں دی جاتی ہیں۔"

عابی نے سوچا' بیٹی سے خوامخواہ بحث نہ کی جائے۔ باپ سے نمٹا جائے۔'

اس نے کہا۔ "میں تمہارے پاپا سے ملنا چاہتا ہوں۔"

وہ خوشی سے چیخ پڑی۔ "کیا پاپا سے میرا ہاتھ مانگو گے؟"

"کیا وہ ہاتھوں کا بھی عطیہ دیتے ہیں؟ لیکن تمہارا ہاتھ لے کر میں اپنے جسم میں کہاں لگاؤں گا۔"

وہ گھور کر بولی۔ "ہاتھ مانگنے کا مطلب ہے' اپنی دلہن بنانا۔ کیا پاپا سے مل کر مجھ سے شادی کی بات کرو گے؟"

"میں کہہ چکا ہوں۔ ابھی گیارہ برس کا ہوں۔ ابھی میری شادی کی عمر نہیں ہے۔"

"تم نے تھوڑی دیر پہلے ایک بوڑھی عورت سے شادی کرنے کا اعلان کیا تھا۔ تب بچے نہیں تھے؟"

"میں سمجھ گیا تھا کہ وہ لب دم ہے۔ میں نے مرنے والی کی آخری خواہش پوری کی تھی۔ شادی کا اعلان کر کے اسے خوش کیا۔ صرف اس کا دل رکھا تھا۔"

"میرا بھی دل رکھ لونا۔ یہ تمہارے ہی لیے ہے۔ میں تمہارے ہی لیے پیدا ہوئی ہوں۔"

"دوسری باتیں کرو۔"

"ڈرتے ہو کہ پھسل جاؤ گے۔"

"عورت کی جھلک گناہ کا پہلا دروازہ ہے۔ اسے چھونے کا مطلب ہے' دروازہ کھولنا۔ ہمارے دین میں عورتوں کو حجاب میں رکھا جاتا ہے۔ نہ دیکھیں گے، نہ چھوئیں گے نہ گناہ کی ترغیب ہو گی۔"

وہ اسے بڑی حسرت سے دیکھنے لگی۔ عابی نے پوچھا۔ "یہ تمہارا گھر کتنی دور ہے۔ میں راستے بدلتا جا رہا ہوں۔ تم گائڈ بھی نہیں کر رہی ہو۔"

"میرا گھر تو بہت پیچھے چلا گیا ہے۔"

اس نے کار کو روکتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے وہاں کیوں نہیں روکا؟"

"جب مجھ سے شادی کی بات نہیں کرو گے تو پھر پاپا سے مل کر کیا کرو گے؟"

"میں ان سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ بتاؤ مجھ سے شادی کیوں نہیں کرو گے؟ دیکھو، کم سن بچے بن کر نہ بولنا۔"

"تو پھر انتظار کرو۔ جوان ہو کر بولوں گا۔"

"کہہ تو رہی ہوں۔ جوان ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔ میرے بیڈروم میں چلو۔ مجھے لیڈی ڈاکٹر سمجھ کر چلو۔ تمہارے اندر جو بچہ بننے کی بیماری ہے، اسے بھگا دوں گی۔"

عابی نے پوچھا۔ "تمہاری عمر کیا ہے؟"

"انیس برس کی ہوں۔"

"میں شادی کے لیے پوچھ رہا ہوں۔ سچ نہیں بولو گی تو تمہارے پاپا سے شادی کی بات نہیں کروں گا۔"

وہ خوشی سے اچھل کر پھر اس کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔ "زندگی میں پہلی بار سچ بول رہی ہوں۔ اپنے گاڈ کو حاضر و ناظر جان کر بول رہی ہوں۔ انتیس برس کی ہوں۔"

"شاباش۔ اب گھر چلو۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "گاڑی کو یوٹرن دو۔"

وہ کار کو واپسی کے دوسرے راستے پر لے آیا۔ وہ بولی۔ "تم نے میرا نام نہیں پوچھا۔ تمہیں میری ذات میں دلچسپی لینا چاہیے۔"

"ذرا صبر کرو۔ تمہارے پاپا راضی ہو جائیں گے تب ... دلچسپی لوں گا۔"

"وہ تو تمہارے جیسے پرنس کو داماد بنانے کے لیے ایک پاؤں پر کھڑے ہو جائیں گے۔"

"ہوسکتا ہے وہ شادی کے سلسلے میں میری شرط نہ مانیں۔"

"ضرور مانیں گے۔ تمہاری شرط کیا ہے؟"

"یہ میں ان کے سامنے بتاؤں گا۔"

گھر آ گیا۔ ڈیوڈ فرنانڈو نے حیرانی سے اپنی بیٹی کو پرنس کے ساتھ دیکھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پرنس بھی اس کے دروازے پر آئے گا۔ وہ کار سے اتر کر دوڑتی ہوئی باپ کے پاس گئی پھر اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ "پاپا! آپ کے لیے سرپرائز ہے۔ پرنس نے مجھے پروپوز کیا ہے۔"

ڈیوڈ نے حیرت سے اور مسرت سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "آنرایبل پرنس نے میرے دروازے پر آ کر مجھے عزت بخشی ہے اور یہ میری بیٹی کیا کہہ رہی ہے؟ کیا واقعی آپ ہمیں اپنا رشتے دار بنانا چاہتے ہیں؟ تشریف لائیں۔"

وہ ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ وہ بولی۔ ''پاپا مجھے پیار سے کیٹی کہتے ہیں۔ ویسے میرا نام روزانا ڈیوڈ ہے۔ شادی کے بعد میں پرنسس روزانا عابد کہلاؤں گی۔''

عابی نے ڈیوڈ سے کہا۔ ''میں سچ بولنے والوں سے رشتے داری کرتا ہوں۔ میں نے کیٹی سے کہا ہے کہ آپ میری ایک شرط مان لیں گے تو میں آپ کا داماد بن جاؤں گا۔''

وہ بولا۔ ''میں اپنی کیٹی کو ریاست کی شہزادی بنانے کے لیے آپ کی ہزاروں شرطیں مان لوں گا۔''

عابی نے کہا۔ ''آپ صرف ایک شرط مان لیں کہ میرے سامنے سچ بولیں گے۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''یہ بھی کوئی شرط ہے؟ میں اپنے داماد سے کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔''

''تو پھر بولیں، جس انسٹیٹیوٹ کے آپ منتظم اعلیٰ ہیں، اس کی انڈر گراؤنڈ خفیہ تجارت کیا ہے؟''

ڈیوڈ فرنانڈو کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کا ہنستا ہوا چہرہ یکلخت بجھ گیا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''یہ...... یہ آپ کیسا سوال کررہے ہیں؟ ہم کسی طرح کی بھی انڈر گراؤنڈ خفیہ تجارت نہیں کرتے ہیں۔ آنر ایبل پرنس! آپ کے دل میں یہ شبہ کیوں پیدا ہو رہا ہے؟''

''میں نے کہا نا کہ سچ بولنے والوں کو رشتے دار بناتا ہوں۔ میں تمہیں سچ بولنے کا موقع دے رہا ہوں۔ مجھے ٹالنے کے لیے باتیں نہ بناؤ۔''

''آنر ایبل پرنس! میں اپنی کیٹی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ بالکل سچ بول...''

عابی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''شٹ اپ۔ اب اگر ایک لفظ بھی بولو گے تو تمہارا دل، گردے اور آنکھیں نکال کر چیل کوؤں کے لیے باہر پھینک دوں گا۔''

وہ سہم کر سکڑ سا گیا۔ کیٹی نے کہا۔ ''تم میرے پاپا کی انسلٹ کررہے ہو۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ مجھ سے شادی نہ کرنے کے لیے پاپا پر غلط دھندے کا الزام لگا رہے ہو۔''

عابی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ''میں عورتوں کے منہ نہیں لگتا۔ نہ انہیں منہ لگانے کا موقع دیتا ہوں۔''

اس نے ڈیوڈ کے سر کو ایک ہاتھ کے پنجے میں جکڑا تو تکلیف کی شدت سے اس کے دیدے پھیل گئے۔ کیٹی باپ کو نجات دلانے آگے آئی۔ ''یہ کیا کررہے ہو؟ چھوڑو میرے پاپا جانی کو...''

اس کی بولتی بند ہوگئی۔ اس کی کھوپڑی بھی دوسرے ہاتھ کے پنجے میں جکڑ گئی۔ اس کے دیدے پھیل گئے۔ اس نے کہا۔ ''ڈیوڈ فرنانڈو! تم چوبیس گھنٹے کے اندر مر جاؤ گے۔ تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ اس شہر میں میرے سامنے نہ آنا۔ سامنا ہوتے ہی مرو گے۔ یہاں سے بھاگو۔''

اس نے دونوں کے سروں کو چھوڑا تو وہ چکرا کر گر پڑے۔ سینٹر ٹیبل پر ان کا ایک موبائل فون پڑا ہوا تھا۔ اس نے فون اٹھا کر مراد کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر سندھی زبان بولنے لگا۔ یہ زبان وہ دونوں سمجھ نہیں سکتے تھے۔

اس نے کہا۔ ''میں بول رہا ہوں۔ آپ کہاں ہیں؟''

وہ بولا۔ ''اس شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ مجھے شام تک بچارسٹ پہنچنا ہے۔ کیا مجھ سے کوئی کام ہے؟''

''جی ہاں۔ ابھی ایک شخص میرے خوف سے شہر چھوڑ کر بھاگنے والا ہے۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ اس کے دونوں کان معمول سے زیادہ بڑے ہیں۔ دور سے یہ عجیب سا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا سر گنجا ہے۔ اس نے دائیں ہاتھ کی انگلی میں ایک انگوٹھی پہنی ہوئی ہے۔ اس انگوٹھی میں ایک سرخ پتھر جڑا ہوا ہے۔''

''میں اسے پہچان لوں گا۔ تم چاہتے کیا ہو؟''

''آپ ہائی وے پر انتظار کریں۔ وہ ادھر سے گزرے گا۔ آپ اس کا کام تمام کردیں۔ میں بعد میں اس کا نام بتاؤں گا۔ یہ ہماری کال سن رہا ہے۔ صرف سن رہا ہے۔ سمجھ نہیں رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے بیٹے۔ میں اس کا انتظار کروں گا۔''

عابی نے فون بند کر کے ڈائل نمبروں کو ڈیلیٹ کیا پھر فون ان کی طرف پھینک کر وہاں سے چلا گیا۔

ڈیوڈ فرنانڈو فوراً اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ کیٹی سے بولا۔ ''مجھے ابھی یہاں سے جانا ہوگا۔ میں تمہیں کریگ ہوسٹن کے پاس چھوڑ کر جاؤں گا۔''

وہ اپنے بیڈ روم میں جا کر ضروری سامان ایک سفری بیگ میں رکھ کر باہر آیا۔ کیٹی بھی اپنا بیگ لے کر آگئی۔ دونوں اپنی کار میں بیٹھ کر کریگ ہوسٹن کی رہائش گاہ میں پہنچ گئے۔

ہوسٹن نے ان کا ماجرا سنا تو پریشان ہو کر کہا۔ ''پرنس ہمارے لیے مصیبت بن گیا ہے۔ پیشوائے اعظم اور ہماری عدالت نے فیصلہ سنا دیا ہے کہ پرنس کو ایک ذرا نقصان نہ پہنچایا جائے۔ اسے آخری حد تک ہمارے دین میں کنورٹ کرنے کی کوششیں کی جائیں گی۔''

وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ''بے شک وہ دجال معظم کا نمائندہ ہے۔ دیکھو کہ اسے اندر کی چھپی ہوئی باتیں کیسے معلوم ہو جاتی ہیں۔''

ڈیوڈ نے کہا۔ ''میرے اندر کپکپی سی ہے۔ میں بہت سہما ہوا ہوں۔ یہاں سے جا رہا ہوں۔ جب آپ اسے یہاں سے پیرس لے جائیں گے، تب واپس آجاؤں گا۔''

دوسروں کی موت سے کھیلنے والے اپنی موت سے نہیں ڈرتے۔ وہ سوچتے ہی نہیں کہ انہیں کبھی موت آئے گی۔ اب موت آنے والی تھی تو وہ اندر سے کانپ رہا تھا۔ گھر اور شہر چھوڑ کر بھاگ رہا تھا۔

کئی یہودی اکابرین عابی کے بنگلے میں آئے تھے۔ اس سے گزارش کر رہے تھے۔ ڈیوڈ فرنانڈو کی طرف سے صفائی پیش کر رہے تھے کہ وہ انسانی اعضا فروخت کرنے والوں کا آلۂ کار نہیں ہے۔ اسے معاف کر دیا جائے۔ وہ بے چارہ شہر چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔

عابی نے کہا۔ ''وہ بھاگ کر جہاں جائے گا، موت اس سے پہلے وہاں پہنچے گی۔ میں اسے نہیں ماروں گا۔ آپ کے سامنے اسی شہر میں ہوں۔ اس کے پیچھے نہیں جاؤں گا۔''

وہ اکابرین اس کی اس بات سے مطمئن ہو گئے تھے۔ مراد ہائی وے کے ایک پٹرول پمپ کے پاس اسنیک بار کے سامنے موجود تھا۔ وہاں سے گزرنے والے اپنی گاڑی کی ٹنکی فل کرانے یا کچھ کھانے پینے کے لیے رکتے تھے پھر تازہ دم ہو کر آگے جاتے تھے۔

مراد نے بچارسٹ تک جانے کے لیے ایک موٹر سائیکل خریدی تھی۔ وہ پارکنگ ایریا میں تھی، وہیں ڈیوڈ فرنانڈو کی گاڑی آکر رکی۔ وہ کار کا دروازہ کھول کر باہر آیا تو مراد نے دیکھا۔ وہ گنجا تھا اور اس کے دونوں کان معمول سے کچھ بڑے تھے۔ وہ بار کے اندر چلا گیا۔

مراد نے اندر آکر اس کے قریب سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے دائیں ہاتھ کی انگلی میں ایک انگوٹھی پہنی تھی اور اس انگوٹھی میں ایک سرخ رنگ کا پتھر جڑا ہوا تھا۔

بعض افراد اپنے عقیدے کے مطابق صحت اور سلامتی کے لیے ایسے پتھر اپنے وجود سے لگائے رکھتے ہیں۔ اس کے عقیدے کے مطابق وہ پتھر اسے سلامتی کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا رہا تھا۔

جب وہ فریش ہو کر بار سے باہر آیا اور اپنی کار کا دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھا تو مراد اچانک ہی دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اس کے برابر والی سیٹ پر آگیا۔ وہ غصے سے کچھ بولنا چاہتا تھا پھر مراد کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر سہم گیا۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ ''گولی نہ چلانا۔ میرے پاس جو کیش ہے وہ تمہیں دے دوں گا۔''

مراد نے کہا۔ ''میں چور ڈاکو اور قاتل نہیں ہوں۔ بچارسٹ تک جانے کے لیے لفٹ چاہتا ہوں۔ زندہ رہنے کے لیے مجھے وہاں تک پہنچاؤ۔ میں نہیں چاہتا کوئی میرے ہاتھ میں گن دیکھے۔ فوراً گاڑی اسٹارٹ کرو اور یہاں سے چلو۔''

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ کار وہاں سے اسٹارٹ ہو کر ہائی وے پر دوڑنے لگی۔ وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''بچارسٹ بہت دور ہے۔ میں تمہیں بڑی رقم دوں گا۔ تم کسی ٹیکسی میں جا سکو گے۔''

مراد نے کہا۔ ''میرے لیے تمہاری گاڑی محفوظ ہے۔ میں ایک مفرور مجرم ہوں۔''

''تم نے کیا جرم کیا ہے؟''

''میں ایک لاش کو چیر پھاڑ کر اس کے گردے اور آنکھیں نکال رہا تھا۔ ایسے وقت پولیس نے چھاپا مارا تو میں وہاں سے بھاگ آیا۔''

ڈیوڈ نے پوچھا۔ ''کیا تم ڈاکٹر ہو؟ کس کے لیے کام کرتے ہو؟ انسانی اعضا کہاں سپلائی کرتے ہو؟''

''برلاڈ میں ایک ڈاکٹر ہے۔ وہ مجھے اچھی خاصی رقم دے کر انسانی اعضا مجھ سے لے جاتا ہے۔ وہ فزیشن اینڈ سرجن انسٹیٹیوٹ کا بہت سینئر ڈاکٹر ہے۔''

ڈیوڈ نے حیرانی سے پوچھا۔ ''اس ڈاکٹر کا نام کیا ہے؟''

''اس کا نام ڈیوڈ فرنانڈو ہے۔''

''نہیں۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ ڈیوڈ فرنانڈو ڈاکٹر نہیں ہے۔ اس انسٹیٹیوٹ کا منتظم اعلیٰ ہے۔''

''کیا تم اسے جانتے ہو؟''

''وہ بہت مشہور ہے۔ برلاڈ میں اس کے نام سے ایک اسٹریٹ ہے۔ تم اتنے مشہور آدمی کو ڈاکٹر کہہ رہے ہو۔ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔''

''تم بھی کچھ چھپا رہے ہو؟''

ایسے وقت عابی نے اسے کال کی۔ مراد نے کہا۔ ''ہاں۔ میں ہائی وے پر ہوں۔ بچارسٹ جانے کے لیے ایک شخص کی گاڑی میں بیٹھا ہوں۔''

وہ عابی کی بات سن کر بولا۔ ''میں نے اس کا نام نہیں پوچھا ہے۔ یہ اچھا شریف بندہ ہے۔ سر پر بال نہیں ہیں۔ یعنی گنجا ہے۔ اس کے دونوں کان معمول سے کچھ بڑے ہیں۔''

عابی نے مسکرا کر پوچھا۔ ''یعنی آپ اس کی شہ رگ تک پہنچ گئے ہیں؟''

"جی۔ آپ نے کیا فرمایا؟ آپ کو فوراً ہی دو آنکھوں کی اور دو گردوں کی ضرورت ہے؟ لیکن جناب! میں اتنی جلدی ارینج نہیں کرسکوں گا۔ پہلے کسی کو پکڑ کر ذبح کرنا ہوگا۔"

عابی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بکرا تو آپ کے پاس ہے۔"

مراد نے کہا۔ "جی ہاں۔ یہ جو مجھے بچا رسٹ لے جا رہے ہیں، ان کی عمر کچھ زیادہ ہے لیکن صحت مند ہیں۔"

مراد نے ڈیوڈ سے پوچھا۔ "کیا تم چشمہ لگاتے ہو؟"

وہ بولا۔ "نہیں مگر یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

مراد نے فون پر کہا۔ "یہ چشمہ نہیں لگاتا ہے۔ دونوں آنکھوں کی بینائی ٹھیک ہے۔"

پھر اس نے ڈیوڈ سے پوچھا۔ "تمہارے دونوں گردے ٹھیک ہیں؟ کوئی پرابلم تو نہیں ہے؟"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "ہاں مگر کیوں پوچھ رہے ہو؟"

وہ فون پر بولا۔ "گردے بھی ٹھیک ہیں۔ آپ کی فوری ضرورت پوری ہوجائے گی۔"

ڈیوڈ فرنانڈو نے اچانک بریک لگا کر گاڑی روکی۔ وہ خوف سے لرزتے ہوئے بولا۔ "تم کیا بول رہے ہو؟ کیا کرنا چاہتے ہو؟"

مراد نے اس کے سینے پر ریوالور کی نال رکھتے ہوئے فون پر کہا۔ "آپ ڈیوڈ فرنانڈو سے بولیں کہ آنکھیں اور گردے ابھی مل جائیں گے لیکن میں معاوضہ زیادہ لوں گا۔"

وہ چیخ کر بولا۔ "ڈیوڈ فرنانڈو میں ہوں... میں۔"

وہ ہنستے ہوئے عابی سے بولا۔ "یہ موت کو قریب دیکھ کر پاگل ہوگیا ہے۔ خود کو ڈیوڈ فرنانڈو کہہ رہا ہے۔"

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ میں ہی اس انسٹیٹیوٹ کا منتظم اعلیٰ ڈیوڈ فرنانڈو ہوں۔ کوئی تم سے سستے داموں اعضا خریدتا ہے۔ میں تمہیں اس سے زیادہ معاوضہ دوں گا۔"

مراد نے ریوالور کو اس کی آنکھوں کے قریب کرتے ہوئے کہا۔ "پہلے اعضا کی خفیہ تجارت کے بارے میں پوری تفصیل بتاؤ۔ تب ہمیں یقین ہوگا کہ تم ہی ڈیوڈ فرنانڈو ہو۔ پھر میں تم سے دوستی اور سودا کروں گا۔"

وہ اپنی جان بچانے اور مراد سے سودا کرنے کے لیے فرفر بولنے لگا کہ انسانی اعضا کتنے چور راستوں سے حاصل کیے جاتے ہیں اور صرف مُردوں کے ہی نہیں زندہ انسانوں کے اعضا بھی علاج کے اور آپریشن کے دوران نکال لیے جاتے ہیں۔ ان کا ہیڈ آفس تل ابیب اسرائیل میں ہے لیکن ان کا کاروباری رابطہ پیرس کے برانچ آفس سے ہے۔

اس برانچ کا ایک بہت ہی سنگدل قصائی ڈاکٹر اور ڈائریکٹر ڈی جان ہنٹر ہے۔ ان کے دفاتر کی شاخیں لندن اور ساؤتھ افریقا میں بھی ہیں۔ یہ کاروباری جال کئی ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ فوری ضرورت کے مطابق انسانی اعضا ایک سے دوسرے ممالک تک پہنچاتے رہتے ہیں۔

مراد نے اپنا فون ڈیوڈ کے ہاتھ میں پکڑا دیا تھا۔ عابی تمام تفصیلات سن رہا تھا۔ اس نے ریوالور میں سائیلنسر لگا کر کہا۔ "بیٹے! دیکھا تم نے کس طرح شیطانوں کے پیٹ سے غلاظت اگلوائی جاتی ہے۔ بس یہ آواز سن کر فون بند کرو۔"

اس نے بڑی خاموشی سے اس کے سینے میں ایک گولی اتار دی۔ ادھر عابی نے فون بند کرکے زیرِ لب کہا۔ "باپ آخر باپ ہی ہوتا ہے۔ آئی لو یو بابا جانی!"

☆☆☆

زیب النساء پریشان تھی۔ ڈھائی ماہ کے حمل میں ہی میڈیکل رپورٹ سے معلوم ہوا تھا کہ بچہ پرنس عابی کی طرح غیر معمولی ہے اور وہ بچہ نہیں بچی ہے۔ قدرتی روٹین کے برعکس اس کا جسم بننے لگا تھا۔ ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ وہ نو ماہ سے پہلے پیدا ہوجائے گی۔

زیب النساء نے ہمزاد کے سینے سے لگ کر کہا۔ "میں نہیں بچوں گی، میرا وقت پورا ہو رہا ہے۔"

اس نے تھپکتے ہوئے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔ "ایسا نہ کہو۔ پورے حوصلے سے ماں بننے کے مراحل سے گزرتی رہو گی تو اللہ تمہیں نئی زندگی دے گا۔ تم اپنی بیٹی کو گود میں کھلاؤ گی۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ "بعض حسرتیں دل میں ہی رہ جاتی ہیں۔ آہ... میں نے جینی کا انجام دیکھا ہے۔ آپ کی یہ اولاد بھی عابی کی طرح عجوبہ ہے۔ یہ بھی اپنے بھائی کی طرح دنیا میں آئے گی۔ میں نہیں بچوں گی۔"

ہمزاد اسے تسلیاں دیتا رہتا تھا لیکن اندر سے فکرمند تھا۔ دل میں اندیشہ تھا کہ یہ بچی بھی عابی کی طرح سہولت سے نہیں آئے گی۔ شاید یہ بھی میجر آپریشن سے پہلے ہی دروازہ توڑ کر دنیا میں آئے گی۔

وہ تنہائی میں سوچتا تھا اور پریشان ہوتا تھا۔ نماز کے بعد زیب النساء کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگتا رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ سے پوچھتا تھا کہ وہ عام انسانوں سے الگ کیوں ہے؟ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا کرتا تھا کہ عابی نے اپنی غیر

معمولی صلاحیتوں سے گیارہ برس کی عمر میں اپنے نا قابلِ شکست ہونے کا اور اپنی شہ زوری کا ڈنکا بجادیا تھا۔ آنے والی بیٹی سے بھی یہی توقع تھی۔ وہ بھی دنیا والوں کو حیران کرنے والی تھی۔ لیکن ایسی روشن تصاویر کا تاریکی پہلو یہ تھا کہ ان کی مائیں عذاب میں مبتلا ہوجاتی تھیں۔ ایک جانبر نہ ہوسکی تھی۔ دوسری کا اللہ ہی حافظ تھا۔

عابی نے اسے فون پر مخاطب کیا۔ ''بابا السلام علیکم۔ آپ کیسے ہیں؟ وہاں کے حالات سب ٹھیک ہیں؟''

''میرے بیٹے سب کہاں ٹھیک ہوتا ہے؟ زندگی کی گاڑی چلتے چلتے کہیں نہ کہیں سے پنکچر ہوتی رہتی ہے۔ ہم مرمت کرتے رہتے ہیں۔ گاڑی کو آگے بڑھاتے رہتے ہیں۔''

''آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں؟''

''ہاں مگر صرف پریشان نہیں ہوں۔ خوش بھی ہوں۔''

''یعنی بیک وقت خوشی بھی ہے اور پریشانی بھی؟''

''ہاں۔ خوشی یہ ہے کہ دنیا میں تمہاری ایک بہن آنے والی ہے۔ پریشانی یہ ہے کہ وہ بھی تمہاری طرح ایک غیر معمولی بے بی ہے۔ حمل کے پہلے مرحلے سے جو آثار تمہارے ساتھ رہے' وہی اس کے ساتھ ہیں۔''

ہم زاد نے بڑے دکھ سے کہا۔ ''بیٹے از چگی کے وقت جو تمہاری ماں کے ساتھ ہوا' وہی زیب النساء کے ساتھ ہوگا تو یہ بے چاری بھی اپنی زندگی ہار جائے گی۔''

''بابا! دنیا کے مشہور و معروف تجربہ کار ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کریں۔ کسی بھی طرح میری اس ماما کی زچگی کو نارمل ہونا چاہیے۔''

''میں پوری کوشش کررہا ہوں۔ میں نے ننانوے برس کے ایک انتہائی تجربہ کار بزرگ ڈاکٹر کی خدمات حاصل کی ہیں۔ اس کے علاوہ دس تجربہ کار ڈاکٹروں کا ایک پینل بنایا ہے۔ وہ دن رات زیب النساء کو آبزرویشن میں رکھتے ہیں۔ کوششیں اور دوائیں جاری رہیں تو دعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں۔ میں ہر نماز میں اس کی صحت اور سلامتی کے لیے دعائیں مانگتا رہتا ہوں۔''

''میں بھی اس پاک پروردگار سے دعائیں مانگتا رہوں گا۔ ہمارا معبود ماما کے لیے آسانی فرمائے گا۔''

سب ہی زیب النساء کے لیے پریشان تھے۔ اس کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ دعا ہی ایک آخری علاج ہے۔ قبول ہوجائے تو تمام مصائب ٹل جاتے ہیں۔

بیٹے سے رابطہ ختم ہوگیا۔ مراد نے فون پر کہا۔ ''آئندہ کے لیے توبہ کرو۔ ہمیشہ خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کرو گے اور اپنی شریکِ حیات کو پیش آنے والے خطرات سے محفوظ رکھو گے۔''

ہم زاد نے کہا۔ ''درست کہتے ہو۔ آئندہ بھی میرے بچے عجوبہ ہوں گے۔ میں توبہ کرچکا ہوں۔''

مراد نے کہا۔ ''میرے دل میں ایک بات آئی ہے۔ کبھی کبھی اپنے عقیدے کے مطابق کچھ کرو تو مصائب کسی حد تک کم ہوجاتے ہیں۔ لوک داستان کی ماروی ایک عقیدہ ہے۔ پاک دامنی اور صداقت کی ایک علامت ہے۔ اس نے جلتی ہوئی ہتھیلی پر انگارے رکھ کر ثابت کردیا کہ سچ ہمیشہ سلامت رہتا ہے۔ میری زندگی میں جو ماروی آئی' اس کی محبت مجھے سلامتی دیتی رہی اور میں اس کے پیار کی لگن میں جنگ لڑتا ہوا نماز کی طرف آگیا۔ آج بھی ماروی کی ذہانت اور وفاداری محبوب کے اربوں کے کاروبار کو عروج دے رہی ہے۔ خاموش رہنے والی اس ہستی نے مجھ کو اور محبوب کو سلامتی اور محبتیں دی ہیں۔ میرے دل میں یہ عقیدہ ہے کہ یہی ماروی' زیب النساء کو سلامتی دے گی۔''

ہم زاد نے حیرانی سے پوچھا۔ ''وہ زیب النساء کو کیسے سلامتی دے گی؟''

مراد نے کہا۔ ''میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہم اپنی ہونے والی بیٹی کا نام ماروی رکھیں۔ پتا نہیں کیوں میرے دل میں یہ بات آرہی ہے کہ ماروی زیب النساء کی کوکھ میں پہنچ گئی ہے۔ وہ اس ماں کے لہو میں پرورش پارہی ہے۔ اس نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا۔ وہ زیب النساء کی بھلائی چاہے گی۔ اس کے وجود کی دیوار توڑ کر نہیں آئے گی۔ اسے ضرور سلامتی دے گی۔''

ہم زاد نے متاثر ہوکر کہا۔ ''اللہ تعالیٰ آپ کی زبان مبارک کرے۔ آپ کے جذبے کو اور آپ کے عقیدے کو زندگی دے۔ میں بھی پیدا ہونے والی بچی کو ماروی تسلیم کررہا ہوں۔''

صبح سے بادل چھائے ہوئے تھے۔ یکبارگی بادل گڑگڑانے لگے۔ جیسے رحمتِ خداوندی کو پکار رہے ہوں۔ زیب النساء کی سلامتی کے لیے ماروی کو اس کے وجود میں پہنچانے کی بات کہہ رہے ہوں۔ بندہ نہیں جانتا کہ کس وقت اس کی کوئی بات' کوئی دعا آسمان کو چھولیتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد ہی محبوب نے صدمات سے چور ہوکر مراد کو فون پر کہا۔ ''مراد! میں ڈوب گیا ہوں۔ ختم ہوگیا ہوں۔''

اس نے پریشان ہوکر پوچھا۔ ''کیا ہوا محبوب صاحب؟''

وہ آنسو بھرے لہجے میں بولا۔ ''ماروی...... میری

ماروی آہ......! اللہ کو پیاری ہوگئی ہے۔"

مراد کے ذہن کو زبردست جھٹکا پہنچا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ اچانک کیسے ہوگیا؟ کیا وہ بیمار تھی؟"

"نہیں۔ کوئی بیماری نہیں تھی۔ میرے ساتھ ہنس بول رہی تھی۔ ڈھیر ساری شاپنگ کرکے آئی تھی۔ پھر ہم نے کوٹھی میں آکر عصر کی نماز پڑھی پھر......"

وہ بولتے بولتے صدمے سے رک گیا۔ مراد نے تڑپ کر پوچھا۔ "پھر......؟"

وہ رو پڑا۔ کہنے لگا۔ "میں نے نماز پڑھ کر دیکھا تو وہ سجدے کی حالت میں تھی۔ میں نے دیر تک انتظار کیا۔ پھر آواز دی۔ معلوم ہوا کہ...... کہ وہ آخری سجدہ اسے اپنے معبود کے پاس لے گیا ہے۔"

وہ چپ ہوگیا۔ مراد کو بھی چپ لگ گئی تھی۔ اگر نادیدہ ہونے والی صلاحیت ہوتی تو وہ چشم زدن میں وہاں پہنچ جاتا۔ ماروی نامحرم تھی۔ اس کا آخری دیدار نہ کرپاتا لیکن اس کی آخری رسومات میں تو شریک ہوجاتا۔

اس نے محبوب کو صبر کی تلقین کی۔ پھر فون بند کردیا۔ اس کا دل بھاری ہوگیا تھا۔ ماروی کی تمام باتیں تمام ادائیں یاد آرہی تھیں۔ وہ پتھر تھا۔ پتھر ٹوٹ جاتا ہے مگر پگھلتا نہیں ہے۔ وہ زندگی میں پہلی بار پگھل گیا۔ اس مرد میدان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اچانک ہی زیب النساء کی حالت بگڑ گئی۔ محل کے اسپتال میں ایک ڈاکٹر ضرور موجود رہتا تھا۔ اس وقت لیڈی ڈاکٹر اسے اٹینڈ کررہی تھی۔ اس کی تکلیف کو سمجھ رہی تھی اور یہ معلوم کررہی تھی کہ تین ماہ میں ہی وہ بچی متحرک ہوگئی تھی۔ اس میں جان پڑ گئی تھی۔ یعنی......؟ یعنی بچی کے وجود میں روح آگئی تھی۔ روح کہاں سے آگئی تھی؟ مرنے والوں کی روحیں عالم ارواح میں چلی جاتی ہیں۔ کیا وہاں سے بھی کہیں جاتی ہیں؟

مشیت ایزدی کو کون سمجھ پاتا ہے؟ وہ بچی زیب النساء کی کوکھ میں آکر متحرک ہوگئی تھی۔ کوئی سنے یا نہ سنے وہ کہہ رہی تھی۔ "امی...... میں آپ کو پریشان نہیں کروں گی۔ آرام سے آپ کی گود میں آؤں گی۔ لیکن بھائی کی طرح عجوبہ کہلاؤں گی۔"

☆☆☆

کیٹی نے اپنے باپ سے رابطہ کرنا چاہا تو معلوم ہوا اس کا فون بند پڑا ہے۔ اس نے کریگ ہوسٹن سے کہا۔ "انکل! پاپا سے رابطہ نہیں ہورہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا انہوں نے فون کا سوئچ کیوں آف کیا ہے؟"

ہوسٹن اور دوسرے عہدیداروں نے گھنٹے آدھے گھنٹے کے وقفے سے کئی بار اسے کال کی اور مایوس ہوئے۔

ایک نے پریشان ہوکر کہا۔ "کیا پرنس نے اسے ٹھکانے لگادیا ہے؟"

کیٹی نے کہا۔ "ہاں۔ پرنس نے بڑے یقین سے کہا تھا کہ پاپا کو چوبیس گھنٹے کے اندر موت آجائے گی۔"

ایک نے کہا۔ "پرنس نے اسے مارڈالا ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "لیکن پرنس کی نگرانی کرنے والے مخبر نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کہا ہے کہ وہ اپنے بنگلے میں ہے۔"

ہوسٹن نے عابی کو فون پر مخاطب کیا پھر کہا۔ "ہم ڈیوڈ فرنانڈو کے لیے پریشان ہیں۔ اس کا فون بند ہوچکا ہے۔ اس سے رابطہ نہیں ہورہا ہے۔ کیا آپ اس کے بارے میں کچھ کہنا چاہیں گے؟"

اس نے پوچھا۔ "آپ کا کیا خیال ہے؟ مجھے اس کے بارے میں کیا کہنا چاہیے؟"

"کیٹی کہہ رہی ہے، آپ نے ڈیوڈ فرنانڈو سے کہا تھا کہ وہ چوبیس گھنٹے کے اندر مرجائے گا۔"

"کیا میرے کہہ دینے سے کوئی بھی مرجاتا ہے؟ میں یہ کہوں کہ ایک گھنٹے کے اندر آپ کو موت آنے والی ہے تو کیا آپ مرجائیں گے؟"

"سوری۔ ہم نے آپ کو ڈسٹرب کیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں کل یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ یہ شہر اچھی طرح دیکھا نہیں ہے۔ دو روز بعد جاؤں گا۔"

عابی یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ مراد نے پیرس پہنچ کر وہاں کی شہریت حاصل کرلی ہے یا نہیں؟ اس کے بعد ہی وہ شہر چھوڑنا چاہتا تھا۔

ہوسٹن نے اپنے خاموش فون کو دیکھ کر کہا۔ "وہ کل یہاں سے نہیں جائے گا اور دو روز رہے گا۔"

ایک نے پوچھا۔ "اس نے ارادہ کیوں بدل دیا ہے؟"

"پتا نہیں، اس کے دل میں کیا ہے؟ شاید یہ شہر اسے اچھا لگ رہا ہے۔"

کیٹی نے کہا۔ "میرے پاپا کو ڈھونڈیں۔ شاید وہ زندہ ہوں۔ شاید ان کے فون میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہو۔"

انہوں نے دو کارندوں کو ہائی وے پر دوڑایا۔ وہ اسے تلاش کرتے ہوئے دور تک جارہے تھے اور فون پر اطلاع دے رہے تھے کہ فرنانڈو کی کار کہیں نظر نہیں آرہی

ہے۔ وہ چھ گھنٹے بعد بچارسٹ پہنچے تو ایک ویران سی سڑک کے کنارے وہ کار دکھائی دی۔ کار والا دکھائی نہیں دیا۔

اور ایک گھنٹے بعد اطلاع ملی کہ اس کی لاش ایک اسپتال کے مردہ خانے میں ہے۔ مراد نے اس کے پاس کوئی شناختی کارڈ یا کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی تھی جس کے ذریعے اسے پہچانا جاتا۔ اسے لاوارث سمجھ کر مردہ خانے میں پہنچا دیا گیا تھا۔

کیتی رونے لگی۔ یہ معلوم نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اسے کس نے قتل کیا ہے؟ عابی ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس سے کچھ اگلوایا نہیں جاسکتا تھا۔

کیتی نے کہا۔ ”میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

ایک نے ناگواری سے کہا۔ ”وہ ون مین آرمی ہے۔ اپنی ذات میں ایک پوری فوج ہے۔ تم کیا کرلوگی؟“

وہ بولی۔ ”عورت اگر ٹھان لے تو اپنے سامنے پہاڑوں کو جھکا دیتی ہے۔ میں اسے یہاں سے زندہ نہیں جانے دوں گی۔“

”فضول باتیں نہ کرو۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ پرنس پر ایک ذرا آنچ بھی نہ آئے۔ اسے یہاں سے پیرس پھر وہاں سے تل ابیب پہنچانا ہے۔“

وہ منہ پھیر کر اپنے بنگلے میں آگئی۔ ماں پہلے ہی مرچکی تھی۔ باپ بھی جہنم میں پہنچ گیا۔ بچارسٹ کے مردہ خانے سے اس کی لاش آنے والی تھی۔ دوسری صبح تک اس کا کریا کرم ہونے والا تھا۔ پھر وہ اٹھائیس برس کی نام نہاد کنواری بے لگام ہوکر زندگی گزارنے والی تھی۔

ڈبلیو ڈبلیو یعنی ورلڈ ریسلنگ سے تعلق رکھنے والے دو پہلوان میکی جورڈن اور بلیک ڈیتھ اس شہر میں رہتے تھے۔ چیمپئن شپ ٹورنامنٹ میں شریک ہونے کے لیے امریکا جایا کرتے تھے۔ کیتی سے ان کی دوستی تھی۔ وہ کئی بار انہیں خوش کرچکی تھی۔

اس نے فون پر بلیک ڈیتھ سے کہا۔ ”ہائے بلیکی! میں کیتی بول رہی ہوں۔“

بلیک ڈیتھ نے پوچھا۔ ”کہاں ہو میری جان! ایک برس پہلے ایک رات کے لیے ملیں پھر غائب ہوگئیں۔“

”بلیکی! آج کی رات تمہارے لیے ہوں لیکن ایک شرط ہے، کسی کو مار گرانا ہے۔“

اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ”کون ہے وہ چوہا؟“

”وہ چوہا نہیں پہاڑ ہے۔ تنہا پوری فوج کو مار گراتا ہے۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا تم پرنس عابی کی بات کررہی ہو؟“

”ہاں...... کیا ڈر گئے؟“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”ہمارا پیشہ لڑنا مرنا ہے یا مارنا ہے۔ ڈرنا نہیں ہے۔ میں نے پرنس کا بہت ذکر سنا ہے۔ آج وہ شہر میں کھلے عام گھوم رہا تھا۔ میں اسے دیکھنے کے لیے نکلا تو وہ کہیں جا چکا تھا۔“

”میں اسے اڑا کر لے گئی تھی۔ لیکن وہ اڑیل ٹٹو ہے۔ اس نے میری انسلٹ کی ہے۔ میرے پاپا کا مرڈر کیا ہے۔ کیا تم اس کی ہڈیاں توڑ سکو گے؟“

”میں نے ڈبلیو ڈبلیو کے دس پہلوانوں کو شکست

دے کر دس لاکھ ڈالرز اور چیمپئن ٹرافی بیلٹ حاصل کیا ہے۔ پرنس ہوگا مردِ میدان لیکن میرے سامنے آئے گا تو ایک ہاتھ کھاتے ہی زمین میں دھنس جائے گا۔ بولو اس سے کہاں ٹکرانا ہے؟"

کیٹی نے اس کی رہائش گاہ کا پتا بتا کر کہا۔ "دو چار جاسوس چھپ کر اس کے بنگلے کی نگرانی کرتے ہیں۔ ہمارے یہودی اکابرین اس کی حفاظت کررہے ہیں۔ تم اس کے پاس جاؤ اور اس سے دوستی کرو۔ اسے اپنے ساتھ تفریح کے لیے کہیں دور لے جاؤ۔"

"سمجھ گیا۔ یہ بتاؤ معاوضے میں تم تو ملوگی اور کیا ملے گا؟"

"اگر تم اس کی ہڈیاں توڑ کر اپاہج بنادو گے تو پچاس ہزار ڈالرز دوں گی۔"

"کنجوسی نہ دکھاؤ۔ باپ کی موت کے بعد تمہیں لاکھوں ڈالرز ملنے والے ہیں۔"

"ملنے والے ہیں۔ ابھی ملے نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے' ایک لاکھ ڈالرز سے زیادہ نہیں دے سکوں گی۔"

"منظور ہے۔"

کیٹی نے اس سے رابطہ ختم کر کے دوسرے ریسلر میکی جورڈن کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر اس سے بھی معاملات طے کیے۔ اسے بھی عابی کے بنگلے کا پتا بتایا۔ وہ بولا۔ "ابھی وہاں جاؤں گا۔ لیکن دو لاکھ ڈالرز لوں گا۔ ایڈوانس ایک لاکھ ابھی دو۔"

"میں بینک سے رقم نکال کر لاؤں گی۔ ایک گھنٹے بعد آکر پیشگی رقم لے جاؤ۔"

وہ اسی وقت بینک جاکر بلیک ڈیتھ کے لیے بھی رقم لے آئی۔ ان دونوں نے اس کے بنگلے میں آکر رقم حاصل کی پھر عابی کے دروازے پر پہنچ گئے۔

رات ہوچکی تھی۔ شہر روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ عابی وہاں رات کا حسن اور تفریح گاہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ ایسے وقت دونوں پہلوانوں نے دروازے پر آکر پیغام بھیجا کہ وہ ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ عابی نے انہیں اندر بلایا اور انہیں دیکھا۔ وہ ہاتھی جیسا ڈیل ڈول رکھتے تھے۔ ان کے سینے چٹان کی طرح پھیلے ہوئے تھے اور بازوؤں کی ابھری ہوئی مچھلیاں فولاد کی طرح سخت نظر آرہی تھیں۔

عابی گیارہ برس کا تھا۔ اپنی عمر سے زیادہ قد آور تھا، تقریباً ان کے برابر تھا۔ ڈھیلے ڈھالے لباس میں اس کے کسرتی بدن کا حسن چھپا ہوا تھا۔

اس نے دونوں سے کہا۔ "تشریف رکھیں، میں کئی بار ڈبلیو ڈبلیو کے پروگرام میں خطرناک ریسلنگ دیکھ چکا ہوں۔ بڑا مزہ آتا ہے۔ آج آپ لوگوں کو روبرو دیکھ رہا ہوں۔"

انہوں نے مصافحہ کرتے وقت اپنے فولادی ہاتھوں کی سختی کا مظاہرہ کیا تھا اور بڑی خاموشی سے تسلیم کیا تھا کہ وہ بھی ان سے کم نہیں ہے۔

بلیک ڈیتھ نے کہا۔ "ہم نے آپ کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے لیکن سیکڑوں سپاہیوں سے لڑنے اور ایک پہلوان سے مقابلہ کرنے میں بڑا فرق ہے۔ ہم اپنی جسمانی قوت اور داؤ پیچ کے ذریعے ایک ہی حملے میں مقابل کو اٹھا کر رنگ سے باہر پھینک دیتے ہیں۔ سپاہی تو کبھی سامنے آتے ہیں کبھی چھپ چھپا کر لڑتے مرتے رہتے ہیں۔"

میکی جورڈن نے پوچھا۔ "پرنس! تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔ کبھی کسی پہلوان سے لڑسکو گے؟"

"میں لڑنے کے لیے نہیں' امن و امان سے اور بڑی محبت سے اس دنیا کو دیکھنے نکلا ہوں۔ لیکن گھر سے نکلتے ہی عداوتیں اور رکاوٹیں سامنے آرہی ہیں۔"

ایک نے کہا۔ "لیکن ہم عداوت نہیں کریں گے۔ دوستانہ انداز میں مقابلہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کی شہ زوری کو تسلیم کریں گے۔ بے شک دوستانہ انداز میں بھی چوٹیں آئیں گی۔ کوئی بات نہیں۔ وہ مرد ہی کیا جو زخم کھا کر نہ مسکرائے۔"

عابی نے کہا۔ "آپ دونوں بڑی اچھی باتیں کررہے ہیں۔ پتا نہیں مجھے زندگی میں کیسے کیسے تجربات سے گزرنا ہے۔ پہلوانوں سے مقابلے کا ایک تجربہ یہ بھی ہوجائے۔ بائی دا وے یہ گھر چھوٹا پڑے گا۔"

جورڈن نے کہا۔ "باہر چلتے ہیں۔ آپ کو دیکھتے ہی بھیڑ لگے گی۔ اچھا ہی ہے، جتنا ہجوم ہوگا۔ اتنا ہی تماشا دکھانے کا مزہ آئے گا۔"

عابی ان کے ساتھ بنگلے سے باہر آگیا۔ احاطے کے باہر ایک سڑک تھی۔ سڑک کے اس پار ایک بہت بڑا میدان تھا۔ اس کے باہر آتے ہی توقع کے مطابق بھیڑ لگنے لگی۔ وہ سڑک پار کرکے میدان میں آئے تو لوگ ہر سمت سے دوڑتے ہوئے آنے لگے۔

پہلوانوں نے انہیں ڈانٹ کر کہا۔ "دور رہو۔ خبردار ہمارے قریب نہ آنا۔ پرنس اپنی طاقت کا مظاہرہ کریں گے۔ ہم سے مقابلہ کریں گے۔ ہم سے دور جاکر دیکھو۔"

وہ سب ایک دوسرے کو پیچھے ہٹانے لگے۔ کیٹی بھی

بڑے ارمانوں سے دیکھنے آئی تھی کہ وہ دونوں پہلوان کس طرح عابی کو اپاہج بنانے والے ہیں۔

بلیک ڈیتھ نے کیٹی کا ہاتھ تھام کر ہجوم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''صرف یہ ہمارے قریب رہے گی۔ تم سب دور نہیں جاؤ گے تو مقابلہ نہیں ہوگا۔''

لوگ دور ہو کر بیٹھ رہے تھے۔ اس ہجوم کے درمیان بہت کھلی جگہ بن گئی تھی۔ بلیک ڈیتھ نے عابی سے کہا۔ ''پہلے مجھ سے مقابلہ کرو۔ اس کے بعد مقابلہ کرنے کے قابل رہو گے تو جورڈن سے لڑو گے۔''

عابی نے پوچھا۔ ''ہار جیت کا فیصلہ کس طرح ہوگا؟''

جورڈن نے کہا۔ ''جو میدان چھوڑ کر بھاگے گا، وہ ہار جائے گا۔ یہ دیکھنے والے اس پر لعنت بھیجیں گے۔''

عابی نے ان سے ذرا دور ہو کر کہا۔ ''میں چیلنج کرتا ہوں۔ تم مجھے چھو بھی نہیں سکو گے۔''

یہ چیلنج سنتے ہی اس نے عابی پر چھلانگ لگائی۔ عابی اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ بلیکی اوندھے منہ گرنے سے پہلے سنبھل گیا پھر دوسرے ہی لمحے میں اس پر جھپٹا۔ عابی فضا میں اچھل کر قلابازی کھاتا ہوا اس کے پیچھے آیا پھر گھوم کر ایک کک ماری۔ اس کی لات گردن پر لگی تو وہ آگے کی طرف لڑکھڑا کر اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔

وہ لات تھی یا ہتھوڑا؟ اس کی گردن کی ہڈی دکھ رہی تھی۔ پہلوانوں کی گردنیں بہت مضبوط ہوتی ہیں۔ لیکن ایک ہی لات میں مضبوطی فنا ہو گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ ہڈی چٹخ گئی ہے۔ سر اٹھائے گا تو ٹوٹ جائے گی۔

وہ زمین پر اوندھے منہ تھا۔ وہیں لیٹے ہی لیٹے چاروں شانے چت ہو گیا۔ میکی جورڈن دوڑتا ہوا اس کے قریب آیا۔ اس نے گھٹنے ٹیک کر اس پر جھک کر پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''میری گردن ٹوٹ رہی ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟ اس نے صرف ایک کک ماری ہے۔''

''اس سے دور رہو۔ اس کے ہاتھ پاؤں لوہے سے بنے ہیں۔ پلیز مجھے اسپتال پہنچاؤ۔''

میکی جورڈن نے وہاں سے اٹھتے ہوئے عابی کو دیکھا۔ وہ ایک خوبرو جوان دکھائی دے رہا تھا۔ کسی پہلو سے خطرناک نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے قریب آ کر پوچھا۔ ''تم کس تکنیک سے کک مارتے ہو؟ بلیکی گردن اٹھانے کے قابل نہیں رہا ہے۔''

عابی نے کہا۔ ''کوئی سوال نہ کرو۔ مقابلہ کرو۔ جواب مل جائے گا۔''

وہ بولا۔ ''میں پہلے سمجھنا چاہتا ہوں۔ کیا تم میری ایک کک برداشت کر سکو گے؟''

''ہاں۔ بولو کہاں کک مارو گے؟''

''تمہارے سینے پر۔''

''کم آن۔ میں تمہاری لات کھاؤں گا۔''

جورڈن نے پیچھے ہٹ کر ایک ذرا جوگنگ کی پھر یکبارگی گھوم کر لات ماری۔ اس کی لات عابی کے سینے پر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی جورڈن کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ وہ کھڑا نہ رہ سکا۔ زمین پر گر پڑا۔ جس پاؤں سے اس نے کک ماری تھی، اس پاؤں کی دو چار انگلیوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔

عابی جوں کا توں کھمبے کی طرح کھڑا ہوا تھا۔ وہ زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے زخمی پاؤں کو تھام کر شدید حیرانی سے عابی کو دیکھ رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے انسانی سینے پر نہیں، لوہے کی دیوار پر لات ماری تھی۔

عابی نے قریب آ کر پوچھا۔ ''اب سچ سچ بتا دو۔ مجھ سے کیا دشمنی ہے؟''

اس نے کہا۔ ''ہم آپ کے دشمن نہیں ہیں۔''

عابی نے دور کھڑی ہوئی کیٹی کو دیکھا پھر کہا۔ ''تم دونوں پلاننگ کر کے آئے تھے۔ سچ بولو۔''

اس نے اپنا ایک پاؤں جورڈن کے پاؤں پر رکھا تو وہ تکلیف سے چیخ پڑا۔ وہ ایسا وزنی تھا جیسے ایک بلڈوزر اس کے پاؤں پر چڑھ گیا ہو۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی قوت سے اس کے پاؤں کو ہٹانا چاہا لیکن عابی کو وہاں سے ہلا بھی نہ سکا۔ اس نے پاؤں پر گھونسے مارنے کا ارادہ کیا لیکن ایک ہاتھ مارتے ہی پھر تکلیف سے چیخ پڑا۔ گھونسا مارنے والی انگلیوں کی ہڈیاں دکھنے لگی تھیں۔

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''مجھے معاف کر دو۔ مجھے چھوڑ دو۔ سچ بولوں گا۔''

عابی نے پاؤں کو ہٹا لیا۔ وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے کیٹی کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ ''وہ کہہ رہی تھی کہ آپ نے اس کے باپ کا مرڈر کیا ہے۔ اس نے ہمیں بڑی رقم دی ہے تاکہ ہم آپ کو ہمیشہ کے لیے اپاہج بنا دیں۔''

عابی اس کی طرف بڑھا تو وہ پلٹ کر بھاگنے لگی۔ وہ گونجتی ہوئی آواز میں لوگوں سے بولا۔ ''اسے پکڑو۔ جانے نہ دو۔''

پھر بھلا وہ کہاں جا سکتی تھی۔ چاروں طرف سے گھیر لی

گئی۔ عابی نے کہا۔ ”اس نے مجھے مار ڈالنے کے لیے ان پہلوانوں کو کرائے پر حاصل کیا تھا۔ اس کی سزا کیا ہونی چاہیے؟ میں اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ اسے جو چاہیں سزا دیں۔“

یہ سن کر صرف مرد ہی نہیں، عورتیں بھی اس پر پل پڑیں۔ سب ہی اس کی پٹائی کرنے لگے۔ کئی ہاتھ اس کی زلفوں کو پکڑ کر اپنی اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ کئی اسے مارتے ہوئے اس کا لباس نوچ رہے تھے۔ وہ رو رہی تھی۔ چیخ رہی تھی۔ لیکن ہجوم کے شور میں اس کی چیخیں گم ہو گئی تھیں۔

عابی وہاں سے پلٹ کر اپنے بنگلے کی طرف جا رہا تھا۔ کریگ ہوسٹن اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ اسی ہجوم میں تھا۔ انہوں نے کیٹی کا انجام دیکھا۔ اسے بے لباس کر دیا گیا تھا۔ وہ زمین پر پڑی زخموں سے چور ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی بے ہوش ہو گئی تھی۔

ہوسٹن نے عابی کے ساتھ اس کے بنگلے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”آپ سے گزارش ہے کہ تنہا گھر سے نہ نکلیں۔ اگرچہ کوئی آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ تاہم احتیاط لازمی ہے۔ پھر یہ کہ اتنی بھیڑ لگ جاتی ہے کہ آپ آزادی سے تفریح کے لیے کہیں جا نہیں پاتے ہیں۔“

وہ بولا۔ ”مجھے بھیڑ اچھی لگتی ہے۔ اس طرح عوام کی محبت دیکھتا رہتا ہوں۔ ابھی کہیں تفریح کے لیے جانا چاہتا ہوں۔“

ایک نے کہا۔ ”یہاں بڑے ہی رنگین نائٹ کلبس ہیں۔ لیکن آپ کو شراب اور شباب سے دلچسپی نہیں ہے۔“

اس نے پوچھا۔ ”کیا ہماری دنیا میں کوئی ایسا کلب نہیں ہے جہاں ماں بہنیں تفریح کے لیے آتی ہوں۔“

وہ ہنسنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ”ماں بہنوں کے کلب کو دینی مجلس کہتے ہیں۔ وہاں تفریح نہیں ہوتی۔ دین ایمان کی باتیں ہوتی ہیں۔ البتہ خوبصورت نائٹ پارکس ہیں۔ وہاں مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے کھیل تماشے دیکھنے آتے ہیں۔“

”میں وہاں جاؤں گا۔“

انہوں نے اسے ایک فن فیئر میں پہنچا دیا۔ ایسے تفریحی میلے میں عورتیں اور بچے دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ بھی عمر کے حساب سے بچہ ہی تھا۔ پھر وہاں بھی وہی تماشا ہوا۔ میلا دیکھنے والے پرنس کو دیکھنے اور باتیں کرنے کے لیے قریب آنے لگے۔

ایک دس برس کی لڑکی ائرگن سے شوٹ کرنے اور غبارے پھوڑنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ اس نے پیچھے آ کر اس کے دونوں ہاتھوں کو گن سمیت پکڑ لیا۔ پھر اس لڑکی نے ٹریگر کو دبانا شروع کیا تو غبارے شور مچاتے ہوئے پھٹنے لگے۔ سب لوگ تالیاں بجانے لگے۔

لڑکی نے اس سے لپٹ کر اسے چوم کر کہا۔ ”پرنس! مائی برادر! یو آر گریٹ۔“

وہاں ایک دوسرے کو چومنے میں، ایک دوسرے سے لپٹنے میں پاکیزگی تھی۔ وہاں سب ہی اس کی بہنیں تھیں یا مائیں تھیں۔ اس ماحول میں اسے پاکیزہ اور روحانی مسرتیں حاصل ہو رہی تھیں۔ وہ ان کے ساتھ ہنس بول رہا تھا۔ آنکھ مچولی کھیلنے کے انداز میں کبھی ان سے چھپ رہا تھا۔ کبھی انہیں اپنے پیچھے دوڑا رہا تھا۔ ان کے ساتھ ناچ رہا تھا، گا رہا تھا اور اپنے مزاج کے مطابق صاف ستھری مسرتیں حاصل کر رہا تھا۔

ایسا لطف حاصل ہو رہا تھا کہ وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ فجر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ وہاں نہ کہیں مسجد تھی، نہ اذان سنائی دیتی تھی۔ اس کے باوجود اسے معلوم ہو جاتا تھا کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔

اس نے فن فیئر کے انچارج سے کہا کہ بیس منٹ کے لیے میوزیکل پروگرام بند کر دیے جائیں۔ وہ عبادت میں مصروف رہے گا۔ کریگ ہوسٹن اور دوسرے یہودیوں کو یہ اچھا نہیں لگا۔ لیکن انہوں نے گانے بجانے کی آوازیں بند کرا دیں۔

مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے اس سے ذرا دور ہو کر دیکھنے لگے۔ وہ وضو کر رہا تھا اور ایک اونچے چبوترے پر جا کر نماز ادا کر رہا تھا۔ یہودی عوام کے لیے وہ نئی بات تھی۔ عبادت کرنے کا نیا طریقہ تھا۔ پھر وہ نماز کے بعد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں ہاتھوں کو کانوں پر رکھ کر بلند آواز سے سورۃ التوبہ کی آیت پڑھنے لگا۔

اس تفریحی میلے میں ساری رات شور بپا رہا تھا۔ گانے بجانے کی آوازیں گونجتی رہی تھیں۔ اب یکلخت خاموشی چھا گئی تھی وہ سب دم بخود ہو کر سن رہے تھے۔

عابی کو کوئی روک نہ سکا۔ عبادت کرنے اور آیات پڑھنے پر اعتراض نہ کر سکا۔ یہودیوں کی اپنی حکمت عملی تھی۔ وہ بڑی خاموشی سے برداشت کرتے ہوئے اسے اسرائیل کے شہر تل ابیب لے جا رہے تھے۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

قرض

ڈاکٹر ساجد امجد

قدرت کا اصول ہے جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے اور جو بوتا ہے اسے ویسی ہی فصل کاٹنا پڑتی ہے۔ اس پر بھی ایک ایسا ہی قرض تھا جسے جانے انجانے میں چاہنے اور نہ چاہنے کے باوجود ہر حال میں اتارنا تھا... سو اس نے اتار پھینکا مگر... اس کے لیے اسے جو قیمت ادا کرنا پڑی شاید کسی انسان کی سوچ میں بھی نہیں آسکتا تھا لیکن قدرت کی وسعت اور دسترس سے کون بھاگ سکتا ہے بھلا...

''رزق حلال عین عبادت ہے'' اس نصیحت سے فرار ہونے والوں کا احوال

دولت نے سب کو ایسا اندھا کر دیا تھا کہ آج کی رونق میں کل کی نحوست کسی کو نظر نہیں آرہی تھی۔

نیاز احمد ایک ایسے محکمے میں تھے جہاں قدم قدم پر رشوت تھی۔ کب تک وہ اس نحوست سے بچتے۔ بچوں کی ضروریات کے نام پر ایک دن انہوں نے بھی اس دلدل میں پاؤں رکھ دیا اور پھر دھنستے ہی چلے گئے۔ وہ یہ بھول ہی گئے یا جان بوجھ کر لاعلم بنے رہے کہ اپنے بچوں کو لقمہ حلال کھلاؤ۔ حرام کا لقمہ کبھی نہ کبھی اثر ضرور دکھاتا ہے۔



حرام کی کمائی کی چمک ایسی ہوتی ہے کہ آنکھیں دھندلا جاتی ہیں۔ وہ خود بھی کچھ دیکھنے کے لائق رہے نہیں تھے حالانکہ ان کی بیوی ذکیہ بیگم دبے لفظوں میں ٹوکتی رہتی تھیں۔ اس راہ میں آنے والے خطروں سے آگاہ کرتی رہتی تھیں لیکن ان کے ہر سوال کا جواب نیاز احمد کی ایک ہنسی ہوا کرتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ وہ بھی اسی رنگ میں رنگ گئیں۔ انہیں یقین ہوگیا کہ نیاز احمد ٹھیک کہتے تھے۔ ”جائز طریقے سے تو دو وقت کی روٹی بھی نہیں مل سکتی۔ اب دیکھنا میں تمہیں کیسے عیش کراتا ہوں۔“

ذکیہ بیگم کسی پارٹی میں جانے کے لیے تیار ہوئیں اور ایک ایک کرکے زیور پہننے شروع کیے تو انہیں نیاز احمد پر فخر ہونے لگا۔ اب وہ برسنے والی دولت کو رشوت نہیں ذہانت سے کمائی ہوئی دولت کہنے لگی تھیں۔

رشوت کی دولت میں برکت ہوتی ہے نہ مروت۔ نیاز احمد ہزاروں لاتے دونوں ہاتھوں سے لٹاتے اور پھر ہاتھ خالی کے خالی۔ مروت کا حال یہ ہوا کہ نیاز احمد نے ایک ایک کرکے سارے رشتے داروں سے تعلق توڑ لیا۔ اس لیے بھی کہ اب یہ سب لوگ ان کے معیار کے مطابق نہیں رہے تھے اور یہ خوف بھی تھا کہ کوئی کچھ مانگ نہ لے۔ چند مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ وہ بھری دنیا میں اکیلے رہ گئے۔ سسرال میں پہلے بھی کوئی نہیں تھا اب دونوں کنارے خالی پڑے تھے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ بڑے لوگوں سے تعلقات پیدا کیے جائیں۔ ان لوگوں سے تعلقات استوار کرنے کے لیے گھر بھی تو بڑا ہونا چاہیے۔ نیاز احمد نے بزرگوں کی نشانی دو سو گز کا گھر فروخت کردیا۔ بہت ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد بھی اتنے پیسے جمع نہ ہوسکے کہ کوئی شاندار کوٹھی خریدی جاسکے لہٰذا ایک شاندار کوٹھی کرائے پر لے لی گئی۔ یہ سوچنے کی فرصت کسے تھی کہ سر چھپانے کا ٹھکانا بھی ہاتھ سے گیا۔ نیاز احمد نے شراب پینی شروع کردی اور آئے دن ایسی پارٹیاں بھی برپا ہونے لگیں جن میں شراب پانی کی طرح بہائی جاتی۔

یہ سوچنے کی فرصت کسی کو نہیں تھی کہ اگر رشوت کا دروازہ کسی وقت بند ہوا تو محض تنخواہ سے اتنے اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔ یہ احساس پہلی مرتبہ اس وقت ہوا جب ان کی تبدیلی کے احکامات آگئے۔ انہیں معلوم تھا کہ جہاں ان کا ٹرانسفر کیا جارہا ہے وہاں دریا نہیں صحرا ہے، تنخواہ ہی تنخواہ ہے رشوت کا نام کوئی نہیں۔ یہ ایسا جھٹکا تھا جس نے ان کے ہوش اڑا دیے۔ انہیں پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ پاؤں پھیلانے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے تھا کہ چادر پرائی ہے۔ بڑے لوگوں سے تعلق داری کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ سر پر لٹکی تلوار کچھ دیر کے لیے ہٹ گئی۔ تعلقات کام آگئے اور تبادلہ رک گیا۔

یہ حادثہ ٹل تو گیا تھا لیکن ہوا تو کبھی بھی اپنا رخ بدل سکتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتے ان کی بیوی نے توجہ دلائی۔

”میں ایک بات آپ سے کہوں۔ ہمیں کچھ پس انداز کرکے رکھنا چاہیے یا آمدنی کا کوئی اور ذریعہ بھی سوچنا چاہیے۔ اگر آپ کا تبادلہ پھر کہیں ہوگیا تو بار بار کس کی سفارش لگواتے پھریں گے۔“

”تبادلے اتنی جلدی جلدی نہیں ہوتے اور پھر جب تک جمالی صاحب موجود ہیں، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”آپ نے خود ہی کہہ دیا کہ جب تک جمالی صاحب موجود ہیں۔ جمالی صاحب نہ رہے تو کیا ہوگا۔“

”بیگم کیا ہوگیا ہے آپ کو۔ کیوں اتنی وہمی ہوگئی ہیں آپ۔“

”میں نے تو ایک بات کہہ دی۔ صفیہ بڑی ہورہی ہے۔ اس کی شادی کے لیے بھی کچھ بچا کے رکھنا ہے۔“

”خدا کا خوف کرو بیگم۔ صفیہ ابھی بارہ سال کی ہوئی ہے۔“

”لڑکیوں کو بڑھتے دیر نہیں لگتی۔ جمع تو ابھی سے کرنا ہوگا۔“

بات اس وقت تو آئی گئی ہوگئی لیکن نیاز احمد کے کان ضرور کھڑے ہوگئے۔ وہ سنجیدگی سے سوچنے لگے کہ آمدنی کا کوئی اور ذریعہ ضرور تلاش کرنا چاہیے۔

اس گفتگو کو کئی دن گزر گئے تھے۔ ذکیہ بیگم بھی یہ سوچ کر خاموش ہوگئی تھیں کہ نیاز احمد نے اب تک ان کی کون سی مانی ہے جو اب مانیں گے۔ جیسی گزر رہی ہے ویسی ہی گزرتی رہے گی۔

دن گزر رہے تھے کہ ایک دن نیاز احمد جس شخص کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے وہ ذکیہ بیگم کے لیے نیا نہیں تھا لیکن اسے اپنے گھر میں دیکھ کر ذکیہ بیگم کو تعجب ضرور ہوا تھا۔ اس لیے بھی کہ وہ اعجاز احمد یعنی ان کا دیور تھا۔ نیاز احمد کا چچا زاد بھائی۔ نیاز احمد قسم کھا چکے تھے کہ وہ رشتہ داروں میں سے کسی سے نہیں ملیں گے اور اب وہ اعجاز کو اپنے گھر ہی لے کر چلے آئے تھے۔ اس لیے بھی تعجب ہوا تھا کہ اعجاز کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ نیاز احمد اس کی غنڈا گردی کی وجہ سے

اس سے قطع تعلق کر چکے تھے۔
اعجاز احمد ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ ملازم ذکیہ بیگم کو بلانے کے لیے آ گیا۔ وہ چاہتیں تو جانے سے انکار کر سکتی تھیں لیکن انہیں معلوم تھا کہ اگر وہ نہیں گئیں تو نیاز احمد خود بلانے آ جائیں گے۔ انہیں تجسس بھی تھا کہ اعجاز کیوں آیا ہے۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک کا ہلکا سا ہاتھ پھیرا اور ڈرائنگ روم میں پہنچ گئیں۔

''نیاز بھائی، آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔ چپکے چپکے اتنی دولت جمع کر لی اور......'' اعجاز احمد کے منہ کی بات منہ ہی میں رہ گئی اور اسے ذکیہ بیگم کے استقبال کے لیے کھڑا ہونا پڑا لیکن شاید وہ اپنا کہا ادھورا چھوڑنے کا عادی نہیں تھا۔ اس نے بات پھر وہیں سے شروع کی۔

''بھابی، ابھی آپ کے آنے سے پہلے میں یہ کہہ رہا تھا کہ نیاز بھائی نے چپکے چپکے اتنی دولت جمع کر لی اور ہمیں خبر ہی نہیں ہوئی۔''

ذکیہ بیگم نے اس بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور نیاز احمد سے مخاطب ہو کر اعجاز کے بارے میں پوچھنے لگیں۔

''اتنے دنوں بعد آج اعجاز بھائی آپ کو کہاں مل گئے۔ چلو آپ کے رشتے داروں میں سے کوئی تو آپ کو ملا۔''

''بیگم آپ کو تو معلوم ہی ہے۔ رشتے داروں پر میں جان چھڑکتا ہوں۔ اب لوگ خود ہی مجھ سے نہ ملیں تو میں کیا کروں۔ کچھ مصروفیات ایسی ہو گئی ہیں۔ اعجاز نے مجھ سے ملنا چاہا تو سر آنکھوں پر بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ احباب کے ہجوم میں جتنی خوشی اعجاز کے آنے کی ہوئی ہے کسی اور کے آنے سے نہ ہوتی۔''

''یہ خوشی تو ظاہر ہو رہی ہے، میں تو یہ پوچھ رہی ہوں کہ ان سے ملاقات کہاں ہوئی؟''

''خون، خون کو کھینچ ہی لیتا ہے۔'' نیاز احمد نے کہا اور اعجاز احمد کی تعریفوں کے ایسے پل باندھے جو ذکیہ بیگم نے اس سے پہلے نہیں سنے تھے۔ وہ تو ہمیشہ یہ کہتے رہے تھے کہ اعجاز احمد بری صحبتوں میں پڑ گیا ہے، اس سے ملنا خطرے سے خالی نہیں۔ دور رہنا ہی بہتر ہے۔

انہیں یہ تعجب ہو رہا تھا کہ نیاز احمد کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اعجاز پر ایک مرتبہ قتل کا مقدمہ چلا تھا۔ یہ الگ بات کہ الزام ثابت نہیں ہوا تھا لیکن سب کو یقین تھا کہ قتل اسی نے کیا ہے۔

ذکیہ بیگم یہ جاننے کے لیے بے چین ہو رہی تھیں کہ آخر وہ کون سی بات ہے کہ نیاز احمد اس کے آگے بچھے چلے جا رہے ہیں۔ انہیں انتظار تھا کہ اعجاز احمد اٹھ کر جائے تو وہ نیاز احمد سے بات کریں لیکن جب نیاز نے ملازم کو حکم دیا کہ وہ لان میں کرسیاں ڈال دے تو ذکیہ بیگم کو یقین ہو گیا کہ وہ ابھی جانے والا نہیں۔ لان میں کرسیاں ڈالنے کا مطلب یہ تھا کہ شراب کی محفل جمے گی۔ ان محفلوں میں وہ بھی بیٹھ جایا کرتی تھیں لیکن اعجاز کے ساتھ بیٹھنا گوارا نہیں تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ گئیں۔ وقت ایسا ہو گیا تھا کہ کچھ دیر بعد دو ایک دوست اور آ گئے اور پھر رات گئے تک ہلا گلا ہوتا رہا۔

نیاز احمد دوستوں کو رخصت کرنے کے بعد بیڈ روم میں آئے تو ذکیہ بیگم جاگ رہی تھیں لیکن نشے کی حالت میں کوئی سنجیدہ بات کرنی مشکل تھی لہٰذا انہوں نے نیاز احمد کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ دوسرے دن اتوار تھا لہٰذا جو کچھ کہنا تھا وہ کل پر اٹھا رکھا۔

صبح ہوئی اور نیاز احمد ناشتے کی ٹیبل سے اٹھ کر کمرے میں آئے تو ذکیہ بیگم نے اعجاز کا ذکر چھیڑ دیا۔ ''آپ نے یہ کیا عقل مندی کی۔ اعجاز کو یہاں لے آئے۔''

''اس میں کیا حرج ہو گیا؟''

''میں تو سمجھ رہی تھی آپ کا نشہ اتر گیا ہو گا مگر آپ تو ابھی تک نشے میں ہیں۔''

''بھئی مجھے تنگ نہ کریں۔ جو پوچھنا ہے صاف صاف پوچھیں۔''

''میں کہہ یہ رہی تھی کہ اسے آپ کو یہ گھر نہیں دکھانا چاہیے تھا۔''

''یہ بھی تو پوچھو میں اسے یہاں لے کر کیوں آیا تھا اور اس کی خاطر مدارات میں کیوں لگا ہوا تھا۔''

''یہی تو پوچھ رہی ہوں اتنی دیر سے اور کیا پوچھ رہی ہوں۔''

''اعجاز اب ویسا نہیں رہا جیسا تم سمجھ رہی ہو۔ پچھلے دنوں تو اس کا بزنس خوب چمک رہا تھا، آج کل کچھ کرائسس میں ہے لیکن بزنس کا تجربہ خوب ہو گیا ہے۔ میری اس سے ملاقات اتفاقیہ ہو گئی اور پھر بزنس کا ذکر نکل آیا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ کچھ رقم میں لگاؤں، کچھ وہ لگائے اور مل کر بزنس کرتے ہیں۔ مجھے تو کچھ تجربہ ہے نہیں۔ اس کے تجربے سے فائدہ اٹھایا تو فائدہ ہی فائدہ ہے۔''

''دیکھ لیں۔ چور اہے کی ہنڈیا والی مثال سامنے نہ آئے۔''

''میں بھی کوئی بچہ نہیں ہوں۔ جو معاہدہ ہو گا تحریری ہو گا۔ کئی وکیل میرے دوست ہیں، فکر مت کرو ہر کام پکا

کروں گا۔"

"آپ جانیں۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

اعجاز اب ہر دوسرے تیسرے دن آرہا تھا۔ زوروشور سے بزنس کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ نیاز احمد نے ایک خطیر رقم اس کے حوالے کی۔ ایک دفتر کرائے پر لیا اور بقول نیاز احمد کے بزنس شروع ہوگیا۔ بزنس کیا تھا، اس کی نوعیت کیا تھی؟ ذکیہ بیگم کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ بزنس کی گتھیوں سے کیا واقف ہوتیں۔ وہ تو بس اتنا جانتی تھیں کہ بزنس کرنے والے بہت دولت مند ہوجاتے ہیں۔ وہ اس دولت سے اپنی بیٹی صفیہ کی شاندار شادی کرسکتی ہیں۔ فراز اور شہزاد دونوں بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر بھیج سکیں گی۔ صفیہ ابھی بارہ سال کی تھی، فراز آٹھ سال کا ہوگا اور شہزاد تو محض چار سال ہی کا تھا۔ اس نے بہ مشکل اسکول جانا شروع کیا ہی تھا۔

بزنس شروع کرنے کے بعد ڈیڑھ دو سال نہایت آرام سے گزر گئے۔ نیاز احمد کو تو جیسے فرصت ہی نہیں تھی۔ سارا کاروبار اعجاز نے سنبھالا ہوا تھا۔ اس کے باوجود نیاز احمد کے حصے میں منافع کی شرح اچھی خاصی آرہی تھی لیکن پھر اچانک بزنس میں خسارہ شروع ہوگیا۔ نیاز احمد نے ابتدا میں اس خسارے کو بزنس کا حصہ سمجھا اور برداشت کرتا رہا لیکن جب منافع کی شرح کم ہوتے ہوتے بالکل ہی ختم ہوگئی تو اس نے اعجاز سے باز پرس کی۔ بس یہیں سے وہ اختلافات شروع ہوگئے جو آگے چل کر بہت بڑے حادثے کا سبب بننے والے تھے۔

نیاز احمد کی شکایتیں روز بروز بڑھتی جارہی تھیں۔ منافع صفر ہوگیا تھا لیکن اعجاز احمد منافع کی مد میں اپنا حصہ برابر وصول کررہا تھا جو نیاز احمد اپنی جیب سے ادا کررہا تھا۔ اعجاز نے نہایت معمولی رقم کاروبار میں لگائی تھی اور لاکھوں وصول کرچکا تھا۔ نقصان کا سارا بوجھ نیاز احمد کے کاندھوں پر آن پڑا تھا۔ اس کا اکاؤنٹ تقریباً خالی ہوگیا تھا۔ اس کے عملے میں بھی کچھ ایسی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں کہ رشوت کی رقم نے آنکھیں پھیرلی تھیں۔ اعجاز احمد کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس کے مطالبات بڑھتے جارہے تھے۔

ذکیہ بیگم کو کچھ معلوم نہیں تھا لیکن وہ دیکھ رہی تھیں کہ نیاز احمد بہت پریشان رہنے لگے ہیں۔ آخر ایک دن یہ راز کھل ہی گیا۔ نیاز احمد کو سب کچھ بتانا پڑا۔

"میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ اس شخص پر بھروسا مت کریں لیکن آپ کسی کی سنتے کہاں ہیں۔"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ ناگ بن کر مجھے ڈسے گا۔ اب تو وہ محض منافع نہیں اپنے اخراجات کے لیے بھی آئے دن رقم کا مطالبہ کرتا رہتا ہے۔"

"آپ بھی ہاتھ کھینچ لیں۔ کہہ دیں کہ جب نقصان ہو رہا ہے تو نقصان میں بھی برابر کے شریک ہو۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہے ذکیہ بیگم۔ مجھے تو اب معلوم ہوا ہے کہ وہ ایک چھٹا ہوا بدمعاش ہے۔ انسانی اسمگلنگ تک میں تو وہ ملوث ہے۔ ابھی تک تو وہ سیدھی انگلیوں سے گھی نکال رہا ہے کسی وقت انگلیاں ٹیڑھی کیں تو میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکوں گا۔ میں اسے ٹکڑے ڈالتا رہتا ہوں مگر اب وہ روٹیاں طلب کررہا ہے۔ مجھے رشوت خوری کے طعنے دیتا ہے۔ اب مجھ سے اپنی بے عزتی برداشت نہیں ہوتی۔"

"ایک مرتبہ اسے صاف جواب دے کر تو دیکھیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔"

"میں بہت ڈر گیا ہوں ذکیہ بیگم۔"

"وہ اس کا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ جتنی رقم اس نے لگائی ہے وہ اس کے منہ پر ماریں اور کہہ دیں کہ آپ کاروبار ختم کررہے ہیں۔ آپ ایک ہی مرتبہ زیربار ہوں گے روز روز کے تقاضوں سے تو نجات مل جائے گی۔"

کئی دن تک گھر میں یہی باتیں دہرائی جاتی رہیں۔ نیاز احمد کی کم ہمتی کوئی قدم اٹھانے سے روکتی رہی لیکن آخر کب تک۔ ایک دن انہوں نے اعجاز احمد سے بات کی اور اس سے کہہ دیا کہ جب مسلسل نقصان ہورہا ہے تو ایسے کاروبار کا کیا فائدہ۔ میں دفتر بند کررہا ہوں۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ اعجاز احمد یہ سن کر بوکھلا جائے گا لیکن وہ نہایت مطمئن تھا بلکہ اس نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔

"آپ کو ان حالات میں یہی کرنا چاہیے۔ میں تو کب سے اس دن کے انتظار میں تھا۔ آپ میرے پچاس لاکھ مجھے واپس کردیں پھر شوق سے ہم ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ دیں گے۔"

"پچاس لاکھ! تم نے کبھی دیکھے بھی ہیں پچاس لاکھ۔ تم نے صرف دو لاکھ ملائے تھے اور اب تک سوگنا زیادہ وصول کرچکے ہو۔ پھر بھی میں تمہیں تمہارے دو لاکھ واپس کردوں گا۔"

"نیاز احمد! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ پچاس لاکھ لے کر مکر جاؤ گے لیکن میں ایسی نرم ہڈی بھی نہیں ہوں کہ اپنے پیسے چھوڑ دوں۔ مجھے کل تک پچاس لاکھ لوٹا دو ورنہ پھر ایک کروڑ وصول کروں گا۔"

''اعجاز احمد، یہ مت بھولو کہ ہمارے درمیان تحریری معاہدہ ہوا تھا۔ اس میں دو لاکھ کی رقم تحریر تھی۔''

''مجھ سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ وہ معاہدہ تمہارے ہی پاس رہ گیا تھا۔'' نیاز نے مزید کہا۔

''وہ کاغذ اب بھی میرے پاس ہے لیکن اس میں پچاس لاکھ لکھے ہوئے ہیں۔ کہو تو دکھا دوں۔''

''تم نے اگر اس میں خرد برد کی ہے تو میں قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہوں۔''

''چارہ جوئی کس بنیاد پر کرو گے۔ کیا ثبوت پیش کرو گے۔ ثبوت تو میرے پاس ہے۔''

''تم نے ضرور میرے جعلی دستخط بنائے ہوں گے۔ میں عدالت میں چیلنج کروں گا۔''

''ایسی غلطی کرنا بھی مت۔ میں عدالت تک جانے کے لیے تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ رشوت سے کمائی ہوئی دولت سے بھی جاؤ گے اور جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔''

''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔''

''اگر میرے پچاس لاکھ مجھے مل جائیں تو یہ دھمکی واپس بھی ہو سکتی ہے۔''

''میرے بھائی، تمہیں میری حالت کا علم ہے۔ اتنی بڑی رقم میں تمہیں کہاں سے دوں گا۔''

''یہ میرا مسئلہ نہیں۔ میں صرف دو دن تمہیں دے رہا ہوں اس کے بعد ایک کروڑ دینا ہوں گے۔''

''اعجاز احمد، کان کھول کر سن لو۔ میں تمہیں پھوٹی کوڑی بھی نہیں دوں گا۔''

''میں دو دن تک تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔''

اعجاز احمد اٹھ کر چلا گیا۔ نیاز احمد قدرے مطمئن ہو گئے کہ دو دن بہت ہوتے ہیں وہ اپنے بچاؤ کے لیے کوئی نہ کوئی ترکیب نکال ہی لیں گے۔

اعجاز کے اٹھتے ہی وہ اپنے بینک گئے۔ اکاؤنٹ میں جتنی رقم تھی سب ایک دوسرے خفیہ اکاؤنٹ میں منتقل کر دی جس کا علم ان کے سوا کسی کو بھی نہیں تھا۔ دراصل انہیں شک تھا کہ اعجاز ان کے جعلی دستخط کر کے رقم نکلوا لے گا۔ یہ بھی خیال تھا کہ اب جو قدم وہ اٹھانے والے ہیں اس کے بعد شاید ان کا اکاؤنٹ بھی چیک ہو۔ لاکر میں بیوی کا زیور رکھا تھا وہ بھی نکلوا کر گھر لے آئے۔

ذکیہ بیگم کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا کھچڑی پک رہی ہے۔

دو دن بعد اعجاز پھر آیا۔ خوب تلخ کلامی ہوئی۔ مزید دو دن کی مہلت دے کر وہ دھمکیاں دیتا ہوا چلا گیا۔ اس مرتبہ وہ گھر آ گیا تھا لہٰذا ذکیہ بیگم نے بھی تمام باتیں سن لیں۔ وہ اتنی ڈر گئیں کہ نیاز احمد کے کاندھے پہ سر رکھ کر خوب روئیں۔

''میں تو کہتی ہوں کہیں سے بھی کر و اس کا مطالبہ پورا کرو۔ مجھے دولت نہیں اپنے بچوں کی زندگی چاہیے۔''

''بیگم اب وہ ایک کروڑ مانگے گا اور میرے پاس اتنا نہیں ہے۔''

''میرا زیور بیچ دو۔ کچھ کرو اس کا مطالبہ پورا کرو۔ ہم پھر سے غریب ہو جائیں مجھے گوارا ہے۔ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو میں دولت کے سہارے کب تک زندہ رہ لوں گی۔''

دوسرے دن جیولر کے پاس جا کر تمام زیور بیچ دیا گیا لیکن اتنی دیر میں ذکیہ بیگم اپنا ارادہ بدل چکی تھیں۔ اب انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ اعجاز کو رقم نہ دی جائے بلکہ اس کے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کرائی جائے۔ نیاز احمد کی اپنی تو کوئی رائے تھی نہیں۔ انہوں نے یہ مشورہ بھی مان لیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ جب تک اعجاز کو ٹالا جا سکتا ہے ٹالا جائے۔ نیاز احمد اس پر عمل بھی کرتے رہے۔ اعجاز احمد ڈھیل بھی دیتا رہا لیکن کسی ذریعے سے اسے معلوم ہوا کہ نیاز احمد چپکے چپکے باہر جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ نیاز احمد کی کسی وکیل سے بات ہوئی ہے اور وہ اس پر مقدمہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ یہ خبر ایسی تھی کہ اسے یقین کرنا پڑا کیونکہ یہ خبر گھر کے ایک نوکر کے ذریعے اس تک پہنچی تھی۔ اگر نیاز احمد عدالت چلے جاتے تو اس کی جعل سازی کا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا۔ بس اب وہ نیاز احمد کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی رات نیاز احمد کا گھر شعلوں کی نذر ہو گیا۔ جب تک لوگوں کو خبر ہوتی، فائر بریگیڈ کی گاڑیاں آتیں، نیاز احمد کے خاندان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا۔

اپنی مفلسی ظاہر کرنے کے لیے ایک دن پہلے ہی انہوں نے تمام ملازموں کو ملازمت سے نکال دیا تھا۔ صرف ایک ملازم رہنے دیا تھا جو اس وقت اپنے سرونٹ کوارٹر میں سو رہا تھا اور آگ کے شعلوں سے دور تھا۔ صبح ہوتے ہی وہ بھی کہیں بھاگ گیا۔

سب سے پہلے پہنچنے والوں میں اعجاز ہی تھا جو یہ درست دعویٰ بھی رکھتا تھا کہ وہ نیاز احمد کا کزن (بھائی) ہے اس وقت وہ مگرمچھ کے آنسو بھی بہا رہا تھا۔ اس نے اپنی مدعیت میں آتش زدگی کی رپورٹ بھی درج کرائی۔

کسی اور رشتے دار نے اپنا کوئی حق نہیں جتایا لہٰذا ایک طویل جدوجہد کے بعد اعجاز احمد نے اپنا حقِ وراثت تسلیم کرا لیا اور جو سامان جلنے سے رہ گیا تھا اس کی ملکیت میں چلا گیا۔

سب یہی سمجھ رہے تھے کہ گھر میں جتنے افراد تھے سب جھلس کر مر گئے۔ کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا لیکن نیاز احمد کا ایک بیٹا جس کی عمر چھ سات سال سے زیادہ نہیں تھی بچ نکلا تھا۔ وہ اور اس کا بڑا بھائی ایک کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ شہزاد کی آنکھ بڑے بھائی کی چیخوں سے کھلی۔ اس نے دیکھا کہ پورے کمرے میں آگ پھیلی ہوئی ہے۔ یہ معجزہ ہی تھا کہ آگ اس کے بستر تک نہیں آئی تھی۔ وہ بستر سے اتر کر بھاگا اور اس کمرے کی طرف بھاگا جہاں اس کے ممی ڈیڈی سو رہے تھے لیکن یہاں بھی چیخوں کا شور مچا ہوا تھا۔ وہ بہن کے کمرے کی طرف گیا۔ یہ دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔ وہ بے تحاشا باہر کی طرف بھاگا۔ اس نے سوچا تھا کہ چوکیدار کو جا کر بتائے گا لیکن چوکیدار غائب تھا۔ غالباً آگ لگی نہیں لگائی گئی تھی اور چوکیدار کو وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ تنہا شہزاد یہ سوچ کر گلی میں آیا کہ کسی پڑوسی کو بتائے گا لیکن پھر وہ ڈر گیا۔ وہ مخالف سمت دوڑ پڑا اور پھر دوڑتا چلا گیا۔ گھر کے پیچھے ریل کی پٹری بچھی ہوئی تھی۔ وہ اس پٹری کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔

صبح نمودار ہو گئی۔ کسی نے بھی غور نہیں کیا کہ اتنا چھوٹا بچہ پٹری پر کیوں دوڑتا چلا جا رہا ہے۔ یہ پٹری اسے اسٹیشن کی طرف لے گئی۔ اسے ڈر تھا کہ کوئی اسے پکڑ نہ لے۔ شاید وہ لوگ یہاں بھی آ جائیں جنہوں نے اس کے گھر میں آگ لگائی ہے۔ جتنی دیر میں کوئی اس سے پوچھتا وہ چھپنے کے لیے ایک ڈبے میں چڑھ گیا۔ کسی نے دیکھا ہوگا تو یہی سمجھا ہوگا کہ یہ بچہ کسی کے ساتھ ہے۔ ریل چلنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ اس دھکم پیل میں وہ ایک طرف سمٹ کر بیٹھ گیا۔ ریل نے سیٹی بجائی پھر ایک جھٹکا سا لگا اور پھر ریل رینگنے لگی۔

وہ خوش ہو گیا کہ اپنے جلے ہوئے گھر سے دور جا رہا ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے سو گیا۔

جب ٹرین اچھی طرح رفتار پکڑ چکی تو ایک صاحب کی نظر اس پر پڑی۔

"یہ بچہ کس کے ساتھ ہے؟"

ایک سے پوچھا دوسرے سے پوچھا۔ وہ کسی کے ساتھ بھی نہیں تھا۔

"بھائیو! یہ بچہ گھر سے بھاگ کر تو کہیں نہیں جا رہا ہے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے گم ہو گیا ہو۔ راستہ بھٹک گیا ہو۔"

"یہ بچہ اتنا بڑا تو ہے کہ اصل بات بتا سکتا ہے۔"

"یہ تو سو رہا ہے کیسے بتائے گا۔"

"اٹھا کر پوچھ لو۔"

"فائدہ کیا۔ ابھی تو ٹرین میں ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ ٹرین سے اتر کر بھاگ تو جائے گا نہیں۔ سو کر اٹھے گا تو پوچھ لیں گے۔"

جتنے منہ اتنی باتیں ہوتی رہیں اور وہ مزے سے سوتا رہا۔

دو ڈھائی گھنٹے بعد ایک اسٹیشن آیا۔ ٹرین نے جھٹکا دیا تو وہ بھی اٹھ بیٹھا۔ لوگوں نے اس پر سوالوں کی یلغار کر دی لیکن وہ یوں خاموش تھا جیسے قوتِ سماعت سے محروم ہو۔

"اس کی عمر پر نہ جاؤ۔ ایسے بچے جیب کترے بھی ہوتے ہیں۔ کسی کی جیب صاف کر کے چلتا بنے گا۔"

"کیوں کسی معصوم پر الزام لگاتے ہو۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے یہ سن نہیں سکتا ہو۔"

"جی نہیں۔ ابھی میں نے آواز دی تھی تو اس نے میری طرف دیکھا تھا۔ میں دعوے سے کہتا ہوں یہ سن بھی سکتا ہے، بول بھی سکتا ہے۔ جان بوجھ کر کچھ نہیں بتا رہا ہے۔"

"بے چارہ جانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا پھرے گا۔ اسے ریلوے پولیس کے حوالے کر دو۔ وہ خود اسے اس کے گھر پہنچا دیں گے۔" پولیس کا نام سنتے ہی اس نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

"مجھے پولیس سے مت پکڑوانا۔ وہ مجھے ماریں گے۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ مجھے پولیس سے مت پکڑوانا۔"

"اچھا پولیس کو نہیں دیں گے۔ یہ بتاؤ تم گھر سے کیوں بھاگے۔"

"انہوں نے میرے گھر میں آگ لگا دی تھی۔"

"کس نے آگ لگا دی تھی؟"

"پتا نہیں، بس آگ لگا دی تھی۔"

"تمہارے ابا نے تمہیں بچایا نہیں؟"

"وہ بھی جل گئے امی بھی جل گئیں، باجی بھی، سب جل گئے۔"

"واہ بیٹا۔ سب جل گئے بس تم بچ گئے۔"

کسی نے اس کہانی پر یقین کیا کسی نے نہیں کیا بالآخر یہ طے ہوا کہ اسے آنے والے اسٹیشن پر ریلوے حکام کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ اسے کسی فلاحی ادارے تک پہنچا دیں گے۔ جو اسے اس کے ماں باپ تک پہنچا دیں گے یا کوئی بے اولاد جوڑا اسے اپنی مامتا کی تسکین کے لیے اپنے گھر میں پناہ دے دے گا۔ در بدر ٹھوکریں کھانے سے تو بچ جائے گا۔

وہ بچہ گھٹی گھٹی سسکیوں کے درمیان سب کی باتیں سن

رہا تھا۔ خاص طور پر ان صاحب کی باتیں جو بار بار پولیس کے حوالے کرنے کا مشورہ دے رہے تھے۔
اتنی دیر میں گاڑی نے اسٹیشن چھوڑ دیا تھا۔
باتوں کے کارخانے میں باتیں بننا بند ہو گئیں۔ ٹرین کی آواز لوری سنا رہی تھی۔ بچہ پھر سو گیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو گاڑی میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ ڈبے میں لائٹیں جل گئی تھیں۔
وہ خاموشی سے اٹھا اور باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ گاڑی ابھی چل رہی تھی اس لیے اس کے بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لہٰذا کسی نے روکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔
وہ باتھ روم سے نکلا تو گاڑی نے کسی اسٹیشن کا پلیٹ فارم پکڑ لیا تھا۔ کوئی بڑا شہر معلوم ہوتا تھا کیونکہ پلیٹ فارم پر بھیڑ بہت تھی۔ اسے یاد آیا کہ سب لوگ اسے پولیس کے حوالے کرنے کی بات کر رہے تھے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ گاڑی رکتے ہی پلیٹ فارم پر کود گیا اور بھیڑ میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

اسے اس گھر میں آئے تیسرا دن تھا۔ پورا گھر ابھی اچھی طرح دیکھا بھی نہیں تھا۔ اسی دیکھ بھال میں وہ کچن کی طرف نکل گیا۔ وہ شیف کھانا پکانے میں مشغول تھے۔ ایک بڑا چولہا پوری رفتار سے جل رہا تھا۔ اس کی نظر جیسے ہی چولہے پر پڑی وہ چیختا ہوا بھاگا۔ شیف یہ دیکھنے کے لیے اس کے پیچھے بھاگا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ وہ بھاگتا ہوا... بہ مشکل لیونگ روم تک پہنچا تھا کہ بے ہوش ہو گیا۔ بیگم عابد نے اس کی حالت دیکھی تو شیف پر برس پڑیں۔
”تم نے اس کے ساتھ ایسا کیا کر دیا کہ یہ بے ہوش ہو گیا۔“
”میں تو خود حیران ہوں۔ چھوٹے صاحب کچن میں آئے تھے اور پھر چیختے ہوئے بھاگے اور یہاں آ کر بے ہوش ہو گئے۔“
”ایسا کیا تھا وہاں؟“
”میں تو خود حیران ہوں۔“
سیٹھ عابد اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ انہیں فون کیا گیا۔ ڈاکٹر کو بھی فون کر دیا گیا۔ سیٹھ عابد ابھی پہنچے نہیں تھے کہ ڈاکٹر آ گیا، تھوڑی دیر میں سیٹھ عابد بھی پہنچ گئے۔
ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ کوئی خطرے کی بات نہیں۔ بچہ کسی چیز سے ڈر گیا تھا اور بے ہوش ہو گیا۔ وہ جب ہوش میں آیا تو بیگم عابد نے اس سے پوچھا کہ ایسی کیا بات تھی جس سے تم ڈر گئے اور بے ہوش ہو گئے۔ بچے نے بتا دیا کہ چولہے میں آگ لگ گئی تھی جو پورے گھر کو جلا سکتی تھی۔ اس لیے میں وہاں سے بھاگ آیا تھا۔ سب ہنسنے لگے لیکن ڈاکٹر کو تشویش ہوئی۔
”آپ اسے معمولی بات نہ سمجھیں۔ اس کے لاشعور میں کوئی خوف چھپا ہوا ہے جو آگ دیکھ کر باہر آ جاتا ہے۔ اس نے آتش زدگی کا کوئی خوف ناک مظاہرہ دیکھا ہے جو اس کے ذہن میں بیٹھ گیا ہے۔ یہ واقعہ اس وقت کا بھی ہو سکتا ہے جب یہ گود میں ہو۔ آپ لوگ یاد کریں کیا کوئی ایسا واقعہ پیش آیا تھا؟“
کوئی کیا جواب دیتا۔ اسے تو اس گھر میں آئے صرف تین دن ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کی کوئی بات کسی کو معلوم ہی نہیں تھی۔ ڈاکٹر کو بتانا بھی نہیں چاہتے تھے کہ یہ بچہ ان کا نہیں بلکہ یہ ایک فلاحی ادارے کے پاس تھا۔ انہوں نے تو اسے گود لیا ہے۔ اس کا ماضی ان سے پوشیدہ ہے۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ بچے کو کسی ماہر نفسیات کو دکھایا جائے ورنہ یہ جب آگ کو دیکھے گا ممکن ہے اسی طرح بے ہوش ہو جائے۔
ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد سیٹھ عابد نے ڈاکٹر کی بتائی ہوئی باتوں پر سنجیدگی سے غور کیا۔
”بیگم کیا کہتی ہو۔ کسی نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھایا جائے؟“
”کیا حرج ہے، ورنہ تو ڈاکٹر کہہ رہا تھا یہ بار بار بے ہوش ہو گا۔“
”دکھا تو دوں لیکن وہ اس کا ماضی کھنگالے گا اور ہمارے پاس بتانے کو کچھ بھی نہیں۔ میں یہ بھی بتانا نہیں چاہتا کہ یہ ہمارا بچہ نہیں۔“
”کیا کریں مجبوری ہے بتا دیجیے گا“ ہم نے اسے گود لیا ہے کہیں سے اٹھا کر نہیں لائے ہیں۔ ڈاکٹر حضرات ایسی باتیں راز میں رکھتے ہیں۔“
”اچھا ایسا کرتے ہیں، پہلے آفتاب سے خود پوچھتے ہیں۔ شاید وہ کچھ بتائے۔“ سیٹھ عابد نے کہا۔ ”اگر وہ کچھ بتاتا ہے تو ہم ڈاکٹر کو بتا سکتے ہیں۔“
انہوں نے آفتاب سے پوچھنے کی کوشش کی اور وہ یہ دیکھ کر پریشان ہو گئے کہ پہلے تو اس نے کچھ بتانے سے انکار کیا۔ سوالوں کو گھماتا پھراتا رہا اور جب بہت کریدا گیا تو ڈر کے مارے اس کی مٹھیاں بند ہو گئیں اور وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔ ڈاکٹر کو ایک مرتبہ پھر بلانا پڑا۔
اب ضروری ہو گیا تھا کہ اسے کسی نفسیات کے ڈاکٹر کو دکھایا جائے۔ انہوں نے شہر کے ایک بہت بڑے ڈاکٹر کو فون کیا اور اس سے ٹائم لے لیا۔
سیٹھ عابد نے آفتاب کے بارے میں پہلے ہی سب

کچھ بتادیا یعنی وہ نہ صرف آگ سے ڈرتا ہے بلکہ اتنا خوف زدہ ہوجاتا ہے کہ بے ہوش ہوجاتا ہے۔

سیٹھ عابد جب اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے تو ڈاکٹر آفتاب کے مرض کے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا البتہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ سیٹھ عابد کا بیٹا نہیں ہے۔ سیٹھ عابد یہ بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لانے سے کترا رہا تھا کہ کہیں راز کھل نہ جائے۔ اب مجبوراً اسے لانا پڑا تھا۔

ڈاکٹر نے آفتاب کا مکمل چیک اپ کیا۔ مختلف سوالات کیے جن کے وہ تشفی بخش جوابات نہ دے سکا۔ ڈاکٹر نے خیال ظاہر کیا۔

”بچے کے لاشعور میں کچھ باتیں دبی ہوئی ہیں جنہیں شعور میں لانا ہوگا تاکہ جس خوف کا وہ شکار ہے اس سے نجات مل سکے۔“

”ڈاکٹر صاحب، میں تو ان باتوں کو مانتا نہیں ہوں۔ آپ جو چاہیں کریں۔“

”میں چند دوائیں دے رہا ہوں۔ یہ بچے کو کھلائیں اور ایک ہفتے بعد میرے پاس آئیں۔“

ایک ہفتے بعد جب سیٹھ عابد، آفتاب کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے تو ڈاکٹر پوری تیاری کر چکا تھا۔ اس نے آفتاب کو ایک آرام دہ بستر پر لٹادیا اور خود اس کے قریب بیٹھ گیا۔ پھر اس نے آفتاب کو ہپناٹائز کرنا شروع کیا۔ باتوں باتوں میں اسے آمادہ کرلیا کہ اس سے جو کچھ پوچھا جائے گا وہ اس کے بارے میں جو کچھ جانتا ہے سچ سچ بتائے گا۔ پھر ڈاکٹر نے لفظ ”آگ“ کو کئی مرتبہ دہرایا اور بچے پر زور دیا کہ آگ کے بارے میں اس کے تصور میں جو کچھ آتا ہے بیان کرے۔ آفتاب کچھ دیر تو کچھ کہنے سے کتراتا رہا۔ معالج کے اکسانے پر اس نے سب کچھ اگل دیا۔ وہ پوری کہانی دہرادی جو اس کے گھر والوں پر گزری تھی۔ اس نے باپ کا اصل نام بھی بتادیا جسے اب تک وہ چھپاتا رہا تھا۔ بھائی بہنوں کے بارے میں بھی بتایا اور اپنے بھاگنے کا قصہ بھی بتادیا۔

یہ عمل ہفتے میں دوبار دہرایا گیا۔ معالج اس کے ذہن میں یہ بھی ڈالتا رہا کہ یہ محض ایک حادثہ تھا۔ ہر مرتبہ ایسا نہیں ہوگا۔

یہ علاج ایک ماہ تک جاری رہا۔ نتیجہ نہایت مثبت نکلا۔ آفتاب کو دہکتے ہوئے شعلوں کے قریب لے جاکر کھڑا کردیا اور وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوا۔

پرورش

ایک مالدار نوجوان سے ایک پیشہ ور بھکاری نے کہا۔ ”صاحب کیا بات ہے، دو سال پہلے آپ مجھے پچاس روپے دیا کرتے تھے۔ پچھلے سال سے پچیس روپے دے رہے ہیں اور اس سال کے شروع میں صرف 12 روپے۔“ نوجوان ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔

”دو سال پہلے میں کنوارا تھا، پچھلے سال میری شادی ہوئی تھی اور اب میں ایک بچے کا باپ ہوں۔“

بھکاری برہم ہو کر بولا۔ ”تو گویا آپ میرے پیسوں سے اپنے کنبے کی پرورش کررہے ہیں۔“

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

اب سیٹھ عابد کی باری تھی۔ ڈاکٹر نے ان سے باز پرس کی۔

”آپ یقیناً یہ سب باتیں جانتے ہوں گے۔ آپ مجھے پہلے بتادیتے تو علاج نہایت آسان ہوجاتا۔“

اس کے جواب میں سیٹھ عابد کو حقیقت بتانی پڑی کہ وہ اس کے بچپن سے قطعی ناواقف ہیں کیونکہ وہ ان کا سگا بیٹا نہیں۔

ڈاکٹر نے بچے کے مفاد میں سیٹھ عابد کو مشورہ دیا کہ وہ کسی طرح اس بچے کو وہ مکان دکھادیں جہاں اس کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا تھا ورنہ یہ خوف اس پر دوبارہ حاوی ہوسکتا ہے۔

”یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ہمیں نہ تو اس کے شہر کا علم ہے نہ اس کے رشتے داروں کو جانتے ہیں۔“

”اس نے سب کچھ بتادیا ہے، میں نے رپورٹ میں سب درج کردیا ہے۔ آپ اس سلسلے میں اس فلاحی ادارے کی مدد بھی لے سکتے ہیں جہاں سے یہ بچہ آپ نے لیا تھا۔“

سیٹھ عابد نے یہ رپورٹ لے لی اور گھر چلے آئے۔

انہوں نے سوچا تو ضرور تھا کہ آفتاب کو اس کے شہر لے جائیں تاکہ اس کا علاج مکمل ہوجائے لیکن پھر وہ یہ سوچ کر رک گئے کہ اس کا کوئی رشتے دار دعویدار بن گیا تو آفتاب ان سے چھن جائے گا۔

☆☆☆

سیٹھ عابد متمول ترین تاجر تھے لیکن اولاد کی طرف

سے بدقسمت تھے۔ شادی کے آٹھ سال بعد ایک بیٹی پیدا ہوئی تھی جو اب پانچ سال کی ہوگئی تھی۔ اس کا نام انہوں نے شاہدہ رکھا تھا۔ شاہدہ کی پیدائش کے وقت ہی ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ اب بیگم عابد ماں نہیں بن سکتیں۔

سیٹھ عابد کو بیٹے کی بڑی خواہش تھی لیکن خواہش سے کیا ہوتا ہے۔ وہ دوسری شادی کے حق میں نہیں تھے اس لیے پانچ سال گزر گئے اور وہ بیٹے سے محروم رہے۔ اسی دوران انہوں نے ٹی وی پر ایک بچے کی تصویر دیکھی اور اعلان سنا کہ یہ بچہ اپنے گھر والوں سے بچھڑ گیا ہے۔ کوشش کے باوجود اس کے گھر والوں کا سراغ نہ مل سکا۔ یہ بچہ اپنے بارے میں کچھ بتانے سے بھی قاصر ہے۔ اگر کوئی مخیر اور باحیثیت شخص اس بچے کو بطور اولاد قبول کرنے کا خواہاں ہو تو رابطہ کرسکتا ہے۔

یہ اشتہار ایک فلاحی تنظیم کی جانب سے تھا۔ بچہ نہایت خوب صورت اور معصوم نظر آرہا تھا۔ انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا کہ وہ اس بچے کو اپنے گھر لے آئیں۔ بیوی سے مشورہ کیا تو وہ بھی تیار ہوگئیں۔

"میری شاہدہ کے ساتھ کھیلنے والا کوئی تو ہوگا۔"

وہ اس فلاحی تنظیم کے دفتر پہنچ گئے۔ شہر میں سب ہی انہیں جانتے تھے۔ وہ اس تنظیم کو ہر ماہ ہزاروں روپے چندہ بھی دیا کرتے تھے۔ تنظیم نے بچہ ان کے حوالے کردیا۔

یہ وہی بچہ تھا جس کا نام شہزادہ تھا اور والد کا نام نیاز احمد جس کے گھر میں آگ لگ گئی تھی یا لگادی گئی تھی اور جو ٹرین میں بیٹھ کر اپنے شہر سے دور اس شہر میں آگیا تھا۔ ٹرین سے اترتے ہی پولیس نے اسے پکڑ لیا اور ایک فلاحی ادارے میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں سے وہ سیٹھ عابد کے گھر آگیا۔

سیٹھ عابد نہیں چاہتے تھے کہ کوئی اس کے اصلی نام سے اسے شناخت کرے یا کسی وقت اسے پہچان لیا جائے۔ انہوں نے اس کا نام آفتاب رکھ دیا۔ تیسرے ہی دن وہ واقعہ پیش آگیا کہ وہ آگ کو دیکھ کر بے ہوش ہوگیا۔ پھر اس کا علاج ہوا اور اب وہ نارمل زندگی گزار رہا تھا۔ سیٹھ عابد نے اسے مہنگے ترین اسکول میں داخل کرادیا۔ شاہدہ بھی اسی اسکول میں پڑھ رہی تھی۔ دونوں بہن بھائی ایک ساتھ اسکول جاتے ایک ساتھ واپس آتے۔ ایک ساتھ کھیلتے۔ بیگم عابد دونوں کا پیار دیکھ کر پھولے نہیں سمارہی تھیں لیکن کبھی کبھی وہ آفتاب کو دیکھ کر فکرمند ہوجاتی تھیں۔ دنیا کی ہر نعمت اسے میسر تھی لیکن بعض اوقات وہ ایسا اداس ہوجاتا تھا کہ اس سے بات کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ شاہدہ بھی اس کا موڈ دیکھ کر الٹے قدموں لوٹ آتی تھی۔

ایک دن اس نے عجیب سوال کیا۔

"اگر ہم شاہدہ کا نام صفیہ رکھ دیں؟"

"کیوں، یہ نام تمہیں اچھا نہیں لگتا؟"

"اچھا تو ہے لیکن صفیہ میری بہن کا نام تھا۔"

"یہ بھی تمہاری بہن ہے اور اس کا نام شاہدہ ہے۔ اب یہی تمہاری بہن ہے میرے بچے۔"

"ہاں وہ تو مرگئی۔ شاہدہ زندہ ہے اور یہی میری بہن ہے۔"

یہ بات یہیں ختم ہوگئی لیکن سیٹھ عابد نے سنا تو فکر میں ڈوب گئے۔ آفتاب اپنے ماضی کی طرف لوٹ رہا ہے۔ اگر اس کی یہی حالت رہی تو وہ ہم لوگوں کو قبول نہیں کرسکے گا۔ ایک مرتبہ اسے پھر معالج کے پاس لے جایا گیا۔ علاج پھر شروع ہوگیا۔ معالج نے مختلف طریقوں سے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھادی کہ اب یہی اس کے ماں باپ ہیں، یہی اس کا خاندان ہے، اس کی نئی بہن کا نام شاہدہ ہے۔ لیکن ڈاکٹر نے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر اسے کوئی صدمہ پہنچا تو وہ ایک مرتبہ پھر ماضی کی طرف لوٹ جائے گا۔ ماضی کسی کے ہاتھ نہیں آتا۔ یہ بھی ماضی کی کھوج میں بھٹکتا رہے گا۔ میں یہی دعا کرسکتا ہوں کہ ایسا نہ ہو۔

سیٹھ عابد نے اس کی ایسی نازبرداری شروع کردی جیسے کسی بیمار کی تیمارداری کرتے ہیں۔ اس کے لیے ایک مستقل ڈرائیور کا انتظام کردیا جو اسے سیر و تفریح میں مشغول رکھتا تھا۔ تعلیم کے نام پر ایک نہیں دو خاتون ٹیوٹر رکھ دیں جو اسے مصروف رکھتی تھیں۔ ان ڈور گیمز کے انبار لگادیے۔ مطلب یہی تھا کہ اسے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ ملے۔ ان کا یہ طریق کار نہایت کامیاب رہا۔ آفتاب رفتہ رفتہ ماضی سے دور ہونے لگا۔ اب اسے شاید یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ کبھی اس کا نام شہزادہ ہوا کرتا تھا لیکن یہ اسے یاد رہا کہ سیٹھ عابد اس کے سگے باپ نہیں ہیں اور ظاہر ہے شاہدہ اس کی سگی بہن نہیں۔ یہ سب معلوم ہونے کے باوجود اس گھر میں اسے اتنا پیار مل رہا تھا کہ اس کے سگے ماں باپ بھی اتنی توجہ نہیں دے سکتے تھے۔

اس نے اس لاڈ پیار کا کبھی غلط فائدہ نہیں اٹھایا اور اپنی توجہ پڑھائی پر مرکوز رکھی۔ وہ تیزی سے تعلیمی مراحل طے کررہا تھا۔ سیٹھ عابد خوش تھے کہ ان کا انتخاب غلط نہیں تھا۔ آفتاب تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کا کاروبار سنبھالے گا اسی لیے انہوں نے اسے کامرس کی تعلیم دلائی اور اب وہ ایم

بی اے کررہا تھا۔شاہدہ بھی کالج میں آگئی تھی۔

وہ دونوں ایک ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے اور جوان ہوئے تھے۔ جوانی کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ یہ تقاضے ان پر بھی اثر انداز ہورہے تھے۔ ہر وقت کی قربت نے آفتاب کے دل میں شاہدہ کے لیے جذبۂ محبت نے انگڑائی لی تھی لیکن بہت دن تک وہ یہ سوچ کر محبت کے جگنو مٹھی میں بند کرتا رہا کہ روشنی اگر باہر نکلی تو اسے اس کی گستاخی اور نافرمانی نہ سمجھا جائے۔ اسے اپنی حیثیت کا علم تھا۔ وہ ایک یتیم لڑکا ہے۔ سیٹھ عابد نے اسے پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ اس پر مہربانیاں کی ہیں۔ وہ شاہدہ کا ہاتھ مانگنے کا اہل بھی ہے یا نہیں۔ وہ اپنی آنکھوں کی چمک چھپاتا رہا۔ کوشش کرتا رہا کہ شاہدہ سے اس کا آمنا سامنا نہ ہوجائے لیکن ایک گھر میں رہتے ہوئے یہ مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ اس نے خود کو چھپانے کے لیے گھر سے باہر رہنا شروع کردیا۔ اس کی بدلتی ہوئی کیفیت کو دیکھ کر سیٹھ عابد بھی چونک اٹھے تھے۔ پہلا خیال ان کے دل میں یہی آیا تھا کہ اس کے ذہن میں پھر کسی نفسیاتی کمی نے جڑ پکڑلی ہے۔ شاید وہ پھر ماضی کے کسی سفر پر چل نکلا ہے۔ بیگم عابد بھی فکر مند ہوگئی تھیں۔ انہوں نے کئی مرتبہ بڑے پیار سے آفتاب سے پوچھا تھا لیکن وہ بڑے حوصلے کے ساتھ مسکرا کر ٹال گیا تھا۔ انہوں نے شاہدہ کو بھی اعتماد میں لینا چاہا۔

''شاہدہ، آفتاب سے تمہارا کوئی جھگڑا ہوا ہے؟''

''نہیں تو، میرا اس سے کیا جھگڑا ہونا ہے۔''

''کیا تم محسوس نہیں کررہی ہو کہ وہ کچھ بدل سا گیا ہے۔''

''ہاں مجھے لگ تو رہا ہے۔ ہوسکتا ہے باہر دوستیاں کچھ زیادہ ہوگئی ہوں۔''

''تم سے وہ بے تکلف ہے۔ کسی وقت موقع دیکھ کر معلوم تو کرو۔ شاید تمہیں کچھ بتائے۔''

''پوچھ کر دیکھتی ہوں صاحب بہادر کس کے عشق میں مبتلا ہیں۔''

''میرا آفتاب ایسا نہیں۔ بات کوئی اور ہی ہے۔''

''پوچھ کر دیکھتی ہوں سب پتا چل جائے گا۔''

شاہدہ نے وعدہ کرلیا۔ وہ اس کی آمدورفت پر نظر رکھنے لگی کہ کسی وقت گھر پر ہو اور اکیلا ہو تو وہ باتوں باتوں میں اس کا حال دریافت کرے۔

اس روز وہ یونیورسٹی سے آیا تھا اور آتے ہی پھر کہیں جانے کی تیاری کررہا تھا کہ وہ اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔

''کہیں جارہے ہو؟''

''ہاں ایک دوست کی طرف جارہا ہوں۔ اس کے پاس کچھ نوٹس ہیں وہ لینے جارہا ہوں۔''

''آفتاب، تم جھوٹ بولتے ہوئے قطعی اچھے نہیں لگتے۔''

''مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''سچ سچ بتاؤ بات کیا ہے؟''

''کیسی بات۔''

''کیا کوئی لڑکی پسند آگئی ہے جس کے عشق میں کھانا پینا بھول گئے ہو۔''

''سچ تو یہی ہے۔''

''مجھے بتاؤ کون ہے۔ ڈیڈی سے کہہ کر ابھی تمہاری شادی کراتی ہوں۔''

''وعدہ کرو ڈیڈی سے کہہ کر میری شادی کرادو گی۔''

''وعدہ۔ تم بتاؤ تو سہی وہ لڑکی ہے کون؟''

''میری اور اس کی حیثیت میں بہت فرق ہے۔ ہوسکتا ہے مجھے کامیابی نہ ہو۔''

''غربت کوئی عیب نہیں ہوتی۔ کیا ہوا اگر وہ غریب ہے۔''

''مشکل تو یہی ہے کہ وہ غریب نہیں امیر ترین ہے۔''

''ہمارے پاس بھی کچھ کم دولت نہیں ہے۔''

''تمہارے پاس ہوگی۔ میں تو اپنی بات کررہا ہوں۔ میں ایک یتیم لڑکا تھا۔ سیٹھ عابد نے مجھے رحم کھا کر پال لیا۔ ان کے احسانات کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں۔ بس یہ ہے میری حیثیت۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو آفتاب۔ ڈیڈی نے تمہیں کبھی غیر سمجھا ہے۔ ان کا جو کچھ ہے تمہارا ہی تو ہے۔''

''پھر بھی میں اس لڑکی کا نام لیتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ نہ جانے ڈیڈی کا ردعمل کیا ہو۔''

''میں سب سنبھال لوں گی۔ ڈیڈی میری بات بھی نہیں ٹالیں گے۔ تم اس لڑکی کا کچھ اتا پتا تو بتاؤ۔''

''وہ لڑکی تم ہو۔''

''کیا؟''

''ہاں، شاہدہ تم۔ تم میری محبت ہو لیکن فاصلہ اتنا ہے کہ میں تم سے کچھ بھی کہتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ اب تم نے خود پوچھا ہے تو میں نے بہت چھوٹے سے منہ سے بہت بڑی بات کہہ دی ہے۔ مجھے معلوم ہے اب میں اس گھر میں نہیں رہ سکوں گا لیکن جہاں بھی رہوں گا تمہیں یاد کرتا رہوں گا۔''

شاہدہ کی شوخی اس کی آنکھوں تک آکر رک گئی۔ آفتاب اس وقت اسے ایسا اجنبی معلوم ہورہا تھا جس سے وہ پہلی مرتبہ مل رہی ہو۔ ہر وقت بولنے والی لڑکی لفظوں کے

خزانے پر تالا لگائے بیٹھی تھی۔
دونوں طرف خاموشی تھی۔ آفتاب نے اظہار جرم کردیا تھا۔ اب سزا کے انتظار میں تھا۔ اس کی بھیگی آنکھیں شاہدہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔
شاہدہ کی آنکھوں سے دو آنسو نکلے اور رخساروں کی شبنم بن گئے۔
''تمہیں میری جسارت پر دکھ ہوا نا؟''
''خوشی ہوئی۔''
''پھر یہ آنسو۔''
''اپنی کم ہمتی پر بہا رہی ہوں۔ یہ بات آج تک مجھ سے نہیں کہی گئی۔''
''تو میں سمجھ لوں کہ مجھے عمر قید سنا دی گئی ہے؟''
شاہدہ کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

''میں تو خود بھی سوچ رہا تھا لیکن تم سے کہتے ہوئے عجیب سا لگ رہا تھا۔'' سیٹھ عابد نے اپنی بیگم سے کہا۔
''عجیب سا کیوں لگ رہا تھا۔ شادی بیاہ کیا ہوتے نہیں ہیں؟''
''شاہدہ اور آفتاب اس گھر میں بہن بھائی کی طرح رہے ہیں۔''
''بہن بھائی ہیں تو نہیں۔''
''سب کو میں نے یہی بتایا ہے کہ آفتاب میرا بیٹا ہے۔''
''آپ نکاح کے وقت اس کی وضاحت کرسکتے ہیں۔ اگر شاہدہ خود مجھ سے ذکر نہ کرتی تو مجھے خیال بھی نہ آتا۔ آفتاب اتنا سعادت مند ہے کہ خود کبھی نہ کہتا اور میرے بچے پر نہ جانے کیا بیت جاتی۔''
''گھر کی دولت گھر میں رہے گی اس سے اچھی کیا بات ہوسکتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ابھی تو دونوں کی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی۔''
''آپ کو بھی کاروبار کے سوا کچھ نہیں آتا۔ ابھی بات پکی کردیتے ہیں شادی دو سال بعد ہوجائے گی۔ شاہدہ یونیورسٹی میں آگئی ہے۔ دو سال بعد ایم اے کرلے گی۔ آفتاب کا بھی ایک سال ہے۔''
شاہدہ نے آفتاب کو مایوس نہیں کیا تھا۔ جو کچھ آفتاب سے بات ہوئی تھی اس نے ماں کے کانوں تک پہنچادی تھی۔ ماں نے بھی عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے طے کردیا تھا کہ ایک چھوٹی سی تقریب کرکے ایک کو دوسرے سے منسوب کردیا جائے۔
دیر کس بات کی تھی۔ لڑکا بھی گھر میں تھا، لڑکی بھی یہیں تھی۔ دونوں کی مرضی بھی ایک تھی۔ ایک شام چھوٹی سی تقریب گھر میں ہی رکھ لی گئی۔ تمام دوستوں کے سامنے منگنی کا اعلان کردیا گیا۔
ان پر پہلے بھی کون سی پابندی تھی، اس اعلان کے بعد تو وہ دونوں ہر جگہ ایک ساتھ دیکھے جانے لگے۔ ان کی ہر شام کسی نہ کسی ریسٹورنٹ میں گزر رہی تھی۔ گھر آنے کے بعد بھی جب تک سونے کا وقت نہیں ہوجاتا وہ اس کے کمرے میں بند رہتی۔ اس کا ملازم اس کے لیے کافی بناتا رہتا اور وہ باتیں کرتی رہتی۔ دنیا جہان کی باتیں۔
شاہدہ نے ایم اے اکنامکس میں داخلہ لے لیا تھا۔ آفتاب نے بی کام کیا تھا اور اب ایم بی اے کررہا تھا لہٰذا اکنامکس پڑھا سکتا تھا۔ شاہدہ نے اس سے ٹیوشن بھی لینی شروع کردی تھی۔
بند کتابوں میں مستقبل کی راہیں بھی تلاش کی جارہی تھیں۔
اچھا وقت جلدی کٹ جاتا ہے۔ ایک سال گزر گیا۔ آفتاب کا ایم بی اے مکمل ہوگیا اور شاہدہ ایم اے فائنل پر آگئی۔
آفتاب بزنس کے گُر سیکھنے کے لیے سیٹھ عابد کے آفس میں بیٹھنے لگا تھا کہ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے کچھ بدل گیا ہے۔
اس نے غور کیا تو اسے محسوس ہوا کہ شاہدہ کے رویّے میں سرد مہری آگئی ہے۔ وہ اس سے دور ہوتی چلی جارہی ہے۔ وہ اگر کہیں چلنے کو کہتا ہے تو شاہدہ کے پاس دس بہانے ہوتے ہیں۔ گھر میں بھی وہ پڑھنے کا بہانہ کرکے اپنے کمرے میں بند رہتی ہے۔ اس کا یہ رویّہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا جارہا تھا۔ ایک دن وہ اسے بہت زبردستی گھر کے باہر لے گیا اور ایک ریسٹورنٹ میں جا کر بیٹھ گیا۔
''شاہدہ یہ کیا حرکت ہے؟''
''کیسی حرکت۔''
''تم مجھ سے سیدھے منہ بات کیوں نہیں کررہی ہو۔''
''یہ تمہارا وہم ہے۔''
''وہم نہیں حقیقت ہے۔''
''ہر وقت میں آپ کی مرضی پر تو نہیں چل سکتی۔''
''اس طرح تم نے کبھی مجھ سے بات نہیں کی۔''
''اسی لیے تم اس کے عادی نہیں ہو مگر اب عادی ہوجاؤ۔''
''مت بھولو کہ اب ہمارے درمیان محبت کے ساتھ

ساتھ ایک اور رشتہ بھی قائم ہو گیا ہے۔"

"اسی رشتے کے بھروسے میں تمہارے ساتھ یہاں تک آ گئی ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے اب تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی ؟"

"تم جو مطلب نکالنا چاہو میری طرف سے آزادی ہے۔"

"میں آج تم سے پوچھ کر رہوں گا کہ تمہارے رویّے میں یہ تبدیلی کیوں آ گئی ہے۔"

"تم مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔" شاہدہ نے کہا اور بڑی بدتمیزی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ مجبوراً آفتاب کو بھی اٹھنا پڑا۔

وہ جب شاہدہ کے ساتھ ہوتا تھا تو خود ہی گاڑی ڈرائیو کرتا تھا۔ اس وقت بھی گاڑی چلا رہا تھا۔

"میں گھر جانا چاہوں گی۔"

آفتاب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس کے برابر فرنٹ سیٹ پر ہی بیٹھ گئی لیکن خاموش تھی بالآخر آفتاب نے اس خاموشی کو توڑا۔

"اس کا مطلب ہے آئندہ تمہیں کہیں باہر لے جانے کی جسارت نہ کروں ؟"

"آپ نے بالکل ٹھیک سمجھا۔"

"میں امی جان سے کہہ بھی سکتا ہوں کہ شاہدہ مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہتی لیکن پھر تمہیں اس کیوں کا جواب دینا پڑے گا لہٰذا اس سے بہتر ہے کہ مجھے بتا دو کہ کس نے تمہیں بہکا دیا ہے۔"

"کسی ایسی جگہ چلو جہاں ہمیں تنہائی مل سکے۔"

آفتاب نے فوراً گاڑی کا رخ موڑا۔ اسے ایسی ہزار جگہیں معلوم تھیں جہاں تنہائی مل سکتی تھی۔ وہ اسے لے کر نسبتاً کم مہنگے ریسٹورنٹ میں پہنچا جہاں کیبن بنے ہوئے تھے۔ گاہک بھی بہت کم تھے۔ وہ ریسٹورنٹ کی دوسری منزل کے ایک کیبن میں بیٹھ گئے۔ چائے کا آرڈر دینے کے بعد وہ شاہدہ سے مخاطب ہوا۔

"میں پوچھ سکتا ہوں اس دور افتادہ ریسٹورنٹ میں آنے کی کیا وجہ ہے۔ تم مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہو ؟"

"تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟"

"میرے اقرار سے تم کیا مطلب اخذ کرنا چاہتی ہو ؟"

"جو پوچھ رہی ہوں اس کا جواب دو۔"

"یہ سوال ہی فضول ہے۔ پھر بھی اگر پوچھ رہی ہو تو میرا جواب "ہاں" میں ہوگا۔"

"محبت کرتے ہو تو مجھے خوش بھی دیکھنا چاہو گے۔"

"بس یہ سمجھ لو کہ ... تمہیں خوش رکھنا میری زندگی کا مقصد بن گیا ہے۔"

"میں تمہارے ساتھ خوش نہیں رہ سکوں گی۔"

"یہ فیصلہ کرنا تمہارا نہیں میرا کام ہے اور میرے دل کا فیصلہ ہے کہ تم میرے ساتھ خوش رہو گی۔"

"آفتاب تم بہت اچھے ہو لیکن میں کسی اور سے محبت کرتی ہوں۔ اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو اور مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہو تو میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔"

آفتاب چند لمحوں کے لیے گونگا ہو گیا۔ کچھ بھی کہنے سے قاصر تھا لیکن یہ اس کی زندگی کا سوال تھا۔ اس نے ہمت کی۔

"تم مجھ سے محبت کا اقرار کرتی رہی ہو۔ میں خود کو تمہارے لائق نہیں سمجھتا تھا لیکن تم نے مجھے حوصلہ دیا۔"

"اس وقت تک خرم سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ خرم میرے ساتھ میری کلاس میں پڑھتا ہے۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"اور میرے بغیر ؟"

"ڈیڈی میری شادی تم سے کرنا چاہتے ہیں۔ تمہیں انکار کرنا ہوگا۔" اس نے مزید کہا۔

"ڈیڈی نے آج تک کوئی چیز تمہیں دے کر واپس نہیں لی۔ میں اگر انکار کر بھی دوں تو وہ بھی نہیں مانیں گے۔ تمہاری موجودگی میں وہ بھی خرم کو قبول نہیں کریں گے۔ تم مجھ پر یہ احسان کر دو۔ انکار کر دو تا کہ خرم مجھے مل جائے۔"

"میں نے کہا نا کہ میں نے آج تک بھی ان کی کسی بات کا انکار نہیں کیا۔ ان کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ ان کے سامنے میری زبان نہیں کھلے گی۔"

"اگر میں کہہ دوں کہ تم مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہتے ؟"

"پھر بھی وہ مجھ سے پوچھیں گے ضرور۔"

"تم کچھ دن کے لیے کہیں چلے جاؤ۔"

"میرے اس رویے سے انہیں کتنا دکھ ہوگا۔"

"اور مجھے کتنی خوشی ہوگی۔ ان کی خوشی کے لیے میں خرم کو ان کے سامنے لا کر کھڑا کر دوں گی۔"

شاہدہ کو معلوم تھا کہ اب آفتاب کے لیے گاڑی ڈرائیو کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ریسٹورنٹ سے باہر آ کر اس نے آفتاب کے ہاتھ سے چابی لی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ آفتاب کسی احتجاج کے بغیر فرنٹ سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ گھر پہنچ کر اس نے آفتاب کو کسی زندہ لاش کی طرح اس کے کمرے تک پہنچایا اور پلٹ آئی۔

اس رات آسمان بھی اس کی حالت پر خوب رویا۔

رات بھر بارش ہوتی رہی۔ وہ صبح سو کر اٹھا تو بھیگے بغیر ہی اس کا بدن بخار سے جل رہا تھا۔ اس پر نیم غشی طاری تھی۔ بار بار اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر تکیے پہ سر رکھ دیتا تھا۔ اس نے انٹرکام کی گھنٹی بھی سنی۔ پھر کسی نے زور زور سے دروازہ بجایا۔ پھر چند آوازیں اس کے کانوں میں آئیں۔ ملازموں کی آوازوں کو وہ خوب پہچانتا تھا۔ ہر آواز پر اس نے گردن اٹھائی اور پھر تکیے پر رکھ دی۔ بیگم عابد اسے پکار رہی تھیں۔ پھر شاہدہ کی آواز آئی۔ شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ شاید وہ مجھے بلانے آئی ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''آفتاب دروازہ کھولو۔''

آواز پھر آئی۔ وہ بستر سے اترا لڑکھڑاتا ہوا دروازے تک گیا اور دروازہ کھول دیا۔ اس کی ہمت نے بس اتنی ہی اجازت دی تھی۔ کیا خبر اس کی دھندلی آنکھوں نے شاہدہ کی طرف دیکھا یا نہیں۔ اس کے پاؤں جھولے کی طرح جھولے اور وہ لڑکھڑا کر گر گیا۔ کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ وہ گر جائے گا لہٰذا اس سے پہلے کہ کوئی سنبھالتا وہ گرا اور اس کا سر کسی چیز سے ٹکرایا۔ بیگم عابد کی نظر اس کے سر سے نکلنے والے خون پر پڑی تو ان کے منہ سے نکلنے والی ایک دلدوز چیخ نے تمام نوکروں کو جمع کر لیا۔ اب اتنا وقت نہیں تھا کہ فیملی ڈاکٹر کو گھر بلایا جاتا۔ یہ منظر دیکھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی نکال لی تھی۔ اس کے سر پر ایک موٹی پٹی باندھ دی گئی تاکہ خون رک جائے۔ نوکروں کی مدد سے اسے گاڑی میں ڈالا۔ بیگم عابد ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھیں اور اسے اسپتال پہنچا دیا گیا۔

ایک مرتبہ وہ بچپن میں بے ہوش ہوا تھا تو ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ بچہ کسی چیز سے ڈر گیا اور بے ہوش ہو گیا ہے۔ اب وہ کس چیز سے ڈر سکتا تھا۔ ڈاکٹروں نے اس بے ہوشی کا سبب کوئی گہرا صدمہ بتایا۔ سیٹھ عابد کو فون کر دیا گیا تھا لہٰذا وہ بھی پہنچ گئے۔ وہ بھی حیران تھے کہ اسے کیا صدمہ ہو سکتا ہے۔

''بیگم میں نے تو اس سے کبھی تیز لہجے میں بات تک نہیں کی، تم نے بھی کبھی اس کی دلداری میں کمی نہیں آنے دی۔ پھر اسے ایسا کیا صدمہ ہو سکتا ہے؟''

''یہ تو وہ ہوش میں آنے کے بعد ہی بتا سکتا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے وہ پھر بھی کچھ نہیں بتائے گا۔ مجھے تو ڈاکٹر ذیشان کا کہنا یاد آ رہا ہے۔''

''کون ڈاکٹر ذیشان؟''

''وہی نفسیاتی معالج جسے بچپن میں ہم نے آفتاب کو دکھایا تھا۔''

''کیا کہا تھا اس نے؟''

''اس نے کہا تھا اگر اب اسے کوئی صدمہ پہنچا تو وہ اپنے ماضی کی طرف لوٹ جائے گا اور ماضی کسی کے ہاتھ نہیں آتا۔ یہ بھی ماضی کی کھوج میں بھٹکتا رہے گا۔''

''اسی ڈاکٹر کو پھر دکھائیں نا۔''

''ڈاکٹر ذیشان کا انتقال ہو چکا ہے۔ خیر اسے ہوش میں تو آنے دو۔ میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔''

ڈاکٹروں نے بتایا کہ صدمہ اتنا گہرا ہے کہ ہوش میں آنے کے بعد بھی انہیں کچھ دن اسپتال میں رہنا ہوگا بلکہ بہتر یہ ہوگا کہ انہیں تبدیلیٔ آب و ہوا کے لیے کہیں باہر لے جائیں۔

اسپتال سے گھر آنے کے بعد سیٹھ عابد نے اسے بزنس ٹور کے بہانے ملک سے باہر لے جانا چاہا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ یہ اس کا پہلا انکار تھا جو اس نے سیٹھ عابد کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کیا تھا۔ سیٹھ عابد نے یہ بھی چاہا تھا کہ اسے کسی نفسیاتی معالج کے پاس لے کر جائے لیکن ایک مرتبہ یہ خوف اس پر پھر غالب آ گیا کہ کہیں اس کا ماضی اس پر آشکارا نہ ہو جائے۔ اب وہ بچہ بھی نہیں رہا تھا کہ اسے زبردستی لے جایا جائے اور وہ یہ نہ پوچھے کہ اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔

گھر آنے کے بعد آفتاب چپ چپ رہنے لگا تھا۔ ہر وقت کمرے میں بند پڑا رہتا۔ دفتر جانا بھی بند کر دیا تھا۔ سیٹھ عابد کو اس سے بڑی امیدیں تھیں مگر اب سب خاک میں ملتی نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے شاہدہ سے بات کی کہ وہ اسے سیر و تفریح کے لیے باہر لے کر نکلا کرے۔ اس کی دلجوئی آفتاب کی صحت پر اچھا اثر ڈالے گی لیکن اس نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ اس کے امتحان ہونے والے ہیں۔ اگر اس کے ساتھ وقت ضائع ہوا تو نتیجے پر اثر پڑے گا لیکن سیٹھ عابد اس کی معذرت قبول کرنے والے نہیں تھے۔

''تمہیں اپنے رزلٹ کی پروا ہے اپنے منگیتر کی پروا نہیں۔ اس وقت تم ہی اسے اداسی سے باہر لا سکتی ہو۔''

''آپ کے کہنے سے پہلے میں نے کوشش کر کے دیکھ لی ہے مگر وہ مانتا ہی نہیں تو میں کیا کروں۔''

''میں دیکھ رہا ہوں تم اس سے کھنچی کھنچی رہتی ہو۔ اس طرح تو وہ اور ڈپریس ہوگا۔''

''آپ کے کہنے سے میں اور کوشش کیے لیتی ہوں۔''

وہ کوشش تو کیا کرتی اس نے تو یہ تک پوچھنا گوارا نہیں

کیا کہ اب وہ کیسا ہے۔ وہ سب کو دکھانے کے لیے اس کے کمرے میں جاتی ضرور تھی لیکن یہ کہنے کے لیے کہ اس نے ابھی تک اس سے شادی کرنے سے انکار کیوں نہیں کیا۔ آفتاب کے پاس اس کے سوال کا جواب خاموشی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ تھک ہار کر اس نے ماں سے بات کرنے کی ٹھانی۔

''ڈیڈی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آفتاب کا دل بہلاؤں۔ اسے گھمانے کے لیے باہر لے جاؤں لیکن وہ تو مجھ سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتا۔ کل تو اس نے بڑی بدتمیزی سے بات کی اور مجھے کمرے سے نکال دیا۔ اب میں بھی یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والا ہمیں آنکھیں دکھا رہا ہے۔''

''نہیں بیٹا ایسا نہیں کہتے۔ کوئی کسی کو نہیں کھلاتا۔ ایسا کہنا اللہ کو برا لگتا ہے۔''

''تو پھر اور کیا کہوں۔ مجھ سے اپنی بے عزتی برداشت نہیں ہوتی۔''

''وہ بیمار ہے بیٹا۔ وقت کا انتظار کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''وہ بیمار ہے اور آپ مجھے اس کے پلے باندھ رہی ہیں۔''

''بے وقوف وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ میری تو خود سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اسے ہو کیا گیا ہے۔''

''ہونا کیا ہے۔ مجھ سے شادی نہ کرنے کا ڈراما کر رہا ہے۔''

''اچھا تم فکر مت کرو۔ میں تمہارے ڈیڈی سے بات کروں گی۔''

انہوں نے بات کی ضرور لیکن سیٹھ عابد نے آفتاب کی حمایت کی اور اس کی حالت کو بیماری قرار دے کر اسے قابلِ معافی ٹھہرایا۔

''اس کی بیماری ایسی نہیں کہ دواؤں سے علاج ہو۔ ہمارا رویہ اسے صحت یاب کرے گا۔ ہمیں چاہیے کہ اسے مزید کسی صدمے سے دوچار نہ کریں۔''

اس وقت بات ٹل گئی لیکن شاہدہ بہت جلدی میں تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر آفتاب کو جھنجوڑ ڈالا۔ اسے اس کی حیثیت یاد دلائی اور اس پر زور دیا کہ وہ گھر چھوڑ کر چلا جائے۔ اس تکرار کے بعد اس نے آفتاب کے سامنے آنا بالکل ہی چھوڑ دیا۔

وہ ایک گھر میں رہتے ہوئے شاہدہ کی صورت کو ترس گیا۔

اس صدمے کا اثر یہ ہوا کہ آفتاب کے لاشعور میں دبی ہوئی یادیں اس کے خوابوں کا حصہ بننے لگیں۔ وہ باتیں جو وہ بھول چکا تھا اس کی یادوں کا حصہ بننے لگیں۔ وہ ایک بڑا سا گھر دیکھتا تھا جس میں ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے وہ اس آگ سے بچ کر نکلتا تو ہے لیکن راستہ بھول جاتا ہے۔

اس خواب کو دیکھتے ہوئے کئی دن ہو گئے تھے۔ اس کا شعور اس کے لاشعور کا حصہ بنتا جا رہا تھا۔ اب وہ دن میں بھی اس خواب کو دہراتا رہتا تھا۔ اب اسے یقین آنے لگا تھا کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ کبھی نہ کبھی یہ واقعہ اس کے ساتھ پیش آچکا ہے۔

اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔

اس دن سیٹھ عابد گھر پر تھے۔ انہوں نے زبردستی اسے اپنے ساتھ لنچ پر بٹھا لیا۔ سیٹھ عابد کی ایک چچا زاد بہن بھی آئی ہوئی تھیں اور ٹیبل پر موجود تھیں۔

''یہ میری بہن صفیہ ہیں۔ کل ہی امریکا سے آئی ہیں۔ اپنی سسرال میں ٹھہری ہوئی ہیں۔ آج میں نے انہیں مدعو کیا ہے۔''

آفتاب نے کسی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتا رہا اور پھر نہایت بدتمیزی سے کرسی چھوڑ کر اٹھ گیا۔

''یہ تو نہایت بدتمیز لڑکا ہے۔'' صفیہ نے کہا۔

''کچھ دنوں سے بیمار ہے۔ کچھ چڑچڑا ہو گیا ہے۔''

''اور آپ شاہدہ کی شادی اس سے کر رہے ہیں۔''

''بیمار تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''لے پالک لڑکوں کے ساتھ یہی مسئلہ رہتا ہے۔ ہم ان کے ماں باپ اور خاندان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ایسے بچے نئے ماحول میں آ کر ڈھل تو جاتے ہیں لیکن کبھی کبھی اپنی اصلیت کی طرف لوٹ بھی جاتے ہیں۔ خراب خون اپنا اثر ضرور دکھاتا ہے۔''

سیٹھ عابد اپنی بہن کو تو کچھ نہ کہہ سکے۔ سر جھکا کر کھانا بھی کھاتے رہے لیکن کھانے کے بعد آفتاب کے کمرے میں گئے۔ وہ اس وقت کسی حد تک نارمل ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے رویے کی معذرت کی لیکن سیٹھ عابد اس کی وجہ سے بے عزتی سے دوچار ہوئے تھے۔ سخت غصے میں تھے۔ اسے خوب ڈانٹ پھٹکار کی۔

''تم کسی نفسیاتی عارضے میں مبتلا ہو۔ تمہیں میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلنا ہوگا۔''

''جی بہتر۔''

وہ اس کے کمرے سے واپس آئے تو سب لوگ ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔

"اپنی آنکھوں سے دیکھ لی اپنے بیٹے کی حالت۔" بیگم عابد نے کہا۔

"کسی کو بخار ہو جائے تو اسے طعنے نہیں دیا کرتے۔"

"معاف کیجیے گا یہ بخار نہیں ہے وہ پاگل ہو گیا ہے اور پاگل کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا باپ پاگل ہو۔ اس نے گھر میں آگ لگائی ہو اور سب جل کر خاک ہو گئے ہوں۔ ایک یہ بچ گیا ہو ہماری جان کا عذاب بننے کے لیے۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں یہ ہمیں بھی جلا کر خاک نہ کر دے اور خود چلتا بنے۔"

"بیگم، کیوں کسی کے بارے میں ایسی کہانیاں بیان کرتی ہو۔"

"آپ کو یاد نہیں ہے، اس کے بچپن میں جب ہم نے ڈاکٹر کو دکھایا تھا تو اس نے اپنی کہانی خود سنائی تھی۔ وہ بھی کہانی تھی جو میں دہرا رہی ہوں۔ میں نے کون سی نئی بات دہرا دی۔ کان کھول کر سن لیجیے، میں اپنی بیٹی کو ایسے پاگل کے حوالے کرنے والی نہیں۔ میری شاہدہ کے لیے رشتے بہت۔"

"دو تین دن کی مصروفیت اور ہے۔ اس کے بعد میں آفتاب کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔ کچھ دن کے لیے ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کے بعد پھر پاگل کا پاگل۔ اس سے صاف کہہ دو وہ شاہدہ کی طرف سے ہاتھ دھو رکھے۔"

"بیگم، آپ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہیں گی۔ جو کہنا ہوگا میں خود کہہ دوں گا۔ اسے کوئی اور صدمہ پہنچا تو اس کی ذمے دار آپ ہوں گی۔"

سیٹھ عابد کے تیور اور لہجہ ایسا تھا کہ اس کے بعد کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ سیٹھ عابد نے بھی وہاں زیادہ رکنا مناسب نہ سمجھا۔

☆☆☆

دن گزر گیا تھا۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ کوٹھی میں بلب روشن ہو گئے تھے۔ آفتاب کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ شاید وہ یہ بھول ہی گیا تھا کہ بلب بھی جلائے جاتے ہیں۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے ایک نام پر برابر غور کر رہا تھا۔ یہ نام میں نے پہلے بھی کہیں سنا ہے۔ صفیہ! کس کا تھا یہ نام۔ یہ نام سنتے ہی میری حالت بگڑ کیوں گئی تھی۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس کا شعور بار بار اس کے لاشعور پر دستک دے رہا تھا۔ اس کے کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں پھر اسے محسوس ہوا جیسے اس کی کوٹھی کے پیچھے سے کوئی ٹرین گزر رہی ہے۔ وہ کمرے میں نہیں ٹرین کے ڈبے میں بیٹھا ہوا ہے۔ بہت سے لوگ اس کے اردگرد جمع ہیں اور اس سے پوچھ رہے ہیں وہ کون ہے اور کہاں سے بھاگ کر آیا ہے۔ اس نے ان سوالوں سے گھبرا کر تکیے پر سر رکھ لیا۔ اسے نیند آ گئی۔ اب وہ خواب کے عمل سے گزر رہا تھا۔ اس کا ماضی اس کے کمرے میں اتر آیا تھا۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ اس کا بھائی فراز جل کر کوئلہ بن چکا تھا۔ آگ اس کے بستر کے قریب تھی کہ وہ اٹھ کر بھاگا اور کمرے سے نکل آیا۔ صفیہ باجی، صفیہ باجی۔ وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ چیخوں کے جواب میں خاموشی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اس کی آنکھ اپنی ہی چیخوں سے کھل گئی۔ اس کے سوال کا جواب اسے مل گیا۔ صفیہ میری بہن کا نام تھا جو آگ میں جل کر مر گئی۔ پھر اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ باپ کی صورت سامنے آ گئی۔ ماں کی شکل یاد آ گئی۔ میں کتنا خود غرض تھا کہ سب کو جلتا ہوا چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس کا نتیجہ بھی ہونا تھا کہ شاہدہ بھی مجھے چھوڑ گئی۔ مجھے کیا ملا۔ کچھ بھی تو نہیں، میری بہن مجھ سے چھن گئی۔ یہ سب غیر ہیں، انہیں میرا خیال کیوں ہونے لگا تھا۔ میرا ماضی کتنا اچھا تھا۔ وہاں سب لوگ میرے اپنے تھے۔ مجھے وہیں جانا چاہیے۔ وہ سب کہاں ہوں گے۔ دہکتی ہوئی آگ کی دوسری جانب۔ مجھے یہ دریا عبور کرنا ہوگا۔ مجھے ثابت کرنا ہوگا کہ میں اپنی بہن کا وفادار ہوں۔ مجھے اپنی ماں کے پاس جانا ہے۔ بیگم عابد، سیٹھ عابد کی بیوی ہیں، میری ماں نہیں ہیں۔

وہ کمرے سے نکلا اور اس اسٹور کی طرف گیا جہاں پیٹرول سے بھرے ہوئے ڈبے رکھے تھے۔ اس نے ایک ڈبا اٹھایا اور کمرے میں چلا آیا۔ پیٹرول سے اپنے بستر کو اچھی طرح بھگو دیا، باقی پیٹرول سے کمرے کی دوسری چیزوں کو بھگو دیا۔ پھر کمرے کو اندر سے لاک کیا اور بستر پر لیٹ کر ماچس دکھا دی۔

اس کی چیخوں سے پوری کوٹھی گونج رہی تھی۔ ایک طرف سے ملازم دوڑے دوسرے جانب سے سیٹھ عابد اپنے کمرے سے نکلے۔ یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ آوازیں آفتاب کے کمرے کی طرف سے آ رہی ہیں۔

آگ سے شروع ہونے والی کہانی آگ پر ختم ہو گئی۔

اس کی موت کے بعد حال اور ماضی، شعور اور لاشعور کی بحث چھڑی ہوئی تھی کہ جس کا خمیر لقمہ حرام سے اٹھا ہو اس کا انجام دہکتی ہوئی آگ کے سوا کیا ہو سکتا تھا۔

شاہ عبدالرحمٰن پاک

ضیا تسنیم بلگرامی

کہتے ہیں کہ انسان کی پیدائش سے قبل ہی کاتبِ تقدیر اس کی زندگی کے تمام عروج وزوال اس طرح تحریر کردیتا ہے کہ انسان کے گمان وخیال تک کی رسائی ممکن نہیں ہوتی کہ ایسا کیوں اور کیسے ہوا... لیکن وقت آہستہ آہستہ اس کتاب کے ورق یوں کھولتا چلا جاتا ہے جیسے کوئی بچہ نادانی میں صفحات الٹتا جائے... کچھ ایسا ہی حال شاہ عبدالرحمٰن کا بھی تھا جن کی حرکات وسکنات پیدائش کے بعد ہی تمام احباب کو چونکانے کا سبب بن رہی تھیں اور بالآخر زندگی کے مختلف ادوار نے ثابت کردیا کہ اللہ کا قرب پانے والے انسان کو اللہ نے ولایت میں کتنا اونچا مقام عطا فرمایا ہے۔

علم کی پیاس بجھانے کے لیے نگرنگر پھرنے والے ایک ولی کی تلاش کا قصہ



پنجاب کے ضلع گوجرانوالہ میں ایک گاؤں صدیوں پہلے اورنگ شاہ پورہ کہلاتا تھا، پھر کچھ عرصے بعد اس کا نام رنگن پورڈلا ہوگیا۔ پھر جس طرح آبادیاں ویرانوں میں اور ویرانے بستیوں میں بدل جاتے ہیں، اسی طرح رنگن پورڈلا اجڑا تو اس ویرانے نے ایک ٹیلے کی شکل اختیار کرلی اور پنجابی زبان میں یہ بھڑ (ٹیلا) زیادہ مختصر ہوا تو یائے تصغر کے ساتھ 'بھڑی' کہلایا جانے لگا۔ ملک گوت ہرانے اس کو ازسرِ نو آباد کیا تو اس کا نام 'بھڑی ہراواں' پڑ گیا، پھر کچھ عرصے بعد جب اس پر قوم دھوتھڑ

کے لوگ قائل ہو گئے تو اس نے بھڑی دھوتھڑاں کے نام سے شہرت پائی اور آخر میں جب اس جگہ ایک ولی کامل شاہ عبدالرحمٰن نوشاہیؒ نے قدم رنجہ فرمایا اور یہاں سے اپنا فیض روحانی جاری کیا تو یہ جگہ 'بھڑی شاہ رحمٰن' کہلائی جانے لگی۔ امراء اور منصب داروں کے رکھے ہوئے نام ان کے کام کی طرح عارضی اور ہنگامی ہوتے ہیں لیکن جب بھی نام اللہ کے پاک اور برگزیدہ بندے رکھتے یا ان کی وجہ سے رکھے جاتے ہیں تو اس نام کو شہرتِ دوام حاصل ہو جاتی ہے۔

یہ شاہ عبدالرحمٰن پاک کون تھے؟ یہ جاننے کے لیے عہدِ اکبری میں جانا پڑے گا۔

گجرات کا ایک خاندان گوجرانوالہ کے ایک گاؤں بھڑی میں آباد ہوا۔ اس خاندان کے سربراہ شیخ صالح محمد تھے۔ صالح محمد کی بیوی کا نام سلطان بیگم تھا۔ یہ لوگ اپنے تقویٰ اور طہارت کی وجہ سے بڑے مشہور تھے۔ بھڑی ہی میں انہیں اللہ نے ایک بیٹا دیا، بیٹے کی پیدائش نے انہیں بہت خوش کر دیا۔ لوگوں نے مبارکبادیاں دیں، دونوں میاں بیوی پھولے نہیں سماتے تھے۔ یہ بیٹا اپنی حرکات وسکنات اور انداز سے عام بچوں سے مختلف محسوس ہوتا تھا۔ نام عبدالرحمٰن رکھا گیا۔ ماں نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن میں بے نیازی کی کیفیت محسوس کی، دودھ پیا یا نہ پیا، ان کی کیفیت میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ بھوک میں جس طرح بچے نڈھال ہو جاتے ہیں، عبدالرحمٰن میں اس قسم کی کوئی بات نہیں پائی جاتی تھی۔ کبھی کبھی سکوت کا ایسا دورہ پڑتا کہ گھر والے آواز تک کو ترس جاتے۔ ایسا لگتا گویا عبدالرحمٰن پر محویت طاری ہے اور وہ کسی اہم مسئلے پر غور فرما رہے ہیں۔ یہ کیفیت اس وقت زیادہ نمایاں ہوگئی جب عبدالرحمٰن کی عمر دو سال کی ہوگئی ان پر کسی کسی وقت سکر و مدہوشی کا دورہ پڑ جاتا۔ ماں باپ پریشان ہو جاتے اور ہوش میں لانے کے سارے جتن کر ڈالتے مگر نا کام رہتے اور جب ہوش آتا تو اپنے آپ ہی آجاتا۔

ماں نے اپنے بیٹے کے بارے میں شوہر کے سامنے اپنا خدشہ ظاہر کیا، بولیں۔ "جنابِ والا! مجھ کو تو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ عبدالرحمٰن کسی شے کے زیر اثر ہے۔ اس کا کوئی نہ کوئی علاج ہونا چاہیے۔"

شوہر نے جواب دیا۔ "میں خود بھی ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔ اگر یہ کسی شے کے زیرِ اثر ہے تو اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ بہرحال لڑکے کو انتہائی احتیاط اور دیکھ بھال سے پالنا ہوگا۔"

ماں نے فرمایا۔ "میرا خدا گواہ ہے کہ میں نے آج تک اس سے ایسا کوئی سلوک نہیں کیا کہ اس کو ناگوار گزرا ہو۔ میں اس کی نازبرداری اور دل جوئی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتی۔"

شوہر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "مجھ کو شبہ ہوتا ہے کہ اس پر کسی آسیب کا اثر ہے شاید لیکن جب تک مجھے اس کا کلّی یقین نہ ہو جائے، میں کسی کامل سے رجوع نہیں کر سکتا۔"

ماں کو شوہر کی یہ بات اچھی نہیں لگی، جواب دیا۔ "میرا بیٹا بالکل ٹھیک ٹھاک ہے، اس میں کوئی خرابی نہیں۔ میں یہ بات کس طرح مان لوں کہ اس پر آسیب کا اثر ہے۔"

شوہر نے نرمی سے کہا۔ "بیوی جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں، عبدالرحمٰن تمہارا ہی نہیں میرا بھی بیٹا ہے۔ میری یہ بات یاد رکھو کہ عبدالرحمٰن معمولی نہیں غیر معمولی ہے۔ یہ غیر معمولیت کس قسم کی ہے میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے وقت کا انتظار ہے۔"

عبدالرحمٰن کی عمر چار سال ہوگئی۔ ان پر وقتاً فوقتاً بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے۔ جب بھی یہ دورہ پڑتا، شوہر بیوی کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگتا۔ گویا کہہ رہا ہو۔ "دیکھو، غور کرو اور مجھے بتاؤ کہ یہ آسیب کا اثر نہیں تو اور کیا ہے؟"

انہی دنوں ساہن پال گجرات کے عارف کامل حضرت نوشہ گنج بخش بھڑی میں تشریف لائے۔ اس وقت بستی کے بچے کھیل کود میں مشغول تھے۔ ان بچوں میں عبدالرحمٰن بھی شامل تھے۔ جب حضرت نوشہ گنج بخش کی تشریف آوری کا چرچا ہونے لگا تو سارے بچے مؤدبانہ کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے نہایت ادب سے سلام کیا اور جہاں کھڑے تھے، وہیں کھڑے رہ گئے۔ چار سالہ عبدالرحمٰنؒ نے جرأت سے کام لیا اور دوسرے بچوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے اور حضرت نوشہ کو خصوصی سلام نیاز پیش کیا۔ حضرت نوشہ نے سلام کا جواب تو دے دیا لیکن ساتھ ہی انہیں نہایت توجہ سے دیکھا۔ اس نظر میں معلوم نہیں کیا تھا کہ عبدالرحمٰن کی حالت ہی غیر ہوگئی۔ وہ جہاں کھڑے تھے وہیں گر گئے۔ بچوں میں کھلبلی مچ گئی حضرت نوشہ کو جو کچھ دینا تھا دے چکے تھے۔ بچوں نے عبدالرحمٰنؒ کے والد کو اطلاع دی کہ حضرت عبدالرحمٰن کے پاس تشریف لے چلیے، وہ راہ میں مدہوش پڑے ہیں اور ان کے منہ سے جھاگ جاری ہیں۔

شیخ صالح محمد آزردہ و پریشان بھاگتے ہوئے مدہوش عبدالرحمٰن کے پاس پہنچے اور انہیں گود میں اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ بولے۔ "میرے بیٹے! یہ تجھے کیا ہو جاتا ہے؟ افسوس کہ میں تجھے کہاں کس کے پاس لے جاؤں؟ میں کیا کروں؟ میری

تو کچھ سمجھ میں آ ہی نہیں رہا۔"

اسی طرح عبدالرحمٰن نے ایک سال اور گزار دیا اور یہ پانچ سال کے ہو گئے۔ والدین کو تعلیم کی فکر ہوئی مگر انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ عبدالرحمٰن بالکل سنجیدہ نہیں ہیں بلکہ ایسا لگتا تھا گویا انہیں تعلیم کا سرے سے کوئی شوق ہی نہیں۔ ان وسوسوں اور خیالوں کے باوجود باپ نے بیٹے کو پڑھائی پر بٹھا دیا۔ جو اساتذہ ان کی تعلیم پر متعین ہوئے تھے، انہیں بڑی مایوسی ہوئی اور انہوں نے چھوٹا سا ایک وعظ کہہ ڈالا۔ "بیٹے! علم بڑی ضروری چیز ہے۔ علم کے بغیر سینہ گداز نہیں ہوتا اور علم کے بغیر خدا کو پہچانا بھی نہیں جا سکتا۔"

عبدالرحمٰن حیرت سے اپنے استاد کا وعظ سنتے رہے اور پھر بے ہوش ہو گئے۔ والدین ایک بار پھر پریشان ہو گئے۔ کافی دیر بعد جب ہوش میں آئے تو مستانہ وار بھاگ کھڑے ہوئے۔ گھر والوں نے انہیں دوڑ کر پکڑ لیا لیکن ان کے ایک جھٹکے نے سبھی کو گرا دیا اور یہ پھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ باپ کو حیرت تھی کہ اس کم سن میں آخر اتنی طاقت کہاں سے آ گئی۔ انہوں نے بیٹے کا پیچھا کیا اور ہمسایوں کی مدد سے انہیں دوبارہ پکڑ لیا اور گھر میں لے جا کر ان کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ ماں نے یہ منظر دیکھا تو ان کے دل پر چوٹ سی لگی، زار و قطار رونے لگیں۔ بیٹے کو سینے سے لگا کر سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ "میرے لعل! یہ تجھے کیا ہو جاتا ہے۔ تیرے ننھے منے پاؤں میں زنجیر دیکھ کر میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔" اس کے بعد وہ اپنے رب سے مخاطب ہو گئیں۔ "خدایا مجھ پر رحم فرما۔ میرے بیٹے پر کرم فرما۔ اے میرے رب! بتا میں کیا کروں؟ اسے کس کے پاس لے جاؤں؟ کسے دکھاؤں؟ کس کا علاج کروں؟ میرے مولا! میری راہنمائی فرما۔"

اتنی دیر میں شوہر نے ایک طبیب کا انتظام کر لیا تھا۔ بیوی سے کہا۔ "نیک بخت! تو پردے میں چلی جا، میں اسے طبیب کو دکھانا چاہتا ہوں۔ اگر عبدالرحمٰن کو کوئی بیماری لاحق ہو گئی ہے تو اس کا ابھی پتا چل جاتا ہے۔"

اللہ کی نیک بندی پردے میں چلی گئی اور طبیب اندر داخل ہوا۔ اس نے عبدالرحمٰن کا خوب اچھی طرح معائنہ کیا اور عبدالرحمٰن سے طرح طرح کے سوال کرنے لگا۔ پوچھا۔ "صاحبزادے! یہ بار بار آپ کو کیا ہو جاتا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "مجھے کچھ پتا نہیں کہ مجھے کیا ہو جاتا ہے، بس ایک آگ سی لگی رہتی ہے اور میرا دل مجھے بے چین اور مضطرب رکھتا ہے۔ جب میرے استاد مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ علم کے بغیر تو میں خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ مجھے ذلیل و خوار کر رہے ہیں۔ وہ معلوم نہیں کس خدا کی بات کرتے ہیں حالانکہ میرا رب میری نس نس میں موجود ہے۔ دنیا کی ہر شے میں وہ موجود اور ظاہر ہے۔ جب میں اس تعلیم ہستی کا بوجھ اپنے دل و دماغ پر محسوس کرتا ہوں تو از خود رفتہ و وارفتہ ہو جاتا ہوں اور اس کی مجھے یہ سزا دی جاتی ہے کہ میرے پاؤں زنجیر میں جکڑ دیے جاتے ہیں۔"

طبیب ساری باتیں حیرت سے سنتا رہا، باپ سے پوچھا۔ "جناب! اس بچے نے کچھ پڑھا لکھا بھی ہے یا نہیں؟"

باپ نے جواب دیا۔ "ہم نے پڑھنے کے لیے بٹھایا تو تھا مگر اس نے کوئی دلچسپی ہی نہیں لی۔"

طبیب نے کہا۔ "حضرت! میری سمجھ میں نہ تو آپ کی باتیں آ رہی ہیں اور نہ ہی اس معصوم بچے کی۔ اس کی باتوں سے یہ پتا ہی نہیں چلتا کہ یہ ان پڑھ بچہ ہے۔ یہ میرے اپنے خیال اور عقیدے کے مطابق بیمار تو ہرگز نہیں، ہاں آسیب کا شبہ البتہ ہوتا ہے اس لیے میں آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ اسے کسی عالم و کامل کے پاس لے جائیں اگر اس پر آسیب ہے تو وہی اسے دور کر سکتا ہے۔"

غمزدہ باپ نے بڑے دکھ سے طبیب کی طرف دیکھا۔ "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ بے بس اور مایوس ہیں؟"

طبیب نے جواب دیا۔ "ہاں، ایسا ہی سمجھ لیں۔"

باپ نے کہا۔ "اچھا پھر آپ جا سکتے ہیں، میں کسی عالم اور کامل کو تلاش کرتا ہوں۔"

کافی بھاگ دوڑ اور تگ و دو کے بعد ایک عالم اور کامل کی خدمات بھی حاصل کر لی گئیں اور اسے اس معصوم کے پاس پہنچا دیا گیا۔ یہ عالم کامل بھی تھا اور عامل بھی۔ وہ پہلے تو انہیں بغور دیکھتا رہا پھر زیر لب کچھ پڑھنے لگا اور ان پر تین پھونکیں مار کر سوال کیا۔ "تم کون ہو اور اس بچے کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟"

عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ "میں عبدالرحمٰن ہوں اور میں کسی کے بھی پیچھے نہیں پڑ گیا ہوں۔ میں تو عشق کی گرمی میں جل رہا ہوں۔ کیا آپ کے پاس کوئی ایسا عمل ہے جو میرے سینے سے میرے عشق کی گرمی کھینچ لے؟"

عامل صاحب کے کان کھڑے ہوئے۔ باپ صالح محمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جناب! یہ بچہ کیا کہہ رہا ہے؟ یہ بچہ خود بول رہا ہے یا اس میں کوئی اور چھپا ہوا ہے اور وہ بول رہا ہے؟"

صالح محمد نے جواب دیا۔ ”جناب! مجھے کیا پتا کہ اس میں کون بول رہا ہے۔ میں نے آپ کی خدمات اسی غرض سے حاصل کی ہیں کہ آپ مجھے اپنے علم کے زور سے یہ بتائیں کہ اس بچے پر کس کا اثر ہے؟“
عامل نے کہا۔ ”جناب والا! یہ باتیں تو بڑے کمال کی ہیں۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ اس پر کس کی روح سایہ فگن ہے۔“
صالح محمد نے کہا۔ ”یہ پتا چلانا آپ کا کام ہے۔ جب اس پر دورہ پڑتا ہے تو اس میں اتنی زیادہ طاقت آجاتی ہے کہ کئی آدمی اسے قابو میں نہیں کر سکتے۔“
عامل نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں کوشش کرتا ہوں مگر مجھے یقین نہیں آتا کہ میں کامیاب بھی ہو جاؤں گا۔“
اتنے میں ماں نے پردے کی آڑ سے کہا۔ ”عامل صاحب! اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میرے بیٹے کو اچھا کر دیں گے تو خیر اپنا روحانی علاج شروع کر دیں لیکن اگر آپ کو اپنی کامیابی کا یقین نہیں ہے تو خدا کے لیے میرے بیٹے کو تختۂ مشق ہرگز نہ بنائیے گا۔ آپ کو جو کچھ درکار ہو، میں حاضر کر دوں گی۔“
عامل نے جواب دیا۔ ”میں اس کا روحانی علاج اس لیے نہیں کر سکتا کہ کچھ پتا ہی نہیں چلتا کہ آخر یہ سایہ ہے کس کا۔ جب بھی پتا نہ چلے گا تو پھر میں علاج کس طرح کروں گا۔“
عامل کی کھانے پینے سے تواضع کر کے اسے رخصت کر دیا گیا اور والدین کو ایک بار پھر یہ فکر لاحق ہو گئی کہ آخر اس بچے کا ہو گا کیا۔
صالح محمد جس سے بھی ملتا، اس سے یہی پوچھتا۔ ”بھائی میرے لیے کچھ کرو۔ کسی ولیِ کامل کا پتا ہی بتاؤ تو میں بہت شکر گزار ہوں گا۔“
ایک بزرگ سے جب بھی بات کہی گئی تو انہوں نے اپنے ذہن پر زور دیا اور کہا۔ ”برادرِ عزیز! ایک ولیِ کامل ہیں تو سہی، ان سے زیادہ مناسب آدمی نہیں مل سکتا۔“
صالح محمد نے پوچھا۔ ”کون بزرگ؟ ان کا نام؟“
بزرگ نے جواب دیا۔ ”جناب! آپ ساہن پال گجرات تشریف لے جائیں۔ وہاں آپ کی ملاقات حاجی نوشہ گنج بخش سے ہو گی۔ یہ بزرگ اس عہد کے سب سے بڑے عالم اور ولی کامل ہیں۔ وہی آپ کے بیٹے عبدالرحمٰن کا علاج کر سکتے ہیں۔“
ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ صالح محمد کے بڑے بیٹے شیخ الہداد نے باپ سے کہا۔ ”پدر بزرگوار! آپ خاصے پریشان ہو چکے ہیں اس لیے اب میں عبدالرحمٰن کو لے کر ساہن پال خود جاؤں گا۔“
باپ نے کہا۔ ”بیٹے! ٹھیک ہے۔ میں نے تو یہ سن رکھا ہے کہ حاجی صاحب کی ایک نظر ہی کافی ہے۔ عبدالرحمٰن ان کے سامنے پہنچتے ہی ٹھیک ہو جائے گا۔“
شیخ الہداد نے عرض کیا۔ ”آپ بے فکر رہیں۔ اللہ نے چاہا تو میں عبدالرحمٰن کو اچھا کرا کے واپس آؤں گا۔“
چنانچہ شیخ الہداد انہیں لے کر ساہن پال چلے گئے۔ یہ عارف کامل حاجی نوشہ کی خانقاہ کے باہر بیٹھ گئے اور اپنی باری اور طلبی کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد آپ کے خادم نے باہر نکل کر شیخ الہداد سے کہا۔ ”اندر تشریف لے چلیں، قبلہ حاجی صاحب یاد فرما رہے ہیں۔“
شیخ الہداد عبدالرحمٰن کے ساتھ اندر چلے گئے۔ آپ کی نظر جب عبدالرحمٰن پر پڑی تو چونک پڑے اور فرمایا۔ ”ارے عبدالرحمٰن! یہ تم ہو؟ خیریت تو ہے؟ کیسے آنا ہوا؟“ پھر شیخ الہداد سے پوچھا۔ ”انہیں میرے پاس کیوں لائے ہو؟“
شیخ الہداد نے ساری کیفیت بیان کر دی اور آخر میں کہا۔ ”قبلہ و کعبہ حاجی صاحب! پورا خاندان پریشان ہو رہا ہے، اگر عبدالرحمٰن پر آسیب کا اثر ہے تو اسے دور کر دیجیے۔“
آپ نے متبسم ہو کر فرمایا۔ ”کیسا آسیب، کہاں کا آسیب؟ یہ تو ہمارا منظورِ نظر ہے، اس کو آسیب نہیں ہے۔ رہ گئی اس کی مدہوشی اور بے ہوشی تو یہ وجد اور جذب کا نشان ہے۔“
اس کے بعد انہوں نے عبدالرحمٰن کو حکم دیا۔ ”وضو کر کے میرے پاس آجاؤ۔“
عبدالرحمٰن بے چون و چرا اپنی جگہ سے اٹھے اور جا کر غسل کیا پھر قبلہ حاجی نوشہ کی خدمت میں حاضری دی۔ حاجی نوشہ نے دریافت فرمایا۔ ”دیکھ جھوٹ تیرے منہ سے اچھا نہیں لگتا، میں تجھے اپنا مرید کرنا چاہتا ہوں۔“
عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ ”بسر و چشم۔ میں حاضر ہوں۔“
حاجی نوشہ نے انہیں بیعت کیا اور چند دنوں کے لیے اپنے پاس ہی روک لیا کہا ”عبدالرحمٰن! یہ بڑی پرخطر اور دشوار راہ

ہے، اس پر کم ہی لوگ چل سکے ہیں۔ میں نے خود بھی یہی پریشانیاں اٹھائی ہیں۔ خدا تمہیں کامیاب کرے (آمین)۔‘‘

عبدالرحمٰن نے عرض کیا۔ ’’حضرت! میں آپ ہی کے پاس رہنا چاہتا ہوں کیونکہ یہاں میں سکون محسوس کر رہا ہوں۔ میں آپ کی خدمت کروں گا اور یہیں آپ کے قدموں میں پڑا رہوں گا۔‘‘

آپ نے فرمایا۔ ’’کوئی مضائقہ نہیں۔‘‘

عبدالرحمٰن اپنے پیرو مرشد کے پاس رہنے لگے۔ یہاں کوئی بے کار تو رہ نہیں سکتا تھا، پیرو مرشد نے ان کے سپرد بھی ایک کام کر دیا جو درویش کسبِ معاش میں کھیتی باڑی کرتے تھے۔ حضرت نوشہ ان کے کھانے پینے کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ آپ نے عبدالرحمٰن کو حکم دیا۔ ’’اب یہ تمہارا فرض ہے کہ کھیتی باڑی میں مشغول درویشوں کو کھانا پہنچا دیا کرو۔‘‘

آپ نے بلاعذر یہ ذمے داری قبول کر لی۔ دوپہر سے پہلے کھانا لے کر چلے جاتے۔ کام سے فراغت پا کر درویش کھانے میں مشغول ہو جاتے اور عبدالرحمٰن ان سے دور کھیت کی منڈیر پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگتے۔ درویش اس بے نیازی اور لاتعلقی سے یہ سمجھتے کہ عبدالرحمٰن گھر سے کھانا کھا کر چلے ہوں گے۔

ادھر سے فارغ ہو کر جب یہ گھر پہنچتے تو گھر والے یہ سمجھتے کہ عبدالرحمٰن نے درویشوں کے ساتھ کھا لیا ہوگا۔ یہ معمول تھا جو جاری تھا اور کسی میں بھی اتنی جستجو نہیں تھی کہ کھانے کے بارے میں عبدالرحمٰن سے بھی معلوم کر لیتا۔ اس عمل کو کئی دن گزر گئے۔

ایک دن صبح ہی صبح حضرت حاجی نوشہ نے عبدالرحمٰن کو طلب کر لیا۔ حاجی صاحب کے فرستادے نے عبدالرحمٰن سے کہا۔ ’’اجی قبلہ! آپ اسی وقت میرے ساتھ چلیں۔ قبلہ حاجی صاحب نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔‘‘

عبدالرحمٰن ڈر گئے۔ جواب دیا۔ ’’حاجی صاحب نے مجھ کو یاد فرمایا ہے تو ضرور چلوں گا۔‘‘

یہ حاجی صاحب کے پاس تشریف لے گئے۔ حاجی صاحب نے نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تک نہیں۔ حاجی صاحب نے فرمایا۔ ’’عبدالرحمٰن! میں نے تجھے کیوں بلایا ہے کچھ معلوم ہے؟‘‘

عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ ’’حضرت! میں اسی حد تک جانتا ہوں جس حد تک آپ کی اجازت ہوتی ہے۔‘‘

حاجی صاحب نے ارشاد فرمایا۔ ’’میں کچھ اور جاننا چاہتا ہوں۔‘‘

عبدالرحمٰن نے عرض کیا۔ ’’آپ ارشاد تو فرمائیں۔‘‘

حاجی صاحب نے اچانک سوال کر دیا۔ ’’صاحبزادے! تم کھانا کہاں کھاتے ہو؟‘‘

عبدالرحمٰن نے شرما کر جواب دیا۔ ’’حضرت! میں کیا عرض کروں؟‘‘

حاجی صاحب نے سخت لہجے میں سوال کیا۔ ’’عبدالرحمٰن! میں تم سے کیا پوچھ رہا ہوں؟‘‘

عبدالرحمٰن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، جواب دیا۔ ’’کہیں بھی نہیں۔‘‘

حاجی صاحب نے فرمایا۔ ’’آج جب میں نے کشف میں تمہیں دیکھا تو پتا چلا کہ تم بھوکے ہو، کئی دن کے بھوکے۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟ تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟‘‘

عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ ’’درویشوں کے لیے جو کھانا دیا جاتا تھا، اس میں میرا حصہ نہیں ہوتا تھا اور گھر میں مجھے پوچھا نہیں گیا۔ تیسری جگہ تھی نہیں جہاں میں کھانا کھانے جاتا۔‘‘

حاجی صاحب نے بے چینی سے فرمایا۔ ’’عبدالرحمٰن! یہ تو نے کیا کیا؟ افسوس کہ تو بھوکا رہا۔‘‘

حاجی صاحب نے ان کی پیشانی کو بوسہ دیا اور فرمایا۔ ’’آ۔ میں تیرا پیٹ بھروں گا۔ تیرا روزہ میں کھلواؤں گا۔‘‘

حاجی صاحب نے کوئلوں پر خود روٹیاں پکائیں اور اپنے ہاتھ سے عبدالرحمٰن کو کھانا کھلایا۔ اس کے بعد حاجی صاحب نے فرمایا۔ ’’عبدالرحمٰن! اس روٹی کے طفیل خدا نے تجھے مقامِ صمدیت سے سرفراز فرمایا۔ سلوک کا وہ مقام جہاں تجھے صفاتِ بشری سے مبرا کر دیا گیا۔ اب تجھے شہودِ ذات کا سرور عطا ہو چکا ہے اور اس سرور میں تجھے اکل و شرب (کھانے پینے) کا ہوش ہی نہیں رہے گا۔‘‘

عبدالرحمٰن نے اپنے آپ میں انقلابِ عظیم محسوس کیا۔ وہ اپنی ذات میں جو سرور محسوس کر رہے تھے اس کی لذت اور کیفیت کے سامنے بھوک پیاس کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہ گئی تھی۔

☆☆☆

آپ نے اپنے پیرو مرشد سے پوچھا۔ ’’اب میرے سپرد کون سی خدمت کی جا رہی ہے؟‘‘

حاجی صاحب نے ارشاد فرمایا۔ ''اب تم گاھدی میں بیٹھ کر کنویں سے پانی کھینچا کرو۔''
یہ کنواں حاجی صاحب کے حجرے کے قریب ہی تھا۔ آپ کنویں کے پاس پہنچے اور گاھدی میں بیٹھ کر بیلوں کو چلانا شروع کر دیا۔ کئی دن تک آپ یہ کام بڑی دلجمعی اور لگن سے انجام دیتے رہے پھر اچانک خیال آیا کہ یہ تو بیلوں پر بڑا ظلم ہے کہ میں خود بھی گاھدی پر بیٹھوں اور بیلوں سے پانی بھی کھنچواؤں۔ وہ اپنا بوجھ جانوروں پر نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ اس احساس نے انہیں گاھدی سے نیچے اتار دیا اور وہ بیلوں کے ساتھ ساتھ پیدل چلنے لگے۔
کئی دن بعد انہیں خیال آیا کہ یہ بات کیا ہوئی کہ جانور تو گاھدی کو کھینچ رہے ہیں اور پانی بھر رہے ہیں اور میں بے کار آزاد گاھدی کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا ہوں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ آپ نے بیلوں کو کھول دیا اور خود جت گئے اور پانی کھینچنے لگے۔ ہر چکر میں جب پیرومرشد کا حجرہ روبرو آجاتا تو بہ احتراماً اپنا سر جھکا لیتے اور پیرومرشد کو سلام عرض کرتے۔
لوگوں کو آپ کی ان حرکات وسکنات کا علم ہوا تو وہ یہ تماشا دیکھنے کے لیے کنویں کے پاس آجاتے اور آپ کی جذب وکیفیت میں ڈوبی ہوئی اضطراری حرکتیں شوق اور حسد سے دیکھتے رہتے چونکہ ان میں مختلف اور متنوع مزاج اور مختلف فطرت کے لوگ شامل ہوتے اس لیے ان کی رائے بھی ایک دوسرے سے مختلف اور بعض اوقات متضاد ہوتی۔
کوئی صاحب فرماتے۔ ''صاحبان! کیا آپ میں سے کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ عبدالرحمٰن کو یہ ہو کیا گیا ہے؟''
دوسرا جواب دیتا۔ ''میں حاجی صاحب قبلہ کے احترام میں کچھ کہہ تو سکتا نہیں' ہاں اگر یہی حرکتیں کوئی اور کرتا تو میں یہی کہتا کہ یہ پاگل ہو گیا ہے، یہ دیوانہ ہو چکا ہے۔''
تیسرا زبان کھولتا۔ ''پتا نہیں ان پر جذب وکیف طاری ہے یا یہ جنون میں مبتلا ہیں؟''
کوئی اور صاحب فرماتے۔ ''اگر یہاں ایسے لوگ آنے اور رہنے بسنے لگے تو صحیح الدماغ تو یہاں سے بھاگ کھڑے ہوں گے۔ خدا کے لیے کچھ اور باتیں کرو' یہاں کی حد تک اپنی اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔''
ایک صاحب نے پیرومرشد سے ان کی شکایت کر دی۔ حاجی صاحب نے فرمایا۔ ''عبدالرحمٰن میرا مست ہے، اس کی فکر میں کرتا ہوں' کسی اور کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔''
معترضین اور نکتہ چیں اپنا وقت ضائع کرتے رہے اور عبدالرحمٰن اپنی خدمات عام کرتے رہے۔ آخر ایک دن ان کے پیرومرشد نے انہیں طلب کیا اور پوچھا۔ ''عبدالرحمٰن! اب تمہیں کیسا لگتا ہے؟''
انہوں نے جواب دیا۔ ''مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ ہر وقت ایک نشہ ایک کیف طاری رہتا ہے اور اکل وشرب کا خیال ہی دل ودماغ سے محو ہو چکا ہے۔''
حاجی صاحب نے فرمایا۔ ''عبدالرحمٰن! میں تجھ سے بہت خوش ہوں۔ اب میں تجھے خرقۂ خلافت دوں گا اور تو کسی اور جگہ بیٹھ کر مخلوق کی خدمت کرتا رہے گا۔''
عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ ''کیا میں آپ کی صحبت سے محروم ہو جاؤں گا؟''
حاجی صاحب نے جواب دیا۔ ''ہاں مگر مجھ سے جدا ہو کر تو مخلوق کی خدمت میں مصروف ہو جائے گا اور تجھے کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہے گا۔''
عبدالرحمٰن سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ حاجی صاحب نے انہیں خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور حکم دیا۔ ''عبدالرحمٰن! تم بھڑی واپس جاؤ اور وہاں بیٹھ کر مخلوق کی راہنمائی کرو۔ خدا اس سے راضی رہے گا۔''
عبدالرحمٰن نے خرقۂ خلافت لیا اور اپنے گاؤں بھڑی کے لیے چل کھڑے ہوئے۔ آپ کی منزل بھڑی نہیں، اس کے مضافات کی کوئی جگہ تھی۔ چنانچہ بھڑی کے پاس پہنچ کر وہ رک گئے۔ یہ جگہ بھڑی کے شمال میں واقع تھی۔ آپ نے اس جگہ پر اپنا ڈیرا ڈالا۔ آپ کی آمد کے ساتھ ہی ہر طرف آپ کا شہرہ پھیل گیا۔ مخلوق جوق در جوق آنے لگی اور اپنی دلی مرادیں پا کر خوش وخرم واپس ہونے لگی۔ آپ نے اپنے ڈیرے کے قریب ہی ایک کٹیا دیکھی۔ لوگوں سے پوچھا۔ ''اس کٹیا میں کون رہتا ہے؟''
جواب ملا۔ ''اس میں دندو رام نامی ایک ہندو فقیر رہتا ہے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''اچھا تو اس میں دندو رام رہتا ہے...... خوب۔''
آپ کی موجودگی اور تشریف آوری کا یہ اثر ہوا کہ دندو رام کی کٹیا اجڑنے لگی۔ مخلوق آپ کے ڈیرے پر آنے لگی۔ دندو رام اپنی محنت اور ریاضت سے دنیا کماتا تھا، جب اس کی کمائی میں رخنہ پڑا تو وہ بہت برہم ہوا اور آپ کے پاس پیغام

بھیجا کہ جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں اور ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے اسی طرح یہاں دو فقیر بھی نہیں رہ سکتے۔ بہتری اسی میں ہے کہ کہیں اور چلے جاؤ کیونکہ میں یہاں پہلے سے رہ رہا ہوں۔

آپ نے جواب میں کہلا دیا۔ ”افسوس کہ میں یہ جگہ نہیں چھوڑ سکتا۔ کیونکہ میرے پیرومرشد نے مجھے اس جگہ بٹھایا ہے۔ اب وہی اگر مجھے اٹھائیں گے تو اٹھ جاؤں گا۔“

وندورام کو اس جواب پر غصہ آ گیا۔ آپ کے پاس خود پہنچ گیا، بولا۔ ”میاں جی! کیا آپ کو میرا پیغام نہیں ملا؟ کیا آپ کو میری حیثیت کا علم نہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”تیرا پیغام مجھے مل گیا تھا اور مجھے یقین ہے کہ میرا جواب بھی تجھے مل گیا ہوگا اور میری سمجھ میں تیری یہ بات نہیں آئی کہ اگر تجھ کو میرا جواب نہیں ملا تھا تو پھر یہ تو چراغ پا ہو کر میرے پاس کیوں آ گیا؟“

وندورام جزبز تو بہت ہوا مگر نرمی سے بولا۔ ”بہرحال میں آپ سے بنتی کرتا ہوں کہ یہاں سے کہیں اور چلے جائیں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں نے ایک بار کہہ جو دیا کہ مجھے اس جگہ میرے پیرومرشد نے بٹھایا ہے۔ میں ان کے حکم کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ جب وہ یہاں سے اٹھ جانے کا حکم دیں گے تو میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

وندورام نے اکڑ کر جواب دیا۔ ”میاں جی! میں مروت اور شرافت سے کام لے رہا ہوں ورنہ مجھے وہ طریقہ بھی آتا ہے کہ میں اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہ ادا کروں اور آپ یہاں سے بھاگ کھڑے ہوں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اگر یہ کام اتنا ہی آسان ہے تو پھر دیر کس بات کی۔ مجھ سے باتیں کر کے اپنا اور ہمارا وقت کیوں برباد کرتے ہو؟“

وندورام نے کہا۔ ”میاں جی! جس چیز کو تم کرامات کہتے ہو اسے میں بھی حاصل کر چکا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم کرامات میں میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”جس شے کو تو کرامات کہہ رہا ہے، وہ دراصل استدراج ہے۔ کرامات سے ملتی جلتی مگر ناقص...... اور اس کو تو دنیا کمانے کے لیے کام میں لاتا ہوگا۔“

وندورام کو غصہ آ گیا، بولا۔ ”میں چاہوں تو آپ کے ڈیرے کو جلا کر خاک کر دوں۔“

آپ نے بڑے تحمل سے فرمایا۔ ”آگ بھی خدا کے حکم کے خلاف ایک تنکا بھی نہیں جلا سکتی۔“

وندورام کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا، بولا۔ ”اچھا اب میں چلتا ہوں۔ بھگوان نے چاہا تو آپ کا ڈیرا بہت جلد سانپوں سے بھر جائے گا۔ اگر آپ میں دم ہے تو میرے سانپوں سے لوہا لیجیے گا۔“

وندورام غصے میں اول فول بکتا چلا گیا۔

اس نے اپنی کٹیا میں داخل ہوتے ہی تصرف سے کام لیا۔ وہ سانپوں کا عامل تھا۔ وہ کچھ دیر زیرِ لب جاپ کرتا رہا پھر بہ آوازِ بلند حکم دیا۔ ”ناگو! جاؤ اور اس مسلمان فقیر کو بھگا دو۔ خبردار جو مروت کی۔“

کچھ دیر بعد ہر طرف سے سانپ نمودار ہونے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ وندورام کی کٹیا کے باہر جمع ہو گئے۔

وندورام نے انہیں حکم دیا۔ ”کیا تم نے میرا حکم نہیں سنا؟ میں نے تمہیں حکم دیا تھا کہ جاؤ اور عبدالرحمٰن کے ڈیرے میں پھیل جاؤ اور اس مسلمان جوگی سے کہو کہ وہ یہاں سے کہیں اور چلا جائے۔“

سانپوں نے پھن اٹھا اٹھا کر وندورام کو سلام کیا اور عبدالرحمٰن کے ڈیرے کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ جب سانپوں کا یہ قافلہ ڈیرے کی طرف جا رہا تھا تو دیکھنے والوں نے شور و غل کرنا شروع کر دیا۔ دو ایک آدمی آپ کے ڈیرے میں بھی داخل ہو گئے اور کہا۔ ”شاہ صاحب! ہزاروں سانپ آپ کے ڈیرے کی طرف بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ اب کیا ہوگا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”تم لوگ بالکل فکر نہ کرو، سب کچھ صحیح ہو جائے گا۔“

اس کے بعد آپ اٹھے اور ڈیرے کے باہر کھڑے ہو گئے۔ اس شخص سے پوچھا۔ ”کہاں ہیں وہ سانپ جن کا تو ذکر کر رہا تھا؟“

اس شخص نے دور سامنے اشارہ کیا۔ ”حضرت! وہ رہے۔ کیا آپ سامنے سڑک پر بہت ساری سائیں سائیں نہیں سن رہے ہیں؟ یہ سانپوں کے سرسرانے کی آواز ہے۔“

آپ نے نہایت اطمینان سے فرمایا۔ ”اچھا، تو ان سانپوں میں زہر بھی ہوگا؟“

ارادت مند نے جواب دیا۔ ''حضرت! یہ سانپ ہیں، ان میں زہر تو ہوگا ہی۔''
آپ نے معصومیت سے دوسرا سوال کیا۔ ''اور یہ کاٹتے بھی ہوں گے؟ میرا مطلب ڈسنے سے ہے یعنی یہ جانداروں کو ڈس بھی لیتے ہوں گے؟''
مرید نے جواب دیا۔ ''جی ہاں، یہ ڈس بھی لیتے ہیں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''اگر یہ بات درست ہے تو میں آج اس کا تجربہ کروں گا۔''
اب سانپ ان کے قریب پہنچ چکے تھے۔ آپ نے ان کی طرف دیکھا اور بہ آوازِ بلند ڈانٹ دیا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟ تمہیں کس کی تلاش ہے؟''
سانپوں نے کوئی جواب تو نہیں دیا مگر پھر فوراً ہی انہوں نے پھنکارنا شروع کر دیا۔ آپ نے ان سانپوں کو وہیں چھوڑا اور خود اندر چلے گئے اور اپنے ایک مرید سے فرمایا۔ ''اس نے مجھ پر سانپ بھیجے تھے تاکہ یہ مجھے مرعوب اور دہشت زدہ کر کے یہاں سے اٹھوا دیں لیکن میں نے ایک بار جو بات کہہ دی ہے، وہی آخر تک کہتا رہوں گا۔ میرے پیرومرشد یہاں سے چلے جانے کا اگر حکم دیں گے تو میں اس کی فوراً ہی تعمیل کروں گا۔''
اب سانپ بالکل ان کے مقابل کھڑے ہوئے تھے لیکن پھن کوئی بھی نہیں اٹھائے ہوئے تھا۔
عبدالرحمٰن نے اچانک انہیں متنبہ کیا۔ ''تم نے یہاں تک آنے کی جسارت کی ہے تو اب اپنے اس جرم کی سزا بھگتو۔''
سانپ کچھ دیر تو وہاں پھن اٹھائے موجود رہے، اس کے بعد انہوں نے مڑنا اور بھاگنا شروع کر دیا۔
ایک مرید نے پوچھا۔ ''حضرت! کیا اب یہ سانپ دوبارہ یہاں نہیں آئیں گے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''اب یہ دوبارہ یہاں آ کر کریں گے کیا؟ میں نے ان کا زہر تو کھینچ ہی لیا ہے، اب یہ بے کار ہو چکے ہیں۔'' پھر اس مرید کو حکم دیا۔ ''جا...... دندو رام سے کہہ دے کہ میں نے اس رقبے کے حاضر اور غیر حاضر سارے ہی سانپوں کا زہر کھینچ لیا ہے۔ اب وہ بیکار ہو چکے ہیں۔''
مرید نے آپ کا یہ پیغام دندو رام کو پہنچا دیا۔ دندو رام ہمت ہار چکا تھا، بولا۔ ''میاں جی سے کہہ دینا، میں ہار گیا آپ جیت گئے۔ اب میں ہی اپنی کٹیا کو کہیں اور لے جاؤں گا۔''
اس کے بعد دندو رام نے اس جگہ کو چھوڑ دیا اور وہاں سے دو میل دور چلا گیا اور یہاں ڈیرا ڈالا۔ یہ جگہ آج بھی موجود ہے۔ حافظ آباد سے گوجرانوالہ کی طرف چلیے تو اس سڑک پر آپ کو یہ گاؤں ملے گا جو آج بھی ڈیرا دندو رام کہلاتا ہے۔

☆☆☆

ایک دن آپ اپنے پیرومرشد حاجی نوشہ گنج بخش کے ساتھ کشتی میں سوار دریائے چناب کی سیر کر رہے تھے۔ اس کشتی میں حاجی نوشہ کے کئی مرید بھی سوار تھے۔ اس عالم میں کشتی ہی پر قوالی شروع ہو گئی۔ حاضرین دیکھ رہے تھے کہ قوالی کا شاہ عبدالرحمٰن پر شدید اثر ہو رہا ہے۔ آپ وجد میں جھوم رہے تھے۔ جھومنے میں تیزی آ گئی اور آپ نے حالتِ وجد میں نعرہ مارا اور دریا میں گر گئے۔ کشتی والوں میں بے چینی پھیل گئی۔ جو لوگ تیرنا جانتے تھے وہ دریا میں کود جانا چاہتے تھے مگر حضرت حاجی نوشہ گنج بخش نے فرمایا۔ ''عبدالرحمٰن کے لیے دریا میں کودنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''
حاضرین میں سے کسی نے پوچھا۔ ''کیوں حضرت؟ پھر یہ نکلیں گے کس طرح؟''
حضرت حاجی نوشہ نے جواب دیا۔ ''جس چیز نے انہیں پانی میں پہنچایا ہے وہی چیز انہیں نکالے گی اور پھر میرا شاہ عبدالرحمٰن تو پانی میں پاک ہونے گیا ہے۔''
پیرومرشد کی باتیں کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ کسی نے پھر پوچھا۔ ''حضرت! پھر یہ نکلیں گے کس طرح؟''
آپ نے فرمایا۔ ''میں نے کہہ جو دیا کہ یہ جس طرح اندر گئے ہیں اسی طرح برآمد بھی ہو جائیں گے۔''
ایک شخص نے سوال کیا۔ ''اور کب؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''جب وہ باہر نکلنا مناسب سمجھیں گے۔''
اس واقعے کو کئی دن گزر گئے مگر شاہ عبدالرحمٰن پانی سے برآمد نہیں ہوئے۔ آخر مایوس ہو کر مریدوں نے آپ کو گھیر لیا اور کہا۔ ''حضرت! اب تو کئی دن گزر گئے، خیال ہے انہیں مچھلیاں کھا گئی ہوں گی۔''
آپ نے جوش میں فرمایا۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ مچھلیوں کی مجال کہ وہ شاہ عبدالرحمٰن کو اپنا لقمہ بنا لیں۔ وہ جس شان سے

اندر گیا ہے اسی شان سے باہر آجائے گا۔“

آخر کئی دنوں بعد آپ نے اپنے قوال کو آواز دی۔ ”ارے بھائی! کدھر چلے گئے ذرا ادھر آؤ۔“

قوال بھاگا بھاگا آیا اور ادب سے عرض کیا۔ ”جی پیر و مرشد! بندہ حاضر ہے۔“

آپ قوال کو دریائے چناب کے ساحل پر لے گئے اور اس سے کہا۔ ”بھائی! کئی دن پہلے اپنا شاہ عبدالرحمٰن بحالتِ وجدان دریا میں چلا گیا تھا۔ اب اسے باہر آجانا چاہیے۔“

قوال دم بخود آپ کی باتیں سنتا رہا، جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پوچھا۔ ”جی پیر و مرشد! میں آپ کا مفہوم نہ پاسکا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”جس طرح وہ تیری قوالی سن کر وجد کی حالت میں پانی کے اندر چلا گیا تھا، اب اسی قوالی سے وہ پانی سے باہر آئے گا۔“

قوال حیرت سے آپ کی شکل دیکھتا رہا، آپ نے فرمایا۔ ”میاں تم قوالی شروع کرو تاکہ شاہ عبدالرحمٰن قوالی سن کر باہر آجائے۔“

قوال کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی مگر تعمیلِ ارشاد میں قوالی شروع کردی۔ کچھ دیر بعد بحالتِ وجد شاہ عبدالرحمٰن پانی کے اندر سے نمودار ہوئے اور میاں علی قوال کے پاس بیٹھ گئے۔ قوالی جاری رہی اور عبدالرحمٰن... پورے انہماک سے قوالی سنتے رہے۔ حضرت حاجی نوشہ کے مریدوں کی حالت غیر ہورہی تھی۔ انہوں نے اس وقت جو کچھ دیکھا تھا، وہ سراسر ناقابل یقین تھا لیکن وہ اس پر یقین کیوں نہ کرتے کیونکہ انہوں نے سب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

جب قوالی ختم ہوگئی تو حاضرین چلے گئے۔ اس وقت آپ نے شاہ عبدالرحمٰن سے کہا۔ ”شاہ عبدالرحمٰن! جو کچھ تم کررہے ہو اس سے میں بھی رسوا ہو رہا ہوں اور تم بھی رسوا ہو رہے ہو۔“

شاہ عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں کیا عرض کروں، آپ تو سب کچھ بغیر بتائے ہی جانتے ہیں۔“

پیر و مرشد نے فرمایا۔ ”جو کچھ ہوا، اس کا بڑا چرچا ہورہا ہے لیکن یہ بھی ہے کہ اب تم پاک ہوچکے ہو اور اب تم ہمیشہ شاہ عبدالرحمٰن ہی کہلاؤ گے۔“

شاہ عبدالرحمٰن مغلوب الجذبات ہورہے تھے، اس وقت ان میں اتنی بھی طاقت نہیں تھی کہ اپنے پیر و مرشد سے آنکھیں ہی ملالیتے۔ نظریں جھکائے مؤدب بیٹھے رہے۔

اب وہ جس مقام پر فائز ہوچکے تھے اس کی ذمے داریوں اور فرائض میں بھی اضافہ ہوچکا تھا۔ شدید ترین گرمیوں کا زمانہ تھا اور شاہ عبدالرحمٰن نے اپنے پورے جسم کو کمبل میں لپیٹ رکھا تھا۔ جو مرید اور ارادت مند وہاں موجود تھے، انہیں اس بات پر حیرت تھی کہ اتنی شدید گرمی میں بھی وہ کمبل میں لپٹے بیٹھے تھے۔ ایک مرید کا تو اس حلیے نے حال ہی غیر کردیا تھا، اس نے پوچھا۔ ”شاہ جی! کیا بات ہے، کیا آپ کو جاڑے بخار نے گھیر لیا ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ایسی تو کوئی بات نہیں...... کیوں؟“

مرید نے عرض کیا۔ ”حضرت! اتنی سخت گرمی میں کمبل میں چھپ جانا عجیب سی بات ہے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”ایسی تو کوئی بات نہیں لیکن اس طرح میں اپنے نفس کو قابو میں رکھنا چاہتا ہوں۔“

مرید نے پوچھا۔ ”پیر و مرشد! وہ کس طرح؟“

آپ نے فرمایا۔ ”میرا نفس موٹا ہورہا تھا۔ اس نے شدید گرمی میں ٹھنڈی ہوا اور ٹھنڈے پانی کا مطالبہ کیا تھا چنانچہ میں نے ان دونوں کی جگہ گرم کمبل دے دیا۔ اس سے وہ اتنا سہم گیا کہ اب یہ آئندہ ٹھنڈے پانی اور ٹھنڈی ہوا کا مطالبہ نہیں کرے گا۔“

اور جب سردی کا موسم آیا تو انہوں نے کورے گھڑے میں پانی بھر کر آسمان تلے رکھ دیا۔ صبح جب سو کر اٹھے اور کورے مٹکے کے پانی کو انگلی ڈال کر دیکھا تو وہ یخ ہورہا تھا۔ آپ نے مریدوں سے فرمایا۔ ”دوستو! میرا نفس مجھ سے کہہ رہا تھا کہ گرم پانی سے غسل کرکے گرم گرم بستر میں چلا جا مگر میں نے اس کی یہ بات نہیں مانی اور وہی کیا جس سے میرے نفس کو تکلیف پہنچتی ہے۔“

آپ کی ریاضتوں کا یہ حال تھا کہ کنویں میں معکوس لٹک کر نماز ادا کرتے تھے۔ جو لوگ یہ منظر دیکھتے ان کا برا حال ہوجاتا۔

☆☆☆

اس عہد کے مشہور صوفی شاہ مسکین قلندر کے مکان پر محفلِ سماع قائم تھی۔ حضرت حاجی نوشہ گنج بخش بھی شاہ عبدالرحمٰن کو ساتھ لے کر وہاں پہنچ گئے۔ اس محفل میں بڑے باکمال لوگ موجود تھے، کسی کا حال کسی سے مخفی نہیں تھا۔ قوالی جوش و خروش سے ہو رہی تھی۔ شاہ مسکین پر وجد طاری ہو گیا اور وہ رقص کرنے لگے۔ صاحبانِ حال نے باطنی نگاہ سے دیکھا کہ شاہ مسکین کے ہاتھ پہلے آسمان کو چھو رہے ہیں۔ حضرت حاجی نوشہ نے شاہ عبدالرحمٰن پر توجہ کی اور یہ بھی غلبۂ شوق میں رقص کرنے لگے۔ اس عالم میں صاحبانِ حال نے اپنی اپنی چشمِ باطن سے دیکھا کہ شاہ عبدالرحمٰن چوتھے آسمان پر کھڑے رقص کر رہے ہیں اور ان کے ہاتھ عرشِ معلٰی تک پہنچ رہے ہیں۔

شاہ مسکین قلندر نے انہیں اس حال میں دیکھا تو طنزاً کہا۔ ”واہ جناب، واہ، پیر و مرشد صاحب تو زمین پر یعنی نیچے ہیں اور مرید کے پاؤں اوپر چوتھے آسمان پر۔“

شاہ عبدالرحمٰن کو ایسا لگا جیسے کسی نے اوپر سے دھکا دے دیا ہو۔ وہ بے ہوش ہو کر حضرت حاجی نوشہ کے قدموں میں گر گئے۔ بے ہوشی کا غلبہ اتنا شدید تھا کہ دیر تک ہوش ہی نہ آیا۔ حضرت حاجی نوشہ نے آپ کے پاؤں میں رسا ڈال کر درخت پر الٹا لٹکا دیا، اس کے باوجود آپ دیر تک وجد و حال میں رہے۔

آپ کی پیر و مرشد سے عقیدت کا یہ حال تھا کہ آپ جب بھی ساہن پال تشریف لے جاتے، اپنی جوتی میلوں دور اتار کر ایک جگہ رکھ دیتے اور پیر و مرشد کے دربار میں ننگے پاؤں حاضری دیتے۔ پھر جب واپس آتے تو اسی جگہ سے جوتی پہن کر بھڑی تشریف لے جاتے۔ آپ جس جگہ جوتی چھوڑ جاتے تھے، وہ جگہ پیر ملہہ کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔

جب کوئی شخص پیر و مرشد کے علاقے سے آپ کے پاس پہنچتا تو آپ اس کا حد درجہ احترام کرتے۔ اس کو چارپائی پر بٹھا کر خود نیچے بیٹھ جاتے تھے۔ پیر و مرشد کا یہ حال تھا کہ اپنے اس مرید پر خاص توجہ رکھتے۔ جب بھی کوئی شخص بھڑی سے ساہن پال پہنچتا آپ اس سے شاہ عبدالرحمٰن کے بارے میں ضرور پوچھتے۔

ایک دن بھڑی کا ایک کھتری سوداگر فروش حضرت حاجی نوشہ کے پاس پہنچا۔ آپ اس سے کچھ دیر تک تو اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر فرمایا۔ ”تمہارے گاؤں میں ہمارا ایک درویش بھی تو رہتا ہے۔“

کھتری نے پوچھا۔ ”حضرت! اس درویش کا نام کیا ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”شاہ عبدالرحمٰن۔“

کھتری شاہ عبدالرحمٰن کا نام سن کر مسکرایا، بولا۔ ”ہاں جناب! اس نام کا ایک درویش بھڑی میں رہتا تو ہے۔“

حضرت حاجی نوشہ نے دریافت فرمایا۔ ”مگر یہ تو ہنسا کیوں؟“

کھتری نے جواب دیا۔ ”جناب! جس شخص کو درویش کہہ رہے ہیں وہ ایک دیوانہ سا شخص ہے۔ ساری رات گیدڑ کی طرح گاؤں کے چکر لگاتا رہتا ہے، لوگوں کو آرام تک نہیں کرنے دیتا۔“

حضرت حاجی نوشہ کو غصہ آ گیا، حالتِ جلال میں فرمایا۔ ”اے گدھے تو کیا جانے۔ وہ تو خدا کا شیر ہے۔ ایک ایسا وقت بھی آئے گا کہ وہ شیر کی طرح غرائے گا اور اس کی حالت لوگوں پر خود بخود ظاہر ہو جائے گی۔“

بعد میں پیر و مرشد کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔ آپ ذکر جہر کرتے تو بالکل شیر کی طرح گرجنے لگتے اور اس کے اثرات صاف ظاہر ہونے لگے۔

جب پیر و مرشد حاجی نوشہ کا آخری وقت آیا تو آپ کے مریدوں اور ارادت مندوں نے مستقل حاضریاں دینا شروع کر دیں۔ شاہ عبدالرحمٰن بھی ہر وقت ان کے پاس موجود رہتے۔

ایک دن حضرت حاجی نوشہ نے سبھی کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”لوگو! میں دنیا سے جانے والا ہوں اگر کسی کو کوئی غرض و حاجت ہو تو طلب کر لے پھر یہ موقع نہیں ملے گا۔“

چنانچہ ہر شخص نے اپنی مطلوبہ شے کا مطالبہ کر دیا۔ انہی میں حاجی نوشہ گنج بخش کے نامی گرامی مرید اور خلیفہ حضرت پیر محمد سچیار بھی موجود تھے۔ انہوں نے اپنے پیر و مرشد سے عرض کیا۔ ”حضرت! اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو کچھ عرض کروں؟“

حضرت حاجی نوشہ نے فرمایا۔ ”جب میں نے طلب کرنے کی اجازت ہی دے دی ہے تو پھر برا کیوں مانوں گا۔“

حضرت سچیار نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں نہ تو دین چھوڑ سکتا ہوں اور نہ ہی دنیا...... میں دونوں ہی چیزیں

چاہتا ہوں۔''

پیرومرشد نے جواب دیا۔''سچیار! خوش ہوجا کہ میں نے تیرے سلسلے میں قیامت تک دولت مندی اور دین داری قائم کردی۔''

اس کے بعد آپ نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔''آج میرا مستانہ کہیں نظر نہیں آرہا؟''

شاہ عبدالرحمٰن اداس اور مغموم اس طرح سر جھکائے بیٹھے تھے کہ نظر ہی نہ آتے تھے۔کسی شخص نے جواب دیا۔

''پیرومرشد! یہ رہے شاہ عبدالرحمٰن۔میرے پاس بیٹھے ہیں۔''

آپ نے انہیں آواز دی۔''اے میرے مستانے! اِدھر میرے پاس تو آ۔''

شاہ عبدالرحمٰن بہ چشمِ پُرنم اپنے پیرومرشد کے سامنے جاکھڑے ہوئے۔اس وقت ان سے بولا نہیں جارہا تھا۔ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور لب ساکت تھے۔

حضرت حاجی نوشہ نے فرمایا۔''کیا تم نے میری بات نہیں سنی؟''

شاہ عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔''بھلا یہ میری مجال کہ آپ فرمائیں اور میں غافل بیٹھا رہوں۔''

آپ نے فرمایا۔''پھر تم نے مجھ سے کچھ مانگا کیوں نہیں؟''

شاہ عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔''پیرومرشد! مجھے تو بس آپ کی ذات کا عشق درکار ہے۔''

آپ نے فرمایا۔''میں تجھے خوش خبری سناتا ہوں کہ عشق کا ظہور تیرے سلسلے میں قیامت تک قائم رہے گا اور یہ عشق ہی تیرے لیے موجبِ عزت واحترام رہے گا۔''

پیرومرشد وصال فرماگئے۔لوگوں نے دیکھا کہ سچیار سلسلے میں دین اور دولت یکجا مل جاتے ہیں مگر ان میں جذب ومستی نہیں ملتی جبکہ شاہ عبدالرحمٰن کے سلسلے میں عشق ومستی کی زبردست فراوانی ہے۔

☆☆☆

شاہ عبدالرحمٰن کو سماع سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔آپ مجلس میں سوز وگداز، رقتِ قلب اور وجد وحال عام تھے۔اس کا شہرہ بھی دور دور تک پہنچ چکا تھا۔پرگنہ بچہ چٹھہ کے مفتی کے برخوردار مولانا حافظ کو آپ کی یہ باتیں بہت گراں گزر رہی تھیں۔

جب یہ باتیں ناقابلِ برداشت ہوگئیں تو اس نے نواب صاحب ناظم لاہور اور قاضی القضاۃ عبدالرحمٰن مفتی اعظم لاہور کو الگ الگ شکایتیں لکھ بھیجیں۔اس نے ان دونوں کو لکھ دیا کہ آپ دونوں پر دین کی بقا اور حفاظت کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔شاہ عبدالرحمٰن بھڑی والے نے بدعت اپنا رکھی ہے۔اس کی محفل رقص وسرود سے گرم رہتی ہے۔قوال گاتے ہیں اور حاضرینِ محفل رقص کرتے ہیں۔انہیں اس بدعت کے ارتکاب سے روکا جائے۔

نواب لاہور نے شاہ عبدالرحمٰن کو فوراً ہی طلب کیا۔''آپ فوراً لاہور تشریف لے آئیں تاکہ شرعی احتساب کیا جاے۔''

شاہ عبدالرحمٰن نے شیخ صالح محمد چتیاں والے، شاہ غریب گاج گولہ والے اور میاں علی قوال کو اپنے ساتھ لیا اور لاہور کے لیے روانہ ہوگئے۔لاہور میں داخل ہوتے ہی آپ نے حضرت مخدوم شیخ علی ہجویری داتا گنج بخشؒ کے مزار پر حاضری دی۔وہاں آپ نے شکایتاً عرض کی۔''حضرت! یہ آپ کے شہر کے دین دار حاکم فقیروں کو احتسابِ شرعی کے لیے تکلیف دے رہے ہیں۔اس سلسلے میں، میں آپ ہی سے استمداد کا طالب ہوں۔''

جب آپ وہاں سے فارغ ہوکر اٹھے اور روضے سے باہر تشریف لائے تو وہاں مرزا احمد بیگ نامی ایک عہدے دار کو اپنے استقبال کے لیے کھڑا دیکھا۔مرزا احمد بیگ شاہ عبدالرحمٰن کا مرید اور نواب صاحب حاکم لاہور کا انتہائی مقرب تھا۔اس نے آپ سے عرض کیا۔''آپ قیام کہیں اور نہیں فرمائیں گے، میرا غریب خانہ حاضر ہے۔''

آپ نے فرمایا۔''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن میں یہ سوچتا ہوں کہ تم سرکاری ملازم ہو اور میں یہاں احتسابِ شرعی کے لیے طلب کیا گیا ہوں۔اس حالت میں اگر میں تمہارے یہاں مقیم ہوتا ہوں تو کہیں اس کا وبال تم پر نہ نازل ہو۔''

مرزا احمد بیگ نے جواب دیا۔''حضرت! میں ان باتوں سے بالکل نہیں ڈرتا۔میں جانتا ہوں کہ کل آپ کو شاہی مسجد لاہور میں علمائے کرام کے روبرو جواب دہ ہونا ہے مگر میں ان باتوں کی پروا نہیں کرتا۔''

آپ مرزا احمد بیگ کے گھر چلے گئے۔دوسرے دن شاہی مسجد میں علمائے کرام کا اجتماع ہوا۔اس میں آپ بھی اپنے تینوں ساتھیوں کو لے کر شریک ہوئے۔ہر کوئی آپ کو نہایت اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔کارروائی کا آغاز ہوا اور آپ سے سوال

کیا گیا۔ ”جب فقہائے حنفیہ نے سماع کی حرمت پر فتویٰ دے دیا ہے تو آپ سماع کیوں سنتے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”جناب! میں تو یہ جانتا ہوں کہ عید کے دنوں میں دو لڑکیوں نے حجرۂ رسولؐ میں دف بجا بجا کر گانا سنایا تھا اگر یہ چیز حرام تھی تو یہ واقعہ کیوں پیش آیا؟“

اس کے بعد انہوں نے امام غزالی کی کتاب ”احیاء العلوم“ کے حوالے سے جوازِ سماع میں مثالیں پیش کیں گو کہ شاہ عبدالرحمٰن ان پڑھ تھے مگر جس شان اور وثوق سے آپ بول رہے تھے، اس نے علمائے کرام کو دم بخود اور خاموش کر دیا۔

حاکم لاہور نواب صاحب نے فرمایا۔ ”ان سے پیش پانا ناممکن ہے کیونکہ آپ کا علم لدنی ہے۔“

علمائے کرام بھی ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ سبھی لاجواب ہو چکے تھے۔ شاہ عبدالرحمٰن نے ان سب کو دم بخود جو دیکھا تو میاں علی قوال کو حکم دیا۔ ”تم کیوں خاموش ہو، کچھ شروع کرو۔“

میاں علی قوال نے ایک بار پھر پوچھا۔ ”تو حضرت! میں شروع کروں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں، تم شروع کرو۔ اب انتظار کس بات کا؟“

میاں علی قوال نے راگ الاپ کر حضرت حاجی نوشہ گنج بخش کی تعریف میں ایک کافی شروع کی۔ شاہ عبدالرحمٰن نے ایک نعرہ لگایا اور حاضرینِ جلسہ کو وجد آ گیا۔ ہر طرف سے ہو حق کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ اس وقت وہاں کئی علماء موجود تھے۔ قاضی القضاۃ علماء سمیت ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔

یہ کیفیت تادیر طاری رہی۔ جب محفلِ سماع کا اختتام ہوا تو جملہ علمائے کرام اور قاضی القضاۃ نے خواہش ظاہر کی کہ انہیں بھی ارادت مندوں میں شامل کر لیا جائے۔ درخواست منظور ہوئی اور انہیں مریدوں میں شامل کر لیا گیا۔

شاہ عبدالرحمٰن نے ان سب کے اصرار اور خواہش پر کچھ عرصے کے لیے لاہور ہی میں سکونت اختیار کی۔ اندرونی بھاٹی گیٹ بازار حکیماں کے ایک کمرے میں معتکف ہو گئے۔ آپ کی وہ چلہ گاہ اب تک موجود ہے اور لوگوں کی زیارت گاہ بنی ہوئی ہے۔ کچھ عرصہ رہ کر آپ بھڑی واپس چلے گئے۔

☆☆☆

آپ کا چہرہ نہایت بارعب تھا۔ کسی شخص میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ آپ سے نظریں ملا کر ہم کلام ہو سکتا۔ آپ کی نظر میں کچھ ایسا اثر تھا کہ جس پر ڈال دیتے، اس کی بھوک پیاس اڑ جاتی۔ آپ کے اس قسم کے مریدوں سے ایک بار کسی نے سوال کیا۔ ”کیا تم نے کھانا پینا قصداً چھوڑ دیا ہے؟“

تقریباً سبھی نے ایک ہی جواب دیا۔ ”ہمیں کھانے کی رغبت ہی نہیں ہوتی۔ اگر ہم تکلف ہی سے ایک آدھ لقمہ منہ میں ڈال لیں تو وہ حلق سے نیچے نہیں جاتا۔“

پوچھا گیا۔ ”کھانا نہ کھانے سے کمزوری تو آ جاتی ہوگی؟“

جواب ملا۔ ”نہیں کوئی کمزوری بھی نہیں آتی اور نہ ہی کسی قسم کی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔“

آپ نے بی بی زہرہ خاتون المعروف بہ بی بی ظہری سے شادی کی تھی۔ آپ اولادِ نرینہ سے محروم رہے۔ تین بیٹیاں البتہ تھیں۔ ایک کا نام بی بی جواہر تھا۔ انہوں نے نہ تو شادی کی اور نہ دنیاداری میں پڑیں، تارک الدنیا بن گئی تھیں۔ دوسری بیٹی بی بی فتح خاتون تھیں۔ ان کی شادی شیخ عبدالکریم معروف بہ میاں شاکر علی سے ہوئی۔ یہ شاہ عبدالرحمٰن کے بھائی شیخ الہداد کے بیٹے تھے۔ تیسری بیٹی بی بی حسین خاتون تھیں۔ ان کی شادی شیخ عبدالرحیم سے ہوئی تھی۔

آپ نے بڑی لمبی عمر پائی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد 1703ء کی بیس مئی (4 محرم 1115ھ) میں بعمر ایک سو بیس سال آپ نے وفات پائی۔ بھڑی ہی میں آپ کا مزار بنا اور آپ ہی کی ذاتِ بابرکات کے طفیل بھڑی نے ”بھڑی شاہ رحمٰن“ کا مرتبہ حاصل کیا۔

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

ماخذ

- احمد شاہ ابدالی — ڈاکٹر گنڈا سنگھ
- تاریخ الافغان — سید جمال الدین افغانی
- تاریخ سلطانی — مرزا محمد علی
- مآثر الامرا — صمصام الدولہ شاہنواز خان
- تاج التواریخ — امیر عبدالرحمٰن
- تاریخ پنجاب — کنہیا لال



غم گسار

سلیم انور

کسی کا غم بانٹنے کے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ آپس میں کوئی گہرا تعلق یا جان پہچان بھی ہو... یہ تو درد کا ایسا احساس ہوتا ہے جو غیرمحسوس انداز میں ایک دل سے دوسرے دل تک رسائی حاصل کرلیتا ہے... وہ بھی ایک دوسرے کی ایسی ہی غم گسار تھیں جن کا آپس میں بہ ظاہر کوئی رشتہ نہ تھا مگر احساس کا تعلق بہت مضبوط تھا۔ یہ بھی قدرت کا کرشمہ ہے جیسے زمین کے اندر نباتات کی جڑیں پھیلتی چلی جاتی ہیں اسی طرح رگوں میں دوڑنے والے خون میں بھی ایک مقناطیسی کشش رکھ چھوڑی ہے... جس کی طرف جوش مارے بس وہی اپنا بن جاتا ہے۔

اجنبی محبتوں اور ہمدردیوں کا بے مثال انداز

میامی پہنچنے کی اگلی صبح جب میں نے اپنے بیڈروم کی کھڑکی کے شیڈز کھولے تو دیکھا کہ باہر آٹھ انچ برف گری ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے مجھے وضاحت کردینی چاہیے۔ میں ریاست فلوریڈا کے شہر میامی میں نہیں بلکہ ریاست ورمونٹ کے قصبے میامی میں تھی۔

یہ جگہ بوسٹن شہر کے علاقے بیکن ہل ایریا میں واقع میرے متمول اور ماڈرن ہائی رائز کونڈومینیم سے کئی گھنٹوں کی مسافت پر تھی اور بطور آفس منیجر کم بک کیپر میری نئی جاب ایک ٹاپ فرم میں بطور فنانشل اینالسٹ کی ہائی پاور پوزیشن سے بھی کہیں زیادہ پرے تھی اور اب میں کم ازکم عاجز کردینے کی حد تک میرا پیچھا کرنے والے اور میرا بوائے فرینڈ بننے کے متمنی فرد کی پہنچ سے بہت دور آچکی تھی جو اقدام قتل کی سزا کاٹنے کے بعد حال ہی میں جیل سے رہا ہوا تھا اور اس نے جس شخصیت کو قتل کرنے کا قصد کیا تھا، وہ

میں تھی۔
اس کا نام ٹام سمودرز تھا۔ اسے بیس سال عمر قید کی سزا ہوئی تھی لیکن اس کے عمدہ رویے کی بنا پر اسے صرف سات سال سزا کاٹنے کے بعد پیرول پر رہائی مل گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے سات سال سے دبے ہوئے غصے کو اخراج کی ضرورت تھی اور میں جانتی تھی کہ اس کے غصے کے اظہار کا نشانہ کون ہوگا۔
میں......! آخر کار یہ میری غلطی تھی کہ میں نے نہ صرف اسے ٹھکرا دیا تھا بلکہ اس کے حدود میں رہنے کا حکم نامہ بھی جاری کرا دیا تھا۔ میں نے رہائش گاہ کے دربانوں سے کہہ دیا تھا کہ اگر ٹام سمودرز کبھی ہماری بلڈنگ کے سامنے سڑک پار بھی ٹہلتا ہوا دکھائی دے تو وہ فوراً پولیس کو اطلاع کر دیں اور احتیاطی تدبیر کے طور پر میں نے اپنے دروازے کے تالے بھی بدل دیے تھے۔ اپنی لینڈ لائن کا نمبر بھی ٹیلی فون ڈائریکٹری کی فہرست سے خارج کرا دیا تھا اور اپنے سیل فون پر کسی بھی غیر معروف نمبر سے آنے والی فون کال کا جواب دینا بھی چھوڑ دیا تھا۔ کم از کم اس حد تک تو میں اپنا دفاع کر سکتی تھی۔
اگر میں اس بات کا احساس کر لیتی کہ میں ایک نشے کے عادی تقریباً بے گھر اور ہارٹن اسکول سے نکالے ہوئے شخص کی .... غلام اور خاتون خانہ بن کر دائمی خوشیاں تلاش کر سکتی ہوں تو اسے اس قسم کے انتہائی اقدامات اٹھانے کی ضرورت بھی پیش نہ آتی کہ اسے یقین آ جائے میں کسی اور سے شادی نہیں کروں گی۔
ٹام سمودرز کی سرکاری وکیل صفائی سے جس نے بار کا امتحان یقیناً مشکل ہی سے پاس کیا ہوگا، ابتدائی غلطی یہ سرزد ہوئی کہ اس نے اپنے مدعا علیہ کو یہ جانے بغیر کہ اسے کیا کہنا ہوگا، کٹہرے میں کھڑے ہونے کی اجازت دے دی۔ ٹام سمودرز نے حلف اٹھا کر جو کچھ کہا، وہ یہ تھا کہ مجھے یہ یقین دلانے کے لیے کہ وہ میرا آئیڈیل رفیق زندگی ہے، اس نے اپنی شراب کی آخری دو بوتلوں کے بدلے میں ایک گن حاصل کر لی تھی اور منصوبہ بنایا تھا کہ جب میں اپنے کام پر جا رہی ہوں گی تو وہ گھات لگا کر مجھ پر حملہ کر دے گا۔
اس روز جب میں دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے شہر سے باہر گئی ہوئی تھی تو ٹام اس آفس بلڈنگ کی لابی میں داخل ہو گیا جہاں میں کام کرتی تھی اور الل ٹپ فائرنگ کر دی۔
سو اس کی قطعی رائے کے مطابق اس کے پانچ افراد کو زخمی کرنے کی ذمے داری میں تھی۔ وہ مزید لوگوں کو بھی ہلاک یا زخمی کر سکتا تھا لیکن اس کی ناقص گن جام ہو گئی تھی۔ اگر ٹام کے پاس ادل بدل کرنے کے لیے شراب کی تین بوتلیں خریدنے کی رقم ہوتی تو وہ زیادہ بہتر ہتھیار حاصل کر سکتا تھا۔
ٹام کو گریڈ اسکول ہی میں شراب کی لت لگ گئی تھی۔ اس کے اسکول سے نکالے جانے کی اصل وجہ بھی یہی تھی۔ اس کی وکیل نے یہ شہادت دینے کے لیے منشیات کے ایک اسپیشلسٹ معالج کو کٹہرے میں پیش کر دیا تھا کہ کثرتِ شراب نوشی نے ٹام کے دماغ کو ابتر کر دیا ہے اور وہ دیوانہ ہے۔ اس کی وکیل کو امید تھی کہ جیوری دیوانگی کی بنا پر اسے بری کر دے گی۔
اس کے بجائے جیوری کو یہ یقین نہیں آیا کہ کوئی بھی اس حد تک دیوانہ ہو سکتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ڈھونگ رچا رہا ہے۔ سو انہوں نے ٹام کو مجرم قرار دے دیا۔
اگر زخمیوں میں سے کوئی ایک بھی مر جاتا تو مجھے بوسٹن چھوڑ کر جانے اور کینیڈا کی سرحد کے پاس...... اس تفریح گاہ میں پناہ لینے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ تب ٹام کو تاعمر قید کی سزا ہو جاتی اور اس کے پیرول پر رہائی کا بھی کوئی امکان نہیں رہتا۔
مجھے ٹام نے جو دھمکیاں دی تھیں، وہ وائس میل ریکارڈنگز، ای میلز اور تحریری پیغامات کی شکل میں میرے پاس موجود تھیں جو اس کے ارادوں کو ثابت کرتی تھیں۔ مقدمے کے دوران میں نے اس کے خلاف عدالت میں گواہی دی تھی لیکن چونکہ اس نے حقیقت میں مجھ پر کوئی حملہ نہیں کیا تھا اس لیے کسی انٹری لیول کے کم آمدنی والے کلرک نے اس وقت جب ٹام پیرول پر رہا ہو رہا تھا تو خود ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ مجھے اس بارے میں سرکاری طور پر مطلع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔
مجھے اس بات کی خبر میرے دفتری ساتھیوں میں سے ایک نے دی جو ٹام کی الل ٹپ فائرنگ کے نتیجے میں زخمی ہو گیا تھا اور گولی اس کے بازو میں لگی تھی۔ تب میں نے فوری طور پر فرار ہونے کا منصوبہ بنا لیا۔ میں جانتی تھی کہ میری راہِ فرار ٹام کے لیے ایک طرح کی فتح ہوگی لیکن سچ بات یہ تھی کہ میں اپنے کام سے بری طرح تھک چکی تھی اور تبدیلی کی خواہاں تھی۔
او کے۔ سچ یہ تھا کہ میں کمپنی کے انضمام اور ملازموں کی علیحدگی کے بارے میں بہت زیادہ افواہیں سن رہی تھی۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اس سے قبل کہ میری ملازمت کا

خاتمہ ہو، میں اپنی شرائط پر اس ملازمت کو خیر باد کہہ دوں۔

یہ ذہن میں رکھتے ہوئے کہ ٹام نے میرے ساتھ کیا سلوک کرنے کا منصوبہ بنایا ہوا ہے، ملازمت چھوڑنا میرے لیے موت کے مانند ہوگا۔ گو یہ ایک وقتی چھٹکارا ہی ہوگا۔

کئی سال قبل جب میں نے وہارٹن اسکول سے گریجویشن کیا تھا اور جہاں ٹام سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی، میں اس ملازمت پر کام کر رہی تھی اور ترقی کے زینے تک پہنچنے کے لیے مسلسل ہاتھ پیر مار رہی تھی۔ تب میں نے سوچنا شروع کیا تھا کہ یہ کیریئر کے بجائے ایک جاب ہے اور اس درمیان میں تبدیلی کی خاطر مجھے قبل ازوقت ریٹائرمنٹ لے لینی چاہیے۔

لیکن اس میں بھی چند رکاوٹیں تھیں۔ اول تو یہ کہ میرے پاس اتنی رقم پس انداز نہیں ہوئی تھی کہ میں قبل ازوقت ریٹائرمنٹ لے لوں۔ پھر قبل ازوقت ریٹائرمنٹ کے لحاظ سے میری عمر بھی خاصی کم تھی۔ میں اس اسٹیج پر بھی نہیں تھی کہ درمیانی زندگی کے بحران کا سامنا کرسکوں یا اس کا اعتراف کرسکوں اور سب سے اہم یہ کہ مجھے کوئی آئیڈیا نہیں تھا کہ میں اور کیا کرنا چاہتی ہوں۔

میں نے اپنی اعلیٰ تنخواہ کے علاوہ بونس کی رقم ملنے کے باوجود ان چیزوں سے کبھی لطف اندوز ہونے کی کوشش نہیں کی جیسے کہ اعلیٰ رہائش، بہترین ملبوسات، تعطیلات منانا، ریسٹورنٹس اور ڈراموں کی تفریح وغیرہ۔ برا ہوا کہ میں نے ان تفریحات کے لیے کبھی وقت نہیں نکالا اور مزید برا یہ ہوا کہ میں رقم کی بچت کرنے کے بجائے اسے خرچ ہی کرتی رہی۔

مجھے غلط مت سمجھیے۔ میرے پاس اتنی رقم ضرور تھی کہ اگر میں اپنے اخراجات گھٹا دیتی اور بوسٹن جیسے مہنگے شہر سے نکل جاتی تو کچھ عرصے تک اپنا ٹھیک ٹھاک گزارہ کرسکتی تھی بلکہ حقیقت میں بوسٹن سے نکلنے یا بوسٹن اور واشنگٹن کے درمیان میٹروپولیٹن کاریڈور میں کسی بھی جگہ میں خاصے عرصے تک کافی آرام دہ زندگی بسر کرسکتی تھی۔ البتہ کیلی فورنیا منتقل ہونے کی صورت میں ایسا ممکن نہیں ہوسکتا تھا۔

اب میرے غائب ہونے کا وقت آ گیا تھا۔

غائب ہونا نسبتاً آسان تھا۔ میں انٹرنیٹ پر نیا کام تلاش کروں گی...... ایسی جگہ پر جو شہری زندگی سے بہت دور اور جہاں تک ممکن ہو بوسٹن سے قطعی مختلف ہو۔ ایسی جگہ تلاش کرنے کے بعد میں اپنا کونڈومینیم مکمل سازوسامان اور آرائش سمیت کرائے پر اٹھا دوں گی، اپنے کریڈٹ کارڈز ختم کردوں گی، ایک نیا سیل فون لے لوں گی اور کسی بھی سوشل میڈیا یا ای میل کا استعمال بند کردوں گی۔ میں نے پہلے ہی اپنے تمام بل الیکٹرونیکلی آٹومیٹک پے منٹ کے ذریعے ادا کرنا شروع کردیے تھے۔

ڈاک کے پرانے نظام سے بھیجی جانے والی جو ڈاک مجھے موصول ہوتی تھی وہ زیادہ تر فضول قسم کی ہوتی تھی۔ جیسے کہ عطیے کی التجائیں، کریڈٹ کارڈ کی درخواستیں، ڈسکاؤنٹ کوپن کے کتابچے، ٹام کی جانب سے دھمکیاں۔

حتیٰ کہ میں نے ایک نیا نام اور سوشل سیکیورٹی نمبر اپنانے کا پلان بھی بنایا ہوا تھا۔ اپنے کام پر میں بے شمار خفیہ معلومات کی رازدار تھی۔ ان میں سے ایک راز اس عورت کا بھی تھا جو میری ہم عمر تھی اور چند سال قبل رحم کے کینسر کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوچکی تھی۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور اس کے والدین کا بھی انتقال ہوچکا تھا۔ اس نے کبھی شادی نہیں کی تھی اور نہ ہی بچے پیدا کیے تھے۔

میں اس عورت کی شناخت اپنا سکتی تھی۔ خاص طور پر اس لیے کہ ہم دونوں کی تفصیلات ایک جیسی تھیں۔ ایسا کتابوں اور فلموں میں ہوتا ہے تو پھر ایسا عملی زندگی میں ممکن کیوں نہیں ہوسکتا، ہے نا؟ کوشش کرنے میں کیا حرج تھا۔

میرا پہلا کام خاصی آسانی اور تیزی سے ہوگیا۔ ریاست ورمونٹ کے میامی نامی نرالے قصبے میں نرالے نام والی میامی اسکی ریزورٹ میں آفس منیجر کی جاب بالکل ویسی ہی تھی جیسی کہ میں تلاش کر رہی تھی۔ میں نے اس تفریح گاہ کے مالکان سے رابطہ نہ کرنے کا فیصلہ کیا بلکہ ان کے پاس خود سے جا کر دوبدو ملاقات کرنے کو ترجیح دی کیونکہ مجھے امید تھی کہ میں وہ ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گی۔

میں بخوبی جانتی تھی کہ اگر میں نے اپنے مختصر شخصی کوائف انہیں بھجوائے تو وہ اسے نظرانداز کردیں گے کیونکہ کاغذوں پر میں بہت زیادہ تعلیم یافتہ تھی اور کاغذات سے ہٹ کر بھی میں اس عہدے کے لیے ضرورت سے زیادہ موزوں تھی۔

میں جب میامی، ورمونٹ پہنچی تو وہ اکتوبر کا ایک خوب صورت دن تھا۔ میرے بوسٹن کے دوستوں کو معلوم تھا کہ میں اکثر ویک اینڈ پر برگ خزاں سے لطف اندوز ہونے کے لیے آگے شمال کی طرف نکل جایا کرتی ہوں۔

میرے بچپن اور انڈر گریجویٹ اسکول کا دور مغربی میساچوسیٹس میں گزرا تھا اور میں شفاف نیلے آسمان کے پس منظر میں رنگ برنگے درختوں کے دلکش مناظر سے محروم رہی

تھی۔ بوسٹن میں بھی یہ قدرتی مناظر دیکھنے کو نہیں ملتے تھے۔ البتہ بوسٹن سے متصل بوسٹن گارڈنز کے فراگ تالاب کی سوان بوٹس میری بیشتر دوستوں کے لیے قدرتی مناظر کے لحاظ سے کافی تھا۔ وہ اسی پر اکتفا کرلیا کرتی تھیں۔ میں بھی کبھار کیپ کوڈ میں تبدیلی کے لحاظ سے گرمیوں کے موسم میں بھی وقت گزارنے چلی جاتی تھی لیکن کوئی بھی میرا ساتھ دینے پر رضامند نہیں ہوتا تھا۔

مجھے یہ اندازہ لگانے کے لیے ایک اچھا موقع تھا کہ آیا میامی، ورمونٹ میرے لیے ایک عارضی اطمینان بخش خفیہ جائے پناہ ثابت ہوسکتی ہے یا نہیں جہاں میں بحفاظت چھپ کر ٹام سمووررز سے مستقل فرار حاصل کرنے کی پلاننگ کرسکوں۔

میں نے دفتر سے چند روز کے لیے چھٹی لے لی تاکہ بدھ کے روز میں ذرا جلدی نکل پڑوں۔ ہائی وے ون نائن پر ٹریفک کے رش میں رینگتے ہوئے میں نے اپنی منزل سے لگ بھگ نصف فاصلے پر واقع پلائی ماؤتھ، نارتھ ہیمپشائر میں رکنے کا فیصلہ کیا۔

اگلے روز میں نے شمال کی جانب اپنا سفر جاری رکھا اور قدرتی مناظر سے نظروں کی تراوٹ حاصل کرنے اور لطف اندوز ہونے کے لیے کئی مرتبہ راستے میں رکتی بھی رہی۔ نیوپورٹ، ورمونٹ کے قریب میں ہائی وے ون نائن ون سے باہر نکل آئی اور بتدریج تنگ ہوتی عقبی سڑکوں سے میامی کی جانب چلتی رہی۔

قصبہ بنیادی طور پر دو سڑکوں کا سنگم تھا۔ چوراہے کے ایک کارنر پر ایک گیس اسٹیشن اور ایک کنوینینس اسٹور واقع تھا جبکہ اس کے سامنے سفید موٹی تختوں کا بنا ہوا ایک چرچ تھا۔ باقی دو کارنرز پر تین منزلہ اینٹوں کے مکانات تھے جن میں سے ایک کی پہلی منزل پر ایک ڈاکٹر کا آفس تھا۔ ایک اور مکان میں باربر کی شاپ تھی۔

میامی اسکی ریزورٹ جو میری منزل تھی، قصبے کے مرکز سے لگ بھگ دو میل کی دوری پر تھی۔ یہ ریزورٹ ماؤنٹ میامی کے دامن میں بے حد خوب صورتی سے بنی ہوئی تھی۔ یہ جے پیک نامی برفانی چوٹی سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی جو کہ مشرق میں کسی بھی اسکی ریزورٹ میں سالانہ سب سے زیادہ برف باری کے لیے مشہور تھی۔

میں جب ریزورٹ میں داخل ہوئی تو لابی میں کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔ البتہ وہاں ایک کاؤنٹر موجود تھا جس پر چھوٹی گول گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے ان گھنٹیوں کو بجایا تو افسردہ سے چہرے والی ایک نوعمر لڑکی پہلو کے ایک کوریڈور سے نمودار ہوئی جس کے ہاتھ میں ایک پرچہ تھا۔ اس کوریڈور میں غالباً مہمانوں کے قیام کے لیے کمرے بنے ہوئے تھے۔

"ہاں، کیا چاہیے؟" اس لڑکی نے اپنی ببل گم چباتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا یہاں کے مالک یا منیجر موجود ہیں؟ میں یہاں آفس منیجر کی ملازمت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے آئی ہوں۔"

اس نے خالی نظروں سے میری طرف دیکھا، پھر بولی۔ "مجھے نہیں معلوم، میں پتا کرکے آتی ہوں۔ تم انتظار کرو۔"

اپنے انٹرویو کے انتظار کے دوران میں نے لابی میں رکھے ہوئے چند پمفلٹ پڑھ لیے۔ جب ہی مجھے پتا چلا کہ یہاں اوسطاً سالانہ تین سو چھپن انچ برف باری ہوتی ہے جبکہ ماؤنٹ واشنگٹن میں اوسطاً سالانہ سو انچ سے کچھ زیادہ برف پڑتی ہے۔

پرفیکٹ۔ مجھ سے شادی کے خواہاں شخص سمیت جو کوئی بھی مجھے جانتا تھا اور خاص طور پر ٹام سمووررز کے جو کہ عاجز کردینے کی حد تک میرا پیچھا کیا کرتا تھا۔ میرے دوستوں سے میرے بارے میں تفتیش کرنے سے گریز نہیں کرتا تھا اور مسلسل مجھے گوگل کیا کرتا تھا سب ہی اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے۔ میری اسکی انگ کو ناپسند کرنے کی اہم وجہ یہی تھی کہ یہ برف پر ہوتی تھی۔

مغربی میساچوسٹس میں پروان چڑھنے اور پھر انڈر گریجویٹ کالج میں تعلیمی دور گزارنے کی وجہ سے مجھے برف سے کوئی دلچسپی نہیں رہی اور نہ ہی میں نے کبھی کسی سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔

انٹرویو کا سب سے مشکل مرحلہ ریزورٹ کی مالکن پامیلا میامی اور جولیانا میامی کو یہ قائل کرنا تھا کہ مجھے یہ ملازمت لازمی درکار ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ پامیلا تھی جس نے کاؤنٹر کے عقب میں بنے ہوئے دفتر کے دروازے کو کھولا اور اندر داخل ہوئی۔ جولیانا اس کے پیچھے تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا ادل بدل تھیں۔ میری اس وقت یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ آیا وہ بہنیں ہیں، یا بزنس پارٹنر یا لائف پارٹنر؟

"ویل، ہیلو!" پامیلا نے کہا۔ "میں سمجھ رہی ہوں کہ تم یہاں جاب کے سلسلے میں آئی ہو۔ اندر آجاؤ۔"

میں نے کاؤنٹر کے چھوٹے دروازے کا کھٹکا کھولا

اور دفتر میں داخل ہوگئی۔ میں نے بڑی بڑی واک ان الماریاں دیکھی تھیں جو کہ بدقسمتی سے میرے کونڈومینیم میں نہیں تھیں۔ میز پر زیادہ فائل فولڈرز بھی موجود نہیں تھے۔ میز کے درمیان میں ایک ایسا حصہ تھا جہاں ایک بالکل نیا لیپ ٹاپ کمپیوٹر رکھا ہوا تھا۔

ان میں سے ایک کسی نے (پامیلا یا جولیانا) دوسری سے میرا تعارف کرایا۔ اس نے حقیقت میں یہ کہا۔ ''ہم پامیلا میامی اور جولیانا میامی ہیں۔ تم کون ہو؟''

میں فیصلہ نہ کرسکی کہ آیا پامیلا یا جولیانا آپس میں بہنیں ہیں یا اتنے طویل عرصے سے ساتھ رہنے کی بنا پر ان میں اس درجہ مشابہت آگئی ہے۔ ان دونوں کی عمریں اسّی سے نوّے سال کے درمیان تھیں یا پھر انہوں نے سن بلاک کے ساتھ اتنا عرصہ باہر گزارا تھا کہ وہ اپنی اصل عمروں سے جو کہ پچاس ساٹھ سال کے درمیان ہوسکتی تھیں، کہیں زیادہ بڑی عمر کی دکھائی دینے لگی تھیں۔ ان کے سفید بال مختصر تھے اور انہوں نے ایک جیسے پینٹ سوٹ پہن رکھے تھے۔ پامیلا کا سوٹ ہلکے گلابی رنگ کا تھا جبکہ جولیانا نے ہلکے بنفشی رنگ کا سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ وہ دونوں دراز قامت، دبلی پتلی اور دیکھنے میں بالکل فٹ تھیں۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ دونوں بہنیں تھیں اور انہوں نے کبھی شادی نہیں کی تھی۔ ان کی پیدائش اور پرورش میامی ہی میں ہوئی تھی۔

میں نے ان دونوں سے اپنا تعارف مارسیلا جونسن کے نام سے کرایا۔ یہ اس آنجہانی نوجوان عورت کا نام تھا جس کی شناخت میں نے اپنائی تھی۔ ''میں نے آن لائن آپ کا اشتہار دیکھا تھا۔'' میں نے لیپ ٹاپ کی جانب سر کی جنبش سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ جاب بالکل ہی ویسی لگ رہی ہے جس کی مجھے تلاش ہے اور اس سے قبل کہ آپ سوال کریں، میں بتادوں کہ میرے پاس آفس ایڈمنسٹریشن کا تجربہ ہے اور میں اسپریڈ شیٹس سے بھی شناسا ہوں۔'' میں نے ایک مرتبہ پھر سر کی جنبش سے لیپ ٹاپ کی جانب اشارہ کیا۔ ''اور دیگر فنانشل مینجمنٹ کے تمام پہلوؤں سے بھی واقف ہوں۔'' ساتھ ہی میں نے بے ترتیب فائل فولڈرز کی جانب دیکھتے ہوئے یہ اضافہ کیا۔ ''کام کے معاملے میں، میں بے حد نظم و ترتیب سے کام کرنے کی عادی ہوں۔''

''معاف کرنا مجھے یہ پوچھنا پڑ رہا ہے اور مجھے امید ہے کہ تم اس کا غلط مطلب نہیں لوگی کہ جس انداز سے تم گفتگو کررہی ہو اور جس سلیقے کا لباس تم نے پہن رکھا ہے تو یہ حیران کن بات لگتی ہے کہ تم میامی کیوں آنا چاہتی ہو۔ ہم اس کائنات کا مرکز تو نہیں ہیں؟'' یہ سوال ان دونوں پامیلا یا جولیانا میں سے کسی ایک نے میری بات کاٹتے ہوئے کیا۔ اس کی ساتھی نے بوسٹن کے بالواسطہ حوالے پر بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

میں قدرے ہچکچائی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انہیں کس حد تک صحیح بات بتائی جائے لیکن پھر کسی وجہ سے میں نے ان پر اعتبار کرنے کا فیصلہ کیا...... شاید اس کی وجہ یہ ہوسکتی تھی کہ انہیں دیکھ کر مجھے اپنی نانی یاد آگئی تھی۔

میں نے بالآخر انہیں ٹام کے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور یہ کہا کہ اس سے قبل کہ وہ مجھے تلاش کرے اور اپنے اس مذموم ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوجائے جو سات سال قبل اس نے کیا تھا، میں اس کی دسترس سے دور نکل جانا چاہتی ہوں۔ میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ یہ کچھ وقت کی بات ہے کہ وہ ایک اور جرم کا ارتکاب کرجائے۔ پھر چاہے اس کا پیرول منسوخ ہوجائے اور اسے پہلے سے زیادہ میعاد کی سزا ہوجائے، اسے اس کی پروا نہیں ہوگی لیکن میں تو اپنی جان سے جاسکتی ہوں۔

ریزورٹ کا تجلتی جائزہ لینے کے بعد میں نے یہ اندازہ بھی لگالیا تھا کہ یہ تفریحی مقام جلد ہی ڈھا لیا ہوجائے گا اور جس وقت تک ٹام واپس جیل پہنچے گا، یہ بند ہوچکا ہوگا اور مجھے واپس بوسٹن جاتے ہوئے اس ندامت کا احساس نہیں ہوگا کہ میں ان بہنوں کو نیجر کے بغیر چھوڑ کر جارہی ہوں۔ لیکن اس انٹرویو کے دوران میں نے اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

میں نے اس حقیقت کا اظہار بھی نہیں کیا کہ میں برف سے نفرت کرتی ہوں اور مجھے بلندی سے ڈر لگتا ہے۔ میری مکمل داستان سننے کے بعد ان دونوں بہنوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر ان میں سے ایک بولی۔ ''تمہیں یہ ملازمت دی جاتی ہے۔ ہمارا شمار جذباتی کہانیوں کا اثر قبول کرنے والوں میں ہوتا ہے اور ہم تمہارا اصلی نام جاننے کے لیے تم پر کوئی دباؤ نہیں ڈالیں گے۔'' وہ یہ کہتے ہوئے ہنس دی۔ ''دہشت زدہ ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہمارے یہاں سیٹلائٹ ڈش لگی ہوئی ہے اور اس کے ذریعے خاصے کرائم شوز اور فلمیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں جس سے ہم نے اندازہ لگالیا ہے کہ تم نے غالباً کسی کی شناخت چرائی ہے۔ میرا خیال نہیں کہ کبھی ہمارا آڈٹ ہوگا لیکن پھر بھی تم اپنا جعلی سوشل سیکیورٹی نمبر ہمیں دے دینا تاکہ ہم متعلقہ ٹیکس فارم داخلِ دفتر کرسکیں۔

ہم آڈیٹرز کے سامنے بے بس بوڑھی خواتین کا ناٹک ہمیشہ رچا سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ تم نے ہمارے ساتھ فراڈ کیا تھا۔''

مجھے اسی وقت یہ احساس کر لینا چاہیے تھا کہ وہ میری ضرورت سے زیادہ مدد کرنے کے آئیڈیے سے بھرپور لطف اندوز ہو رہی ہیں۔ البتہ مجھے یہ یقین نہیں تھا کہ اس کا منطقی انجام اس سے مختلف بھی ہو سکتا ہے۔

پھر میں بوسٹن واپس آ گئی۔ میں نے اپنا فرنشڈ کونڈومینیم ایک اسٹیٹ ایجنٹ کو دے دیا کہ وہ اسے کرائے پر اٹھا دے اور دفتر میں اپنا استعفا پیش کر دیا اور اپنے دوستوں کو اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ میری الوداعی پارٹی کر دیں۔ اس پارٹی میں ٹام کو مدعو نہیں کیا گیا۔

گو مجھے یقین تھا کہ ورمونٹ کا ایک اسکی ریزورٹ وہ آخری جگہ ہو گی جہاں کوئی مجھے تلاش کر سکتا ہے۔ لیکن میں نے ہر کسی کو یہی بتایا کہ میں میامی منتقل ہو رہی ہوں...... البتہ انہیں یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ کون سی ریاست کے میامی۔

میں نے اپنے وکیل جون پیٹرسن کو بھی ایک بند لفافہ بھیج دیا جس کے اوپری خط میں اسے یہ تاکید کر دی تھی کہ اس لفافے کو اسی وقت کھولے جب اسے میرے مرنے کی خبر سننے کو ملے۔ اس لفافے میں، میں نے اپنے تمام ارادوں کی تفصیل بیان کر دی تھی۔

ایک ماہ بعد میں اپنی نئی جاب اور نئے کمرے میں سیٹ ہو چکی تھی۔ البتہ میں یہ ضرور سوچتی تھی کہ میں نے خود کو کس صورتِ حال میں ڈال دیا ہے۔ میں جانتی تھی کہ یہاں بہت زیادہ برف باری ہوتی ہے۔ البتہ یہ توقع نہیں تھی کہ سردیوں میں اتنی جلدی اس کا آغاز ہو جائے گا۔

میں نے دفتر کو منظم کرنے اور تمام ڈیٹا اسپریڈ شیٹس میں درج کرنے اور ڈیٹا بیس میں منتقل کرنے میں پوری تندہی سے کام کیا۔ میں اس بات کا تصور نہیں کر سکتی تھی کہ میرا کوئی شناسا میامی اسکی ریزورٹ میں آ سکتا ہے۔ لیکن اگر ایسا کوئی اتفاق ہو جاتا تو میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں بند دروازوں کے پیچھے خود کو محدود کر لوں گی اور فرنٹ ڈیسک کا انتظام میامی سسٹرز سنبھال لیں گی۔

ایک ویک اینڈ کی رات جب یہاں کوئی مہمان نہیں تھا تو پامیلا، جولیانا اور میں گرم آرام دہ پارلر میں بیٹھے آتش دان کے روبرو مارش میلوز اور پاپ کارن سے لطف اندوز ہو رہے تھے تو میں نے پوچھا۔ ''اس جگہ اور تم دونوں کا نام 'میامی' کیونکر پڑا؟''

''ہم حیران تھے کہ تم یہ سوال کب کرو گی؟'' جولیانا نے اپنے پیر پائیدان پر رکھ دیے اور نرم و گداز کاؤچ پر اطمینان سے دراز ہوتے ہوئے بولی۔ ''یہ ایک نہایت غیر دلچسپ کہانی ہے۔ ہمارے دادا کے دادا ایک فرانسیسی اور فر کے شکاری تھے۔ ہمیں یہ تو نہیں پتا کہ وہ یہاں کیوں آئے تھے...... لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ پھانسی کی سزا سے بچنے کے لیے وہاں سے بھاگ آئے تھے۔ البتہ وہ بے حد انسان دوست آدمی تھے۔ ان سے جو کوئی بھی ملتا تھا، وہ اسے ''مونامی'' کہتے تھے جس کا فرانسیسی میں مطلب ''میرے دوست'' ہے۔ یہ لفظ بعد میں بگڑ کر میامی ہو گیا۔ داستان ختم! اور اس لفظ نے مارکیٹنگ کے لیے ہمیں ایک دلچسپ پوزیشن عطا کر دی۔''

''مارکیٹنگ کا ذکر آ ہی گیا تو پھر تم لوگ مارکیٹنگ کیوں نہیں کرتیں؟'' میں نے اپنا تجسس ختم ہونے پر گفتگو کا موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تم لوگوں کے لیے ایک ویب سائٹ اور فیس بک کا ایک صفحہ سیٹ کر سکتی ہوں، تم ان تمام لوگوں کو جو بوسٹن میں میرے شناسا ہیں، نوٹس ارسال کر سکتی ہو۔''

''کیا تمہیں یہ ڈر نہیں ہو گا کہ تمہارا کوئی شناسا تمہیں دیکھ لے گا؟ تمہیں بار بار دفتر سے باہر نکلنے کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے کیونکہ کبھی تمہیں اپنے کمرے میں یا کھانا کھانے کے لیے باہر تو نکلنا ہی ہوتا ہے۔''

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ ''جب وہ ریزرویشن کے لیے آئیں گے تو میں چیک کر لوں گی اور اگر میں اپنے بالوں کی رنگت اور اسٹائل تبدیل کر لوں، کانٹیکٹ لینسز کے بجائے اپنی عینک استعمال کروں، فلالین کی شرٹس، جینز اور ورک بوٹس پہننا شروع کر دوں تو مجھے یقین ہے کہ کوئی مجھے پہچان نہیں پائے گا۔ اس کے علاوہ کوئی بھی ریسپشنسٹ پر زیادہ توجہ نہیں دیتا ہے اور اگر کوئی شناسا ریزرویشن کے لیے فون کرے گا تو میں کہہ دوں گی کہ ہمارے یہاں کوئی گنجائش نہیں اور ہم فل ہو چکے ہیں۔ گو اس بات سے ہمارا ایڈورٹائزنگ کا مقصد ضائع ہو جائے گا۔ ہے نا؟''

اب سوچنے کی باری ان دونوں کی تھی۔ گو وہ دونوں بہنیں جڑواں نہیں تھیں اور ان کی عمروں میں صرف گیارہ مہینے کا فرق تھا، اس کے باوجود ان کی ذہنی ہم آہنگی حیران کن تھی۔ کچھ بولے بغیر ان کے خیالات میں بے حد موافقت پائی جاتی تھی۔

جولیانا نے سر کو ہلکے سے جنبش دی اور پامیلا ان دونوں کی جانب سے گویا ہوئی۔ ”اگر تم یہ چانس لینے کے لیے رضامند ہو تو ہم یہ ٹرائی کر لیتے ہیں۔ تم ہمارے کھاتوں کی تمام کتابیں بخوبی دیکھ چکی ہو اور یہ جان چکی ہو کہ موجودہ حالات کے تحت ہم اس کاروبار کو اس طرح جاری نہیں رکھ سکتے۔ اگر ہمارا ایک اور سیزن اتنا ہی کمزور گزرا تو ہمیں اس ریزورٹ کو بند کرنا پڑ جائے گا اور ہم کسی اور میامی منتقل ہو جائیں گے۔“

ان دونوں کے درمیان کسی اور بات کی اشارے بازی بھی ہوئی لیکن انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ مجھے بعد میں افسوس بھی ہوا کہ میں نے کیوں نہیں پوچھا۔

اگلے روز میں نے ویب سائٹ کی ڈیزائننگ کا آغاز کر دیا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر میں نے یہ کام مکمل کر لیا اور وہ فیس بک لنکس اور ایڈورٹائزنگ کے ساتھ رواں ہو گئی۔ البتہ ہمیں اس کا رسپانس بہت ہی کم ملا۔ لوگ اس علاقے کی بڑی ریزورٹ کو ترجیح دیتے تھے۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے جب میں خود کو بیمار محسوس کرنے لگی تھی۔ اگرچہ ایسی کوئی تکلیف نہیں تھی کہ جس کی میں خصوصی نشان دہی کر سکتی۔ بس کچھ مبہم سی تکلیف اور درد ہوتا تھا، خاص طور پر پیٹرو کے حصے میں۔ میری رحم کے سسٹ کی ہسٹری تھی اور میں نے سوچا کہ یہ بھی سسٹ ہو سکتا ہے۔ میں جانتی تھی کہ مجھے بوسٹن میں اپنی گائناکولوجسٹ سے اپائنٹمنٹ لینے کا چانس لینا ہوگا۔ بوسٹن سے تقریباً پچیس میل کے فاصلے پر نواح میں شیرون نامی چھوٹے شہر میں ایک برانچ آفس بھی تھا۔

میں اس بارے میں خاصی فکرمند تھی کہ اپنے اصل نام سے شیرون میں اپائنٹمنٹ کے لیے فون کروں یا نہ کروں؟

میں نے میامی بہنوں کو یہ نہیں بتایا کہ مجھے چند روز کی رخصت کیوں چاہیے۔ بس اتنا کہا کہ میں چند ضروری کام نمٹانا چاہتی ہوں اور میں کسی ایسی جگہ نہیں ہوں گی جہاں کوئی جاننے والا مجھے دیکھ پائے۔ مجھے یہی امید تھی۔ ان دونوں بہنوں نے اسی چیستانی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مجھے اپنی دعاؤں سے نوازا۔

میری چند روز کی رخصت میری توقع سے زیادہ طویل ہو گئی۔ میرا قیام اس علاقے کے ایک سستے سے موٹیل میں تھا جبکہ میری ڈاکٹر میرے ہر قسم کے ٹیسٹ کروا رہی تھی۔ یہ رحم کا سسٹ نہیں تھا۔ مجھے رحم کا کینسر تھا اور چوتھے اسٹیج پر تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے کسی علاج کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ مجھے مزید اذیت دیں اور تکلیف میں مبتلا رکھیں اور اس کا اختتام موت ہی ہو۔

اس کے بجائے میں میامی، ورمونٹ واپس آ گئی تا کہ یہ تخمینہ لگا سکوں کہ اپنی زندگی کے بقیہ ماہ کس طرح بسر کروں۔ دونوں میامی بہنیں بہت تیز فہم اور دانا تھیں۔ وہ فوراً ہی سمجھ گئیں کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔

بالآخر ایک شب جب ریزورٹ خالی تھا اور ہم تینوں آتش دان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے تو میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔

”تم یہاں قیام نہیں کر سکتیں۔“ پامیلا نے کہا۔ ”تمہیں واپس بوسٹن جانا ہوگا...... اپنے دوستوں اور رشتے داروں کے درمیان۔“

”میرے والدین کا چند سال پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ سو میری کوئی فیملی نہیں۔ جہاں تک دوستوں کا تعلق ہے تو میرے ساتھی اور شناسا تو ہیں لیکن حقیقی دوست کوئی نہیں ہے...... ماسوائے تم دونوں کے۔“

ان دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ ”کتنے غم کی بات ہے۔“ جولیانا نے کہا۔ ”اتنی شدید نوعیت کی بیماری اور ساتھیوں کے طور پر صرف ہم دونوں بوڑھی عورتیں۔“ پھر وہ اپنی بہن کی جانب گھومی۔ ”پامیلا! ہمیں اسے ایک تحفہ دینا ہے۔“

”احمق پن کی باتیں مت کرو۔ تمہیں میرے لیے کچھ نہیں کرنا ہے۔ بس مجھے یہاں قیام کرنے دو اور جب میری حالت حقیقت میں بہت زیادہ خراب ہو جائے تو پھر تم لوگ مجھے قریب ترین بیماروں کی اقامت گاہ میں داخل کرا دینا تا کہ میں تم لوگوں پر بوجھ نہ بن سکوں۔ میں بس یہی چاہتی ہوں۔“

”اوہ نہیں۔“ پامیلا نے کہا۔ ”ہم اس بارے میں اس وقت سے سوچ رہے ہیں جب تم نے پہلی بار ہمیں ٹام سمودرز کے بارے میں بتایا تھا۔ میرا خیال ہے تمہیں وہ پسند آئے گا۔“

مجھے کوئی آئیڈیا نہیں تھا کہ وہ دونوں کیا پلاننگ کر رہی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ تحفہ مجھے پسند نہیں آئے گا اور جیسا کہ ثابت ہوا، مجھے قطعی پسند نہیں آیا۔

میں کچھ دنوں تک خود کو بہتر محسوس کرتی رہی۔ میں اس دوران ریزورٹ کی مارکیٹنگ کا کام کرتی رہی۔ ساتھ ہی فائلیں بھی ترتیب دیتی رہی۔ پھر ایک روز میں نے اپنے دفتر

کی کھلی کھڑکی سے باہر اچٹتی نگاہ ڈالی تو ایک شناسا فرد کو کار سے نیچے اترتے ہوئے دیکھا۔

"پامیلا، جولیانا!" میں چیخ پڑی۔ "یہاں آؤ...... جلدی سے!"

وہ دونوں قدرے جھینپتے ہوئے دفتر میں داخل ہوگئیں۔ ان کا یہ انداز غیر معمولی تھا۔ میں نے ان کے اندر آتے ہی دروازہ بند کردیا۔ "یہ ٹام سمودرز یہاں کیا کررہا ہے؟" میں نے ترش لہجے میں سوال کیا۔

"اوہ، تم پریشان مت ہو، ڈیئر۔" پامیلا نے کہا۔

"اسے ہم ہی نے بتایا ہے کہ تم یہاں پر ہو۔"

"ہم نے اس کے لیے ایک چھوٹا سا سرپرائز پلان کیا ہے۔" جولیانا نے پامیلا کی بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم یہیں ٹھہرو اور دروازہ لاک کردو۔" پامیلا نے کہا پھر اس نے میز کے برابر کی کھڑکی پر اچٹتی نگاہ ڈالی اور بولی۔ "اور پردے گرادو۔ ہم باہر جاکر اس کا استقبال کرتے ہیں اور ہر بات کا دھیان رکھیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ فائل کیبنٹ کی سب سے نچلی دراز پر جھکی اور کوئی شے نکالنے لگی۔ اس دوران وہ اور جولیانا دونوں میری آڑ میں اس طرح کھڑی رہیں کہ میری نگاہ اس شے پر نہ پڑسکے جو وہ دراز سے نکال رہی تھی۔

جب پامیلا دوبارہ سیدھی کھڑی ہوئی تو وہ شے اس کی جیب میں منتقل ہوچکی تھی۔ مجھے اس وقت ایک عجیب سا احساس ہونے لگا۔ نصف گھنٹے بعد وہ دونوں یہیں واپس آگئیں۔ پامیلا نے آفس کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔ "اب تم باہر آسکتی ہو ڈیئر! ہم نے سب کچھ سنبھال لیا ہے۔ ٹام سمودرز اب کبھی تمہیں پریشان نہیں کرے گا۔"

"تم لوگوں نے اس کے ساتھ کیا، کیا؟" میں نے دروازے کا تالا کھولتے ہوئے پوچھا۔ پھر بیرونی دروازے سے باہر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "اور اس کی کار کہاں ہے؟"

"تم نے بے تہ کی گہری تنگ گھاٹی کے بارے میں سنا ہے جو اس تفریح گاہ سے ایک یا ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع ہے؟" پامیلا نے پوچھا۔ "اس کی کار اس گھاٹی کی تہ میں پہنچ چکی ہے اور ٹام بھی اسی کے اندر موجود ہے۔ اوہ، نو تمہیں فکرمند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچ رہی ہوگی۔ ہم نے پہلے اسے گولی ماردی تھی۔" پامیلا نے اپنی جیب تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "میں ایک عمدہ نشانہ باز ہوں چاہے پستول چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔ خاص طور پر جب متوقع ٹارگٹ کو یہ توقع ہی نہ ہو کہ ایک ضعیف سی بوڑھی عورت مسلح بھی ہوسکتی ہے۔"

"یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ جب ہم نے کسی ایسی عورت کی مدد کی ہے جو شوہر کے ہاتھوں مار کھاتی رہی ہو یا کسی نہ کسی انداز سے اس کے ساتھ زیادتی ہوتی رہی ہو یا برا برتاؤ کیا جاتا رہا ہو۔" جولیانا نے مطمئن انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "تمہیں ان تمام لاشوں کو دیکھ کر حیرانی ہوگی جو اس تنگ گہری گھاٹی کی تہ میں موجود ہیں۔"

"اب تم بوسٹن واپس جاسکتی ہو اور اپنا مناسب علاج اور دیکھ بھال کرسکتی ہو۔ ہم نے اس ریزورٹ کو بند کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ آخرکار اتنے برسوں کے بعد اب یہاں میامی، ورمونٹ میں کوئی میامی فیملی رہائش پذیر نہیں رہے گی۔"

"تم دونوں کہاں جاؤ گی؟"

"اوہ! میرے خیال سے بہتر یہی ہوگا کہ ہم تمہیں اس بارے میں کچھ نہ بتائیں۔ ٹھیک ہے نا؟"

میں بوسٹن واپس آگئی۔ میرا کونڈومینیم ابھی تک کرائے پر نہیں اٹھا تھا۔ سو میں اسی میں واپس آگئی۔

جب میں بیماروں کی اقامت گاہ میں منتقل ہوئی تو میں پہلے سے کہیں.... زیادہ تکلیف محسوس کررہی تھی۔ سو میں نے مارفین کی زیادہ خوراک لینا شروع کردی، جس کا میں نے ذخیرہ کیا ہوا تھا۔

میں نے پلان کیا تھا کہ جب درد کی شدت برداشت سے باہر ہوجائے گی تو میں تمام خوراک ایک ہی وقت میں لے لوں گی۔ آج وہ وقت آن پہنچا ہے۔ میں نے تمام کی تمام مارفین ابھی ابھی لے لی ہے اور مجھ پر غنودگی طاری ہو رہی ہے۔

لہٰذا وکیل جون پیٹرسن میں تمہیں اطلاع دینے کے لیے یہ ای میل کررہی ہوں کہ اب میں مرچکی ہوں۔ تمہیں وہ لفافہ کھولنے کی ضرورت نہیں جو میں نے تمہیں بھیجا تھا کیونکہ میں نے تمام باتیں یہاں تفصیل سے بیان کردی ہیں۔ پولیس سے رابطہ کرنے کی زحمت مت کرنا۔ مجھے یقین ہے کہ میامی سسٹرز نے اپنی نئی منزل کا کوئی سراغ نہیں چھوڑا ہوگا اور اس کے تمام نشانات بخوبی مٹادیے ہوں گے۔

اور مجھے امید ہے کہ انہوں نے اپنے نام اور اپنی شناخت بھی بدل لی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ انہیں اپنا نیا نام غم گسار سسٹرز رکھ لینا چاہیے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟



مات

عمر عبداللہ

اس خالقِ باری نے انسانی جوش و جذبات میں ایسی قوت رکھی ہے جس کے بل پر انسان ناقابلِ یقین مراحل سے بھی گزر جاتا ہے لیکن... یہی انسان معرکہ سر کرلینے کے بعد حیرت سے سوچتا بھی ہے کہ یہ سب وہ کیسے کرگزرا... ایسا ہی حال اس عاشق کا بھی تھا جسے عشق کے امتحان کو تمام رموز و اسرار کے ساتھ سچا ثابت کرنا تھا... ناکامی کی صورت میں اس کے نزدیک اس کا وجود شاید سانس لیتا چلتا پھرتا زمین پر محض بوجھ بن کر رہ جاتا... جبکہ وہ ایک بھرپور زندگی جینا چاہتا تھا، سارے موسموں کے مکمل رنگوں کے ساتھ... بہت کٹھن ہوتا ہے دنیا کی رنگینیوں سے دامن چھڑانا... چاہنے والوں کے ہجوم سے آنکھ بچانا... اور دل میں ابھرتی لامتناہی خواہشوں کو دبانا... مگر کسی کی خاطر اسے ان کڑی آزمائشوں پر پورا اترنا تھا... کتنا خوش نصیب ہوتا ہے وہ انسان جس کی خاطر کوئی جبر کی اس انتہا پر پہنچ جائے... اس کے باوجود جب نامرادی پیروں میں زنجیر بن جائے تو اس کے جنون کا کیا عالم ہوگا۔ وہ جوشیلا عاشق بھی دل کی مراد بر آنے تک اس کے در پر دامن پسار بیٹھا تھا... پھر کیسے قدرت کو اس کی اداؤں پر پیار نہ آتا... اور کیسے اس کی بازی مات ہوجاتی... دنیا میں سب سے خوب صورت منظر قدرت کا بندے پر مہربان ہوجانا ہی ہے شاید۔ دل فریب دنیا سے اپنے دل کو تمام فریبوں سے بچا لانا ایک جوئے شیر لانے کے مترادف ہی تو ہوتا ہے۔

محبتوں کی سرزمین پر صحرا صحرا بھٹکنے والے ایک آبلہ پا کی روداد الم



درد...... وہ واحد احساس تھا جو اس وقت اس کے نیم مردہ وجود میں باقی رہ گیا تھا۔ اس کے علاوہ تو سب کچھ اس ظلم اور بربریت نے مٹا ڈالا تھا جس سے وہ کچھ دیر قبل گزرا تھا۔ تلوؤں پر برسائے گئے ڈنڈے، برف کی سل پر لٹائے جانے کی ٹھنڈک بھری اذیت اور سگریٹ سے جسم کو داغے جانے کی جلن سب نے مل کر اس کے جسم کو ایک بے حد دکھتے ہوئے پھوڑے میں تبدیل کر دیا تھا اور اس وقت کھردرے سخت فرش پر مڑا تڑا پڑا وہ سانس بھی کھینچ کھینچ کر لے رہا تھا۔ اتنی زیادہ اذیت سے گزرنے کے بعد اسے سانس بھی ڈھنگ سے نہیں آرہی تھی لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ زندہ ہے اور فی الحال زندہ ہی رہے گا، اِلّا یہ کہ اوپر سے ہی اس کے لیے موت کا حکم آجائے۔ اسے اس اذیت کا نشانہ بنانے والے لوگ تربیت یافتہ اور ماہر تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کسے کتنی اور کس حد تک مار لگانی ہے کہ وہ اندر تک بلبلا اٹھے لیکن روح جسم کا قفس توڑ کر فرار نہ ہو سکے۔ اسے اس تاریک اور سیلن زدہ سیل میں آج دوسرا ہی دن تھا لیکن جتنی اذیت اس نے سہی تھی یوں لگتا تھا کہ نہ جانے کتنی صدیاں بیت چکی ہوں اس عذاب میں۔ اس میں اتنی بھی سکت نہیں تھی کہ اپنے زخموں کا جائزہ ہی لے لیتا۔ اگر وہ ایسا کرنا بھی چاہتا تو اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا کیونکہ اس سیل کی تاریکی میں تو ہاتھ کو ہاتھ بھی سجھائی نہیں دیتا تھا۔

چھوٹا سا یہ سیل اونچی اونچی سپاٹ دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔ ان دیواروں میں کوئی کھڑکی یا ہوادان ہونا تو دور کی بات معمولی سی درز بھی نہیں تھی۔ بس سامنے والی دیوار میں ایک دروازہ تھا جس کی بناوٹ کچھ ایسی تھی کہ کسی جھری تک سے روشنی اندر آنے کی گنجائش نہیں تھی بس جب دروازہ کھلتا تب ہی روشنی اور ہوا اندر آتی اور گھٹن اور تاریکی کا احساس ذرا کم ہوتا لیکن اس دروازے کا کھلنا اس کے لیے اذیت کا نیا پیغام لے کر آتا تھا۔ کل سے اب تک جب بھی یہ دروازہ کھلا تھا، اسے اپنے صیاد کے تند و تیز سوالوں اور اپنی خاموشی کے نتیجے میں دی جانے والی اذیت کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اب اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہ دروازہ کبھی نہ کھلے، چاہے اسے اس تنگ و تاریک اور گھٹن زدہ سیل میں پڑے پڑے موت ہی کیوں نہ آجائے لیکن موت کا آنا بھی آسان تو نہیں تھا۔ کم از کم اس کے لیے آسان نہیں تھا ورنہ تو دن رات لوگ مرتے ہی رہتے ہیں۔ بیماری سے، حادثات سے، گولیوں سے لیکن وہ ڈھیر ساری اذیت سہہ کر بھی زندہ تھا کہ اسے اس اذیت سے گزارنے والوں کو اس کی زندگی مقصود تھی۔ کیسے عجیب لوگ تھے وہ کہ اس سے بے پناہ نفرت رکھنے کے باوجود اسے زندہ رکھنا چاہتے تھے لیکن نہیں...... وہ اسے زندہ نہیں رکھنا چاہتے تھے بلکہ صرف اس وقت تک زندہ رکھنا چاہتے تھے جب تک اس کی زبان سے وہ سب نہ اگلوا لیتے جو وہ سننا چاہتے تھے اور اسے خود پر حیرت ہوتی تھی کہ وہ سب کچھ سہہ کر بھی کیسے اب تک اپنی زبان بند رکھے ہوئے ہے۔ وہ انہیں ان کے حسبِ منشا جوابات دے کر اپنی موت کو آسان کیوں نہیں بنا لیتا۔ جو کچھ یہاں رہ کر سہنا پڑ رہا تھا اس کے مقابلے میں موت کچھ آسان ہی ہوتی لیکن آسانی کی راہ تو بہت دن ہوئے وہ چھوڑ چکا تھا۔ اسے مشکلوں کو سہنے میں لطف آنے لگا تھا کہ اسے اللہ کے اس وعدے پر اعتبار تھا کہ بے شک مشکل کے بعد آسانی ہے۔ اسے سامنے نظر آتی آسانیوں کے مقابلے میں مشکل کے بعد ملنے والی آسانی میں زیادہ کشش محسوس ہونے لگی تھی کیونکہ اسے یقین ہو چکا تھا کہ بعد کی آسانی ہی پائیدار اور ہمیشگی والی ہے۔ وہ زبان جس نے دنیا بھر کے ذائقے چکھ رکھے تھے، روٹی کے ایک نوالے اور پانی کی ایک بوند تک سے محروم ہو کر اکڑ گئی تھی اور بھوک کا عفریت اس کی آنتوں کو نوچ رہا تھا پھر بھی وہ خاموش تھا اور صبر کر رہا تھا کہ اسے حق کی خاطر صبر کا ہی تو حکم دیا گیا تھا۔

☆☆☆

جناح انٹرنیشنل ائرپورٹ کے ڈیپارچر لاؤنج میں بیٹھی وہ یوں ہی ایک جریدے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ فیشن، فلمی دنیا کی خبروں، اداکاروں کے انٹرویوز اور ستاروں کے حال جیسے موضوعات پر مبنی اس جریدے میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا جسے وہ دلچسپی سے پڑھتی۔ اس نے فقط وقت گزاری کے لیے یہ جریدہ اٹھا لیا تھا کہ لوگوں سے بھرے اس لاؤنج میں تنہائی اور بوریت ستانے لگی تھی۔ وہ ابا کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ کچھ دیر بعد انہیں دبئی کے لیے روانہ ہونے والی فلائٹ میں سوار ہونا تھا لیکن ابا اور ابا کی مقبولیت کہیں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔ یہاں بھی انہیں ایک صحافی مل گیا تھا جو چلتے پھرتے ہی ان کا ایک مختصر سا انٹرویو لینے کا خواہش مند تھا۔ ابا شہرت کے بھوکے نہیں تھے لیکن ان کی طبیعت کی نرمی انہیں کسی کو نہ نہیں کہنے دیتی تھی۔ چنانچہ اب وہ اس صحافی کے ساتھ ایک الگ گوشے میں بیٹھے تھے اور وہ یہاں اکیلی بیٹھی بور ہو رہی تھی۔

”سوہنی دھرتی، اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے...... قدم قدم آباد تجھے۔“

اچانک ہی ایک پرانا ملی نغمہ کسی نئی آواز میں اس کے کانوں سے ٹکرایا اور اس نے بے ساختہ ہی سر اٹھا کر ٹی وی کی ایل ای ڈی اسکرین کی طرف دیکھا۔ آج 23 مارچ کا دن تھا اور مختلف چینلز سے اسی حوالے سے پروگرام نشر کیے جا رہے تھے۔ بچپن میں وہ اس قسم کے پروگرام بہت شوق سے دیکھتی تھی لیکن پھر چینلز کی بھرمار نے نہ جانے معیار کو متاثر کیا یا وہ ہی اتنی کثرت سے دکھائے جانے والی ایک جیسی چیزوں سے اکتا گئی کہ اب پہلے کی طرح کسی خاص دن پر ٹیلی ویژن کھول کر بیٹھنے کا شوق ہی مر گیا اور خاص دنوں کی خصوصی نشریات نے بھی سرسری دلچسپی کی شکل اختیار کرلی۔

سو آج بھی کچھ ایسا ہی حال تھا اور اس نے سامنے چلتے پروگرام میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی لیکن سوہنی دھرتی کے شناسا الفاظ کو نئی آواز میں سن کر وہ چونک گئی تھی۔ آواز بہت خوب صورت اور پُرکشش تھی اور وہ بے ساختہ ہی اسکرین کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔ وہاں وہی اکتا دینے والے مناظر تھے۔ تیز روشنیاں، اونچا میوزک اور بے قابو ہوتا لڑکے لڑکیوں کا ہجوم ..... نت نئے چینلز کی بھرمار میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کا یوم پاکستان ایسی ہلڑ بازی کے ساتھ منایا جا رہا تھا کہ اسلامی اقدار کا تو کہیں نام ونشان ہی نظر نہیں آتا تھا اور ذہن میں سوال اٹھتا تھا کہ اس وطن کے قیام میں کلیدی کردار ادا کرنے والے دوقومی نظریے کا کیا ہوا کہ یہ قوم تو اب کسی طور ان سے جدا نظر نہیں آتی تھی جن سے بے پناہ اختلافات کے باعث خون کی ندیاں بہا کر یہ وطن حاصل کیا گیا تھا۔

ممکن تھا کہ وہ ان بے زار کر دینے والے مناظر سے اکتا کر اپنی نظریں اسکرین سے ہٹا لیتی لیکن آواز کے سحر نے اس کو نظریں نہیں موڑنے دیں۔ یہاں تک کہ کیمرے کا رخ بے قابو ہجوم سے ہٹ کر اسٹیج کی طرف ہوگیا اور گانے والے کا چہرہ نظر آنے لگا۔ وہ چہرہ بلاشک وشبہ ان چہروں میں سے تھا جو ہزاروں کے ہجوم میں بھی الگ پہچانا جائے۔ سرخ وسفید رنگت والے اس چہرے کا ایک ایک نقش خالق نے گویا خصوصی توجہ کے ساتھ بنایا تھا۔ گلابی ہونٹ، ستواں ناک، براؤن غلافی آنکھیں، آنکھوں کے ہم رنگ بے حد گھنے اور چمکدار بال جنہیں آڑھی مانگ نکال کر سنوارا گیا تھا۔ نقوش کی اس دل آویزی میں مردانہ وجاہت اپنی جگہ قائم تھی اور بے شک وہ ان مردوں میں سے تھا جن پر لڑکیاں جان چھڑکتی ہیں۔ سامنے موجود ہجوم کے اس قدر بے قابو ہونے کی وجہ بھی شاید یہی تھی کہ وہاں موجود لڑکیوں کا بس نہیں چلتا تھا کہ کیسے اس کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کریں۔ وہ بس بے قابو ہوکر ناچ اور چلا رہی تھیں۔ لڑکیوں کے ساتھ ہی لڑکے بھی اس دیوانگی میں شامل تھے کہ ایک طرف انہیں اپنی صنف کی اتنی پذیرائی بھارہی تھی تو دوسری طرف وہ لڑکیوں کی دیوانگی میں شامل ہوکر ان سے بے تکلف ہونے کے مواقع حاصل کر رہے تھے۔ اپنی ایکسائٹمنٹ میں ان لڑکیوں کو پروا ہی نہیں تھی کہ وہاں انجوائے منٹ کے نام پر ان کے ساتھ کون سا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ روشن خیالی اور عورتوں کی آزادی کی آڑ میں پھیلنے والی بے حیائی کی وبا نے بہت سوں سے تو وہ حس ہی چھین لی تھی جو انہیں یاد دلا پاتی کہ بنتِ مشرق کا کیا شعار اور مقام ہونا چاہیے۔ روحانہ عبدالجبار نے اس ساری صورتِ حال پر اپنے دل میں شدید کوفت محسوس کی کیونکہ اس کی تربیت جس ماحول اور انداز میں ہوئی تھی، وہاں ایسی خرافات کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اور وہ بچپن سے اس بات کی عادی ہوگئی تھی کہ ایسے ماحول اور مناظر سے منہ موڑ کر آگے بڑھ جائے لیکن آج ایسا نہیں ہوسکا تھا۔ وہ اسکرین پر نظر آتے منظر کے لیے ناپسندیدگی محسوس کرنے کے باوجود اپنی نظریں نہیں موڑ سکی تھی۔ اصل میں تو اسے اپنی تربیت کے مطابق اس بات کا احساس ہی نہیں ہوسکا تھا کہ اسے اس منظر سے منہ موڑ لینا چاہیے۔ وہ بڑی بے اختیاری سی کیفیت میں تھی۔ جس کی سحر انگیز آواز نے ساعتوں میں اتر کر اسے اسکرین کی طرف متوجہ کیا تھا اب اسی کا سراپا اس کی نظروں کو باندھ چکا تھا۔ وہ نظریں جنہیں تربیت دی گئی تھی کہ کسی نامحرم کے چہرے پر پڑنے کی صورت میں فوراً جھک جائیں اسکرین پر جم کر رہ گئی تھیں۔ روحانہ عبدالجبار ظالم وقت کے کسی ایسے لمحے کی گرفت میں تھی جہاں اس کا اس کی ہستی پر سے اختیار ختم ہوگیا تھا اور وہ کسی سحرزدہ انسان کی طرح یوں بے حس وحرکت بیٹھی تھی کہ اس کی آنکھوں کے سوا گویا جسم کے کسی اور عضو میں جان ہی نہیں رہی تھی۔

"روحی ...... روحی بیٹا! کہاں گم ہیں آپ؟" اس کا شانہ ہلاتے ہوئے ابا نے اسے پکارا تو وہ .... چونک کر جیسے کسی خواب سے جاگی۔

"وہ جج ...... جی ابا۔" اس نے ہڑبڑا کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور چور نظروں سے اسکرین کی طرف دیکھا۔ وہاں کسی ڈٹرجنٹ کا اشتہار چل رہا تھا اور اس بات کا یہی مطلب لیا جاسکتا تھا کہ وہ ایسی خود میں گم ہوگئی تھی کہ نظروں کو باندھ لینے والے چہرے کے اسکرین سے ہٹ جانے

کے باوجود بھی وہاں اس چہرے کو دیکھتی رہی تھی۔ اس قسم کا تجربہ اسے زندگی میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اس لیے گھبرا سی گئی اور اسے لگا کہ وہ کسی جادو کے زیر اثر آگئی ہو ورنہ ایسا کیسے ہوسکتا تھا کہ اسکرین پر منظر بدل جانے کے باوجود وہ اس شخص کو وہاں دیکھتی رہی تھی جس کا نام تک ڈھنگ سے نہیں جانتی تھی۔

"کیا بات ہے بیٹا، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ آپ کو اتنا پسینا کیوں آرہا ہے؟ آپ اتنی گم صم تھیں کہ میرے پکارنے پر بھی متوجہ نہیں ہو رہی تھیں۔" ابا ابھی تک اس کے شانے پر ہاتھ رکھے فکرمندی سے پوچھ رہے تھے۔

وہ بہت عمدہ آدمی تھے جو اپنی اولاد سے بے تحاشا محبت کرنے کے ساتھ ساتھ بڑے مہذب انداز میں پیش آتے تھے۔ روحانہ نے اپنی پوری زندگی میں کبھی انہیں چیختے چلاتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہر مسئلے کو اپنے اسی نرم لہجے کے ساتھ حل کر لینے کے عادی تھے۔

"کچھ نہیں ابا! میں یوں ہی کسی خیال میں کھو گئی تھی۔" اس نے پست آواز میں ان کی بات کا جواب دیا اور پھر فوراً ہی موضوع بدل کر پوچھنے لگی۔ "کیا ہوا، آپ کی اس صحافی سے جان چھوٹ گئی کیا؟"

"وہ بہت مہذب نوجوان تھا۔ میری فلائٹ کا ٹائم ہوتے دیکھ کر خود ہی انٹرویو کو طول نہیں دیا۔ اب آپ بھی ذرا خیالی دنیا سے باہر آئیے ورنہ پرابلم ہوسکتی ہے۔" انہوں نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے سامان کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ شرمندہ ہو کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ دبئی جانے والی پرواز کی روانگی کے سلسلے میں ہونے والے اعلان کی طرف اب کہیں جا کر اس کی توجہ مبذول ہوئی تھی۔ ابا نے قدم آگے بڑھائے تو وہ بھی ان کی پیروی کرنے لگی۔ ابا کے پیچھے چلتے ہوئے اس کی نظریں حسب معمول جھکی ہوئی تھیں کہ مومنات کو یہی حکم دیا گیا ہے لیکن وہ اپنی اس بے بسی کا کیا کرتی کہ باوجود کوشش کے بھی وہ ایک چہرہ اس کے سامنے سے نہیں ہٹ رہا تھا۔ وہ شخص جسے وہ ڈھنگ سے جانتی بھی نہیں تھی گویا بالکل اچانک ہی اس کے روم روم میں رچ بس گیا تھا اور لہو کی طرح رگوں میں دوڑتا پھر رہا تھا۔

☆☆☆

"کیا ہے روجی آپی جب سے آئی ہیں ڈل ہی نظر آرہی ہیں۔ نہ کوئی ہنسی مذاق نہ بات چیت بس جب دیکھو خاموش بیٹھی دیواروں کو تک رہی ہیں۔ کیا دو دن میں ہی پاکستان کی یاد آنے لگی بلکہ مجھے تو لگ رہا ہے کہ اس بار ماموں جان آپ کو زبردستی اپنے ساتھ لائے ہیں ورنہ آپ کا یہاں آنے کا کوئی موڈ ہی نہیں تھا۔" یہ اس کا دس سالہ پھوپی زاد بھائی بلال تھا جو خفا خفا سے لہجے میں اسے اس کی غائب دماغی کا احساس دلا رہا تھا۔

"بلال بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے آپی۔ اس بار تو ایسا لگتا ہے کہ آپ بس اپنی تصویر ساتھ لائی ہیں اور آواز وہیں پاکستان میں چھوڑ دی ہے۔" بلال سے چار سال بڑی ملیحہ نے بھی بھائی کا ساتھ دیتے ہوئے اپنے انداز میں شکوہ کیا۔

وہ دونوں اس کی اکلوتی پھپھو کے بچے تھے اور عمروں کے تفاوت کے باوجود اس کی ان سے گاڑھی چھنتی تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ خود اس کی اپنی پھپھو سے گہری وابستگی تھی۔ اس کی والدہ اس کے بعد بیٹے کی پیدائش کے مرحلے میں کسی پیچیدگی کا شکار ہو کر خالق حقیقی سے جاملی تھیں اور ساتھ ہی نومولود بھی دنیا میں چند سانسیں ہی لے سکا تھا۔

اس وقت اس کی پھوپی سمعیہ کی شادی نہیں ہوئی تھی اور انہوں نے ہی بھائی کے بکھرے ہوئے گھر کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ ماں کی اچانک جدائی پر ہراساں ہوجانے والی روحانہ کو سنبھالا تھا۔ سمعیہ پھپھو کی شادی تک کے جو چند سال اس نے ان کے ساتھ گزارے تھے ان میں اس کے اور پھپھو کے درمیان بالکل ماں بیٹی جیسی ہی محبت پیدا ہوگئی تھی۔ پھپھو کے شادی ہو کر دبئی رخصت ہونے کے سبب جہاں وہ بری طرح بلکی، وہیں پھپھو بھی تڑپ تڑپ کر روتی رہی تھیں اور عرصے تک دونوں بلاناغہ ٹیلی فون پر ایک دوسرے سے گفتگو کر کے اپنی اپنی اداسی کو دور کرنے کی کوشش کرتی رہی تھیں۔ پھر قدرت کے متعین کردہ خودکار عمل کے تحت آہستہ آہستہ دونوں نے ہی اس جدائی پر صبر کرنا سیکھ لیا۔ روحانہ اپنی تعلیم اور پھپھو بچوں کی مصروفیت میں گھر کر توجہ کا مرکز ومحور بدل بیٹھیں لیکن دلوں کی محبت بہرحال اپنی جگہ برقرار تھی۔ اب بھی ہر اہم موقع پر ایک دوسرے کو لازماً یاد رکھا جاتا تھا۔ سمعیہ دبئی سے جب بھی پاکستان آتیں ان کا قیام روحانہ کی وجہ سے ان ہی کے گھر رہتا اور دوسرے بھائیوں سے وہ وقتاً فوقتاً چند گھنٹوں کے لیے ملاقات کرنے چلی جاتیں یا وہ خود ان سے ملنے چلے آتے۔ پندرہ سال کے اس عرصے میں خود روحانہ بھی کئی بار ابا کے ساتھ دبئی گئی تھی اور پھپھو کی بھرپور توجہ کا لطف اٹھانے کے ساتھ ساتھ ان کے بچوں سے بھی محبت والفت بانٹتی رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں بچے اس کے ساتھ خاصے بے تکلف تھے اور خود

بھی اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔

سمعیہ کی شادی سے قبل ہی ابا نے عزیز واقارب کے مشورے پر ایک طلاق یافتہ خاتون سے شادی کرلی تھی۔ اس کی سوتیلی والدہ عادلہ کو شادی کے محض دو سال بعد ہی بانجھ ہونے کے جرم میں طلاق دے دی گئی تھی۔ ابا کی ہمدرد طبیعت نے دوسری شادی کے لیے پیش کردہ رشتوں میں سے عادلہ کی اسی مظلومیت کے سبب ان کا انتخاب کیا تھا ورنہ وہ چاہتے تو کسی ایسی خاتون کا بھی انتخاب کرسکتے تھے جن سے انہیں مزید اولاد مل سکے لیکن انہوں نے پدرانہ شفقت ومحبت کی تسکین کے لیے روحانہ کے وجود کو ہی کافی جانا تھا اور یوں عادلہ ان کی زندگی کی ساتھی بن گئی تھیں۔ وہ خاصی معقول خاتون تھیں۔ انہوں نے گھر کا انتظام وانصرام نہایت سلیقے سے سنبھال لیا تھا اور روحانہ سے بھی اچھے طریقے سے پیش آتی تھیں۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا تھا کہ انہوں نے روحانہ کی زندگی میں ماں کے خلا کو پُر کردیا تھا لیکن اس کے ساتھ ان کا رویہ مناسب تھا۔ سمعیہ کی شادی تک تو سمعیہ خود ہی روحانہ کی مکمل دیکھ بھال کرتی تھیں لیکن بعد میں عادلہ نے بھی کبھی کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ ہاں وہ اس سے ویسی بے ساختہ محبت نہ کرپائی تھیں جیسی اس کی امی کرتیں یا جو سمعیہ پھپھو نے اس پر لٹائی تھی اس لیے اس کی زندگی میں پھپھو کی اہمیت اپنی جگہ برقرار رہی اور کوئی دوسرا ان کی جگہ نہیں لے سکا۔

وہ چھوٹی تھی تو ماں کی کمی پر کڑھتی تھی اور اسے عادلہ سے شکوے بھی ہوتے تھے لیکن آہستہ آہستہ اس نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ عادلہ بری خاتون نہیں ہیں بس وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہیں کہ اس سے سگی ماں جیسی محبت نہیں کرپاتیں لیکن بہرحال وہ کبھی اس کے لیے روایتی سوتیلی ماں بھی ثابت نہیں ہوئی تھیں اور انہوں نے اپنے سارے فرائض بڑے احسن طریقے سے ادا کیے تھے اور اب بھی ادا کررہی تھیں۔ ان دنوں جبکہ ابا دبئی کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے آرہے تھے، عادلہ کے میکے میں کسی قریبی رشتے دار کی شادی چل رہی تھی اس لیے روحانہ ابا کے ساتھ دبئی آگئی تھی۔ دبئی میں اس کا سمعیہ پھپھو اور ان کے بچوں کے ساتھ خوب دل لگتا تھا اس لیے یہاں آتے ہوئے وہ بہت خوش تھی لیکن کراچی ائرپورٹ پر اس کے ساتھ جو گزری اس نے اسے ایسی الجھن میں ڈال دیا کہ وہ خود سے بھی بیگانی ہوگئی۔ ایسے میں کسی کی صحبت سے لطف اندوز ہونا یا کسی کو اپنی واقفیت... کرنا بھلا کیسے ممکن ہوسکتا تھا۔ وہ تو سارا وقت گم صم بیٹھی بس اس معمے کو حل کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی کہ بھلا کسی کی آواز کی نغمگی اور صورت کی خوب صورتی نے اس پر ایسا کیا جادو کردیا تھا کہ وہ اس سحر سے نکل ہی نہیں پا رہی تھی۔ اس جہان میں بھلا کوئی وہ ایک ہی تو اچھی آواز اور شکل کا مالک نہیں تھا جو وہ لمحوں میں اس سے بندھ کر رہ گئی تھی۔ وہ تو مانو کسی سحر میں جکڑی گئی تھی اور باوجود کوشش کے اس سحر کا توڑ نہیں کرپارہی تھی۔

”یہ دیکھیں، آپ پھر مراقبے میں چلی گئیں۔ کچھ معلوم ہی نہیں ہے کہ ہم غریب کیا دہائی دے رہے ہیں۔“ اسے خبر بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ بلال اور ملیحہ کے شکوے سنتے ہوئے کس طرح خیالوں میں کھوگئی ہے۔ ملیحہ نے بلند آواز میں دہائی دی تو چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی اور ایک پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر اپنے رویے کی وضاحت پیش کرنے کی کوشش کی۔

”کیا ہوگیا ہے تم دونوں کو جو میرے لیے اتنے ہلکان ہورہے ہو۔ میں ایگزامز سے فارغ ہوکر آئی ہوں اس لیے تھوڑی سی تھکی ہوئی ہوں پھر یہ بھی ٹینشن ہے کہ معلوم نہیں رزلٹ کیسا رہے گا؟ بس اتنی سی بات ہے اور تم لوگ پتا نہیں کیا کیا کہہ رہے ہو۔“

”رزلٹ کی تو آپ بالکل ٹینشن مت لیں، اس بات کی تو میں آپ کو شیورٹی دے سکتی ہوں کہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی آپ کا رزلٹ بیسٹ ہی رہے گا۔ رہی تھکن کی بات تو دو دن میں اسے بھی اتر جانا چاہیے اس لیے اب آپ بالکل ایکٹو ہوجائیں اور ہمارے ساتھ شاپنگ کے لیے جانے کے لیے ریڈی ہوجائیں۔“ ملیحہ نے گویا ساری بحث کو سمیٹ کر اس کے لیے حکم نامہ جاری کیا۔ اس قسم کی فرمائشیں وہ اس سے کرتی ہی رہتی تھی جنہیں وہ بہت خوشی سے پورا کرتی تھی لیکن اس بار تو کیفیت ہی کچھ جدا تھی چنانچہ کسلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قدرے بیزاری سے بولی۔

”میرا شاپنگ کا بالکل بھی موڈ نہیں ہورہا، تم لوگ چلے جاؤ۔ میں گھر پر ہی رہ کر تمہارا ویٹ کروں گی۔“

”ہم نے تو آپ کی وجہ سے ہی شاپنگ کا پروگرام بنایا تھا اگر آپ کا موڈ نہیں تو رہنے دیتے ہیں اور ایسے ہی آؤٹنگ پر چلتے ہیں۔ بابا سے کہیں گے ڈنر باہر ہی کروائیں۔“ ملیحہ نے اس کے انکار پر جھٹ نیا پروگرام بنا ڈالا۔

”نہیں نا گڑیا۔ اصل میں میرا باہر جانے کا ہی موڈ نہیں ہے۔ آؤٹنگ کسی اور دن پر رکھ لو۔“ وہ اپنے انکار پر قائم رہی۔

"کیا ہے آپی۔ آپ نے تو بور کر کے رکھ دیا ہے۔"
اس بار ملیحہ خفا سی ہو گئی۔

"بجو بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ آپ کے آنے کا سن کر ہم لوگوں نے اتنے سارے پروگرام بنائے تھے لیکن آپ کو تو لگتا ہے کوئی انٹرسٹ ہی نہیں ہے۔" بلال نے بھی بہن کا ساتھ دیا اور منہ بناتے ہوئے اسے اپنی ناراضی جتائی۔

"بری بات ہے بیٹا بڑی بہن سے اس طریقے سے بات نہیں کرتے۔ جب وہ کہہ رہی ہے کہ آج اس کا موڈ نہیں ہو رہا باہر جانے کا تو آپ لوگ کیوں ضد کر رہے ہو۔ آج ہی آؤٹنگ پر جانا ضروری تو نہیں ہے نا۔ آپ لوگ بابا سے کہہ دینا۔ وہ کل آپ کو آؤٹنگ پر لے جائیں گے۔ ابھی تو آپ کی آپی کچھ دن تک یہیں رکی ہوئی ہیں نا پھر کس بات کی جلدی ہے۔" ان کی گفتگو کے دوران سمعیہ کب وہاں آ گئی تھیں، ان میں سے کسی کو خبر نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے گفتگو میں دخل اندازی کرتے ہوئے اپنے بچوں کو ٹوکا تو وہ تینوں ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

"سوری مما۔ اصل میں ہم نے آپی کے آنے کا سن کر اتنے سارے پروگرام ڈیسائڈ کر لیے تھے اس لیے ان کے رفیوز کرنے پر تھوڑے سے Irritate ہو گئے تھے۔" ملیحہ نے جھٹ ماں سے معافی مانگ لی کہ جانتی تھی وہ رویوں کے معاملے میں کتنی سخت گیر ماں ہیں اور قطعی پسند نہیں کرتیں کہ ان کے بچے کسی معاملے میں کسی بڑے سے ضد یا بحث کریں۔

"اٹس اوکے۔ اب آپ دونوں اپنے روم میں جائیں اور اسٹڈی کریں۔ کل آپ دونوں نے مجھے میتھس کا ٹیسٹ دینا ہے۔" سمعیہ نے انہیں وہاں سے جانے کا حکم دیا تو وہ دونوں کان دبا کر وہاں سے باہر نکل گئے۔

"آپ نے تو بے چاروں کی خواہ مخواہ ہی کلاس لے لی پھپھو۔ آپ کو معلوم ہے کہ دونوں مجھ سے کتنے اٹیچڈ ہیں اسی لیے ایسی فرمائشیں کرتے ہیں۔" اسے دونوں بچوں کے اترے چہرے دیکھ کر افسوس ہوا تھا جس کا اظہار اس نے اس انداز میں سمعیہ کے سامنے کیا۔

"میں نے تو ان سے تمہاری جان چھڑوائی ہے اور اب تم ہی ان کی طرف داری کر رہی ہو۔" سمعیہ نے مسکراتے ہوئے اسے آنکھیں دکھائیں۔ ان کے اس انداز پر اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

"شکر ہے تم مسکرائیں تو سہی ورنہ مجھے تو لگ رہا تھا کہ اپنی مسکراہٹ پاکستان میں ہی چھوڑ کر آ گئی ہو۔" اس کے سامنے ہی نشست سنبھالتے ہوئے سمعیہ نے بھی تقریباً ویسی ہی بات کہی جیسی وہ دونوں کہہ رہے تھے۔

"لیں اب آپ شروع ہو جائیں۔ ابھی آپ کے جگر گوشوں نے ناطقہ بند کر رکھا تھا اور اب آپ بھی وہ بات کرنے لگیں۔"

"سوچ لو ان سے تو میں نے تمہاری جان چھڑوا دی لیکن مجھ سے تمہاری جان چھڑوانے والا کوئی نہیں ہے۔ بچے ٹھیک ہی کہہ رہے تھے کہ اس بار تم خاصی ڈل ہو رہی ہو۔ کیا بات ہے، کوئی پرابلم ہے کیا؟" شوخ لہجے میں اسے دھمکاتے ہوئے وہ آخر میں قدرے سنجیدگی اور فکرمندی سے پوچھنے لگیں۔

"کچھ نہیں پھپھو۔ بس وہی ایگزام اور رزلٹ کی ٹینشن ہے۔" اس نے انہیں بہلانا چاہا۔

"میری طرف دیکھو روحی!" اس کے جواب پر انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ سنجیدگی سے اسے پکارا۔ ناچار اس نے نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا لیکن پھر فوراً ہی پلکوں کی جھالر گرالی۔

"میں تم سے اصرار نہیں کروں گی کہ مجھے سچ بتاؤ لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ میرے سامنے بہانے مت بناؤ۔ میں تمہارے سچ اور جھوٹ کو بہت اچھی طرح پہچان سکتی ہوں اس لیے تمہارا جب بھی مجھ سے کچھ شیئر کرنے کا موڈ بنے، مجھے سچ ہی بتانا۔ مجھے تم ہمیشہ کی طرح اپنا دوست پاؤ گی۔" سمعیہ پھپھو کے الفاظ نے اسے اس حد تک شرمندہ کر دیا کہ اس کی گردن جھک گئی لیکن پھر وہی بات تھی کہ وہ انہیں کیا بتاتی۔ اسکرین پر نظر آنے والے ایک چہرے اور کانوں کو سنائی دینے والی ایک آواز کی ہی تو بات تھی اور اسے کسی کو کچھ بتاتے ہوئے بھی شرمندگی ہوتی تھی کہ وہ روحانہ عبدالجبار اچھی خاصی میچور ہو کر ایسی حماقت میں مبتلا ہو گئی ہے۔

☆☆☆

"کیا ہے یار؟ کتنی بوریت ہو رہی ہے۔ گھر میں دل ہی نہیں لگ رہا۔" وہ ریموٹ ہاتھ میں تھامے ٹی وی کے چینل پر چینل بدل رہا تھا جب اس سے چھوٹے کاشان نے اس کے قریبی صوفے پر بیٹھتے ہوئے شکوہ کیا۔

"بور تو میں بھی ہو رہا ہوں۔ ٹی وی پر ڈھنگ کا کوئی پروگرام ہی نہیں آ رہا۔" اس نے کاشان کی تائید کی۔

"یہ کہو نا کہ کسی چینل سے تمہیں نہیں دکھایا جا رہا۔ تمہارے نزدیک تو ڈھنگ کا پروگرام وہی ہوتا ہے جس میں تمہیں دکھایا جا رہا ہو۔" کاشان نے اسے چھیڑا۔ ان دونوں میں صرف ڈیڑھ سال کا فرق تھا اور کاشان اس فرق

کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس سے برابری کی بنیاد پر پیش آتا تھا۔

''بکواس نہ کر۔ میں ایسا بھی خود پسند نہیں ہوں۔'' وہ چھوٹے بھائی کے ریمارکس پر جھینپا کہ حقیقت میں اس کی نظریں ایسے ہی کسی منظر کی تلاش میں تھیں جہاں اس کا چہرہ نظر آرہا ہو۔ شہرت کی دیوی اس پر جس طرح اچانک مہربان ہوئی تھی، وہ واقعی کچھ کچھ خود پسند ہوتا جارہا تھا اور اسے اسکرین پر خود کو دیکھنا اچھا لگنے لگا تھا۔

''ہیلو برادرز۔ کیا چل رہا ہے؟'' کاشان اس کی وضاحت کے جواب میں کچھ کہتا، اس سے قبل ہی ان کی اکلوتی بہن رعنا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں، ہم مل کر بور ہو رہے ہیں؟'' اس نے منہ بناتے ہوئے بتایا۔

''حیرت ہے آپ کے پاس بور ہونے کے لیے وقت کیسے نکل آیا۔ وہ جو ڈھیروں پریاں آپ پر فدا رہتی ہیں، ان میں سے کسی کی کال نہیں آئی آپ کے سیل پر؟'' رعنا نے اس کی بات سن کر تبصرہ کیا۔

''ان سے تو میں شدید بور ہوں اسی لیے اپنا سیل آف کر کے رکھا ہوا ہے۔'' اس نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا۔'' رعنا نے خوشی کا اظہار کیا۔ اس کو بھائی کے وقت بے وقت بجتے فون سے سخت الجھن ہوتی تھی۔ شایان خود بھی جب متواتر آنے والی فون کالز سے سخت بیزار ہو جاتا تھا تو اپنا سیل فون اس کے حوالے کر دیتا تھا۔ وہ بڑی خوبی سے اس کی فینز سے نمٹ لیتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ان دیوانی لڑکیوں کی وجہ سے چند گھنٹے گھر پر گزارنے والا اس کا بھائی نہ تو خود آرام کر پاتا تھا اور نہ ہی ان لوگوں کو دستیاب ہوتا تھا چنانچہ وہ اس کے فینز جن میں بڑی تعداد لڑکیوں کی تھی، سے باقاعدہ چڑتی تھی۔

شایان کا اپنا وقت بھی ان کی وجہ سے ضائع ہوتا تھا اور اس نے کئی بار اپنا نمبر تبدیل کیا تھا لیکن ہر بار اس کا نیا نمبر اتنی تیزی سے پھیلتا تھا کہ وہ حیران رہ جاتا تھا۔ اس کی مجبوری تھی کہ وہ کسی کالر سے بداخلاقی سے بھی پیش نہیں آسکتا تھا کہ خوامخواہ اس پر مغرور اور بداخلاق ہونے کی چھاپ لگ جاتی۔ چینلز کی بھرمار نے جہاں گلیمر کی دنیا سے وابستہ لوگوں کو دولت اور شہرت سے نوازا تھا، وہیں اسکینڈلز اور بدنامی کے در بھی زیادہ کھل گئے تھے۔ چٹ پٹی خبریں پیش کرنے کے شوق میں منٹوں میں بندے کا خانہ خراب کر دیا جاتا تھا چنانچہ خیریت اسی میں تھی کہ دامن بچا کر چلا جائے۔ اپنی بچت کے لیے ہی وہ حسبِ ضرورت اور موڈ وقتاً فوقتاً اپنا سیل فون آف کر دیا کرتا تھا۔

''کیا خیال ہے کہیں باہر آؤٹنگ کے لیے چلا جائے؟ بہت دن ہو گئے ہم سب ساتھ مل کر کہیں گھومنے نہیں گئے۔'' یہ تجویز رعنا کی طرف سے آئی تھی۔

''رہنے دو۔ باہر بھی ان کے فینز انہیں گھیر لیں گے اور ساری آؤٹنگ کا ستیاناس ہو جائے گا۔'' کاشان نے منہ بنا کر اس کی تجویز کو رد کیا۔

''اس کا سولوشن ہے میرے پاس۔'' رعنا کی آنکھیں کسی خیال سے چمکیں۔

''کیا تم اسے برقع پہنا کر لے جاؤ گی؟ معاف کرنا بہنا یہ جو اس کا تاڑ سا قد ہے نا اسے دیکھ کر ہی لوگ سمجھ جائیں گے کہ برقعے میں کوئی گڑبڑ ہے۔ ویسے بھی تم اس کے سائز کا برقع لاؤ گی کہاں سے؟'' کاشان بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔

''اُفوہ۔ آپ چپ تو کریں۔ میں کوئی برقع ورقع نہیں پہنا رہی انہیں۔ میرے پاس ایک دوسرا حل ہے۔'' رعنا نے کاشان کو چپ کروایا اور حل پیش کیا جسے سن کر شایان اچھل پڑا۔

''نقلی ڈاڑھی مونچھیں۔ ہرگز نہیں، میں تمہارے ہاتھوں مخنچو بننے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوں۔''

''گھبرائیں مت بھائی۔ میرے ہاتھ میں بہت صفائی ہے۔ ابھی جو پچھلے ہفتے ہمارے کالج میں فنکشن ہوا تھا، اس میں، میں نے ہی سب کا میک اپ کیا تھا۔ وہ میری دوست ہے نا زارا، اسے میں نے اتنی مہارت سے ڈاڑھی مونچھیں لگا کر لڑکا بنایا تھا کہ کسی کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اس گیٹ اپ کے پیچھے کوئی لڑکی موجود ہے۔'' رعنا اپنی تجویز کے حق میں دلائل دینے لگی۔ اکلوتی ہونے کی وجہ سے وہ گھر بھر کی لاڈلی تھی چنانچہ ذرا سی دیر میں سب کو اپنا ہمنوا بنا لیا اور ریحان بھائی، بھابی اور بچوں سمیت امی بھی اسے قائل کرنے وہاں آموجود ہوئے کہ رعنا کی تجویز نہایت عمدہ ہے۔ سب کے اصرار پر بالآخر اسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ویسے بھی وہ زیادہ تر اپنے گھر سے دور ہی رہا کرتا تھا اور بہت کم ہی اسے قسمت سے ایسا وقت مل پاتا تھا جو وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ گزار سکے۔ اس کے حامی بھرتے ہی رعنا اپنی زنبیل لیے اس کے سر پر سوار ہو گئی اور آدھے گھنٹے کی محنت سے اسے اتنا تبدیل کر دیا کہ واقعی اس

کو اپنا چہرہ مختلف لگنے لگا۔ بڑے بڑے سن گلاسز نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ کچھ دیر بعد وہ سب بڑی سی ایک گاڑی میں بھر کر سی ویو پہنچ گئے کہ کراچی والوں کے لیے کم وقت میں تفریح کے لیے جانے کے واسطے یہ ہی مقام رسائی میں ہوتا ہے۔ بہت دن بعد ارینج کی جانے والی اس اچانک پکنک سے سب ہی بے حد لطف اندوز ہوئے۔ وہ اپنی مصنوعی ڈاڑھی اور مونچھوں کی وجہ سے تھوڑا سا کانشس رہا لیکن سب کے مسکراتے چہروں نے اس کے دل کو بھی خوش کر دیا۔ رعنا کا خیال تھا کہ باقاعدہ کھانا کھانے کے بجائے وہیں ساحل پر موجود بن کباب اور چھولوں کے ٹھیلے سے مستفید ہوا جائے لیکن اس نے اس کی اس تجویز کو قبول نہیں کیا۔ اگلے ہی دن اسے ایک شو میں شرکت کے لیے شہر سے باہر جانا تھا اور وہ ایسا کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا جو اس کی صحت کے لیے نقصان کا باعث بنتا۔ اس موقعے پر امی نے بھی اس کے موقف کی حمایت کی اور یوں وہ ایک اعلیٰ درجے کے ریستوران میں کھانے کے لیے پہنچ گئے۔ ریستوران میں کھانے کا ذائقہ چاہے جیسا بھی تھا لیکن صفائی کا معیار بہت بلند تھا۔ ایک ایک چیز یوں چمک رہی تھی گویا دکان سے ابھی ابھی خرید کر ان کے سامنے پیش کر دی گئی ہو۔ پینے کے لیے ان کے آرڈر کردہ مشروبات کے علاوہ مشہور کمپنی کی منرل واٹر کی ٹھنڈی ٹھار بوتلیں پیش کی گئی تھیں۔ شایان نے پانی کی بوتل منہ سے لگا کر ایک گھونٹ ہی لیا تو طبیعت خوش ہو گئی۔

آہ...... پانی...... کیسا ٹھنڈا میٹھا پانی تھا وہ......

☆☆☆

''پانی......'' اس کے پیاس کی شدت سے تڑختے ہونٹوں سے گویا آہ سی نکلی لیکن وہاں کون تھا جو اس کی پکار پر اسے وہ ٹھنڈا میٹھا پانی پلاتا۔ وہاں تو سب اسے اذیت دے کر لطف اٹھانے والے تھے۔ اب بھی اس کی پکار پر کسی نے تمسخر بھرا قہقہہ لگایا پھر اس کے کانوں نے ایسی آواز سنی جیسے گلاس میں پانی انڈیلا جا رہا ہو۔ اس نے تڑپ کر آنکھیں کھولیں اور آواز کی سمت میں دیکھا۔ واقعی شیشے کے ایک گلاس میں صاف شفاف پانی انڈیلا گیا تھا اور اب اس گلاس کو اپنی موٹی اور بھدی انگلیوں سے تھام کر وہ شخص ہونٹوں سے لگا رہا تھا جس کے حکم پر اس کے جسم کو تختۂ مشق بنا کر اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا گیا تھا۔ اس نے اس شخص کو پانی پیتے ہوئے نہایت ندیدے پن سے دیکھا اور اپنے ہونٹوں پر یوں زبان پھیری جیسے اس کے گلاس میں موجود پانی کی ٹھنڈک اور نمی سے اپنے ہونٹوں کو تر کرنا چاہتا ہو لیکن پیاس سے اکڑ کر خشک ہو جانے والی زبان نے خشک پپڑی زدہ ہونٹوں کو چھو کر پیاس کی تلخی کو کچھ اور بھی سوا کر دیا۔

''پانی پیو گے مسٹر؟'' گلاس کے اس پار سے اس کی کیفیت کا بغور جائزہ لیتے شخص نے پچکارنے کے انداز میں اس سے دریافت کیا۔ اس کی گردن خود بخود ہی اثبات میں ہل گئی۔ اس کا اثباتی جواب پا کر وہ شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور ہاتھ میں پانی کی بوتل اور گلاس لیے اس سے کچھ فاصلے پر آن کھڑا ہوا۔ اس مقام پر کھڑے ہو کر اس نے گلاس سے ایک اور گھونٹ پانی پیا۔ وہ جو جانے کب سے پیاسا تھا، اسے اپنے اتنے قریب کھڑے ہو کر پانی پیتے دیکھ کر تڑپ گیا۔ اس کے اور پانی کے اس گلاس کے درمیان فاصلہ ہی کتنا تھا۔ وہ ہاتھ بڑھاتا تو گلاس اس کے ہاتھ میں آ سکتا تھا لیکن ہائے مجبوری کہ وہ ہاتھ ہی تو آگے نہیں بڑھا سکتا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کرسی کے ہتھوں سے جکڑے ہوئے تھے جس پر اسے بٹھایا گیا تھا۔ اس جیسوں کے لیے خصوصی تیار کردہ اس کرسی پر وہ اس حالت میں بیٹھا ہوا تھا کہ اپنے سر کے علاوہ جسم کے کسی حصے کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔

''تمہیں یہ پانی مل سکتا ہے۔ پانی ہی کیا بہترین کھانا بھی مل سکتا ہے۔ مزید دوسری چیزوں پر بھی بات ہو سکتی ہے بس تمہیں ہمارے ساتھ تھوڑا سا کوآپریٹ کرنا پڑے گا۔ تمہیں ماننا ہوگا کہ تم پاکستانی جاسوس ہو اور ساتھ ہی یہ بھی بتانا ہوگا کہ وہ خفیہ کاغذات کہاں ہیں جو تم نے پونم کے ذریعے حاصل کیے تھے۔'' ایک بے حد بھوکے، پیاسے اور بہیمانہ تشدد سے گزرتے شخص کے لیے یہ آفرز بے حد پُرکشش تھیں۔ اسے بس اثبات میں سر ہلانا تھا پھر اس کی ساری مشکلیں آسان ہو جاتیں لیکن یہ ذرا سی اثباتی جنبش ہی تو اس کے لیے بہت دشوار تھی۔ سامنے کھڑا شخص بھی اس دشواری کو سمجھتا تھا اس لیے تمام تر نفسیاتی ہتھکنڈے استعمال کر رہا تھا۔ اس کی مزاحمت کو توڑنے کے لیے اس نے اس پل ایک عجیب ہی حرکت کی۔ اپنے ہاتھ میں پکڑی پانی کی بوتل کو اس کے سر سے ذرا بلندی پر اتنے فاصلے پر لے کر آیا کہ جب اس نے بوتل کو الٹا تو اس سے گرتا پانی اس سے چند انچ کے فاصلے سے گزرا۔ اس نے بے تاب ہو کر منہ آگے کیا کہ اس پانی کو پی سکے لیکن فوراً ہی بوتل کا فاصلہ بڑھا دیا گیا۔ وہ ناکام اور مایوس سا اس پانی کو دیکھتا رہ گیا جس نے اس کے لیر لیر ہو جانے والے لباس کو تو بھگو ڈالا تھا لیکن اس کے ہونٹوں کو تر نہیں کر سکا تھا۔

"پھر کیا کہتے ہو تم؟" اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتے صیاد نے اس سے دریافت کیا۔ وہ پیاس کی اس انتہا پر کھڑا تھا، فوراً ہاں کہہ دینا چاہتا تھا لیکن یکدم ہی کسی شعلے کی طرح اس کے دماغ میں قرآن کریم میں بیان کردہ وہ قصہ روشن ہوا جس میں بتایا گیا تھا کہ حق کی راہ میں نکلنے والے حضرت داؤد علیہ السلام کی فوج میں سے بہت سوں نے راستے میں پڑنے والے پانی کے اس ذخیرے سے اپنی پیاس بجھالی تھی جس سے انہیں منع کیا گیا تھا اور پھر نتیجے میں وہ سب کے سب ہلاک ہو گئے تھے۔ شدید پیاس نے انہیں حکم ربی بھلا دیا تھا اور جو حکم ربی بھلا دیتا ہے، وہ ضرور ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس کے سامنے بھی اس وقت ایسا ہی پانی موجود تھا جسے پی لیتا تو ہلاک ہو جاتا اور اب تک کی ساری جدوجہد برباد ہو جاتی۔ جس ہاں کے بدلے اسے پانی عنایت کیا جا رہا تھا، وہ ہاں اس پانی کی بہت بھاری قیمت تھی۔ وہ اپنے جذبۂ حب الوطنی اور ایمان کو داؤ پر لگاتا تو اسے پیاسے ہونٹوں، زبان اور حلق کو تر کرنے والا یہ پانی مل پاتا اور کیا بھروسا تھا کہ مل بھی پاتا کہ نہیں کہ اس کے سامنے جس قوم کا نمائندہ کھڑا تھا، وہ اپنی مکاری، فریب، وعدہ خلافی اور دھوکا دہی میں اپنی مثال آپ تھی۔ اتنی مشکوک صورتِ حال میں وہ اتنا مہنگا سودا بھلا کیونکر کرتا۔ وہ یہ سودا کر لیتا تو اپنے لوگوں سے نظریں کیسے ملا سکتا تھا۔ ہر دم پاکستان کو دہشت گرد ثابت کرنے کے جنون میں مبتلا بھارتی سورماؤں کو تو موقع مل جاتا کہ وہ پوری دنیا کے سامنے پاکستان کا منہ کالا کرنے بیٹھ جاتے۔ کیا وہ اپنے وطن اور قوم کی یہ ذلت برداشت کر سکتا تھا؟ وہ بھی صرف پانی کے ایک گلاس کی خاطر...... اگر وہ یہ اذیت سہہ لیتا تو زیادہ سے زیادہ اس کے ساتھ کیا ہوتا۔ یہ ظالم اسے اذیتیں دے دے کر جان ہی سے تو مار ڈالتے اور اس راہ میں جان چلی جاتی تو کیا برا ہوتا۔ وہ جان دے کر شہادت کا رتبہ پا لیتا اور شہید کو تو اللہ کی بنائی جنت میں حوضِ کوثر کا وہ پانی پینے کے لیے ملتا جس کی مٹھاس، رنگت، ٹھنڈک اور خوشبو کی دنیا میں کوئی مثل نہیں مل سکتی تھی۔ کیا وہ دنیا کے اس ذلت بھرے پانی کو پینے کے لیے حوضِ کوثر کے پانی سے خود کو محروم کر لیتا؟ ہرگز بھی نہیں۔ وہ کسی صورت اتنا مہنگا سودا نہیں کر سکتا تھا۔ لمحوں میں فیصلہ ہوا تو گردن خود بخود ہی نفی میں ہل گئی۔ اپنی چال کی ناکامی پر اس کے سامنے کھڑا دشمن اس انکار پر تلملا اٹھا اور ہاتھ میں تھاما گلاس جھنجلا کر اسے دے مارا۔ شیشے کا گلاس اس کے سر سے ٹکرا کر چور چور ہوتے ہوئے اسے زخمی کر گیا اور اس کے ماتھے سے بھل بھل خون بہنے لگا۔ اس نے خون کی گرمی اور چپچپاہٹ کو محسوس کیا اور آنکھیں موند لیں۔ اس کے سامنے صبر کے سوا کوئی راہ نہیں تھی اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

☆☆☆

"آپی اسکی چلیں۔ وہاں بڑا مزہ آتا ہے۔" وہ لوگ امارات میں گھوم رہے تھے جب بلال نے فرمائش کی۔ روحانہ کو اسکی کے بارے میں علم تھا۔ یہ امارات میں بنایا گیا ایک مصنوعی برف زار تھا جہاں لوگوں کو وہ تمام تفریحات اور سہولیات فراہم کرنے کی کوششیں کی گئی تھیں جو کسی قدرتی برفانی علاقے میں پائی جاتی ہیں۔ برفانی گاڑیاں، برف سے ڈھکے درخت، پھسلنے کے لیے بنائے گئے راستے، برف سے بنا غار یہ سب دیکھ کر انسان کچھ دیر کے لیے بھول ہی جاتا تھا کہ وہ دبئی کے صحرا میں ہے۔ روحانہ پہلے وہ جگہ دیکھ چکی تھی اور پہلی دفعہ میں اسے واقعی وہ ایک دلچسپ جگہ محسوس ہوئی تھی لیکن اس بار تو دل گویا کسی بھی چیز سے بہلتا ہی نہیں تھا۔ ہر وقت یہی خواہش ہوتی تھی کہ سر منہ لپیٹے ایک طرف پڑی رہے لیکن یہ بھی ایک ناممکن سی بات تھی۔ اسے صرف اپنی دلی کیفیات کو نہیں دیکھنا تھا بلکہ ان لوگوں کو بھی دیکھنا تھا جو اس سے محبت کرتے تھے اور جنہیں اس کے مزاج کی یہ تبدیلی بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے ان پیاروں کی خاطر اس نے کسی نہ کسی طرح خود پر قابو پانے کی کوشش کی تھی اور نتیجتاً آج وہ لوگ امارات میں تھے۔ انہوں نے تھوڑی بہت ونڈو شاپنگ کی تھی اور اب بلال کو یہ آئیڈیا سوجھ گیا تھا۔ مہمان ہونے کے ناتے اسے خصوصی اہمیت دی جا رہی تھی اس لیے والدین کے بجائے بلال نے اس سے اپنی خواہش ظاہر کی تھی۔ اسے ذاتی طور پر وہاں جانے میں دلچسپی نہیں تھی لیکن بلال کی خواہش پر مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ ذرا دیر میں وہ لوگ خودکار زینوں کے ذریعے مال کے اس حصے میں پہنچ چکے تھے جہاں اسکی دبئی نامی وہ عجوبہ بنایا گیا تھا۔

"پاپا! میرے لیے بھی ٹکٹ لیجیے گا۔" عثمان انکل ٹکٹ کاؤنٹر کی طرف بڑھنے لگے تو ملیحہ مچلی۔

"کیا بچپنا ہے ملیحہ۔ اتنی بڑی ہو کر تم ایسے کرتب کرتی ہوئی کیا خاک اچھی لگو گی۔" سمیعہ نے بیٹی کو گھر کا۔ وہ چودہ سال کی ہو گئی تھی اور قد کاٹھ بھی اچھا نکلا تھا اس لیے اپنی عمر سے کچھ بڑی ہی لگتی تھی۔ ان کے خاندان میں اس عمر کی لڑکیاں عموماً پردہ کرنا شروع کر دیتی تھیں لیکن عثمان انکل ذرا

ماڈرن آدمی تھے اس لیے ملیحہ کو خاصی آزادی حاصل تھی تاہم سمعیہ خیال رکھتی تھی کہ اس کا لباس ماڈرن ہونے کے باوجود حدود سے باہر نکلا ہوا نہ ہو۔ اس وقت بھی ملیحہ نے بلیو جینز کے ساتھ گھٹنوں سے کافی نیچے آتا ڈھیلا ڈھالا کُرتہ پہن رکھا تھا۔ کرتے کی آستینیں فل تھیں اور سر پر میچنگ اسکارف بھی موجود تھا۔

''اس کا موڈ ہو رہا ہے تو جانے دو نا۔'' عثمان فوراً بیٹی کے حمایتی بن گئے۔

''پلیز عثمان۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میری بیٹی غیر مردوں کی نگاہ کا مرکز بنے اور وہ اسے عجیب زاویوں سے دیکھیں۔ میں آپ کی وجہ سے اس پر سختی نہیں کرتی لیکن کچھ باتوں میں احتیاط اچھی ہوتی ہے۔ میں ساری دنیا کے مردوں کو پابند نہیں کرسکتی کہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق اپنی نگاہوں کو جھکا کر رکھیں لیکن اپنی بیٹی کو تو یہ سکھا سکتی ہوں ناکہ وہ خود کو نامحرموں کا مرکزِ نگاہ نہ بننے دے۔'' سمعیہ نے نرم لہجے میں شوہر کو سمجھایا تو وہ ان کا نقطۂ نظر سمجھتے ہوئے ملیحہ کے شانے پر ہلکی سی تھپکی دے کر آگے بڑھ گئے۔ بلال ان کے ساتھ تھا۔

''دس از ناٹ فیئر مما۔ آپ مجھے لڑکی ہونے کی سزا دیتی ہیں...... کیا لڑکیوں کا دل نہیں چاہتا کسی تفریح کے لیے؟'' ملیحہ نے ماں کے سامنے احتجاج کیا۔

''میں تمہیں سزا نہیں دیتی۔ اللہ کی پکڑ سے بچانے کے لیے تمہیں تمہاری حدود یاد دلاتی ہوں۔ ورنہ تم خود جانتی ہو کہ ہر معاملے میں، میں تمہیں بلال سے کچھ بڑھ کر ہی اہمیت دیتی ہوں۔ لڑکی ہونے کی حیثیت سے میں نے کبھی کسی معاملے میں تمہارے ساتھ ڈنڈی نہیں ماری۔ تمہارے لیے اسکول، لباس، فرنیچر اور دیگر اشیا کے انتخاب سے لے کر اظہارِ خیال تک ہر معاملے میں بلال سے زیادہ ہی اچھے معیار اور آزادی کا خیال رکھا ہے لیکن مجھے ایک مسلمان ماں ہونے کا فرض بھی تو ادا کرنا ہے اور کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں اس فرض کی ادائیگی میں کچھ کوتاہی کر جاتی ہوں، تب ہی تو تم ویسی نہیں ہو جیسی روحانہ ہے۔ تم نے دیکھا ہے نا کہ دین کیسے اس کی بنیادوں میں بیٹھا ہوا ہے اور یہ بڑی سے بڑی ترغیب سامنے پا کر بھی اپنی حدود سے باہر نہیں نکلتی۔'' لہجے میں ہلکی سی خفگی اور آزردگی لیے وہ بیٹی سے بولتی جارہی تھیں اور روحانہ شرمندہ ہو رہی تھی کہ وہ کہاں کی ایسی دین دار تھی کہ ترغیب کے آگے ڈٹ کر کھڑی ہو جاتی۔ وہ تو ایک لمحے میں ہی ہار گئی تھی اور ایک نامحرم شخص اس کے دل و دماغ میں بس کر رہ گیا تھا۔ پھر وہ تھا بھی کون؟ ایک ناچ ناچ کر گانے بجانے والا نام نہاد آرٹسٹ جس کا اس کے خاندان کے ساتھ کوئی میچ ہی نہیں تھا۔ اس کے ابا جو ایک دینی اسکالر تھے، کیا کسی طور ایسے شخص کو اپنے خاندان کا حصہ بنا سکتے تھے اور وہ تھی کہ ایک نظر میں اس شخص کو اپنا دل دے بیٹھی تھی۔

''تم کہاں گم ہوگئی ہو روحی۔ سمجھاؤ اس بے وقوف کو۔ میں اس کی ماں ہوں کوئی دشمن نہیں۔'' سمعیہ پھپھو نے اس کا شانہ ہلا کر اسے مخاطب کیا تو وہ اپنی سوچوں سے باہر آئی اور پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''ابھی چھوٹی ہے پھپھو۔ آہستہ آہستہ سب سمجھ جائے گی۔''

''نہیں، اب یہ چھوٹی نہیں رہی بڑی ہو رہی ہے۔'' سمعیہ پریشانی سے بڑبڑائیں۔ وہ واقعی خاصی ڈسٹرب تھیں کہ اپنی بیٹی کی تربیت اس نہج پر نہ کر پائیں جو ان کے خاندان کی روایت ہے۔

''بڑی ہو رہی ہے تو اس کی عقل و شعور میں بھی اضافہ ہو رہا ہے اور ایک باشعور لڑکی سے ہم کیسے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ یہ سمجھانے کے باوجود اللہ کے احکامات کو نہیں سمجھے گی۔ کیوں ملیحہ تم سمجھ سکتی ہو نا ہماری بات۔'' اس نے کچھ ایسے مان سے پوچھا کہ ملیحہ الجھی ہوئی ہونے کے باوجود انکار نہ کرسکی اور سر کو اثبات میں حرکت دی۔

''گڈ گرل۔'' روحانہ نے اس کے گال پر ہلکی سی چٹکی لی اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ سوچنا کہ لڑکی ہونے کی وجہ سے تمہارے ساتھ زیادتی ہوتی ہے، ایک حماقت ہے۔ تمہیں اور بلال دونوں کو برابری کے حقوق حاصل ہیں لیکن دونوں کا دائرۂ کار ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ بلال اگر آزادی کے نام پر میک اپ کرنے، زرق برق لباس پہننے، گڑیوں کی شادی رچانے جیسے کام کرنا چاہے گا تو یقیناً کوئی بھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا اور لازماً اسے بتایا جائے گا کہ یہ اس کے لیے نامناسب کام ہیں۔ اس سادہ سے نکتے کو اگر تم سمجھ لو گی تو کبھی دل میں شکوہ پیدا نہیں ہوگا۔ میں ہر بات میں لڑکیوں پر قدغن لگانے کی قائل نہیں ہوں۔ خواتین بھی تفریحات میں حصہ لے سکتی ہیں بس مستور رہیں اور اس بات کا اہتمام رکھیں کہ مرد حضرات ان کی ذات سے اپنی آنکھیں سینکنے کی تفریح نہ کرسکیں تو کسی چیز میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' وہ پروفیسر عبدالجبار کی بیٹی تھی اور لوگوں کو قائل کرنے کا ہنر جانتی تھی۔ ملیحہ کے تاثرات سے بھی ظاہر تھا کہ وہ قائل ہوتی جارہی ہے۔

''یہاں کھڑے کھڑے کب تک بات کرتے رہیں گے، چلو وہاں ریسٹورنٹ میں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' بیٹی کے تاثرات نے سمعیہ کو بھی تھوڑا سا ریلیکسڈ کیا اور انہوں نے ہلکے پھلکے انداز میں تجویز پیش کی۔ ریستوران میں رکھی کرسیوں پر بیٹھ کر سمعیہ نے اورنج جوس کا آرڈر دیا، ساتھ ساتھ وہ لوگ اردگرد کا جائزہ بھی لیتی رہیں۔ عثمان اور بلال ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے اور اب برفانی علاقے میں جانے کے لیے مخصوص لباس اور اسکیٹنگ کا سامان وغیرہ حاصل کر رہے تھے۔ جوس آگیا تو وہ تینوں جوس پینے لگیں۔ سمعیہ اور روحانہ حجاب کے اندر اسٹرا کی مدد سے جوس پی رہی تھیں۔

''آپ لوگ یہ کیسے کرلیتی ہیں؟ آپ کو اس طرح کھانے پینے میں مشکل نہیں ہوتی؟'' ملیحہ بچپن سے یہ سب دیکھتی آرہی تھی لیکن اس وقت بلال اور عثمان کے ساتھ نہ جاسکنے کے باعث مختلف کیفیات کے زیرِ اثر تھی اس لیے ایسا سوال کیا تھا۔

''بالکل مشکل نہیں ہوتی کیونکہ مشکل جس چیز کا نام ہے، وہ صرف ہمارے دماغ میں ہوتی ہے۔ ہم جس چیز کو مشکل قرار دے دیتے ہیں صرف وہی مشکل ہوتی ہے ورنہ دنیا میں کچھ بھی ناممکن اور مشکل نہیں ہوتا۔ انسان کے پختہ ارادے کے سامنے ہر کام خود بخود آسان ہوتا چلا جاتا ہے۔ تم نے بتایا تھا ناکہ بائیو کی جو ڈایاگرامز بنا دیکھے بغیر کسی غلطی کے بنالیتی ہو وہ تمہاری بہت سی فرینڈز دیکھ کر بھی اچھی نہیں بنا پاتیں تو اس کی وجہ کیا ہے؟ وجہ صرف اتنی ہے کہ تم نے ڈایاگرامز کی پریکٹس کر رکھی ہے اور تمہارے ذہن نے تمہیں باور کروا رکھا ہے کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے جبکہ تمہاری فرینڈز انہیں ڈرا کرنے سے پہلے ہی یہ سوچ لیتی ہیں کہ یہ بہت مشکل کام ہے اور ہم سے ڈھنگ سے نہیں ہوگا اس لیے وہ نہیں کر پاتیں۔ کیوں ایسا ہی ہے نا؟'' روحانہ نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا تو وہ تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دے کر ایک بار پھر عثمان اور بلال کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''تم بہت اچھے طریقے سے لوگوں کو قائل کرنا جانتی ہو روحی۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتی تو ابھی یہ مجھ سے بے تکان بحث کر رہی ہوتی۔'' سمعیہ نے ملیحہ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے برابر میں بیٹھی روحانہ سے آہستہ سے کہا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ رکھی کرسیوں پر بیٹھی تھیں جبکہ ملیحہ ان کے سامنے میز کی دوسری طرف بیٹھی ہوئی تھی۔

''یہ بھائی جان کی صحبت اور تربیت کا اثر ہے جو تم اتنے اچھے طریقے سے گفتگو کرنا جانتی ہو۔'' وہ ان کی بات کا جواب دیتی اُس سے قبل ہی سمعیہ نے ایک اور کمنٹ دیا۔

''آپ کافی حد تک ٹھیک کہہ رہی ہیں پھپھو۔ ابا جیسے علم والے انسان کے ساتھ رہ کر انسان واقعی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ اصل کمال ہماری گفتگو کا نہیں بلکہ اس رب کا ہوتا ہے جو ہمارے الفاظ میں تاثیر پیدا کردیتا ہے اور ساتھ ہی سامنے والے کو بھی یہ توفیق عطا کرتا ہے کہ وہ حق کو سمجھ سکے ورنہ اس طرح کے الفاظ اور دلائل تو بہت سے لوگ دے سکتے ہیں بلکہ اس سے بھی اچھی گفتگو کرسکتے ہیں لیکن بات اس تاثیر اور توفیق کی ہوتی ہے جو اللہ عنایت کرتا ہے ورنہ تو سب رائگاں ہے۔ لفظ عمدہ ہوں مگر پُرتاثیر نہ ہوں تو انہیں کون سنے گا پھر توفیق کی بھی بڑی اہمیت ہے پُرتاثیر لفظ بھی اسی پر اثرانداز ہوتے ہیں جسے توفیق دی جائے اور توفیق انہیں ہی دی جاتی ہے جس کے اپنے اندر بھی چاہ ہو اور نیت میں کھوٹ نہ ہو۔'' بولتے بولتے اس نے یونہی رخ بدلا تو یکدم ہی پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہوگئی۔ بلیو جینز پر پنک اور بلیک امتزاج کی ٹی شرٹ پہنے وہ خودکار زینے سے نیچے کی طرف آرہا تھا۔ اس کی آنکھوں پر بڑے بڑے براؤن سن گلاسز لگے ہوئے تھے جن کی وجہ سے چہرہ واضح نہیں تھا لیکن روحانہ عبدالجبار ہر وقت نظروں کے سامنے رہنے والے چہرے کو شناخت کرنے میں کیسے غلطی کرسکتی تھی؟ وہ تو اسے لاکھوں کے ہجوم میں بھی پہچان سکتی تھی، چاہے وہ کتنے ہی روپ بدل لے۔

''آپ شایان ہیں نا؟ شایان صدیقی۔'' وہ سیڑھیوں سے نیچے اترا ہی تھا کہ لڑکیوں کا ایک گروپ لپک کر اس کے قریب پہنچا اور ان میں سے کسی لڑکی کا کیا گیا سوال ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا مدھم آواز میں روحانہ تک بھی پہنچا۔ اس سوال کے ساتھ ہی اس نے شایان کے چہرے پر آجانے والی لاچاری اور جھنجلاہٹ کو بھی محسوس کیا۔ یقیناً وہ نہیں چاہتا تھا کہ پہچانا جائے لیکن کوشش کے باوجود پہچان لیا گیا تھا۔ روحانہ نے دیکھا کہ ایک پل کے لیے اس کے چہرے پر نظر آنے والے تاثرات پر اس نے فوراً ہی قابو بھی پالیا تھا اور اب اخلاق سے لڑکیوں کے اس گروپ سے گفتگو کر رہا تھا۔ بات کرتے ہوئے اس نے اپنے گلاسز اتار کر گریبان میں اٹکا لیے تھے اور اب اس کی سحرزدہ کرنے والی آنکھیں روحانہ کے سامنے تھیں۔ وہ اپنے اختیار میں ہوتی تو نظروں کو واپس موڑ لیتی لیکن کراچی ائرپورٹ کے

بعد اب ایک بار پھر اسے اپنی بے اختیاری کا تجربہ ہو رہا تھا۔ وہ شایان صدیقی کے چہرے پر سے نظریں نہیں ہٹا پا رہی تھی۔ حقیقت میں اسے اس بات کا خیال ہی نہیں آیا تھا ورنہ خود پر جبر کر کے بھی یہ عمل کر گزرتی۔ اس کی جھپکتی پلکیں، ہلتے ہونٹ، چہرے پر پھیلی مسکراہٹ ایک ایک ادا نے اس کی نظر کو اپنے ساتھ باندھ لیا تھا۔ اب وہ ان لڑکیوں کو آٹوگراف دے رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ اور لوگ بھی وہاں جمع ہو گئے تھے۔

''اوہو...... یہ تو شایان ہے۔'' وہاں لگتے ہجوم یا پھر روحانہ کے ارتکاز نے سمعیہ کو بھی اس طرف متوجہ کر دیا اور وہ ذرا خوش گوار حیرت کے ساتھ بولیں تو روحانہ کا ارتکاز ٹوٹا۔ ''ملیحہ! وہ دیکھو۔ وہ شایان ہے نا؟'' انہوں نے جیسے بیٹی سے بھی اپنی پہچان کی تصدیق چاہی۔

''جی مما! وہ شایان بھائی ہیں۔'' ملیحہ جو بلال کو برف پر پھسلتے دیکھنے میں مصروف تھی چونک کر متوجہ ہوئی اور فوراً ہی پُرجوش لہجے میں بولی۔ ساتھ ہی اس نے بڑی بے ساختگی سے بلند آواز میں ''شایان بھائی'' کی پکار بھی لگا دی۔ یہ پکار اس کے کانوں تک پہنچ گئی اور اس نے فوراً ہی آواز کی سمت دیکھا۔ نظریں ملیحہ کے چہرے سے ٹکرائیں تو لمحہ بھر میں ہی ان میں پہچان کے رنگ بھی اتر آئے۔ وہ اپنے اردگرد جمع فینز سے معذرت کرتا ہوا ان کی سمت بڑھا۔ دبئی کے بجائے اگر پاکستان ہوتا تو اس کے فینز اس کی معذرت کی پروا کیے بغیر اس کے ساتھ چپکے رہتے لیکن وہاں موجود افراد نے معقولیت کا مظاہرہ کیا۔ ویسے بھی ان میں سے زیادہ تر لوگ آٹوگراف لینے کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ تصویر کھنچوانے کی خواہش بھی پوری کر چکے تھے۔

''السلام علیکم بھابی! آپ لوگ یہاں کیسے؟'' قریب آ کر وہ نہایت شائستگی سے سمعیہ سے مخاطب ہوا۔

''وعلیکم السلام۔ اگر تمہیں یاد ہو تو ہم یہاں دبئی میں ہی رہتے ہیں اس لیے پوچھنا تو ہمیں تم سے چاہیے کہ تم یہاں کیسے نظر آ رہے ہو۔'' سمعیہ نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے شگفتگی سے کہا تو وہ ہنس دیا۔ اس کی ہنسی بھی اس کی آواز کی طرح سحر انگیز تھی۔ اصل میں وہ شخص سرتاپا جادوگر تھا جس کی ہر ہر ادا میں جادو تھا۔

''آؤ بیٹھو۔'' سمعیہ نے اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کی دعوت دی۔ اس نے یہ دعوت قبول کر لی۔ سمعیہ نے اس کی پسند دریافت کر کے اس کے لیے بھی جوس کا آرڈر دے دیا۔

''پھر بتایا نہیں تم نے کہ یہاں کس سلسلے میں آئے ہوئے ہو؟'' آرڈر دینے کے بعد سمعیہ نے گفتگو کا سلسلہ دوبارہ جوڑا۔ ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اسے نہ صرف اچھی طرح جانتی ہیں بلکہ خاصی بے تکلفی بھی ہے۔ وہ ملیحہ کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا تھا اور اس کے بالکل مقابل بیٹھی روحانہ عبدالجبار سوچ رہی تھی کہ آخر اللہ کو اس کا ایسا کون سا امتحان لینا مقصود ہے کہ یوں اس شخص کو اس کے سامنے لے آیا ہے جسے اسکرین پر ایک نظر دیکھ کر ہی وہ خود پر سے اختیار کھو بیٹھتی تھی۔ اب جو وہ اس کے بالکل سامنے بیٹھا تھا تو اس کو اپنی نظریں جھکانے کے لیے خاصی جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ اس کی جھکی نظریں میز کے اس پار نظر آنے والے شایان کے جوتوں پر جمی ہوئی تھیں۔ لیدر کے براؤن امپورٹڈ جوتے اس کے اعلیٰ ذوق کی گواہی دے رہے تھے۔

''یہاں پاکستانی فنکاروں کا ایک کنسرٹ ہو رہا ہے۔ کل رات مجھے بھی اس میں پرفارم کرنے کے لیے بلایا گیا ہے۔ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ اس وقت کچھ فرصت تھی تو میں نے سوچا تھوڑی سی شاپنگ کر لوں۔ آپ لوگوں کی طرف کنسرٹ سے فارغ ہو کر چکر لگاؤں گا۔'' وہ سمعیہ کے سوال کا تفصیلی جواب دے رہا تھا۔

''آپ کا کنسرٹ کہاں ہو رہا ہے شایان بھائی؟'' ملیحہ نے اشتیاق سے دریافت کیا۔

''تمہارے گھر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ تمہیں آنا ہے تو بتاؤ۔ میں تمہارے لیے بندوبست کر دوں گا۔'' اس نے خوش اخلاقی سے ملیحہ کو پیشکش کی۔

''ارے نہیں شایان۔ ان لوگوں کے اسکول چل رہے ہیں۔ یہ کہاں لیٹ نائٹ کسی پروگرام میں شریک ہو سکتے ہیں۔ پھر آج کل روحانہ بھی تو آئی ہوئی ہے۔ بچے اسے کمپنی دے رہے ہیں۔'' سمعیہ اپنے بچوں کا کسی میوزیکل کنسرٹ میں شرکت کرنا کہاں گوارا کر سکتی تھیں چنانچہ جلدی سے عذر پیش کیا۔ پھر موضوعِ گفتگو تبدیل کرتے ہوئے بولیں۔

''ارے میں نے روحانہ سے تو تمہارا تعارف کروایا ہی نہیں۔ یہ میری بھتیجی ہے۔ عبدالجبار بھائی کی بیٹی۔ بھائی کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے دبئی آئے ہوئے ہیں اور یہ ان کے ساتھ ہماری محبت میں کھنچی چلی آئی ہے۔''

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ آپ کے والد صاحب تو خاصی مشہور شخصیت ہیں۔'' اس نے روحانہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔ جواب میں وہ اس سے کچھ

نہیں کہہ سکی۔ وہ اس کی طرف متوجہ تھا اور اس سے مخاطب تھا تو وہ گنگ سی ہو کر رہ گئی تھی۔ ابھی کچھ دیر قبل تک تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کے دل و دماغ پر چھا جانے والا شخص یوں اس سے آٹکرائے گا۔

"روحانہ! یہ شایان صدیقی ہیں۔ عثمان کے تایا زاد بھائی کے بیٹے۔ خاصے فیمس سنگر ہیں۔ سنا ہے پاکستان میں تو ان کی دھوم مچی ہوئی ہے لیکن تم اس طرح کی چیزوں میں انٹرسٹڈ نہیں ہو اس لیے نہیں پہچانتی ہو گی۔" اب سمعیہ شایان کو اس سے متعارف کروا رہی تھیں۔ "عثمان کے کزن ان سے عمر میں خاصے بڑے تھے اس لیے عثمان کی ان سے زیادہ ان کے بچوں سے دوستی رہی۔ خاص طور پر بڑے ریحان سے تو عثمان کی گاڑھی چھنتی ہے۔ ہم جب بھی پاکستان آئیں، ان کے گھر ضرور جاتے ہیں اور وہاں ہماری اتنی خاطر مدارت ہوتی ہے کہ ہم شرمندہ ہو جاتے ہیں لیکن خود ان صاحب نے ہمیں میزبانی کا شرف نہیں بخشا کہ ہم بھی تھوڑی بہت ان کی خدمت کر سکتے۔" سمعیہ کے تعارف کروانے پر وہ شایان سے ایک بھی رسمی جملہ نہیں بول سکی تھی لیکن سمعیہ کے مسلسل بولنے کی وجہ سے شاید ہی کسی نے اس بات کو محسوس کیا ہو۔

"آپ تو شرمندہ کر رہی ہیں بھابی! میں نے بتایا تو ہے کہ میں گروپ کے ساتھ آیا ہوا ہوں اور کنسرٹ ہونے تک ہوٹل میں ہی رکنے کا پابند بھی ہوں۔ فارغ ہو کر آپ لوگوں سے ملنے ضرور آؤں گا۔" شایان نے شرمندہ سے لہجے میں وضاحت دی تو سمعیہ کو احساس ہوا کہ وہ تھوڑا زیادہ بول گئی ہیں چنانچہ فوراً ہی بولیں۔

"سوری شایان۔ میرا مقصد تمہیں شرمندہ کرنا نہیں تھا۔ عثمان اور بچے تم لوگوں سے بہت محبت کرتے ہیں اور تمہارے گھر آنے سے بہت خوش ہوں گے اس لیے میری خواہش تھی کہ تم ہمارے گھر ضرور آؤ۔"

"میں سمجھتا ہوں بھابی...... پلیز آپ اس طرح وضاحت پیش کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔" اس نے انکساری سے جواب دیا۔

"پھر آپ جلد ہمارے ہاں آ رہے ہیں نا شایان بھائی؟" ملیحہ نے جوش سے پوچھا۔

"آف کورس آ رہا ہوں گڑیا۔ تم میرے لیے مزے مزے کی چیزیں بنا کر رکھو۔ کچھ ککنگ وغیرہ سیکھی ہے یا نہیں؟" شایان ملیحہ کی طرف متوجہ ہو کر اس سے ہلکے پھلکے انداز میں گفتگو کرنے لگا۔

"تھوڑی بہت چیزیں مما نے بنانا سکھا دی ہیں۔ آپ بتائیں آپ کو کیا پسند ہے؟" ملیحہ نے اشتیاق سے پوچھا۔ روحانہ جو اس کا ایک ایک لفظ پہلے ہی توجہ سے سن رہی تھی، غیر ارادی طور پر مزید جی جان سے متوجہ ہو گئی۔ شایان ملیحہ کو اپنی پسند کی ڈشز کے نام گنوانے لگا۔

"اف اتنے مشکل کھانے۔ آپ اتنی پیور دیسی ڈشز پسند کرتے ہوں گے مجھے تو بالکل اندازہ نہیں تھا۔" اس کی پسند سن کر ملیحہ پریشان ہو گئی۔

"تو تمہارے خیال میں شایان کو پاستا، فرائیڈ رائس اور چائنیز سوپ جیسی چیزیں پسند ہوں گی؟" سمعیہ بیٹی کی حالت سے حظ اٹھاتے ہوئے ہنسی اور پھر شایان کو مخاطب کرتے ہوئے بولیں۔

"بھئی شایان! اگر تمہیں ہماری بیٹی کے ہاتھ کا کھانا کھانا ہے تو یہی سب مل سکتا ہے۔ اس کی ککنگ کی مہارت میں تمہاری پسندیدہ چیزوں میں سے ایک بھی شامل نہیں ہے۔"

"ہمارے گھر میں بھی رعنا ایسے تجربے کرتی رہتی ہے۔ میں تو امی سے صاف کہہ دیتا ہوں کہ جب میں گھر پر ہوا کروں تو رعنا کو کچن کا رخ مت کرنے دیا کریں لیکن وہ بھی اتنی زبردست شے ہے کہ کچھ نہ کچھ اپنے ہاتھ سے بنا کر زبردستی مجھے کھلاتی ضرور ہے۔" بہن کا ذکر کرتے ہوئے اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی محبت تھی۔

"بس تو پھر میں بھی رعنا باجی ہی کی طرح آپ کو زبردستی اپنی پسند سے اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی کوئی ڈش بنا کر کھلا دوں گی۔" ملیحہ کا مسئلہ گویا حل ہو گیا۔ اس کے اس انداز پر شایان بے ساختہ ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی دل کے تاروں کو چھیڑنے والی تھی۔ روحانہ جس نے کسی نہ کسی طرح نظروں کو جھکنے پر مجبور کر دیا تھا، اس کی ہنسی پر دل کے بجتے ساز کو راگنی چھیڑنے سے نہ روک سکی۔

"تم مجھے کوئی رعنا سے کم پیاری تھوڑی ہو۔ جیسے اس کا پکایا الم غلم کھا لیتا ہوں، تمہارا پکایا بھی کھا لوں گا۔" اپنے بالکل سامنے بیٹھی روحانہ عبدالجبار کی قلبی کیفیات سے بے خبر وہ ملیحہ کی بات کا جواب دے رہا تھا۔ بات کرتے کرتے اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب مجھے اجازت دیجیے بھابی۔ مجھے ریہرسل کے لیے ٹائم پر پہنچنا ہو گا۔ میوزیشنز میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"او ہو۔ تمہاری تو عثمان سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔" سمعیہ بھی کھڑی ہو گئیں اور افسوس سے بولیں۔

"عثمان کو بہت افسوس ہوگا کہ تم سے نہیں ملے۔"
"کوئی بات نہیں، آپ انہیں بچے کو انجوائے کروانے دیں۔ میں گھر پر آؤں گا تو ان سے تفصیلی ملاقات ہوجائے گی۔" اس نے شیشے کی دیوار کے اس پار کافی فاصلے پر نظر آتے عثمان اور بلال کو دیکھتے ہوئے انہیں تسلی دی پھر اللہ حافظ کہہ کر بڑے بڑے قدم اٹھاتا ہوا وہاں سے دور جانے لگا۔ روحانہ عبدالجبار نے اس کے جاتے ہوئے قدموں سے لپٹے اپنے دل کو صاف دیکھا مگر عجیب مقام بے بسی تھا کہ وہ مزاحمت کرنے کے قابل بھی نہیں رہ گئی تھی۔

☆☆☆

اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی تھیں اور پاؤں بیڑیوں میں قید تھے، اس کے باوجود اسے اس کے سیل سے نکال کر لے جانے والوں نے اس پر یوں اپنی گنز تان رکھی تھیں کہ جیسے انہیں اس کے خود پر حملہ کر دینے کا خدشہ ہو۔ ان کی اس قدر احتیاط پر اسے دل ہی دل میں ہنسی آرہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ایسا برتاؤ رکھتے تھے جیسے وہ کوئی بہت بڑا دہشت گرد یا تربیت یافتہ ماہر لڑاکا ہو اور زنجیروں میں جکڑے ہونے کے باوجود نہیں اس کی طرف سے حملے کا خدشہ ہو۔ حالانکہ ان کے رویے کے برعکس وہ بہت عام سا آدمی تھا جس نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کسی پر گولی نہیں چلائی تھی بلکہ سچ تو یہ تھا کہ ہتھیاروں کا استعمال بھی اسے کچھ عرصے قبل سکھایا گیا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ اپنے ذاتی دفاع کے لیے کوئی قدم اٹھا سکے لیکن مختصر عرصے میں سیکھے گئے اس ہنر میں وہ کتنے فیصد مہارت حاصل کرسکا ہے، اس کا اسے خود بھی صحیح سے علم نہیں تھا۔ ہاتھ پیر کی سنجیدہ لڑائی کی بھی اس کی زندگی میں کبھی نوبت نہیں آئی تھی البتہ وہ مضبوط جسامت کا مالک تھا اور اس نے نوجوانی میں باقاعدہ جم جوائن کر کے اپنی جسامت کو خوب صورت اور مضبوط بنایا تھا جس کی وجہ سے ہی شاید اس پر ایک فائٹر کا گمان ہوتا تھا ورنہ اس فن میں بھی اس کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک ماہر انسٹرکٹر کی کوششوں کے نتیجے میں بس تھوڑے بہت ہاتھ پاؤں چلانا ہی سیکھ سکا تھا اور جن سے اس کا واسطہ پڑا تھا انہوں نے ایک عمر اس دشت کی سیاحی میں گزاری تھی۔ وہ ذرا سی دیر میں کسی انسان کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دینے کی صلاحیت رکھتے تھے اور ان کے لیے بندے کو ایک سے دوسرے جہان میں پہنچا دینا بھی کوئی بڑی بات نہیں تھی۔
دھنائی اس کی بھی بہت ہوئی تھی۔ تشدد کی دیگر اقسام بھی اپنائی گئی تھیں لیکن ابھی انہیں اس کا اعترافی بیان درکار تھا اس لیے اسے زندہ رکھا گیا تھا۔ اس پر تشدد اور ظلم وجبر کی انتہا کرنے کے بعد وہ اچانک ہی کبھی مہربان بھی ہوجاتے تھے۔ اس عرصے میں اسے خوراک اور علاج کی سہولیات فراہم کی جاتی تھیں اور کوئی نہ کوئی اجنبی چہرہ مہربانی کا خول اوڑھ کر اسے یہ سمجھانے بیٹھ جاتا تھا کہ وہ اعتراف کر کے اپنی جان چھڑوالے تو اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔ وہ ہلکے چارجز کے ساتھ عدالت کے روبرو پیش کر دیا جائے گا اور کوشش کی جائے گی کہ عدالت اس کے لیے نرم سزا تجویز کرے۔ یوں بھی وہ قانونی طور پر ہندوستان آیا ہے اس لیے اس کی پوزیشن زیادہ خراب نہیں ہے۔ وہ عام آدمی ضرور تھا لیکن اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ ان کے ایسے حربوں میں پھنس جاتا۔ ہر پاکستانی کی طرح وہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ بھارت پاکستان کو بدنام کرنے کا کوئی بھی موقع ضائع نہیں کرتا۔ موقع ضائع کرنا تو دور کی بات وہ تو خود ایسے ڈرامے تخلیق کرتا رہتا تھا کہ عالمی برادری میں پاکستان کا نام بدنام ہوجائے۔ اس کے ان بھونڈے ڈراموں کا آئے دن بھانڈا بھی پھوٹتا رہتا تھا لیکن وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا تھا۔ ایسے کینہ پرور دشمن سے وہ کیسے امید رکھ سکتا تھا کہ وہ اس کے اعترافی بیان دینے کے بعد اس سے نرم سلوک کرے گا۔ بالفرض ایسا ہو بھی جاتا تو وہ اپنی ذات کے لیے یہ سہولت حاصل کرنے کی قیمت اپنے وطن کی بدنامی کی صورت ادا نہیں کرسکتا تھا۔ وہ جب کچھ خاص مقاصد کے تحت ہندوستان آرہا تھا، تب ہی اسے معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے اور وہ اپنے بدترین خدشات کے مطابق بری طرح پھنس بھی گیا تھا۔ را کے اس ٹارچر سیل میں بدترین غیر انسانی تشدد سہتے ہوئے بھی اگر اس نے اپنی زبان بند رکھی تھی تو اس میں اس کی سخت جانی یا ثابت قدمی سے زیادہ اللہ کی مدد شامل تھی۔ تشدد اور بھوک پیاس سے نڈھال ہوکر وہ ایک سے زیادہ بار سوچ چکا تھا کہ اسے ان کے سامنے ہتھیار ڈال دینے چاہئیں لیکن ہر بار اللہ اس کے دل میں ایسی کوئی بات ڈال دیتا تھا کہ وہ اپنی زباں بندی پر پختہ ہوجاتا تھا اور اس کے دل میں یہ بات آجاتی تھی کہ یہ جو بھی تکلیفیں ہیں، دنیا کی فانی زندگی کا حصہ ہیں اور ان تکلیفوں سے نجات کے لیے وہ آخرت کی ہمیشگی والی زندگی کی راحتوں کا سودا نہیں کرسکتا۔ وہ را کے سورماؤں کی دی گئی ایذا رسانیاں تو پھر بھی سہہ سکتا ہے لیکن جنت کی نعمتوں سے محروم ہوکر دوزخ کی آگ میں نہیں جل سکتا۔

شاطر صیاد اسے گھیرنے کے لیے طرح طرح کے حربے آزماتا رہتا تھا۔ آج کل انہوں نے اس پر نرمی کر رکھی تھی۔ بستر، کھانا، صاف ستھرا لباس اور علاج ساری سہولتیں دی جارہی تھیں۔ ان تمام سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے حقیقی معنوں میں ان کے نعمت ہونے کا ادراک ہوا تھا ورنہ پہلے بس وہ زبان سے ان کے نعمت ہونے کا اعتراف کرتا تھا لیکن حقیقی شعور نہیں رکھتا تھا کہ یہ سب چیزیں کس طرح نعمت ہوسکتی ہیں۔ نرمی کے اس عرصے میں اس نے دل کی گہرائیوں سے اللہ کا ان نعمتوں کے لیے شکر ادا کیا تھا۔ ساتھ ہی وہ اس بات کے انتظار میں بھی تھا کہ اس کے دشمن کے ترکش میں اس کے لیے اب کونسا تیر موجود ہے۔ آج جب اسے اس کے سیل سے نکال کر پابہ زنجیر کہیں لے جایا جارہا تھا تو وہ ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار ہوگیا تھا کہ اس کی نرمی کے دن ختم ہوئے اور اب پھر نئے سرے سے اسے مشقِ ستم بنایا جائے گا۔ مسلح افراد کے نرغے میں اسے جس کمرے میں لے جایا گیا، وہاں وہ اس سے قبل کبھی نہیں لے جایا گیا تھا۔ وہ کمرا دفتر کے انداز میں سجا ہوا تھا اور کسی عمدہ ائیر فریشنر کی خوشبو نے اس کی فضا کو نہایت خوش گوار بنا رکھا تھا۔

"بیٹھ جایئے۔" ابھی وہ کمرے کا سرسری جائزہ ہی لے سکا تھا کہ کسی نے بھاری گونج دار آواز میں اسے حکم دیا۔ حکم کے باوجود لہجہ مہذبانہ تھا اور یہاں آنے کے بعد سے یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی مہذب لہجے میں اس سے بات کررہا تھا۔ اس نے آواز کی سمت دیکھا۔ وہ شیشے کی بڑی سی میز کے پیچھے اس ریوالونگ چیئر پر بیٹھا ہوا تھا جس کا رخ اس کے کمرے میں داخلے کے وقت دوسری طرف تھا اور کرسی کی اونچی پشت کی وجہ سے اس پر بیٹھا ہوا شخص نظر نہیں آسکا تھا۔ اس شخص کے کہنے پر وہ وہاں رکھے ایک صوفے پر ٹک گیا۔ صوفہ نرم اور دبیز تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ اسے ایک مدت بعد ایسی آرام دہ نشست پر بیٹھنا نصیب ہوا ہے۔ اس کے بیٹھتے ہی اسے اپنی نگرانی میں یہاں تک لانے والے افراد میں سے ایک اس کی پشت پر جا کھڑا ہوا جبکہ دوسرا بائیں جانب یوں چوکنا ہو کر کھڑا ہوگیا جیسے اس کے ذرا بھی کوئی غلط حرکت کرنے پر اس پر جھپٹ پڑے گا۔ ان لوگوں کی اس احتیاط پر دل میں مسکراتا وہ میز پر بیٹھے شخص کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ کم و بیش چالیس سال کا ایک پُرکشش شخصیت رکھنے والا شخص تھا۔ اس نے نیوی بلیو کلر کا ٹو پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ آدھی مانگ نکال کر سنوارے گئے بالوں میں جیل کی ہلکی سی چمک محسوس ہورہی تھی اور محسوس ہورہا تھا کہ اس نے تازہ شیو بنا رکھی ہے۔ اس کے بائیں ہاتھ کی کلائی میں ایک مہنگی سی رسٹ واچ موجود تھی۔ اس ساری تیاری اور ہونٹوں پر موجود ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ ایک جنٹل مین کا تاثر پیش کررہا تھا۔ "میرا نام انیل شرما ہے۔ میں یہاں فارن افیئرز ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتا ہوں۔ تمہارا کیس اتفاقاً میرے سامنے آیا اور میں شاکڈ رہ گیا کہ تمہارے جیسا فیمس آدمی کیسے اس سارے میں انوالوڈ ہوگیا۔ تم مجھے اپنے فینز میں سے ایک سمجھ سکتے ہو اور میں تمہارے سامنے اپنے پرسنل انٹرسٹ کی وجہ سے ہی موجود ہوں۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے تمہارے کیس کی پوری جانکاری لے لی ہے اور سچ یہ ہے کہ تم پر بہت سیریس چارجز ہیں لیکن ایک فین کی حیثیت سے میں تمہیں کسی بھی سخت سزا سے بچانا چاہتا ہوں اور اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ تھوڑا سا کوآپریٹ کرنا ہوگا۔" اسے اپنی طرف متوجہ پا کر خود کو انیل شرما کے نام سے متعارف کروانے والا ایک تسلسل سے بولتا چلا گیا اور وہ چوکنا ہوگیا کہ اس کے ساتھ کوئی نیا ڈراما کیا جارہا ہے۔

"کیا تم میرے ساتھ کوآپریٹ کرو گے؟"

"کیسا کوآپریٹ؟" اس نے بلی کو تھیلے سے باہر نکالنے کے لیے سوال کے جواب میں سوال داغا۔

"بس تمہیں اپنا اعترافی بیان دینا ہوگا۔ اس کے بعد کے سارے مراحل میں خود دیکھ لوں گا۔ مجھے تمہاری پوزیشن کا اندازہ ہے۔ ہمارے ساتھ کوآپریٹ کرنے کی صورت میں تمہیں اپنے ملک میں رسپیکٹ نہیں دی جائے گی تو اس کا میرے پاس یہ سولوشن ہے کہ تمہیں یہاں کی سٹیزن شپ دلوادوں گا۔ تمہارے ملک میں ویسے بھی تمہارے لیے کیا رکھا ہے۔ یہاں رہ کر تم ترقی بھی کرو گے اور عیش بھی۔ میں اپنے سورسز یوز کر کے تمہارے کیریئر کو پیک پر پہنچا دوں گا۔ ہر طرف تمہارا ڈنکا بجے گا اور پبلک تم سے پہلے کے بڑے بڑے ناموں کو بھول جائے گی۔" وہ اسے سنہرے خواب دکھا رہا تھا جنہیں سن کر وہ ایسے مسکرایا جیسے کسی بچے کی طفلانہ بات سن کر مسکرایا جاتا ہے پھر سنجیدگی سے بولا۔

"آپ کے اتنا خیال کرنے کا بہت بہت شکریہ مسٹر شرما لیکن آپ مجھے جو آفرز دے رہے ہیں، وہ اس اعتبار سے غیر اہم ہیں کہ میں اپنے کیریئر کو پہلے ہی اس کے عروج پر چھوڑ چکا ہوں اور اب مجھے اس فیلڈ میں کوئی انٹرسٹ نہیں رہا ہے۔ فرض کریں میں آپ کی آفر قبول بھی کرلیتا ہوں تو

مجھے اپنے ہاں کی شہریت اور دیگر مراعات دینے کے بعد آپ وہ سارے مقاصد کیسے حاصل کرسکیں گے جو میرے اعترافی بیان سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ دنیا تو یہی کہے گی کہ آپ نے لالچ دے کر مجھے خرید لیا ہے۔'' اس کی بات سن کر شرما کے چہرے پر پل بھر کے لیے بدمزگی کا تاثر ابھرا۔ شاید اسے اچھا نہیں لگا تھا کہ سامنے والا اتنا بے وقوف نہیں ہے جتنا وہ اسے بنانے کی کوشش کررہا ہے لیکن پھر بھی اس نے اپنی کوشش ترک نہیں کی اور نہایت ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''ویل...... اگر تم یہ سب ایسے نہیں چاہتے تو نہ سہی، ہم دوسرے آپشنز پر بھی سوچ سکتے ہیں۔ ٹھیک ہے تم اپنی شہرت کا فائدہ مت اٹھاؤ اور دوبارہ سے فیلڈ میں مت جاؤ۔ تم بس ایک بار اپنا بیان دے دو۔ اس بیان پر کورٹ تمہارے لیے فیصلہ سنا دے تو اس کے بعد میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔ یہ میری ذمے داری ہوگی کہ تمہیں جیل سے نکال کر خاموشی سے بھارت بھر میں جہاں تم چاہو وہاں تمہاری رہائش کا ارینجمنٹ کردیا جائے۔ گھر، گاڑی، عورت اور زندگی کی دوسری ساری سہولتیں تمہیں حاصل رہیں گی اور تم بنا ہاتھ پاؤں چلائے آرام سے رہ سکو گے۔ وہاں پاکستان میں تو سنا ہے تم پر خاصا کڑا وقت آگیا تھا اور تمہیں اپنی دال روٹی کے لالے پڑگئے تھے۔'' آخر میں اس کا لہجہ قدرے طنزیہ ہوگیا تھا۔

''کوئی تیسرا آپشن؟'' شرما کے طنز کو خاطر میں لائے بغیر اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ اس کے انداز سے شرما سمجھا کہ شاید وہ اس کے جال میں پھنسنے کے لیے تیار ہے اس لیے جوش سے بولا۔

''تیسرا آپشن یہ ہوسکتا ہے کہ اگر تم بھارت میں نہ رہنا چاہو تو ہم دنیا بھر میں جہاں تم چاہو تمہارے رہنے کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ اس صورت میں تمہیں یہ فائدہ ہوگا کہ تم اپنی فیملی سے بھی ٹچ میں رہ سکو گے اور انہیں اپنے پاس بلوا سکو گے۔''

''کوئی اور آپشن؟'' اس نے شرما کی پُرکشش آفر کے جواب میں ایک بار پھر سنجیدگی سے پوچھا تو وہ الجھ سا گیا اور الجھے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''میرے دیے آپشنز اگر تمہیں منظور نہیں ہیں تو تم اپنی ڈیمانڈ میرے سامنے رکھ سکتے ہو۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہاری ہر ڈیمانڈ پوری ہوسکے۔''

''میری کوئی ڈیمانڈ نہیں ہے۔'' بالآخر اس نے اس کھیل کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور شرما کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ''تم میرے سامنے کتنے ہی اچھے آپشنز کیوں نہ رکھو، میرے اپنے سامنے جو واحد آپشن ہے وہ اتنا پُرکشش ہے کہ میں تم سے کوئی سودے بازی نہیں کرسکتا۔''

''واٹ ڈو یو مین۔'' شرما کے بگڑے لہجے میں بھی حیرت تھی۔

''شہادت کا آپشن۔ میرے انکار پر تم زیادہ سے زیادہ مجھے جان سے مار سکتے ہو اور شہادت کی موت پانے کے بعد مجھے اپنے رب کی جنت میں وہ سب بلکہ اس سے ہزاروں لاکھوں گنا بڑھ کر ہمیشہ کے لیے مل جائے گا جس کا تم مجھے اس دنیا کی چند روزہ زندگی کے لیے لالچ دے رہے ہو۔'' اس کے نہایت اطمینان سے کہے ان جملوں پر شرما کو پتنگے سے لگ گئے اور وہ منہ بگاڑ کر بولا۔

''واٹ ربش۔ کیا احمقوں جیسی بات کررہے ہو۔ کون جانے کہ اس جنت کا وجود بھی ہے یا نہیں جس کا لالچ دے کر تمہیں یہاں بھیجا گیا ہے۔''

''لالچ تو تم جیسے دیتے ہیں۔ میرا رب تو پکے اور سچے وعدے کرنے والوں میں سے ہے اور مجھے اس کے وعدوں کی سچائی پر کوئی شک نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جارہا تھا۔

''ویل...... میں نے تمہیں بہت اچھی آفرز دیں لیکن تم اپنی حماقت میں ان آفرز پر غور نہیں کررہے لیکن امید ہے کہ جو کچھ اب میں تمہارے سامنے پیش کروں گا، اس کے بعد تم میری بات پر غور ضرور کرو گے۔'' شرما نے اپنے لہجے پر ضرور قابو پالیا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں جو سفاکی تھی، اسے صاف پڑھا جاسکتا تھا۔

''اپنے رائٹ سائڈ پر دیکھو۔'' میز پر رکھے لیپ ٹاپ کو کھولتے ہوئے وہ اس سے مخاطب ہوا۔ شرما کے کہنے پر اس نے دائیں جانب دیکھا۔ وہاں ایک پروجیکٹر موجود تھا۔ اس کے متوجہ ہوتے ہی پروجیکٹر نے عکس دکھانا شروع کردیے۔ پہلا عکس اس کی ماں کا تھا۔

''آسیہ خاتون۔ عمر چھپن سال، انجائنا کی مریض، اپنے جوان بیٹے کے اچانک غائب ہونے پر سخت پریشان اور بیمار۔ کئی دن اسپتال میں زیر علاج رہیں۔ ڈاکٹرز کے مطابق کوئی مزید صدمہ ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوسکتا ہے۔'' وہ اپنی ماں کے عکس کو دیکھ کر تڑپ رہا تھا اور شرما کی آواز اس کے زخموں پر نمک چھڑک رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ماں کا عکس غائب ہوگیا اور بڑے بھائی کی فیملی فوٹو

سامنے آگئی۔
''ریحان صدیقی۔ عمر بتیس سال۔ ایک ملٹی نیشنل فرم میں جاب کرتا ہے۔ شادی شدہ۔ خوش شکل بیوی اور پیاری سی بیٹی کا باپ۔'' شرما کی آواز اس کی سماعتوں میں زہر گھول رہی تھی۔ وہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھنا چاہتا تھا لیکن وہاں ایک بار پھر عکس تبدیل ہو گیا تھا۔
یہ کاشان کی سمندر کنارے لی گئی تصویر تھی۔
''کاشان صدیقی، عمر تیس سال۔ ایم بی اے کے آخری سال میں پڑھتا ہے۔'' شرما اس کے فیملی ممبرز کا یوں تعارف کروا رہا تھا جیسے وہ انہیں جانتا ہی نہ ہو۔ کاشان کے بعد رعنا کی تصویر ابھری۔ وہ کالج یونیفارم میں تھی اور کسی بات پر بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔
''رعنا صدیقی، عمر انیس سال۔ گورنمنٹ گرلز کالج میں زیر تعلیم تین بھائیوں کی اکلوتی اور حسین بہن۔'' اس نے حسین پر خصوصی زور دیا تو وہ بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔
''تم یہ مت سمجھو کہ ہم نے تمہارے پریوار کے بارے میں یہ انفارمیشن اسپیشلی حاصل کی ہیں۔ تمہارے ملک میں ہمارا نیٹ ورک اتنا مضبوط ہے کہ ہم جس شخص کا چاہیں منٹوں میں بائیو ڈیٹا حاصل کر لیں۔ تمہارے کتنے لوگ ہمارے ایجنٹ ہیں اور کتنے ادارے ہمارے مفاد کے لیے کام کر رہے ہیں، تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ یہ ہماری مرضی پر ہے کہ ہم یہاں بیٹھے بیٹھے کس شخص کی موت کا حکم صادر کر دیں اور کس کو راہ چلتے کڈنیپ کروالیں۔ ہمارے بہترین آپشنز دینے پر بھی اگر تم ہماری بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہو تو ہمیں خود اپنے کچھ آپشنز کا استعمال کرنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے دونوں بھائیوں کو دفتر یا یونیورسٹی جاتے ہوئے گولی ماری جائے، تمہاری بھتیجی کی اسکول وین الٹ جائے۔ تمہاری جوان اور حسین بہن اغوا ہو جائے اور اگلے دن اس کی برہنہ لاش شہر کے کسی چوراہے پر ملے۔'' وہ بہت اطمینان سے بول رہا تھا لیکن اس کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی تھی چنانچہ نتائج کی پروا نہ کرتے ہوئے یکدم ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور ہاتھوں پیروں کی زنجیروں کے باوجود انیل شرما پر جھپٹنے کی کوشش کی لیکن اس کی یہ کوشش بس کوشش ہی تھی۔ اس کے سر پر چوکنا کھڑے دونوں افراد نے اتنی تیزی سے حرکت کی کہ وہ اس میز تک بھی نہیں پہنچ سکا جس کے پیچھے انیل شرما بیٹھا تھا۔
''تو نے میرے گھر والوں کی طرف میلی آنکھ سے دیکھا تو میں تیری آنکھیں پھوڑ دوں گا۔'' اس کو کچھ نہیں سوجھا تو شرما کو زبانی دھمکی دینے لگا۔ اس دھمکی کے جواب میں شرما تو کچھ نہیں بولا لیکن اسے جکڑنے والوں نے اسے منہ کے بل فرش پر گرایا اور بھاری جوتوں سے بلا تخصیص اس کے جسم کے ہر حصے پر ٹھوکریں برسانے لگے۔ ذرا سی دیر میں انہوں نے اسے لال نیلا کر کے رکھ دیا۔
''بس۔'' تماشا دیکھتے شرما نے جب دیکھا کہ وہ اچھی طرح پٹ چکا ہے تو ان لوگوں کو روکا۔ وہ دونوں فوراً پیچھے ہٹ گئے جبکہ وہ فرش پر ہی پڑا رہ گیا۔
''چچ چچ چچ...... کیا حلیہ بنوالیا تم نے اپنا۔ ہم نے تو تمہیں بڑا سمان دیا تھا اور اتنے پریم سے تمہیں اپنے سامنے صوفے پر بٹھوایا تھا لیکن تم کو ہمارا اتنا پریم، اتنا سمان راس نہیں آیا۔'' شرما اپنی جگہ سے اٹھ کر اس سے کچھ فاصلے پر آن کھڑا ہوا اور طنز بھرے لہجے میں بولنے لگا۔ اس نے شرما کو نفرت بھری نظروں سے گھورا اور پھر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔
''جلد بازی اچھی چیز نہیں۔ میں تمہیں تھوڑا سے دے دیتا ہوں۔ تم اپنا نہیں تو اپنی فیملی کا سوچ کر فیصلہ سنانا کہ ہمارے ساتھ کوآپریٹ کرو گے یا نہیں۔'' شرما پر اس کے انداز کا کوئی اثر نہیں ہوا اور سکون سے اسے مشورہ دیا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ مشورہ نہیں کھلی دھمکی ہے اور وہ جتنے خبیث تھے، ان سے یہی امید رکھی جا سکتی تھی کہ وہ اپنی دھمکی پر من و عن عمل کر گزریں گے۔

☆☆☆

اس نے کوفتوں کی بریانی کو دم لگایا اور کھلی ڈش میں رکھے شاہی ٹکڑوں کو چیک کرنے لگی۔ وہ بالکل ویسے ہی بنے تھے جیسے وہ چاہتی تھی۔ اب بس اسے ان کی سجاوٹ کرنی تھی۔ اس مقصد کے لیے وہ کچن ٹیبل کی طرف بڑھی جس پر ملیحہ نے پہلے ہی سلاد کے لیے سبزیوں کا ڈھیر لگا رکھا تھا اور خود اس ڈھیر سے نبرد آزما تھی۔ وہ بھی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور چھیل کر رکھے گئے بادام پستوں کو چھری کی مدد سے باریک باریک کاٹنے لگی۔ اسی وقت سمعیہ نے کچن میں جھانکا۔
''کیا ہو رہا ہے گرلز؟ میں کچھ ہیلپ کرواؤں؟''
''نہیں پھپھو۔ سب کچھ بس ریڈی ہی سمجھیں۔ تھوڑا سا ہی کام رہ گیا ہے، آپ آرام کریں۔ ہیلپ کے لیے ملیحہ ہے نا میرے ساتھ۔'' روحانہ نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں جواب دیا۔ سمعیہ کی کل رات سے طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ زبردست فلو کے ساتھ ہی خاصا تیز بخار ہو گیا تھا۔

اس کے باوجود جب صبح شایان نے فون کر کے رات تک اپنی آمد کی اطلاع دی تو وہ اسے منع نہیں کر سکیں۔ بعد میں انہیں یہ پریشانی لاحق ہو گئی کہ اتنی خراب طبیعت کے ساتھ وہ شایان کی بھرپور میزبانی کا حق کیسے ادا کر سکیں گی۔ ان کی طبیعت سچ مچ بہت زیادہ خراب تھی اس لیے عثمان نے حل پیش کیا کہ وہ رات کے لیے کسی اچھے ہوٹل سے کھانا لے آئیں گے لیکن اس موقع پر روحانہ نے دخل اندازی کی اور فیصلہ سنایا کہ باہر سے کچھ لانے کی ضرورت نہیں ہے، کھانا وہ تیار کرے گی۔ عثمان کو اس سے اتنا کام کروانے میں تھوڑا سا تذبذب تھا کہ وہ چند دن کے لیے تو آئی ہے اور مہمان ہے لیکن اس نے اپنی مہمان والی حیثیت کو ماننے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ وہ یہاں مہمان نہیں ہے بلکہ پھپھو کی بیٹی کی حیثیت سے خود کو گھر کا ہی ایک فرد سمجھتی ہے۔ اس موقعے پر ابا نے بھی اس کی تائید کی اور عثمان کو یقین دلایا کہ وہ رات کی دعوت کے لیے بہترین کھانا بنانے کی اہلیت رکھتی ہے۔

اس کے بعد ابا اور عثمان انکل تو اپنے اپنے کاموں کے لیے نکل گئے اور وہ پھپھو کو آرام کے لیے بھیج کر خود ملیحہ کے ساتھ باورچی خانے میں پہنچ گئی۔ پھپھو کے کچن اور فریج میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اس نے اس دن شاپنگ مال میں شایان کے بتائے گئے پسندیدہ کھانوں کی فہرست کے مطابق کھانا بنانے کی تیاری شروع کر دی۔ کوفتوں کی بریانی، بہاری کباب، حیدرآبادی مرچوں کا سالن، مٹن کڑاہی اور شاہی ٹکڑے یہ سب ایسے کھانے تھے جنہیں تیار کرنے کے لیے وقت درکار تھا اس لیے اس نے فوری طور پر ہی کام کا آغاز کر دیا تھا۔ ان کھانوں کی تیاری کے ساتھ اس نے رائتہ، سلاد اور چٹنیوں کی تیاری کا خیال رکھا تھا۔ کالی مرچ اور ہرے مسالے کا دو طرح کا رائتہ، املی، آلو بخارے اور پودینے کی چٹنیاں سب اس نے اپنے ہاتھوں سے تیار کی تھیں۔ صرف سلاد وہ واحد چیز تھی جو ملیحہ بنا رہی تھی البتہ چھوٹے موٹے کاموں میں اس نے خاصا ہاتھ بٹایا تھا۔ کھانے کی تیاری کے ساتھ کچن کی صفائی میں بھی وہ مستقل ہاتھ بٹاتی رہی تھی۔ سمعیہ نے کوشش کی تھی کہ وہ بھی اس کی مدد کروا دیں لیکن اس نے انہیں بیڈروم سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ دعوت کی تیاری کے ساتھ اس نے ان کا پرہیزی کھانا بھی تیار کیا تھا البتہ دوپہر کے کھانے کے لیے دال چاول بنانے کی ذمے داری ملیحہ نے لے لی تھی۔ بلال کا منہ نہ بنے اس لیے اس نے دال چاول کے ساتھ تھوڑے سے فریز کیے ہوئے شامی کباب بھی تل دیے تھے۔ بے حد دل لگا کر تیار کردہ کھانوں کے معیار کی طرف سے وہ اپنے طور پر مطمئن ہونے کے باوجود مسلسل دل میں یہ دعا کرتی جا رہی تھی کہ کھانا شایان کو پسند آجائے۔ اس ٹینشن میں اس سے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا گیا تھا۔

"تم نے بھی اپنے شایان بھائی کے لیے کچھ تیار کیا ہے یا صرف سلاد ہی بنا کر کھلانے والی ہو؟" سمعیہ نے بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ان کی آواز کا بھاری پن خاصا کم ہو گیا تھا لیکن آنکھوں اور ناک کی سرخی ابھی تک برقرار تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ انہیں اب بھی بخار ہے۔

"روحی آپی نے سارے ان کی پسند کے کھانے تیار کیے ہیں۔ اب اگر میں اپنا پاستا یا فرائیڈ رائس تیار بھی کردوں گی تو انہوں نے کونسا کھانا ہے؟ ایویں میری محنت ضائع جائے گی۔" کھیرے کے گول گول قتلے کاٹتے ہوئے اس نے ذرا سا منہ بنا کر جواب دیا تو سمعیہ اور روحانہ دونوں کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھر سمعیہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"روحی بیٹا! اب بس کر دو اور جا کر فریش ہو جاؤ۔ پورے دن سے لگی ہوئی ہو، تھک گئی ہو گی... یہ چھوٹے موٹے کام تو ملیحہ بھی نمٹا لے گی اور میں بھی اب اتنی بہتر تو ہوں کہ تھوڑے بہت ہاتھ چلانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ چلو شاباش مجھے بتاؤ کہ کیا کرنا باقی ہے۔ میں ملیحہ کے ساتھ مل کر نمٹا لوں گی۔" سمعیہ پھپھو جو اس کی طرف سے آرام کا مشورہ ملنے کے بعد بھی بدستور وہیں ڈٹی ہوئی تھیں، اس بار اپنے بزرگانہ تحکم کے ساتھ مخاطب ہوئیں تو وہ ان سے مزید ضد نہیں کر سکی البتہ اتنا ضرور بولی۔

"ٹھیک ہے پھپھو۔ میں بس ذرا شاہی ٹکڑوں کی سجاوٹ کر لوں پھر جا کر فریش ہوتی ہوں۔" پھپھو نے اس کی یہ بات مان لی اور وہ چاندی کے ورق اور بادام پستوں سے شاہی ٹکڑوں کی سجاوٹ کرتے ہوئے انہیں ان دو ایک کاموں کے بارے میں بتانے لگی جو ابھی کرنے باقی تھے۔ پھپھو نے اسے اطمینان دلایا کہ وہ یہ کام بخوبی کر لیں گی تو وہ کچن سے باہر نکل گئی۔ اس کا رخ ملیحہ کے کمرے کی طرف تھا کیونکہ اس کا سامان وہیں رکھا تھا۔ کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نے لاؤنج میں موجود عثمان انکل کو دیکھا۔ وہ ٹیلی ویژن پر خبریں دیکھ رہے تھے۔ انہیں گھر واپس آئے تقریباً پون گھنٹا ہو چکا تھا اور ملیحہ انہیں چائے بنا کر پہنچا چکی تھی۔ چائے سے فارغ ہونے کے بعد وہ اب خبریں دیکھتے ہوئے شایان کے انتظار کا وقت گزار رہے

تھے۔ اصولاً اب تک اسے آجانا چاہیے تھا لیکن وہ پہنچا نہیں تھا۔ ابا بھی نہیں آئے تھے لیکن انہوں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ انہیں کچھ تاخیر ہوجائے گی چنانچہ ان کی طرف سے اسے کوئی تشویش نہیں تھی۔

کمرے میں پہنچ کر اسے ملیحہ پر بے ساختہ پیار آگیا۔ اس نے اس کے کہے بنا ہی اس کا لباس استری کر دیا تھا۔ موتیا رنگ کا یہ لباس جس پر ہم رنگ موتیوں کی بیل لگی ہوئی تھی' اسے خود بھی بہت پسند تھا۔ اس نے جلدی سے باتھ لے کر وہ لباس زیب تن کر لیا اور اپنے بالوں کو سنوارنے لگی۔ اس کے بال غیر معمولی لمبے نہیں تھے البتہ گھنے اور چمکیلے ضرور تھے اس لیے اچھے لگتے تھے۔ بالوں کو سلجھانے کے بعد اس نے انہیں سوکھنے کے لیے ایسے ہی کھلا چھوڑ دیا اور خود بیڈ پر ٹک گئی۔ باہر کی خاموشی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ابھی مہمان کی آمد نہیں ہوئی ہے۔ کام تو سارا نمٹ ہی چکا تھا اس لیے اس نے مناسب سمجھا کہ کچھ دیر ریلیکس ہوجائے۔ نہانے سے جہاں جسم ہلکا پھلکا ہوگیا تھا، وہیں اس تھکاوٹ نے بھی اثر دکھانا شروع کر دیا تھا جو مسلسل کام میں لگے رہنے کی وجہ سے ہوگئی تھی لیکن وہ اپنے جوش و خروش میں محسوس نہیں کر سکی تھی۔

اصل میں اسے سارے کام آتے تو تھے لیکن ایک ساتھ ایک ہی دن میں اتنی ساری ڈشز بنانے کا تجربہ نہیں تھا۔ ابا کنجوس نہیں تھے لیکن ایک وقت میں اتنے بہت سے کھانے بنانے کو اسراف میں شمار کرتے تھے اور ان کا نظریہ تھا کہ صرف اپنی زبان کو چٹخارے کے لیے اتنے پیسے اور وقت کا استعمال دوسروں کے حقوق غصب کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ اتنا کھانا بنانا جسے آپ پورا کھا بھی نہیں سکتے، ایک فضول عمل ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ ایسے پرتکلف کھانے کی تیاری پر صرف ہونے والی رقم اور وقت کسی کی فلاح کے لیے خرچ کر لیا جائے۔ وہ ابا کے اس نظریے کی حامی تھی لیکن شایان کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ زندگی میں شاید پہلی اور آخری بار اسے وہ موقع ملا ہے جب وہ اس شخص کو اپنے ہاتھوں کا بنا کھانا کھلا سکتی ہے اس لیے اس کی ساری پسندیدہ ڈشز آج ہی تیار کر دی تھیں اور اپنی اس کارکردگی پر خاصی سرشار اب بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے اپنی تھکن سے بھی لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ پھپھو شایان کو یہ ضرور بتائیں گی کہ یہ ساری محنت اس نے کی ہے۔ شایان یہ سن کر کیا ردعمل دے گا، اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس کے لیے تو بس اتنا ہی کافی تھا کہ وہ اس کے پکائے ہوئے کھانے کو شوق سے کھالے لیکن وہ آتا تو کھاتا۔ وہ تو ابھی تک پہنچا ہی نہیں تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ موصوف شوبز کی روایت کے مطابق تاخیر سے پہنچنے کے عادی ہیں۔ اس قسم کی سوچوں میں گم ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ لیے وہ کب غنودگی میں چلی گئی اسے خود بھی علم نہیں ہوسکا۔

☆☆☆

تازہ مار نے اس کے جسم کو پھوڑے کی طرح دکھا دیا تھا۔ جسم کا شاید ہی کوئی حصہ ایسا ہو جو ان ظالموں کا نشانہ بننے سے رہ گیا ہو لیکن اس وقت وہ فرش پر چت پڑا اپنی کسی تکلیف کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس کا پورا دھیان انیل شرما کی ان دھمکیوں پر لگا ہوا تھا جو اس نے اسے اس کے اہل خانہ کی تصویریں مع کوائف دکھانے کے بعد دی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جن ظالموں کی قید میں ہے وہ اپنی دی گئی دھمکیوں پر عمل پیرا ہونے میں بھی کسی تکلف سے کام نہیں لیں گے۔ اس کی چشم تصور میں کبھی ریحان بھائی اور کاشان کی لہولہان لاشیں آجاتیں تو کبھی امی کا غم سے نڈھال کمزور وجود۔ ننھی ذویا کو پہنچنے والی کوئی تکلیف بھی اس کے لیے ناقابل برداشت تھی اور پھر سب سے بڑھ کر اس کی پاکباز اور معصوم بہن سے متعلق دی جانے والی دھمکی تھی۔ رعنا تو ان سب کی اتنی لاڈلی تھی کہ انہوں نے کبھی اس تک گرم ہوا کا جھونکا بھی نہیں پہنچنے دیا تھا۔ ابو کا انتقال اس کی خاصی کم عمری میں ہوگیا تھا لیکن اس نے اور ریحان بھائی نے اپنی خصوصی توجہ کے باعث کبھی اسے احساس ہی نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ باپ کے سائے سے محروم ہو چکی ہے۔ اتنی لاڈلی اور پیاری وہ بہن کسی کی میلی نظروں کا نشانہ بنتی تو وہ بھلا کیونکر سہہ پاتا لیکن دوسری طرف معاملہ حب الوطنی کا تھا۔ وہ صیاد کا مطالبہ مان لیتا تو اس کا ملک دنیا بھر میں بدنام ہو کر رہ جاتا۔ اس کے منفی بیان پر اس سے نفرت کرنے والے کروڑوں پاکستانیوں کے ساتھ ساتھ اس کے اپنے گھر والے بھی شامل ہوتے۔ وہ اگر اپنوں کی تکلیف نہیں سہہ سکتا تھا تو ان کی نفرت سے ملنے والی تکلیف بھی نہیں سہہ سکتا تھا اور پھر اس کی جذباتی قوم کا ردعمل بھی تو خطرناک ہوسکتا تھا۔ وہ یہاں بھارت میں بیٹھ کر وطن کے خلاف زہر اگلتا تو نفرت کی آگ اس کے آشیانے کو آگ لگا دیتی۔ اس کے کروڑوں ہم وطنوں میں سے سوڈیڑھ سو جوشیلے بھی اگر اس کے گھر پر پل پڑتے تو وہاں کچھ نہ بچتا۔ ان خطوط پر سوچتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کے پاس چوائس صرف اتنی ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کو کس کے رحم و کرم پر چھوڑتا ہے

کیونکہ نشانہ تو وہ دونوں صورتوں میں بن سکتے تھے۔

''ہمیں احساس ہے بریو مین کہ ہم تمہیں ایک مشکل ٹاسک دے کر بھارت بھیج رہے ہیں اور تم کسی مشکل میں بھی پھنس سکتے ہو لیکن اس بات کا یقین رکھنا کہ تمہارے پھنس جانے کی صورت میں ہم تم سے غافل نہیں ہو جائیں گے۔ ہم سے تمہارے اور تمہارے گھر والوں کے لیے جو ہو سکا ہم ضرور کریں گے۔'' یہ وہ تسلی تھی جو کرنل شبیر عالم نے اس کی بھارت روانگی سے محض دو دن قبل ہی اسے دی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ محض ایک تسلی ہی تھی یا اسے عملی جامہ بھی پہنایا جانے والا تھا لیکن فی الحال تو اسے گھپ اندھیرے میں وہی روشنی کی ایک کرن نظر آئی اور اس نے خود کو حوصلہ دینے کی کوشش کی کہ وہاں پاکستان میں اس کے گھر کے کسی بھی فرد پر ہاتھ ڈالنا بھارتی سورماؤں کے لیے اتنا آسان نہیں ہوگا۔ یہ محض ایک حربہ ہے جو وہ اسے زیر کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور ایمان کو بھی آزمائش کی بھٹی سے گزرے بغیر سرخروئی حاصل نہیں ہوئی۔ بلال حبشیؓ صحرا کی تپتی ریت پر گھسیٹے جانے کے بعد ہی تو اس مقام کو پہنچے تھے کہ انہیں رسول اکرم ﷺ کی غلامی کا شرف حاصل ہوا تھا اور یہ غلامی کتنے اونچے درجے کی غلامی تھی کہ سیدنا عمرؓ جیسے صحابی رسولؐ انہیں میرے آقا بلال کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کا بھی تو ایمان سچا تھا کہ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے اور وہ دشمن کے ہاتھوں میں کھیل کر اس قلعے کی دیوار میں سوراخ کرنے والا پتھر کیونکر بن سکتا ہے۔ اسے تو سیدنا بلالؓ کی طرح بس ایک ہی کلمے کو وردِ زبانی بنائے رکھنا تھا کیونکہ جو زبان پورے یقین کے ساتھ یہ کہتی ہے کہ میرا رب اللہ ہے، تو پھر اس کے سارے معاملات خود بخود ہی اللہ سنبھال لیتا ہے۔

اس کے قلب پر خود بخود ہی یہ اطمینان اترنے لگا کہ جس رب نے دشمن کی قید میں اس کی زندگی کو قائم رکھا ہوا ہے، وہی اس کے گھر والوں کی زندگیوں اور عصمت کی بھی حفاظت کرے گا۔ اب چاہے یہ حفاظت کرنل شبیر عالم کے ایفائے عہد کی صورت میں ہو یا کسی اور ذریعے سے لیکن ایسا ہونا ضرور تھا۔ ایک بار اس نکتے پر پہنچ کر اس نے حتمی فیصلہ کر لیا تو ذہن دوسرے رخوں پر بھی سوچنے لگا۔ آج کل وہ صاف محسوس کر رہا تھا کہ اس سے تفتیش کرنے والے بھارتی کچھ بے چینی اور عجلت کا شکار ہیں۔ شاید ان پر کہیں سے دباؤ پڑ رہا تھا۔ ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ وہ قانونی طور پر بھارت آیا تھا اور انہوں نے اسے بغیر کسی ثبوت کے گرفتار کیا تھا۔ گرفتاری کے وقت انہیں اس کے پاس سے کچھ نہیں ملا تھا۔ اس کے سامان میں بھی ایسا کچھ نہیں تھا کہ قابل گرفت ٹھہرتا اسی لیے تو وہ اسے کھلے بندوں گرفتار بھی نہیں کر سکے تھے اور اسے اپنی تحویل میں لینے کے لیے انہیں باقاعدہ ڈراما رچانا پڑا تھا۔ انہوں نے اسے بالکل اچکوں اور بدمعاشوں کی طرح ایک ویران سڑک پر گھیرا تھا اور اپنے ڈرامے میں جان ڈالنے کے لیے اس کی گاڑی چلانے والے ڈرائیور کو گولی مار دی تھی حالانکہ وہ غریب ڈرائیور ان ہی کا ہم وطن اور ہم مذہب تھا لیکن اپنے مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے اسے بلی چڑھا دیا تھا۔

اسے اندازہ تھا کہ اس کی گرفتاری کو اغوا کا رنگ دینے والے کس طرح کا راگ الاپ رہے ہوں گے۔ انہوں نے پاکستانی سفارت خانے کو یہی باور کروانے کی کوشش کی ہوگی کہ یہ بھارت میں موجود کسی ایسے گروپ کی کارروائی ہے جو ایک مشہور غیر ملکی کو اغوا کر کے سرکار پر دباؤ ڈالنا چاہتا ہے۔ بھارت کے مختلف حصوں میں کئی حکومت باغی تحریکیں چل رہی تھیں۔ وہ اس کے اغوا کا الزام ان میں سے کسی پر دھر دیتے اور ظاہری طور پر اس کی بازیابی کا ڈراما بھی کرتے رہتے کہ ڈراما بازی میں تو انہیں کمال حاصل تھا لیکن حقیقتاً ان کی یہ ڈراما بازی زیادہ دن تک جاری نہیں رہ سکتی تھی۔ پاکستان سے جن لوگوں نے اسے خصوصی مشن پر بھارت بھیجا تھا، وہ اتنے بے وقوف نہیں ہو سکتے تھے کہ سارا حساب کتاب لگا کر یہ نہ سمجھ پاتے کہ وہ گرفت میں آ گیا ہے اور یقین ہونے کی صورت میں سفارتی سطح پر ہنگامہ لازم تھا۔ پاکستان کی طرف سے مسلسل یہ مطالبہ کیا جا رہا ہوگا کہ بھارتی ایجنسیاں اپنے وطن میں غائب ہونے والے پاکستانی شہری کو جلد از جلد بازیاب کروائیں۔ ہو سکتا تھا کہ اب تک کوئی جوائنٹ انویسٹی گیشن ٹیم بنانے کا بھی مطالبہ کیا جا چکا ہو اور پاکستانی انٹیلی جنس کے ساتھ اس کی بازیابی کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں اور ملنے والے کلیوز کو شیئر کرنے پر زور دیا جا رہا ہو۔ کاغذات پر جعلی کوششیں، کارروائیاں اور کلیوز سب دکھائے جا سکتے تھے لیکن اس ڈرامے کو اپنی سوپ سیریز کی طرح طول دینا بھارت کے لیے آسان نہیں تھا کیونکہ سوپ سیریز پاکستان میں بیٹھی چند کم فہم گھریلو خواتین کو تو بے وقوف بنا کر باندھنے کا کام کر سکتی ہیں لیکن سمجھ دار طبقے میں ایسی چیزوں کی نہ تو پذیرائی ہے نہ قبولیت۔

وہ جوں جوں ان لائنز پر سوچ رہا تھا، اسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اسے قید کرنے والوں پر خود بہت دباؤ ہے اس

لیے وہ اس پر دباؤ بڑھانے کی کوشش کررہے ہیں۔ اسے پچھلے سارے تشدد کی طرح اس دباؤ کو بھی ہمت سے اللہ کے بھروسے پر برداشت کرنا ہوگا تب ہی سرخروئی نصیب ہوگی۔ سرخروئی سے مراد وہ یہاں سے آزادی نہیں لیتا تھا۔ آزادی کی خوش گمانی تو اس کے دل کی سب سے آخری امید تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ لوگ اپنا کچا چٹھا کھولنے کے لیے اسے ہرگز بھی آزاد نہیں چھوڑیں گے۔ وہ اسے اگر اپنے مفادات میں استعمال نہیں کرسکے تو ان کے پاس دوسرا حل اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کروا دینا ہوگا۔ بھارت بھر میں سے کہیں بھی ملنے والی اس کی لاش کو اس کے سفارت خانے کے حوالے کرتے ہوئے بھارتی سورماؤں کو بھلا کیا شرمندگی ہوتی کہ ان کی سرزمین پر ایک پاکستانی شہری مارا گیا۔ دکھاوے کو وہ افسوس کا اظہار ضرور کرتے۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اس کے قتل کے جرم میں اپنے کچھ دوستوں کو پھانسی بھی چڑھا دی جاتی لیکن ان سے کوئی اچھی امید بہرحال نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ تو جن سے خیر کی امید نہیں تھی، وہ ان کے شر سے ڈر کر اسے مزید پھیلانے کے مواقع کیوں مہیا کرتا۔ اس کے پاس صرف ایک راہ تھی۔ ان کے شر کے سامنے ڈٹے رہنا۔ اللہ نے قرآن میں وعدہ کیا ہے کہ ”بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“ اور صبر کے معنی ہی ڈٹ جانے کے ہیں تو وہ بھی راکے اس تنگ و تاریک ٹارچر سیل میں اسلام دشمنوں کے خلاف ڈٹ جانے اور صبر سے کام لینے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

☆☆☆

شایان وہاں پہنچا تو کچھ ڈسٹرب اور شرمندہ سا تھا۔

”سوری ایوری باڈی۔ مجھے دیر ہوگئی آنے میں اور آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔“

سلام کے بعد اس نے سب سے پہلا کام معذرت کرنے کا کیا۔

”اٹس او کے یار۔ ہم نے زیادہ مائنڈ نہیں کیا۔ ایک تو پاکستانی، دوسرے شوبز کے بندے کو مہمان آنا ہو تو اتنے انتظار کا حوصلہ تو رکھنا پڑتا ہے۔“ عثمان نے اسے چھیڑنے والے انداز میں اس کی معذرت قبول کی جس پر وہ اور بھی شرمندہ ہوگیا اور جلدی سے بولا۔

”یہ بات نہیں ہے عثمان بھائی۔ میں اپنے ہوٹل سے تو بالکل وقت پر ہی نکلا تھا لیکن ہوا کچھ یوں کہ یہاں آنے کے لیے میں نے جو کیب ہائر کی اس کے ڈرائیور صاحب پاکستانی تھے اور دبئی میں ڈرائیونگ کا لائسنس حاصل کرلینے کے باوجود شاید ان کے اندر سے پاکستانی عادتیں پوری طرح نکلی نہیں تھیں اس لیے انہوں نے کیب ایک شیخ صاحب کی گاڑی کے بمپر سے ٹکرادی۔ اچھا خاصا مسئلہ ہوگیا۔ شیخ صاحب بے حد برہم ہوئے۔ پولیس پہنچ گئی۔ مجھے بھی عینی گواہ کی حیثیت سے اپنا بیان لکھوانا پڑا۔ اس سب سے نمٹ کر دوسری کیب لینے اور یہاں آنے میں تھوڑا وقت لگ گیا پھر بھی آپ لوگوں سے معذرت چاہتا ہوں۔“

”اچھا بھئی اب تم بار بار معذرت کرکے ہمیں شرمندہ مت کرو۔ ایسی بھی کوئی زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے اور نہ ہی ہمیں کوئی زحمت اٹھانی پڑی ہے۔ آرام سے اپنے گھر میں بیٹھے ہیں، کہیں کسی سڑک کنارے تو نہیں کھڑے کہ انتظار کرنا مشکل ہوجائے۔“

اس بار سمعیہ نے اسے تسلی دی تو وہ تھوڑا ریلیکس ہوگیا اور بولا۔ ”تھینک یو بھابی۔ اب ذرا مجھے واش روم کا راستہ تو دکھا دیں۔ میں تھوڑا سا ری فریش ہوجاؤں تو پھر سب کے ساتھ آرام سے بیٹھوں گا۔“

”آپ میرے کمرے کا واش روم یوز کرلیں شایان بھائی۔ کامن واش روم میں تھوڑا مسئلہ ہے۔ ڈیڈی نے کمپلین لکھوائی ہوئی ہے لیکن پلمبر کل آئے گا۔“ ملیحہ نے فوراً ہی اسے پیشکش کی جس پر ظاہر ہے کسی کو اعتراض نہیں تھا۔ کسی کو دھیان بھی نہیں تھا کہ روحانہ، ملیحہ کے کمرے میں موجود ہے۔ ملیحہ باہر ہی سے اسے اپنے کمرے کے دروازے پر چھوڑ کر کچن میں بھاگ گئی تاکہ کھانا لگانے کے سلسلے میں اپنی خدمات انجام دے سکے۔ عام دنوں میں بھی سمعیہ عموماً کھانا خود ہی تیار کرتی تھیں لیکن ٹیبل پر لگانے کی ذمے داری اس کی تھی۔ یہ سمعیہ کا اندازِ تربیت تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ لڑکیوں کو سب سے پہلے اس بات کا قرینہ ہونا چاہیے کہ کھانا کس طرح پیش کرنا ہے کیونکہ برے طریقے سے پیش کیا گیا کھانا اچھے پکے ہوئے کھانے کا تاثر بھی زائل کردیتا ہے۔ پھر ایسے چھوٹے موٹے کام کرنے سے لڑکیوں کو کام کرنے کی بھی عادت ہوجاتی ہے اور رفتہ رفتہ جب ان پر ذمے داریاں بڑھتی ہیں تو وہ اتنا بوجھ محسوس نہیں کرتیں۔

ملیحہ کے کمرے میں کسی کی موجودگی کے امکان سے قطعی بے خبر شایان بے دھڑک دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو لمحہ بھر کے لیے خود ہی گڑبڑا گیا۔ موتیا رنگ کے لباس میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے سوئی ہوئی اس لڑکی پر اسے موتیا کے پھول کا ہی گمان ہوا تھا۔ وہ کوئی بہت زیادہ خوب

صورت نہیں تھی لیکن موتیا کے پھول کی طرح ہی مقدس اور پاکیزہ لگ رہی تھی۔ اس کو فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ اس دن مال میں ملنے والی سمعیہ کی بھتیجی روحانہ تھی۔ اس دن اس نے اسے حجاب میں دیکھا تھا اور سمجھتا تھا کہ وہ گھر میں بھی اس کے سامنے بنا حجاب کے نہیں آسکتی تھی۔ سمعیہ قریبی رشتے داری اور بے تکلفی کے باوجود ان بھائیوں کے سامنے کبھی بنا حجاب کے نہیں آئی تھیں تو وہ ان کی بھتیجی سے ایسی امید کیسے رکھ سکتا تھا اور یہ بھی اندازہ تھا کہ اگر اس کو یہاں اس کی موجودگی کی خبر ہو گئی تو سخت شرمندہ اور ہراساں ہو سکتی ہے چنانچہ تہذیب کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر سے نظریں ہٹائیں اور آہستہ قدموں سے واش روم کی طرف بڑھ گیا۔

وہاں سے جلد از جلد فارغ ہو کر وہ سب کے درمیان واپس آیا تو پروفیسر عبدالجبار واپس آچکے تھے۔ ان سے تعارف وغیرہ کا مرحلہ طے ہونے کے بعد وہ سب آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ پروفیسر صاحب کے بارے میں عثمان نے اسے بتایا کہ وہ یہاں کس قسم کی کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ وہ انہیں ممتاز مذہبی اسکالر کی حیثیت سے پہلے سے ہی جانتا تھا لیکن ان کے کام سے بہت زیادہ واقفیت نہیں تھی۔ عثمان نے اسے بتایا کہ وہ کتنی کتابیں لکھ چکے ہیں اور دنیا کے کتنے رسائل میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں تو وہ سخت متاثر ہوا۔ حقیقتاً اتنے بڑے آدمی کے سامنے اسے اپنا آپ کچھ کم تر لگ رہا تھا۔ اسے انہیں یہ بتاتے ہوئے بھی ہچکچاہٹ ہو رہی تھی کہ وہ یہاں کس سلسلے میں آیا ہوا ہے۔ حقیقتاً وہ دونوں دو بالکل مختلف دنیاؤں کے افراد تھے اور اس کا تجربہ تھا کہ مذہبی رجحان رکھنے والے لوگ اس کی فیلڈ سے تعلق رکھنے والوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ تھا کہ پروفیسر صاحب بھی اسی قسم کے تاثرات دیں گے لیکن اس کے اندازے کے برخلاف انہوں نے ایسے کسی رویے کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ اس سے بہت خلیقانہ انداز میں بات چیت کرتے رہے اور دورانِ گفتگو یہاں تک اعتراف کیا کہ وہ ان کے لیے اجنبی نہیں ہے۔ وہ اخبارات اور ٹیلی وژن وغیرہ پر اس کی تصویریں دیکھ چکے ہیں۔ ان کے شفقت بھرے انداز نے اس کی جھجک دور کر دی اور وہ کھل کر گفتگو میں حصہ لینے لگا۔

کچھ دیر میں ہی کھانا لگنے کی اطلاع کے ساتھ ان لوگوں کو ڈرائنگ روم میں بلا لیا گیا۔ ٹیبل پر لگے کھانے دیکھ کر شایان کی آنکھیں کھل گئیں۔

"ارے یہ کیا؟ میں تو پاستا اور پیزا جیسی چیزوں کی امید لے کر آیا تھا لیکن یہاں تو ماشاء اللہ زبردست انتظام ہے۔ عثمان بھائی آپ کہہ رہے تھے کہ بھابی کو رات سے خاصا تیز بخار چڑھا ہوا تھا تو پھر یہ سب انہوں نے کیسے کیا؟ میں تو سخت شرمندہ ہو رہا ہوں بھابی کہ آپ نے بیماری کی حالت میں میرے لیے اتنی زحمت اٹھائی۔"

"تمہیں شرمندہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں نے اس کھانے کی تیاری میں کوئی زحمت کی ہی نہیں۔ یہ تو میری پیاری بھتیجی کے ہاتھوں کا کمال ہے۔ اگر وہ یہاں نہ ہوتی تو آج لازماً تمہیں ملیحہ کے ہاتھوں کا پاستا اور پیزا ہی کھا کر گزارہ کرنا پڑتا۔" سمعیہ کی فراہم کردہ اطلاع پر فوراً ہی بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے سوتی ہوئی موتیے جیسی لڑکی چھم سے اس کی آنکھوں کے سامنے آگئی اور وہ آہستہ سے بولا۔

"آپ میری طرف سے ان کا خصوصی شکریہ ادا کر دیجیے گا۔ خود مہمان ہو کر انہوں نے اتنی زحمت اٹھائی، اس پر مجھے بڑی شرمندگی ہو رہی ہے۔"

"میں نے اور عثمان نے تو بہت روکا تھا لیکن اصل میں وہ ہمارے لیے بالکل بیٹی جیسی ہے تو ہم سے اس کا کوئی تکلف نہیں ہے۔ وہ یہاں بھی اپنے گھر کی طرح ہی رہتی ہے۔" سمعیہ نے وضاحت دی تو پروفیسر صاحب نے بھی ان کی تائید کی اور بولے۔

"سمعیہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ روحانہ کی ماں کا کردار تو اصل میں سمعیہ نے ادا کیا ہے اور اسی وجہ سے وہ بھی ان کے ساتھ گہری وابستگی رکھتی ہے۔"

"ارے بھئی سمعیہ ہے کہاں؟ بہت دیر گزر گئی نظر نہیں آئی۔" عثمان کو خیال آیا تو انہوں نے بالکل اچانک پوچھ لیا۔

"ملیحہ کے کمرے میں نماز پڑھ رہی ہے۔ آپ کو اس کی عادت معلوم ہے نا کہ نماز کا وقت ہو جانے پر سب سے پہلے نماز کی ادائیگی کی کوشش کرتی ہے۔" جواب سمعیہ نے دیا۔ کھانا لگانے کے دوران انہیں روحانہ کی غیر موجودگی کا احساس ہوا تھا اس لیے کھانا لگاتے ہی انہوں نے سب سے پہلے اسے تلاش کیا تھا اور وہ انہیں ملیحہ کے کمرے میں نماز پڑھتے ہوئے نظر آگئی تھی۔ اصل میں جب شایان کمرے سے باہر جا رہا تھا تو دروازہ بند کیے جانے کی آواز پر اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اسے گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ کمرے سے نکل کر جانے والا شایان ہوگا۔ وہ تو یہی سمجھی تھی کہ ملیحہ ہوگی چنانچہ وقت ہو جانے کے باعث آرام سے عشا کی نماز کی

ادائیگی کے لیے کھڑی ہوگئی تھی۔
کھانا نہایت خوش گوار ماحول میں کھایا گیا۔ شایان نے ہر ڈش کی بے حد تعریف کی۔ عثمان اور بچے بھی برابری سے اس کی تائید کرتے رہے۔ سمعیہ اور پروفیسر عبدالجبار ان تعریفوں کو سن کر مدبرانہ انداز میں مسکراتے رہے۔ روحانہ ان دونوں ہی کو بہت پیاری تھی اس لیے اس کی تعریف دونوں کو ہی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ کھانے سے فارغ ہوکر وہ لوگ دوبارہ لاؤنج میں آکر بیٹھے تو کچھ ہی دیر میں خوشبودار قہوے کی ٹرے بھی وہاں پہنچ گئی۔ یہ قہوہ بھی روحانہ نے نماز سے فارغ ہوکر تیار کیا تھا۔
''میں نے ناک تک سیر ہوکر کھایا تھا لیکن یہ قہوہ اتنا خوشبودار اور خوش ذائقہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس کے لیے بھی گنجائش نکال ہی لی۔'' بے ساختگی سے تعریف کرتے ہوئے شایان کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کسی کا سیروں خون بڑھا رہا ہے۔ حقیقتاً وہ ایک نہایت شاندار ڈنر اور عمدہ محفل سے فارغ ہوکر جب وہاں سے رخصت ہو رہا تھا تو اسے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ لڑکی جس پر اسے موتیا کے پھول کا گمان ہوا تھا، نظر کے راستے اس کے دل میں اتری ہے یا معدے سے دل تک کا سفر طے کیا ہے۔
☆☆☆
عثمان کے گھر سے واپس آنے کے بعد بھی روحانہ اس کے ذہن سے محو نہیں ہوئی تھی۔ دبئی کی زندگی بہت ہنگامہ خیز تھی اور وہ تو تھا ہی شوبز کی دنیا کا فرد۔ اس کی زندگی میں تو سارا وقت ہی اچھی خاصی مصروفیت رہتی تھی۔ اس کے باوجود اسے دن میں کئی بار روحانہ کا خیال آجاتا تھا۔ موتیا رنگ کے لباس میں کسی بھی قسم کے میک اپ سے پاک دھلا دھلایا بالکل صاف چہرہ اور چہرے پر سایہ فگن بالوں کی سیاہ چمکیلی لٹیں، یہ وہ منظر تھا جو اس کے ذہن کے پردے پر چپک کر رہ گیا تھا۔ اسے تسلیم تھا کہ روحانہ کوئی غیر معمولی خوب صورت لڑکی نہیں تھی لیکن اس کی سادگی میں جو کشش تھی وہ اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ پروفیسر عبدالجبار کی باپردہ و باکردار بیٹی تھی اور اس کے چہرے کی معصومیت سے اس کا کردار جھلکتا تھا۔ اپنی فیلڈ کی وجہ سے اس کا ایک سے بڑھ کر ایک خواتین سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ پڑھی لکھی، ماڈرن، حسین، طرح دار، ذہین و فطین ہر طرح کی لڑکی اس نے دیکھ رکھی تھی لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کے دل کو ایسے نہیں چھو سکی تھی جیسے روحانہ عبدالجبار ایک نظر میں بھا گئی تھی۔ وہ خود اپنی شخصیت کی مقبولیت اور سحر انگیزی سے بھی واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اپنے لیے کسی بہت حسین، تعلیم یافتہ اور دولت مند لڑکی کا بھی انتخاب کرسکتا ہے۔ سیٹھ موسیٰ کی بیٹی کے لیے تو اس کے کئی دوستوں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ ہاں کردے۔ وہ لڑکی اس پر فریفتہ تھی اور اس کے دوستوں کا خیال تھا کہ اس سے شادی کرکے اس کا مستقبل بن جائے گا لیکن اس نے کبھی بہت سنجیدگی سے اس بارے میں نہیں سوچا تھا اور روحانہ کو ایک نظر دیکھ کر ہی دل میں اسے اپنانے کی خواہش پیدا ہونے لگی تھی۔ شاید وہ وہی روایتی مرد تھا جسے اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے لیے اَن چھوئی اور ایسی معصوم لڑکی کی تلاش ہوتی ہے جس کے دل و دماغ پر کسی غیر مرد کی پرچھائیں نہ پڑی ہو۔ روحانہ عبدالجبار کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ ایسی ہی لڑکی ہے لیکن بہرحال یہ اسے پسند کرنے کے لیے واحد وجہ نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے اپنے خاندان میں بھی کئی ایسی لڑکیاں موجود ہیں جو سختی سے شرعی پردہ کرتی ہیں اور خاندان کے محرم مردوں کے علاوہ کبھی کسی نے ان کی ایک جھلک تک نہیں دیکھی۔ اپنی شادی کا موضوع نکلنے پر اس کا ذہن کبھی ان لڑکیوں میں سے بھی کسی کی طرف نہیں گیا تھا چنانچہ سب سے بڑی حقیقت یہ تھی کہ روحانہ عبدالجبار کی دید کے ایک پل نے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا اور وہ اس کا اسیر بنا اسے ہی سوچے جاتا تھا۔ اپنی اس کیفیت کی وجہ سے اس کا دل چاہا کہ وہ دوبارہ عثمان بھائی کے گھر جائے اور اسے دیکھے لیکن ایک تو اس کا شیڈول بہت ٹف تھا اس لیے وہاں جانے کا وقت نکالنا مشکل ہو رہا تھا۔ دوسرے اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اس کے سامنے نہیں آئے گی اور جو اتفاق ایک بار ہوگیا تھا، وہ بار بار نہیں ہوسکتا تھا۔ پھر بھی پاکستان واپس جانے سے پہلے جیسے ہی اسے موقع ملا وہ الوداعی ملاقات کے بہانے اچانک وہاں پہنچ گیا۔ حسب سابق وہاں اس کا پُرجوش استقبال ہوا۔ خصوصاً ملیحہ اور بلال تو اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ سمعیہ نے بھی خوب خاطر مدارت کی۔ وہ شام کی چائے کے وقت وہاں پہنچا تھا اس لیے چائے کے ساتھ بے شمار لوازمات اس کے سامنے رکھے گئے۔
''یہ شامی کباب لو شایان! روحانہ نے بنائے ہیں۔'' سمعیہ نے اچھے میزبان کی طرح اس کی طرف ایک ایک چیز بڑھاتے ہوئے شامی کبابوں کی پلیٹ آگے کی تو اس نے جھٹ ایک کباب اپنی پلیٹ میں نکال لیا۔
''بہت مزے کا ہے۔ آج کل تو آپ لوگ خوب عیش

کر رہے ہیں۔ مہمان کی خاطریں کریں، اس کے بجائے بے چاری مہمان خود مزے مزے کے کھانے بنا کر آپ لوگوں کو کھلا رہی ہیں۔'' کباب کا چھوٹا سا ٹکڑا کانٹے سے توڑ کر منہ میں رکھنے کے ساتھ اس نے تبصرہ کیا جس پر سمعیہ اور عثمان ہنس پڑے لیکن ملیحہ نے منہ بناتے ہوئے اداس لہجے میں اطلاع فراہم کی۔

''ہم عیش کر نہیں رہے بلکہ کر رہے تھے۔ روحانہ آپی تو دو دن ہوئے ماموں جان کے ساتھ پاکستان واپس چلی گئیں۔ ہاں جاتے جاتے بلال کی فرمائش پر انہوں نے ڈھیر سارے شامی کباب بنا کر فریز کر دیے تھے۔'' اس کے بعد اس کا وہاں زیادہ دیر دل نہیں لگا۔ سمعیہ اسے رات کے کھانے تک روکنا چاہتی تھیں لیکن اس کے اصرار پر بھی وہ معروفیت کا بہانہ بنا گیا۔

''شایان! اگر تمہیں پرابلم نہ ہو تو اپنے ساتھ کچھ چیزیں لے جاؤ گے۔ اصل میں، میں نے بھابی اور روحانہ کے لیے کچھ چیزیں بننے کے لیے دی ہوئی تھیں لیکن وقت پر ڈلیوری نہ ملنے کی وجہ سے بھائی جان...... کے ساتھ نہیں بھجوا سکی۔'' سمعیہ نے اس کی روانگی سے قبل اس سے درخواست کی تو اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ ملاقات کی ایک امید بندھ گئی تھی، یہ بھی بہت تھا۔

''کیوں نہیں بھابی۔ ضرور لے جاؤں گا۔ آپ مجھے وہاں ان لوگوں کا ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ دے دیں۔ میں آپ کی امانت پہنچادوں گا۔'' اس نے نہایت خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا تو سمعیہ خوش ہوگئیں اور ایک پیکٹ لا کر اس کے حوالے کر دیا۔

پیکٹ زیادہ بھاری نہیں تھا اور وہ آرام سے اپنے سامان کے ساتھ پاکستان لے جا سکتا تھا۔

☆☆☆

پاکستان وہی تھا جہاں وہ ہمیشہ سے رہتی آئی تھی لیکن وہ خود وہ نہیں رہی تھی جو اپنے دبئی کے دورے سے پہلے ہوا کرتی تھی۔ دل کے بدلے موسم نے سب بدل کر رکھ دیا تھا۔ گھر میں تو خیر اس کی اس تبدیلی کو محسوس کرنے والا کوئی نہیں تھا کہ عادلہ سے اس کے تعلقات ہمیشہ محدود رہے تھے۔ وہ افراد خانہ کی طرح ایک ساتھ کھاتے پیتے اور ایک دوسرے کی ضرورتوں کا خیال ضرور رکھتے تھے لیکن بہت زیادہ بے تکلفی وغیرہ نہیں تھی جو وہ اس کے بارے میں کوئی اندازہ لگا سکتیں ابا اور اس کی ملاقات بھی کم کم ہی ہوتی کہ دونوں کی اپنی اپنی معروفیات تھیں۔ عمومی روٹین میں ابا سے رات کے کھانے پر ملاقات ہو جاتی تھی لیکن اگر انہیں کسی دعوت میں جانا ہو یا ٹیلی ویژن کے کسی پروگرام میں شرکت کرنی ہو تو یہ ملاقات بھی رہ جاتی تھی۔ دبئی سے آنے کے بعد ان کی مسلسل اس طرح کی معروفیات چل رہی تھیں اور وہ ایک آدھ بار ہی رات کے کھانے پر گھر میں موجود رہے تھے اس لیے اس کے اندر آنے والی کسی تبدیلی کو محسوس نہیں کر سکتے تھے البتہ دوستوں نے کئی بار ٹوکا تھا کہ وہ بہت چپ چپ رہنے لگی ہے اور بعض اوقات تو گفتگو کرتے کرتے ہی اچانک کہیں گم ہو جاتی ہے۔ وہ مختلف بہانے بنا کر انہیں ٹال دیتی تھی لیکن خود اپنے آپ سے فرار ہو کر کہاں جاتی۔

اس حقیقت کو تسلیم کرنا کہ کوئی اس کے دل و دماغ پر ایسے چھا گیا ہے کہ وہ اس کے سوا کچھ سوچ ہی نہیں پاتی، اس کے لیے ایک مشکل امر تھا۔ وہ اپنے آپ سے ہی الجھتی رہتی تھی اور خود کو باور کرواتی رہتی تھی کہ اسے شایان صدیقی کو ہرگز بھی اپنے دل و دماغ میں جگہ نہیں دینی ہے کہ اس شخص کے اس کی زندگی میں جگہ حاصل کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے لیکن دل و دماغ پر ان نصیحتوں کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہاں تو گویا چپے چپے پر شایان صدیقی کی حکمرانی تھی۔ اسے دبئی میں پھپھو کے گھر اس کے لیے اس کا من پسند کھانا تیار کرنا یاد تھا۔ کیسی راحت مل رہی تھی اسے شایان کے لیے وہ سب کرتے ہوئے۔ اسے یاد تھا کہ اتنی لگن سے اس نے صرف ایک بار ابا کے لیے کھانا بنایا تھا۔ ان دنوں وہ ایف اے کر کے فارغ تھی اور ابا پورے چار مہینے بعد مصر میں اپنے تحقیقی دورے کو مکمل کر کے واپس آئے تھے۔ اس روز اس نے بہت دل لگا کر ابا کے لیے ان کے سارے پسندیدہ کھانے ایک ہی وقت میں تیار کر دیے تھے۔ ابا نے اس کے محنت سے تیار کردہ کھانوں کو بہت شوق سے کھایا تھا اور اسے اس کی کارکردگی پر انعام بھی دیا تھا لیکن اگلے دن اپنی اسٹڈی میں بلا کر اسے یہ بات سمجھا دی تھی کہ آئندہ وقت اور وسائل کا اس طرح اسراف نہ کرے کہ فضول خرچی کرنا اللہ کے نزدیک ایک ناپسندیدہ فعل ہے۔ اس نے ابا کی اس نصیحت کو ہمیشہ یاد رکھا تھا لیکن شایان کی دعوت کے موقع پر سب بھول گئی تھی۔ ابا نے اس دعوت کے لیے اسے کوئی سرزنش نہیں کی تھی۔ شاید وہ اس روز کے مینیو کو پھپھو کا مرتب کیا ہوا سوچ کر خاموش رہے تھے لیکن وہ دل ہی دل میں شرمندگی محسوس کر رہی تھی کہ کیسے اس نے ایک غیر شخص کے لیے ابا کی نصیحت کو فراموش کر دیا تھا۔ اسے اپنے آپ پر

غصہ بھی تھا اور اپنی بے بسی پر دکھ بھی۔ اپنی اس اندرونی کشمکش سے نڈھال اس روز وہ عصر کی نماز پڑھنے کھڑی ہوئی تو نماز کے بعد بہت دیر تک اللہ سے اپنے دل کے سکون کے لیے دعا مانگتی رہی۔

”میں بہت بے بس اور حقیر انسان ہوں میرے اللہ! میں آپ کی اس آزمائش پر پورا اترنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ آپ یا تو میرے دل و دماغ سے اس شخص کو اس طرح سے نکال دیجیے کہ مجھے بھولے سے بھی اس کا خیال نہ آئے یا پھر اسے ہمیشہ کے لیے میرا بنا دیجیے۔ میرے لیے اس اذیت کو سہنا کہ ایک نامحرم مسلسل میرے اعصاب پر حاوی ہے، بہت مشکل ہو گیا ہے۔ آپ یا تو اسے میرا محرم بنا دیجیے یا اس کا خیال ہمیشہ کے لیے میرے دل سے نکال دیجیے۔“

وہ روتے ہوئے مسلسل اسی قسم کی دعائیں کرتی رہی تھی۔ دعا مانگتے ہوئے اس کے دل میں مسلسل یہ خیال موجود تھا کہ وہ پروفیسر عبدالجبار کی بیٹی ہے اور پروفیسر عبدالجبار اپنی بیٹی کے لیے کسی گانے والے کو قبول نہیں کر سکتے اسی لیے وہ چاہنے کے باوجود صرف اسے پانے کی دعا نہیں کر پائی تھی اور ساتھ ساتھ یہ دعا کرتی رہی تھی کہ اگر وہ شخص اس کا نصیب نہیں ہے تو اللہ اس کا خیال بھی اس کے دل سے نکال دے۔ دعا سے فراغت کے بعد ابھی وہ جائے نماز لپیٹ ہی رہی تھی کہ ملازمہ دستک دے کر کمرے میں داخل ہوئی۔

”روحی بی بی۔ باہر کوئی شایان صدیقی صاحب آئے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں سمعیہ بی بی نے دبئی سے کچھ سامان بھجوایا ہے۔“ ملازمہ کی دی اطلاع نے اسے پل بھر کے لیے ساکت کر دیا۔ پتا نہیں کیوں وہ شخص اسے بار بار ڈسٹرب کرنے کے لیے سامنے آ جاتا تھا۔ اسکرین پر اسے دیکھ کر اس سے متاثر ہونے کے حادثے کو شاید وہ بھلا بھی دیتی لیکن وہ تو بار بار اس کی آزمائش بن کر اس کے سامنے آ جاتا تھا۔

”تم امی کو ان کی آمد کی اطلاع دو۔“ اس نے خود پر قابو پا کر ملازمہ کو ہدایت کی۔

”لیکن بڑی بی بی تو اپنی کسی جاننے والی کی عیادت کے لیے گئی ہوئی ہیں اور ابھی تک واپس نہیں آئیں۔“ ملازمہ نے اسے جواب دیا تو اسے یاد آیا کہ دوپہر کے کھانے پر عادلہ نے اسے اپنے پروگرام کے بارے میں بتایا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے، تم انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ میں آ رہی ہوں۔“ وہ گھر آیا مہمان تھا اور وہ بھی سمعیہ پھپھو کا خاص سسرالی رشتے دار۔ اسے دروازے سے واپس نہیں لوٹایا جا سکتا تھا اس لیے اسے ایک بار پھر خود کو امتحان سے گزرنے کے لیے راضی کرنا پڑا۔ ملازمہ باہر چلی گئی تو اس نے نماز کے لیے اوڑھی گئی بڑی سی چادر کے اوپر ہی حجاب لینے کے بعد ڈرائنگ روم کا رخ کیا۔ پروفیسر صاحب ہمیشہ گھر میں نہیں ہوتے تھے اور ان کی غیر موجودگی میں آنے والے مہمانوں کو وہ اور عادلہ عموماً اسی طرح نمٹایا کرتی تھیں کہ گھر کے باہر ہی سے آنے والوں کو ٹرخا دینا ناراضگیوں کا سبب بھی بن سکتا تھا۔ خصوصاً رشتے داری میں ان نزاکتوں کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔

”السلام علیکم۔“ اس نے جیسے ہی ڈرائنگ روم میں قدم رکھا صوفے پر براجمان شایان کھڑا ہو گیا اور سلام میں پہل کی۔ ڈارک براؤن ڈیزائنر شلوار قمیص میں اس کا دراز قد نمایاں تھا اور یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں تھی کہ اس پر یہ رنگ بہت جچ رہا تھا۔ وہ تو ان لوگوں میں سے تھا جن پر ہر رنگ جچتا ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ جس کی وجہ سے رنگ مزید نکھر جاتے ہیں۔

”وعلیکم السلام۔ پلیز تشریف رکھیے۔“ اس نے بہ مشکل اپنی آواز کی لرزش پر قابو پا کر اسے کہا اور خود بھی نشست سنبھال لی۔

”سمعیہ بھابی نے آپ لوگوں کے لیے کچھ تحائف بھجوائے تھے۔ میں صبح ہی واپس پہنچا ہوں۔ سوچا کہ آپ کی امانت جلد از جلد آپ تک پہنچا دوں۔“ اس نے سمعیہ کا دیا ہوا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔

”شکریہ۔ آپ کو زحمت اٹھانی پڑی۔“ اسے اپنی نظروں کو جھکائے رکھنے کے لیے خاصی جدوجہد کرنی پڑ رہی تھی پھر بھی کسی نہ کسی طرح آدابِ میزبانی نبھا رہی تھی۔

”زحمت کی کوئی بات نہیں۔ عثمان بھائی ہمارے لیے سگے بھائیوں کی طرح ہیں اور ان کی مسز کا یہ معمولی سا کام کرنے میں میرے لیے کوئی زحمت نہیں تھی۔“ اس کی خوب صورت آواز روحانہ کے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر رہی تھی چنانچہ اس بار وہ جواب میں کچھ نہیں بول سکی۔

”میں شام کے وقت اس لیے آیا تھا کہ پروفیسر صاحب گھر پر موجود ہوں گے لیکن شاید وہ نہیں ہیں۔“ وہ جو سارے راستے یہ دعا مانگتا آیا تھا کہ کسی طرح روحانہ سے ملاقات ہو جائے، گفتگو کے سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے بولا۔

”ابا بہت مصروف رہتے ہیں۔ ان کا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کب گھر پر ہوں اور کب نہیں۔“ روحانہ نے اس کی بات کا

جواب دیا۔ اس نے کوشش کر کے اپنا لہجہ سپاٹ رکھا تھا۔

’’ٹھیک ہے پھر میں چلتا ہوں۔ پروفیسر صاحب تشریف لائیں تو انہیں میرا سلام دیجیے گا۔‘‘ روحانہ کی نپی تلی مختصر گفتگو نے اسے مجبور کیا کہ وہ وہاں سے روانگی کی بات کرے حالانکہ اس کا دل جانے کو بالکل بھی راضی نہیں تھا۔ اسے حجاب سے جھانکتی اس کی جھکی، نم پلکوں والی آنکھوں کو دیکھنا بھی بہت اچھا لگ رہا تھا۔

’’پلیز آپ بیٹھیں۔ چائے آرہی ہے۔‘‘ روحانہ نے فوراً اسے روکا۔ وہ یہاں آتے ہوئے ملازمہ سے چائے کا کہہ کر آئی تھی، یہ صحیح تھا لیکن ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ شایان کی موجودگی اگر ایک طرف اس کے اعصاب کے لیے بوجھ تھی تو دوسری طرف اس کا دل اسے سامنے پاکر خوش بھی تھا اور وہ لاشعوری طور پر اسے وہاں روکے رکھنے کی خواہش مند تھی۔ خود شایان بھی اپنے دل میں اسی طرح کی خواہش رکھتا تھا اس لیے اس کے ایک بار کہنے پر ہی رک گیا۔

’’اس روز عثمان بھائی کے گھر آپ سے ملاقات نہیں ہوسکی تھی اس لیے میں آپ کا شکریہ ادا نہیں کرسکا تھا۔ آپ نے نہایت عمدہ کھانا تیار کیا تھا۔ آپ کے بنائے کھانوں میں مجھے بالکل اپنی امی کے ہاتھ کا ذائقہ محسوس ہوا تھا۔‘‘ موقع ملا تو اس نے روحانہ سے اس کے بنائے کھانے کی تعریف کرڈالی۔ اس کی تعریف سن کر روحانہ کی آنکھیں چمکنے لگیں اور لگا کہ محنت کا صلہ مل گیا ہو۔ بتانے کو اس دن پھپھو نے بھی بتایا تھا کہ شایان کو اس کا بنایا ہوا کھانا بہت پسند آیا تھا اور اس وقت بھی اس نے خوشی محسوس کی تھی لیکن شایان کے روبرو بیٹھ کر اس کی زبان سے تعریف سننا کہیں زیادہ خوش گوار تجربہ تھا۔

’’شاید آپ تکلفاً ایسا کہہ رہے ہیں ورنہ میں ککنگ میں اتنی زیادہ ایکسپرٹ نہیں ہوں۔‘‘ دل خوش ہوجانے کے باوجود اس نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔

’’نہیں، میں تکلفاً ایسا نہیں کہہ رہا۔ آپ خواتین کی اس قسم میں سے ہیں جو معدے کے راستے دل میں اتر جانے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں۔‘‘ شایان نے بڑے خاص لہجے میں یہ جملے ادا کیے تھے، روحانہ پل بھر کے لیے ٹھٹک گئی۔ اس نے خود کو باور کرانا چاہا کہ شایان نے ایک عمومی بات کہی ہے اور اسے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ ملازمہ کی ٹرالی سمیت آمد نے اسے اپنے دل کی اتھل پتھل ہوتی کیفیت پر قابو پانے کے لیے مہلت مہیا کردی۔ یہ ملازمہ عموماً گھر کے اوپری کام انجام دیتی تھی اور کچن کی ذمے داری زیادہ تر وہ اور عادلہ ہی سنبھالتی

تھیں۔ اس وقت چائے کے ساتھ ٹرالی میں موجود آئٹمز میں سے بھی بیشتر اشیا ایسی تھیں جو وہ اور عادلہ اچانک آنے والے مہمانوں کی آمد کے پیشِ نظر وقتاً فوقتاً تیار کر کے فریج میں رکھتی رہتی تھیں۔ ملازمہ نے بھی لگتا تھا کہ فریز کیے ہوئے تمام ہی آئٹمز نکال کر شایان کی خدمت میں پیش کر دیے تھے۔ شاید وہ سمعیہ پھپھو کا سسرالی رشتے دار ہونے کی وجہ سے شایان کو خصوصی اہمیت دے رہی تھی۔

”آپ وہی ہیں نا جو ٹی وی پر گانے گاتے ہیں۔ میں نے پہلی نظر میں ہی آپ کو پہچان لیا تھا لیکن پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔“ ٹرالی رکھ کر فوری طور پر واپس جانے کے بجائے ملازمہ نے شایان سے پوچھا تو روحانہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ اسے سمجھ آ گئی تھی کہ یہ اتنی مدارت سمعیہ پھپھو کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ محترمہ ایک مشہور گلوکار کو گھر میں دیکھ کر خوشی سے دیوانی ہو رہی ہیں۔ بس بات یہ تھی کہ وہ پروفیسر عبدالجبار کے گھر کی ملازمہ تھی اس لیے شایان کی یہاں آمد پر کچھ حیران اور کچھ پریشان فوری ردعمل نہیں دے سکی تھی۔ اب بھی وہ روحانہ کی وجہ سے ہی قابو میں تھی اور اپنے اندرونی جوش کو قابو میں رکھ کر بات کر رہی تھی۔ شایان نے اس کے سوال کے جواب میں محض اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

”اللہ...... میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی یوں آپ سے ملنا ہو جائے گا۔ آپ مجھے آٹوگراف تو دے دیں۔“ شایان کے تصدیق کرتے ہی اس نے فوراً فرمائش کر ڈالی۔

”اوکے۔ لائیں کہاں ہے آپ کی آٹوگراف بک۔“ شایان کو اپنے اور روحانہ کے درمیان اس کی موجودگی ناگوار گزر رہی تھی پھر بھی وہ اس سے اخلاق سے بات کر رہا تھا۔

”اللہ...... وہ تو نہیں ہے میرے پاس۔ بھلا مجھے کیا معلوم تھا کہ آج مجھے آپ ملنے والے ہیں۔“ اس نے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے اپنی پریشانی کا اظہار کیا لیکن پھر فوراً ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور اس نے دوپٹے کا پلو کھینچ کر شایان کے سامنے میز پر پھیلا لیا۔ وہ ملازمہ کی اس اچانک حرکت پر گڑبڑا گیا۔ فنکشنز اور کنسرٹس میں اس کے فینز دوپٹے کے پلوؤں پر تو کیا اپنی ٹی شرٹس اور ہتھیلیوں تک پر آٹوگراف لے لیا کرتے تھے اور اس ہنگامہ خیز ماحول میں اسے جلدی جلدی انہیں نمٹاتے کچھ بھی عجیب نہیں لگتا تھا لیکن یہاں پروفیسر عبدالجبار کے ڈرائنگ روم میں روحانہ کے مقابل بیٹھ کر اسے کسی لڑکی کے آنچل پر اپنا آٹوگراف دینا بہت عجیب لگا۔

”یہ کیا حرکت ہے نغمہ! جاؤ اندر جا کر اپنے کام نمٹاؤ۔“ روحانہ کو جانے شایان کے تذبذب نے اس ردعمل پر مجبور کیا تھا یا ویسے ہی ملازمہ کی حرکت مزاج پر گراں گزری تھی کہ سخت لہجے میں ملازمہ کو حکم دیا۔ وہ اس حکم پر بادلِ ناخواستہ اپنا پلو سمیٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

”آپ لیجیے شایان صاحب!“ روحانہ نے کوشش کر کے اپنا لہجہ ہموار کیا اور آدابِ میزبانی نبھانے لگی۔ لاشعوری طور پر اس نے اپنے تیار کردہ قیمے کے سموسے سب سے پہلے شایان کی طرف بڑھائے تھے۔ شایان نے شکریہ کہہ کر ایک سموسہ اپنی پلیٹ میں ڈال لیا۔

”ڈیلیشیس۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ آپ نے بنائے ہیں۔“ پہلا لقمہ لیتے ہی اس نے تعریف کی۔ روحانہ اس کے یقین پر ششدر رہ گئی۔

”اتنی حیران کیوں ہو رہی ہیں؟ میں نے آپ سے کہا ہے نا کہ آپ کے ہاتھ میں بالکل میری امی کے ہاتھ جیسا ذائقہ ہے اور میں اس ذائقے کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا۔“ اس نے روحانہ کی حیرت کو اس کی آنکھوں سے پڑھ لیا اور مزے سے بولا تو وہ مسکرا دی۔ اس کی یہ مسکراہٹ ہونٹوں سے آنکھوں تک بھی منتقل ہوئی تھی اس لیے شایان نے اس کا مسکرانا محسوس کر لیا اور بےساختہ ہی بولا۔

”ہنستی مسکراتی رہا کریں، رونے کے مقابلے میں ہنستے ہوئے آپ کی آنکھیں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔“ اس کے اس بےتکلفانہ تبصرے نے روحانہ کو ششدر کر دیا۔ ایک طرف وہ اس کی جسارت پر حیران تھی تو دوسری طرف یہ پریشانی تھی کہ وہ اس کے سامنے کب روئی ہے۔ جو وہ ایسے کمنٹس دے رہا ہے۔

”ابھی کچھ دیر پہلے جب آپ یہاں داخل ہوئی تھیں تو آپ کی آنکھوں کی سرخی اور پلکوں کی نمی بتا رہی تھی کہ آپ روتی رہی ہیں۔ مجھے آپ کے رونے کے خیال سے بہت تکلیف پہنچی تھی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ ہمیشہ خوش اور مسکراتی رہیں۔“ وہ کیا کہہ رہا تھا روحانہ ڈھنگ سے سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ نہ ہی اسے یہ ہوش تھا کہ کس قسم کے ردعمل کا مظاہرہ کرے۔ اس کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر کوئی شخص اس سے ایسی بےتکلفی کا مظاہرہ کر سکتا ہے اور اس کے بارے میں اتنے درست قیافے لگا سکتا ہے وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

”سوری۔ میں شاید ضرورت سے زیادہ بول گیا ہوں

لیکن میرا خیال ہے کہ جب میں اتنا کچھ بول ہی چکا ہوں تو وہ بات بھی کہہ دوں جو مجھے آج نہیں تو کل آپ سے کہنی ہی ہے۔'' روحانہ کی آنکھوں کے تاثرات نے یکدم ہی اس سے وہ فیصلہ کروالیا جس کے بارے میں وہ دبئی میں اسے دیکھنے کے بعد مسلسل سوچتا رہا تھا۔

''میں آپ کو اپنی زندگی کا ہم سفر بنانا چاہتا ہوں روحانہ۔ میں جیسی شریک حیات کا تصور اپنے دل و دماغ میں رکھتا تھا آپ اس پر پوری اترتی ہیں اور اگر میں نے آپ کو پالیا تو میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔'' روحانہ پر تو حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شایان صدیقی اس کے مقابل بیٹھ کر اتنی آسانی سے اور اتنی جلدی یہ بات کہہ دے گا۔

''مجھے اندازہ ہے کہ اپنی اس خواہش کی تکمیل میں مجھے خاصی دشواری پیش آسکتی ہے۔ پروفیسر صاحب کے لیے شاید ایک گلوکار داماد قابلِ قبول نہ ہو لیکن میں ان کی عدالت میں اپنا مقدمہ پیش کرنے سے قبل آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔ آپ کے جواب کے بعد ہی میں اپنے قدموں کو آگے بڑھانے یا پیچھے ہٹنے کا فیصلہ کرسکوں گا۔'' وہ اس سے کہہ رہا تھا لیکن وہ کوئی رائے دینا تو دور کی بات منہ سے آواز نکالنے کے قابل بھی نہیں رہ گئی تھی۔

''مجھے جواب کی اتنی جلدی نہیں ہے۔ آپ اطمینان سے اچھی طرح سوچ لیں پھر میں فون کرکے آپ سے آپ کی رائے معلوم کرلوں گا۔'' شایان کو بھی اندازہ تھا کہ اس کے اچانک پروپوزل پر روحانہ کو ذہنی جھٹکا لگا ہے اور وہ فی الفور کوئی فیصلہ سنانے کے لائق نہیں ہے اس لیے اسے سوچنے کی مہلت دے دی تھی۔

''اچھا، اب اجازت دیجیے۔ اللہ حافظ۔'' اس نے جیسے اچانک اتنی بڑی بات کہی تھی، ویسے ہی بالکل اچانک جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ روحانہ آدابِ میزبانی نبھانے کے لیے بھی اپنی جگہ سے کھڑی نہ ہوسکی۔ اسے اپنی ٹانگیں سن ہوتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔ وہ وہاں سے چلا گیا تب بھی وہ بہت دیر تک یونہی گم صم سی بیٹھی رہی۔ ایسی انہونی کا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

''شانی بیٹا! ذرا ادھر میرے کمرے میں آکر میری بات سنو۔ مجھے تم سے بہت اہم بات کرنی ہے۔'' وہ رعنا کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھا اسے اپنے دبئی کے ٹور کی تفصیلات سے آگاہ کررہا تھا کہ امی نے اسے آواز دے کر بلایا۔

''جی اچھا امی آرہا ہوں۔'' اس نے انہیں جواب دیا اور فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ حالانکہ ابھی اسے رعنا سے بہت سی باتیں شیئر کرنا تھیں۔ وہ اسے روحانہ کے بارے میں بتانا چاہتا تھا لیکن براہِ راست بتانے کے بجائے تمہید کا سہارا لیے ہوئے تھا۔ چنانچہ شاپنگ مال میں عثمان بھائی کی فیملی سے اتفاقاً ہونے والی ملاقات سے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ آگے چل کر اسے ان کے گھر پر ہونے والی دعوت کا ذکر کرنا تھا۔ دعوت کا ذکر ہوتا تو روحانہ کا ذکر چھیڑنے کا موقع خودبخود ہی مل جاتا لیکن گفتگو کے اس موڑ پر آنے سے قبل ہی امی نے اسے آواز دے لی تھی۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ کوئی بہت ہی خاص بات ہے اس لیے اس نے اٹھنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی تھی۔ ویسے بھی وہ سب بہن بھائی امی کے بہت فرمانبردار تھے۔ ابو کی زندگی میں تو پھر بھی کبھی کبھار وہ انہیں جل دے جاتے تھے لیکن ابو کے بعد بطورِ خاص اس بات کا خیال رکھتے کہ ان کے کسی عمل سے امی کو یہ احساس نہ ہو کہ باپ کا سایہ سر پر نہ ہونے سے اولاد نافرمان ہوگئی ہے اور وہ بطور ایک عورت جوان اولاد کے سامنے بے بس ہیں۔ ان لوگوں نے ابو کے بعد امی کو گھر کا حقیقی حکمران ہونے کا احساس دیا تھا اور کسی بھی معاملے میں ان کی رائے حتمی بھی جاتی تھی۔

''خیریت امی! کوئی پریشانی ہے کیا؟'' وہ امی کے کمرے میں پہنچا تو انہیں ایک فائل کھولے دیکھا۔ وہ جس سنجیدگی سے اس فائل کا جائزہ لے رہی تھیں، اسے دیکھ کر اسے تشویش ہوئی کہ معلوم نہیں امی کس مسئلے میں الجھی ہوئی ہیں۔

''نہیں بیٹا! پریشانی تو کوئی نہیں ہے بس میں اپنے ایک فیصلے میں تمہاری رضامندی شامل کرنا چاہ رہی تھی۔'' امی نے فائل بند کرکے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو اس کے کان کھڑے ہوگئے۔ کچھ عرصے سے گھر میں اس کی شادی کا تذکرہ ہونے لگا تھا اور امی کا جملہ سن کر وہ ٹھٹک گیا تھا کہ آخر ایسی کونسی بات ہے جس کے لیے اس کی رضامندی ضروری ہے۔ اگر امی اس کے لیے کوئی لڑکی پسند کر بیٹھی تھیں تو یہ بہت بڑی گڑبڑ تھی۔ اس کے لیے ایک طرف امی کے فیصلے سے انکار کرنا مشکل ہوجاتا تو دوسری طرف روحانہ کے سامنے کیے گئے اظہار کا بھی مسئلہ تھا۔ وہ دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ امی جو بھی کہیں لیکن کم از کم اس کی شادی کی بات نہ کریں۔

''کیا بات ہے بیٹا، تم اتنے پریشان کیوں ہوگئے۔ تمہارے خیال میں کیا میں تم سے کوئی بہت خوفناک بات

کرنے والی ہوں؟'' انہوں نے اس کے تاثرات سے اس کی پریشانی کا اندازہ لگالیا۔

''نہیں امی، میں تو بس اس خیال سے پریشان ہوگیا تھا کہ کہیں آپ کو تو کوئی پریشانی نہیں ہے۔'' اس نے جلدی سے بات بنائی۔

''اللہ کا شکر ہے بیٹا کہ مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ جس عورت کی اولاد فرمانبردار ہو اس سے بڑھ کر کون سکھی اور مطمئن ہوسکتا ہے۔ اپنی اولاد کی فرمانبرداری کے بھروسے پر ہی میں نے اپنے طور پر کچھ فیصلے کیے ہیں۔ امید ہے کہ تمہیں اختلاف نہیں ہوگا اگر ہو تو تم اظہار کرسکتے ہو۔'' امی تو گویا پہیلیاں بجھوا رہی تھیں۔

''اللہ نے چاہا تو میں آپ کے اعتماد پر پورا اتروں گا۔'' اس نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ امی کو جواب دیا۔ ساتھ ہی دل میں یہ دعا بھی جاری رکھی کہ وہ اس کی شادی کے معاملے پر کوئی فیصلہ کرکے نہ بیٹھی ہوں۔

''یہ میرا وصیت نامہ ہے۔ پہلے تم اسے پڑھ لو پھر میں تم سے بات کرتی ہوں۔'' امی نے اپنے ہاتھ میں موجود فائل اس کی طرف بڑھائی تو اس نے کچھ تعجب کے ساتھ فائل تھام لی اور خاموشی سے اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ اس فائل میں گھر کے کاغذات کے علاوہ بینک اکاؤنٹ سے متعلق کچھ ڈاکیومینٹس تھے اور ساتھ ہی امی کا وصیت نامہ تھا۔ اس وصیت نامے کی رو سے انہوں نے یہ گھر ریحان بھائی اور کاشان کے نام کردیا تھا جبکہ امی کا کل زیور اور بینک میں موجود رقم کا بیشتر حصہ رعنا کے نام تھا...... بس کچھ رقم کاشان کے نام کی گئی تھی۔ اسے اس وصیت نامے کو پڑھ کر کچھ عجیب سا لگا۔ یہ گھر ابو چھوڑ کر گئے تھے۔ اسی طرح بینک میں موجود رقم بھی ابو کی کی ہوئی بچت کے علاوہ ان کے ادارے سے ملنے والے فنڈز اور واجبات پر مشتمل تھی جو ان کے بعد محکمے نے امی کے نام منتقل کردی تھی۔ ابو کی اس چھوٹی سی جائداد میں وارث ہوتے ہوئے بھی امی نے وصیت نامے میں اس کا کہیں ذکر نہیں کیا تھا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ یہ گھر جس میں وہ لوگ رہائش پذیر تھے، ابو اس حالت میں نہیں چھوڑ کر گئے تھے۔ ان کی وفات کے وقت صرف نیچے کا پورشن بنا ہوا تھا۔ بعد میں ریحان بھائی نے اپنی فیملی کی ضرورت کے تحت اوپر دو کمرے بنوائے تھے اور جب وہ کمانے لگا تھا تو اس نے اپنی آمدنی سے اوپر کے پورشن کو مکمل کروا کر اسے مکمل فرنشڈ کروایا تھا۔ اس کا اپنا کمرا بھی اوپری پورشن میں ہی تھا۔

''کچھ کہو گے نہیں؟'' امی نے اس کے فائل بند کرنے کے بعد بھی خاموش بیٹھے رہنے پر اس سے پوچھا۔

''نہیں امی! یہ آپ کا فیصلہ ہے۔ میں اس سے کیسے اختلاف کرسکتا ہوں۔'' اسے یکدم ہی یاد آگیا تھا کہ ابھی کچھ دیر قبل وہ دعا کررہا تھا کہ امی نے اس کی شادی کے علاوہ جو بھی فیصلہ کیا ہو، اسے منظور ہوگا۔ اس کی دعا قبول ہوگئی تھی تو اسے چاہیے تھا کہ اپنا دل کشادہ رکھے چنانچہ اس نے یہی کیا اور چہرے پر بشاشت لے آیا۔

''جیتے رہو اور سدا سکھ پاؤ۔'' امی اس کا جواب سن کر خوش ہوگئیں پھر اسے وضاحت دیتے ہوئے بولیں۔

''میں نے یہ وصیت نامہ تیار کرتے ہوئے اس میں تمہارا ذکر اس لیے نہیں کیا ہے کہ ماشاء اللہ تم اتنا اچھا کما کھا رہے ہو کہ تمہیں اس معمولی سی جائداد میں حصے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یوں تو ریحان کی بھی اچھی جاب ہے لیکن بہرحال وہ لگا بندھا ہی کماتا ہے اور اس میں سے بھی زیادہ تر حصہ گھر کے اخراجات میں ہی خرچ ہوجاتا ہے۔ تھوڑی بہت جو بچت اس نے کی تھی، وہ اوپر کا پورشن بنوانے میں لگا چکا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ وہ کم از کم اس فکر سے آزاد رہے کہ اسے اپنی فیملی کے لیے گھر بنانا ہے۔ کاشان بھی ابھی پڑھ رہا ہے اور اسے بھی سپورٹ کی ضرورت ہے۔ میں نے اس کے لیے تھوڑی سی رقم اسی لیے رکھی ہے کہ وہ اس سے اپنی تعلیم مکمل کرلے۔ اللہ نے چاہا تو اسے بھی اچھی جاب مل جائے گی لیکن ظاہر ہے کہ وہ تمہاری طرح بے حساب تو نہیں کما سکتا کہ آسانی سے گھر بنالے اسی لیے میں نے یہ گھر اس کے اور ریحان کے نام کردیا ہے۔ رقم اور زیور میں نے رعنا کے نام اس لیے کردیے ہیں کہ اس کی شادی کے وقت کوئی پریشانی نہ ہو اور تم بھائیوں پر کوئی بار ڈالے بغیر میں اسے اس کے گھر کا کردوں۔''

''رعنا ہمیں بہت پیاری ہے امی۔ اس کی شادی پر کچھ خرچ کرتے ہوئے بھلا ہم خود کو زیر بار کیوں محسوس کریں گے۔ کم از کم میں تو بہت دل سے اس کی شادی پر خرچ کروں گا۔'' اس نے امی کی ساری وضاحت سنتے ہوئے پہلی بار دخل اندازی کی۔

''مجھے تمہاری محبت پر یقین ہے بیٹا لیکن یہ وقت بڑی ظالم شے ہے۔ شادی کے بعد خصوصاً حالات بہت مختلف ہوجاتے ہیں اور مرد ماں باپ اور بہن بھائیوں کو چھوڑ کر اپنے بیوی بچوں کی ضروریات اور خواہشات پوری کرنے میں مگن ہوجاتا ہے۔ میں تم لوگوں کو ایسی کسی آزمائش میں

نہیں ڈالنا چاہتی۔" انہوں نے تدبر سے اس کی بات کا جواب دیا تو وہ دل ہی دل میں قائل نہ ہونے کے باوجود خاموش ہوگیا۔

"مجھے احساس ہے بیٹا کہ تم خود کو کچھ نہ دیے جانے پر تھوڑا بہت تو برا محسوس کر ہی رہے ہوگے۔ خاص طور پر گھر میں بھائیوں کے ساتھ حصہ نہ ملنے پر لیکن میں نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے اور فیصلہ کرتے وقت تمہاری مالی حالت اور پروفیشن دونوں کو مدنظر رکھا ہے۔ اللہ کا کرم ہے کہ تم اتنا کماتے ہو کہ جلد اپنے لیے الگ گھر خرید سکتے ہو۔ تم نے اس گھر پر جو اور جتنا لگا دیا وہ بہت ہے۔ اب تم اپنے ذاتی گھر کے لیے رقم جمع کرو۔ بنانے کو تم اس گھر میں بھی اپنے لیے ایک الگ پورشن بنا سکتے ہو لیکن یہ خود تمہارے لیے مناسب نہیں ہوگا۔ تم شوبز میں ہو۔ تمہارا اسی حساب سے ملنا جلنا اور اٹھنا بیٹھنا ہے۔ ہوسکتا ہے تم شادی کے لیے بھی شوبز ہی کی کسی لڑکی کا انتخاب کرلو تو ایسے میں تمہارا جوائنٹ فیملی میں رہنا مناسب نہیں ہوگا۔ تمہارے بھائیوں اور بھابیوں کو تمہارے طرزِ زندگی سے اختلاف ہوسکتا ہے تم لوگ بھی فضول کی تنقیدوں اور نگرانی سے گھبرا جاؤ گے اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ تم شادی کے بعد یہاں سے دور اور الگ رہو۔ دور رہنے سے محبتیں اور تعلق دونوں قائم رہتے ہیں۔"

امی نے اپنے طور پر بہت کچھ سوچ لیا تھا اور اسی اعتبار سے فیصلہ بھی کر بیٹھی تھیں۔ اس موقع پر اگر وہ انہیں یہ بتاتا کہ وہ اپنے لیے شوبز کی نہیں بلکہ ایک بہت گھریلو لڑکی کا انتخاب کرچکا ہے تو شاید انہیں لگتا کہ وہ ان کی وصیت سے اختلاف رکھتا ہے۔ وہ انہیں یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ جیسے آج شوبز میں ہوتے ہوئے وہ شوبز کی دنیا کو کبھی اپنے گھر کے اندر نہیں لے کر آیا ویسے ہی مستقبل میں بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا لیکن بات وہی تھی کہ وہ اس کی وضاحتوں کو اختلاف سمجھ لیتیں تو اس کے لیے یہ شرمندگی کا باعث ہوتی۔ ان کا فیصلہ صحیح تھا یا غلط، وہ اس سے اختلاف نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وصیت نامہ پڑھتے ہی اسے جو ابتدائی جھٹکا لگا تھا اس سے بھی وہ اب مکمل طور پر نکل چکا تھا اور امی کے اس پوائنٹ سے پوری طرح متفق تھا کہ اس کی اتنی اچھی انکم ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے مقابلے میں بہت جلد اس سے بھی اچھا مکان بنا سکتا تھا بس اسے اپنی آمدنی کو تھوڑی پلاننگ سے خرچ کرنے کی ضرورت تھی۔ اس سے قبل اس نے کسی پلاننگ کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور جہاں دل چاہتا تھا کھلے ہاتھ سے خرچ کردیتا تھا لیکن اب اس کی آنکھوں میں روحانہ کے خواب اتر آئے تھے اور امی کی باتوں نے خود بخود ہی اس کے دل میں روحانہ کے لیے ایک پیارا سا گھر بنانے کا خواب جگا دیا تھا۔

☆☆☆

وہ بالکل دم بخود تھی۔ شایان صدیقی نے اسے پرپوز کیا ہے اس بات پر یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ شخص جو پہلی نظر میں ہی بری طرح اس کے اعصاب پر سوار ہوگیا تھا، اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے اس کی دسترس میں آسکتا ہے، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اسے تو اس شخص کا حصول اتنا ناممکن لگتا تھا کہ اس نے اللہ سے دعا مانگتے ہوئے بھی اسے پانے کی ضد نہیں کی تھی اور اپنی دعا میں یہی التجا کی تھی کہ اے اللہ یا تو اسے میرا بنا دیجیے یا پھر اسے میرے دل و دماغ سے نکال دیجیے...... اور یہ دعا مانگنے کے چند لمحوں بعد ہی وہ دستِ طلب پھیلائے اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ ایک طرح سے اللہ نے اس کی دعا مستجاب کرلی تھی اور شایان صدیقی کو اس کا بنانے کے لیے اسے اس کے پاس لے آیا تھا۔ اسے اپنی دعا کی اس قبولیت پر خوشی سے پھولے نہیں سمانا چاہیے تھا لیکن صورتِ حال اس کے برعکس تھی۔ شایان کے پرپوز کرنے پر وہ خوش نہیں ہوسکی تھی بلکہ فیصلے کا اختیار اپنے پاس آجانے پر کشمکش میں مبتلا ہوگئی تھی۔ وہ اسے سوچ کر جواب دینے کی مہلت دے گیا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس کا جواب کیا ہونا چاہیے۔ دل کو شایان صدیقی کی کتنی ہی طلب ہو، روحانہ عبدالجبار کے لیے ہاں کہنا آسان نہیں تھا۔ اس کی ہاں اسے ابا کے مقابل لاکھڑا کرسکتی تھی۔ بھلا ابا کیسے اسے اپنے داماد کے طور پر قبول کرسکتے تھے۔ بیٹی کی پسند پر اگر راضی بھی ہوجاتے تو ایک طرف ان کا دل غمگین ہوتا تو دوسری طرف دنیا کے سامنے سر جھک جاتا۔

مشہور دینی اسکالر پروفیسر عبدالجبار کی بیٹی کی ایک گلوکار سے شادی ہوتی تو بے شمار لوگوں کے منہ کھل جاتے۔ کوئی ابا پر تنقید کرتا تو کوئی ان کا مضحکہ اڑاتا۔ وہ جو دینی معاملات میں ایک مستند و معتبر شخصیت شمار کیے جاتے تھے، ایک دم ہی متنازعہ حیثیت اختیار کرجاتے۔ فرض کیا وہ شایان کو پانے کی خاطر اس عظیم خودغرضی کا مظاہرہ بھی کر ڈالتی تو کیا خود اس کے ساتھ زندگی گزار سکتی تھی؟ وہ پروفیسر عبدالجبار کی بیٹی تھی جنہوں نے ہمیشہ اسے رزقِ حلال کھلایا تھا۔ رزقِ حرام پر پلنے والے جسم کو ایک دن بالآخر جہنم کا ایندھن بننا ہوگا یہ بات بھی وہ بچپن سے سنتی آئی تھی اور اب یہ سوچ رہی تھی کہ کیا اس میں اتنا حوصلہ ہے کہ وہ ایک

خواہش......صرف ایک خواہش کی تکمیل کے لیے خود کو جہنم کا ایندھن بنانے کے لیے راضی ہو جاتی؟ اس فانی زندگی کے لیے اگر اسے شایان صدیقی کا ساتھ مل بھی جاتا تو ماسوائے نفس کی تسکین کے ایسا کونسا فائدہ حاصل ہوتا جس کی خاطر وہ اپنی آخرت برباد کر لیتی۔ اس انداز میں سوچتے ہوئے اسے اچھی طرح احساس ہو گیا کہ شایان صدیقی کا پروپوزل دعا کی قبولیت نہیں بلکہ آزمائش بن کر سامنے آیا ہے۔ اللہ قرآن میں فرماتا ہے......اے لوگو اتم جو ایمان لائے ہو تو کیا سمجھتے ہو کہ تم آزمائے نہیں جاؤ گے......تو بس اس کے حصے کی آزمائش بھی شایان صدیقی کی صورت اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی اور اب یہ اس پر تھا کہ وہ اس آزمائش میں پوری اترتی ہے یا نہیں۔ پورا اترنا اتنا آسان نہیں تھا۔ ایک ایسی چیز جو بالکل اچانک اس کی زندگی میں وارد ہوئی تھی اور پوری طرح اس کے حواسوں پر غالب آگئی تھی، دسترس میں آتی دکھائی دے رہی تھی اور وہ اس سے دست بردار ہو جاتی، یہ اتنا سہل نہیں تھا۔ اس آزمائش سے گزرتے ہوئے اس کے بستر پر گویا کانٹے اگ آئے اور پیروں تلے انگارے بچھ گئے۔ خواہش کی شدت اور باپ کی تربیت میں ایسا گھمسان کا معرکہ ہوا کہ وہ نڈھال ہو کر رہ گئی لیکن بہر حال فیصلہ ہو ہی گیا اور جب شایان صدیقی نے اس کا جواب جاننے کے لیے اسے فون کیا تو وہ اس سے بات کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔

''آپ نے کیا فیصلہ کیا روحانہ؟'' اس چھوٹے سے سوال میں جتنی بے چینی و بے قراری سموئی ہوئی تھی، وہ یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ دوسری طرف بھی آتشِ عشق پوری شدت سے بھڑک رہی ہے۔

''آپ کے خیال میں، میرا فیصلہ کیا ہو سکتا ہے؟'' اس نے سیدھے سبھاؤ جواب دینے کے بجائے ذرا تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

''کاش میں اندازہ لگا سکتا۔ میں تو امید و بیم کے درمیان جھول رہا ہوں۔ آپ کی ہاں مجھ پر خوشیوں کے در کھول دے گی اور نہ جیتے جی مار ڈالے گی۔'' اس کا جواب سن کر روحانہ کا دل بری طرح یوں سکڑا جیسے کسی نے اسے مٹھی میں دبوچ لیا ہو۔ وہ جو اس کے دل کی دھڑکن بن گیا تھا، کیا وہ اس سے اس کی زندگی چھین سکتی تھی؟ اسے جیتے جی مار سکتی تھی؟ اس کے دماغ میں سوالوں کی یلغار ہونے لگی لیکن پھر اس نے خود کو سمیٹا اور سنبھالا اور اس سے گفتگو کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''مجھے اعتراف ہے شایان صاحب کہ اللہ نے آپ کو اتنی بھرپور شخصیت سے نوازا ہے کہ کوئی بھی شخص آپ کو ایک نظر دیکھنے کے بعد آپ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ حقیقتاً بہت پرکشش شخصیت کے مالک ہیں لیکن کیا ظاہری شخصیت کی بنیاد پر زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کیا جا سکتا ہے؟''

''یقین کیجیے روحانہ مجھے اپنی شخصیت کی دلکشی کا کوئی گھمنڈ نہیں اور میں صرف اپنے دل کی خواہش کو سفارش بنا کر آپ کے سامنے دستِ طلب دراز کر رہا ہوں۔ ایک ایسا شخص جو آپ سے بے حد محبت کرنے لگا ہے اور خود اپنے آپ سے آپ کو دنیا کا ہر سکھ دینے کے وعدے کرتا چلا جا رہا ہے، کیا اتنی اہلیت نہیں رکھتا کہ آپ سے آپ کو مانگ سکے؟'' اس کا لہجہ اس کی سچائی کا گواہ تھا۔ روحانہ کا دل ایک بار پھر سکڑا اور پھیلا لیکن اس لمحے اس نے اپنی کسی کمزوری کو خود پر غالب نہیں آنے دینا تھا۔ وہ ایمان والی تھی اور اللہ کی طرف سے آنے والی آزمائش سے سرخرو ہو کر نکلنا چاہتی تھی۔

''دنیا کے ہر سکھ سے آپ کی کیا مراد ہے؟ آپ مجھے اپنی زندگی میں شامل کر کے کونسے سکھ دینا چاہتے ہیں؟'' اس نے بہت سنجیدگی اور قدرے تختی سے دریافت کیا۔

''میں آپ کے لیے ایک بہت خوب صورت سا گھر بناؤں گا اور اس گھر کو ہر اس سہولت سے سجادوں گا جو آپ کی زندگی کو سہل بنادے۔ آپ اس گھر کی مالکہ ہوں گی اور مجھ سمیت ہر شے پر آپ کی حکمرانی ہوگی۔'' وہ خواب رنگ لہجے میں اسے اپنی خواہشات سے آگاہ کر رہا تھا۔

''کیا آپ میرے لیے یہ سب رزق حلال سے بنا سکیں گے؟'' اسے معلوم تھا کہ اس کا یہ سوال کسی تیز دھار چھری کی طرح شایان کے دل میں جا کر پیوست ہوگا لیکن وہ اسے یہ تکلیف دینے پر مجبور تھی۔ اس سوال کی دھار صرف شایان کے لیے نہیں تھی۔ وہ خود بھی اس کی زد پر تھی کیونکہ اس سوال کا جواب ہی فیصلہ کرتا کہ شایان صدیقی اس کی زندگی میں شامل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ حسبِ توقع اس کے اس سوال نے شایان کو گنگ کر دیا۔

''رزقِ حلال......'' لائن کی دوسری طرف وہ جیسے خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

''جی ہاں رزقِ حلال۔ اللہ کے فضل و کرم سے آپ مسلمان ہیں لیکن آپ نے جس پیشے کو اپنا ذریعۂ آمدنی بنا رکھا ہے، وہ میرے لیے قابلِ قبول نہیں۔ امید ہے کیوں اور کس لیے جیسے سوال آپ نہیں اٹھائیں گے کہ بحیثیت مسلمان آپ خود بھی گانے بجانے کے سلسلے میں شریعت کے

احکامات سے واقف ہوں گے اور یہ بات سمجھتے ہوں گے کہ پروفیسر عبدالجبار جیسے دینی اسکالر کے لیے آپ بطور داماد قابلِ قبول نہیں ہو سکتے۔'' شایان صدیقی سے یہ سب کہنا اس کی مجبوری تھی، سو کہتی چلی گئی۔ دوسری طرف چھا جانے والی خاموشی نے اسے باور کروایا کہ اس کے کہے جملوں کی کاٹ اتنی ہی شدید ہے جتنا وہ سوچ چکی تھی لیکن کہے بغیر چارہ نہیں تھا کہ کہہ کر امید کا کوئی در بھی کھلنے کا امکان تھا۔

''اگر میں گلوکاری ترک کر کے کوئی کاروبار کرلوں؟''

دوسری طرف خاموشی ضرور چھا گئی تھی لیکن لائن بے جان نہیں ہوئی تھی اس لیے وہ امید کا دامن تھامے شایان کے جواب کا انتظار کرتی رہی۔ کافی دیر کے توقف کے بعد جب شایان نے اس سے یہ سوال کیا تو اس کے تنِ مردہ میں جان سی پڑنے لگی۔

''تو آپ کی راہ کی واحد رکاوٹ دور ہو جائے گی۔'' اپنے خشک لبوں کو لعابِ دہن سے تر کر کے یہ جواب دیتے ہوئے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

''پھر تو سمجھیں کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ میں بہت عرصے سے پلان کر رہا تھا کہ کسی بزنس میں رقم انویسٹ کردوں۔ یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ ہم شوبز کے لوگوں کی زندگی میں عروج و زوال بہت تیزی سے آتے ہیں۔ عروج کا دور ہو تو ہم سے زیادہ کوئی نہیں کما سکتا لیکن زوال میں کنگال ہوتے بھی دیر نہیں لگتی۔ ماضی کی شخصیات اس زوال کا عبرت ناک نمونہ بن کر آئے دن سامنے آتی رہتی ہیں اس لیے آج کل کے عقل مند فنکار عروج کے دور میں ہی اس وقت کی پلاننگ کرنا شروع کر دیتے ہیں جب ان کا طوطی بولنا بند ہو جائے۔ میں نے بھی سوچ رکھا تھا کہ اپنی آمدنی کو کسی اچھے کاروبار میں لگا کر اپنا مستقبل محفوظ کرلوں۔ اب میں آپ کی خاطر یہ کام جلد ہی کرلوں گا۔'' وہ بولنے پر آیا تو اسے اپنی ساری پلاننگ سے آگاہ کرتا چلا گیا۔

''مجھے آپ کے کاروبار کرنے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن شوبز کی کمائی سے کاروبار کرنے پر اعتراض ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ چاہے بہت چھوٹے پیمانے پر کاروبار کا آغاز کریں لیکن اس میں صاف ستھری اور شک و شبہات سے پاک رقم لگائیں۔'' روحانہ نے اس کی ساری بات سنی اور پھر نہایت دھیمے لہجے میں مشورہ دیا۔ اس کا مشورہ سن کر شایان کو ایک بار پھر چپ لگ گئی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ جس طرح روحانہ کو اس کی شوبز کی کمائی پر اعتراض ہے اسی طرح اس کے لیے شوبز کی کمائی سے شروع کیا جانے والا کاروبار بھی ناقابلِ قبول ہے۔

''ٹھیک ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے کیا تدبیر ہو سکتی ہے۔ فی الحال تو آپ مجھے اجازت دیجیے۔'' جواب دیتے ہوئے اس کا لہجہ تھوڑا بجھا ہوا تھا۔ روحانہ نے فوراً اس بات کو محسوس کرلیا اور جلدی سے بولی۔

''ایک منٹ شایان......! میں بھی آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

''جی۔ میں سن رہا ہوں۔'' وہ فوراً ہمہ تن گوش ہوا۔

''پہلی بات تو میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آپ جو بھی کریں، وہ پوری ہمت اور لگن سے کیجیے گا کیونکہ جہاں انسان کا ارادہ پختہ ہو وہیں راہیں بھی کھلتی اور آسان ہوتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ اپنے کام کا آغاز یہ سوچ کر مت کیجیے گا کہ آپ یہ سب ایک لڑکی کے لیے کر رہے ہیں بلکہ یہ سوچ کر کیجیے گا کہ آپ یہ سب اپنی آخرت سنوارنے کے لیے کر رہے ہیں کیونکہ اس دنیا کی زندگی تو فانی ہے اور یہاں انسان کو اگر حسبِ خواہش کچھ نہ بھی ملے تو زندگی بہرحال گزر جائے گی اس لیے انسان کی نظر آخرت کے ہمیشہ رہنے والے اصل فائدے پر ہونی چاہیے۔''

''ٹھیک ہے، میں خیال رکھوں گا اور کچھ......؟'' اس نے پوچھا۔

''اور یہ کہ یاد رکھیے گا کہ مجھے بڑے سے باسہولت گھر، گاڑی اور عیش و عشرت کی کوئی تمنا نہیں ہے۔ ان سب چیزوں کے بغیر بھی میرا گزارہ ہو سکتا ہے۔ آپ پاک اور حلال رزق کمائیں، میرے لیے یہی بات سب سے اہم ہے۔''

''لیکن پروفیسر صاحب تو اپنی بیٹی کو اچھے گھر میں بیاہنا چاہتے ہوں گے۔ انہیں تو اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے کوئی بہت کم حیثیت شخص قابلِ قبول نہیں ہوگا۔''

''آپ غلط انداز میں سوچ رہے ہیں۔ وہ میرے ابا ہیں اور میرا اندازِ فکر اصل میں ان ہی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ انہیں میری پسند سے ہرگز بھی اختلاف نہیں ہوگا۔''

''یعنی میں آپ کی پسند ہوں؟'' شایان نے اس کی روانی میں کہی بات کو فوراً پکڑ لیا تو وہ جھینپ گئی۔

''بتائیے نا روحانہ! کیا مجھے آپ کی پسند ہونے کا اعزاز حاصل ہے؟'' دوسری طرف سے اصرار ہوا۔ اس اصرار پر اس کے رخسار دہک اٹھے لیکن خود کو سنبھال کر ذرا نروٹھے پن سے بولی۔

''تو آپ کے خیال میں، میں ہر اس شخص سے جو مجھے پروپوز کرے اتنی تفصیلی گفتگو کر سکتی ہوں؟''

''نہیں۔ یقیناً میں واحد خوش قسمت انسان ہوں جسے یہ اعزاز حاصل ہے۔'' وہ اس کا جواب سن کر کھل اٹھا اور وقتی طور پر بھول گیا کہ ابھی روحانہ کی شرائط سنتے ہوئے وہ دل ہی دل میں کتنا پریشان ہو گیا تھا۔ جو کچھ اس نے کہا تھا، وہ اتنی انہونی بات نہیں تھی لیکن اس کے لیے مشکل ضرور ہو جاتی۔

''ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم نے ایک دوسرے سے وہ سب کہہ اور سن لیا ہے جس کی ضرورت تھی اس لیے امید کرتی ہوں کہ آئندہ آپ مجھے کال نہیں کریں گے۔ کسی نامحرم سے بلاوجہ ٹیلی فونک رابطہ رکھنے کو میں قطعی نامناسب سمجھتی ہوں اور اس عمل کو بار بار دہرا کر خود کو گناہ گار نہیں کرنا چاہتی۔'' اس کا دل شایان صدیقی کی طرف کتنا ہی ملتفت سہی لیکن اس نے اس سے وہی کچھ کہا جو اس کی تربیت کا تقاضا تھا۔ اس تربیت کا مان رکھ کر ہی وہ اللہ اور خود اپنی نظروں میں سرخرو ہو سکتی تھی۔ چنانچہ نہ چاہتے ہوئے بھی فون بند کر دیا کہ اصل محبت تو وہی ہے جو دل کی بے اختیاری کو بے اعتباری اور بدکاری کی راہ پر نہ چلنے دے۔

☆☆☆

روحانہ سے بات کر کے اگر وہ ایک طرف بہت خوش تھا تو دوسری طرف پریشانی ہی پریشانی تھی۔ روحانہ اس کے جذبے کی قدر کرتی ہے اور محبت کی راہ میں اس کی ہمسفر ہے، یہ جان کر وہ نہال ہو گیا تھا لیکن اس کی شرائط بہت کڑی تھیں۔ اس نے ڈھکے چھپے انداز میں سہی اس پر اچھی طرح واضح کر دیا تھا کہ شایان کے لیے اپنے دل میں خصوصی جذبات رکھتے ہوئے وہ اس وقت تک اسے قبول نہیں کر سکتی جب تک وہ گلوکاری چھوڑ کر کوئی اور ذریعہ معاش اختیار نہیں کر لیتا۔ گلوکاری شایان کا جنون نہیں تھی کہ وہ کسی طور اس کو ترک کرنے کا نہ سوچ پاتا۔ وہ تو بالکل اتفاقیہ اس شعبے میں آیا تھا۔ بات یہ تھی کہ اپنی اچھی آواز کی وجہ سے وہ دوستوں کو ان کی فرمائش پر فلمی نغمے گا کر سناتا رہتا تھا۔ ان ہی دوستوں نے کالج کے ایک فنکشن میں اسے گلوکاری کے جوہر دکھانے کے لیے راضی کر لیا تھا اور یہ بالکل ایک اتفاق تھا کہ اس فنکشن میں ایک ایسے صاحب بھی بطور مہمان شریک تھے جو نئے ٹیلنٹ کو سامنے لانے میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ ان کی بنائی ویڈیوز نے کئی گمنام گلوکاروں کو شہرت کی بلندی پر پہنچا دیا تھا۔ انہوں نے شایان کی آواز سنی تو اسے گاڈ گفٹڈ قرار دے کر فوراً ہی اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے راضی کر لیا۔ شایان جو بی کام کے بعد ایم بی اے کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، اس پیشکش کو قبول کر کے دولت اور شہرت کے سمندر میں ایسا ڈوبا کہ پڑھائی وغیرہ سب ایک طرف رہ گئی اور اس نے گلوکاری کو ہی اپنا مستقل ذریعہ معاش بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

کم عمری میں دولت اور شہرت دونوں ایک ساتھ مل رہی ہوں تو کون اپنے قدم پیچھے ہٹانے کا سوچتا ہے۔ وہ بھی اس شعبے میں اپنا لوہا منوانے لگا لیکن روحانہ عبدالجبار سے بالکل اچانک ہونے والی محبت میں کامیابی کی شرط ہی یہ ٹھہری کہ وہ گلوکاری چھوڑ دے۔ اسے گلوکاری سے عشق نہیں تھا کہ اسے ترک کرنے کے لیے بہت زیادہ سوچنا پڑتا لیکن وہ گلوکاری کے نتیجے میں حاصل ہونے والی کھلی آمدنی کا عادی ہو گیا تھا اور تنگی میں گزارہ کرنا اس کے لیے آسان نہیں رہا تھا۔ اگر وہ اپنے پاس موجود جمع پونجی سے کوئی کاروبار شروع کرتا تو بھی اس بات کا امکان تھا کہ اتنا ہی کما پاتا جتنا گلوکاری کے ذریعے کما رہا تھا لیکن روحانہ نے اس سرمائے کے استعمال پر بھی پابندی لگا دی تھی۔ گلوکاری سے حاصل ہونے والی رقم کے علاوہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اسے تو اپنے والد کے ترکے میں سے بھی کچھ نہیں ملنے والا تھا۔ اس کی والدہ نے اس کی کھلی آمدنی کو دیکھتے ہوئے اسے اس کا حصہ دینا غیر ضروری سمجھتے ہوئے سب کچھ اس کے بہن بھائیوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ان حالات میں اس کے پاس واحد حل یہی رہ جاتا تھا کہ وہ کہیں ملازمت کر لیتا..... لیکن کہاں؟ یہ ایک بہت بڑا سوال تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھا اور نہ ہی اس کے پاس ایسا کوئی ہنر تھا جس کی بنیاد پر اسے کوئی اچھی ملازمت مل پاتی۔ ان ہی فکروں میں غلطاں وہ اپنی جگہ الجھا ہوا بیٹھا تھا کہ اس کے موبائل پر کسی کی کال آنے لگی۔ اس نے فون کرنے والے کا نام دیکھا اور کال ریسیو کر لی۔ وہ ایک بہت بڑا پروموٹر حامد خان تھا۔

''تیاری کر لو ہیرو۔ دبئی میں ایک اور شو کی تیاری ہے۔ جن لوگوں کو بلوایا گیا ہے ان میں تمہارے لیے سب سے زیادہ پُرزور اصرار ہوا ہے۔'' علیک سلیک کے بعد حامد خان نے اسے اطلاع دی۔ عام طور پر ایسی اطلاعات سن کر وہ بہت خوش ہوتا تھا۔ بیرونِ ملک ہونے والے یہ شوز مالی طور پر بہت فائدہ مند ثابت ہوتے تھے۔ ساتھ ہی مفت میں دنیا دیکھنے کا موقع بھی مل جاتا تھا لیکن آج یہ اطلاع سن کر خوشی کا اظہار کرنے کے بجائے وہ چپ ہو گیا۔

''کیا ہوا یار! تم کچھ بول کیوں نہیں رہے؟'' حامد

خان نے اس کی خاموشی کو فوراً نوٹ کیا۔

''سوری حامد بھائی۔ میں اس شو میں شریک نہیں ہوسکتا۔'' اس نے آہستہ سے انہیں جواب دیا۔

''کیا کہہ رہے ہو بھائی۔ میں دبئی میں شو کی بات کر رہا ہوں۔ یہیں پاکستان کے کسی شہر کی نہیں۔'' حامد خان کو لگا کہ اس سے سننے میں کوئی غلطی ہوگئی ہے جب ہی انکار کر رہا ہے۔

''میں نے سن لیا ہے حامد بھائی کہ آپ دبئی کی بات کر رہے ہیں لیکن میں نہیں جاسکتا۔'' اس نے نرمی سے اپنا انکار دوبارہ ان تک پہنچایا۔

''کیوں؟ کیا کوئی پرابلم ہے؟'' حامد خان نے تشویش سے پوچھا۔

''میں نے گلوکاری چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے حامد بھائی!'' اس نے جیسے کوئی دھماکا کیا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا مذاق کے موڈ میں ہو؟'' حامد خان بیک وقت حیرانی اور بے یقینی کا شکار ہوا۔

''نہیں، میں مذاق نہیں کر رہا۔ میں پوری سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔'' اس نے حامد خان کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ اس قسم کا ردعمل اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھا اور وہ یہ سوچ کر بات کر رہا تھا کہ ایک بار جو فیصلہ کر چکا ہے اس پر فوری عمل درآمد ہی بہتر ہے۔

''لیکن کیوں؟ تم اس فیلڈ میں اتنے فیمس ہوچکے ہو اور اتنا اچھا کما رہے ہو پھر اسے چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ کہیں کچھ اور تو چکر نہیں ہے۔ پیسے ویسے بڑھوانے کی بات ہے تو بولو۔ اس پر بات ہوسکتی ہے۔'' حامد خان شکوک وشبہات کا شکار ہونے لگا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر پیسوں کی بات ہوتی تو میں آپ سے صاف صاف کہہ دیتا۔''

''تو پھر کیا مسئلہ ہے، وہ بھی تو صاف بولو؟'' حامد خان نے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

''آپ اسے پرسنل سمجھیں حامد بھائی۔ میں آپ کو صرف اتنا ہی بتا سکتا ہوں کہ میں نے اس فیلڈ کو چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' اس نے بڑی استقامت سے جواب دیا۔ اسے خود بھی اپنے رویے پر حیرت ہورہی تھی۔ خود سے اتنی مضبوطی کی تو اسے بھی امید نہیں تھی وہ بھی ان حالات میں کہ اس کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی بھی نہیں تھا۔

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ تمہارے کسی مولوی کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی بھی خبر نہیں ملی کہ میں سوچوں تمہاری کایا پلٹ ہوگئی ہے۔ مجھے تو اب بھی یہی لگ رہا ہے کہ تم مذاق کے موڈ میں ہو۔ میں پھر کسی وقت فون کر کے تم سے بات کروں گا۔'' حامد خان نے بے یقینی کی کیفیت میں اس سے کہا۔ اس کے بعد اگلے چند دن تک وہ اسی قسم کی فون کالز کو نمٹاتا رہا۔ حامد خان سمیت کئی افراد نے اس سے رابطہ کر کے اس خبر کی تصدیق چاہی۔ فون کرنے والوں میں زیادہ تعداد الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا سے تعلق رکھنے والے افراد کی تھی۔ لوگ جاننا چاہتے تھے کہ اس کے اس فیصلے کی کیا وجہ ہے لیکن اس نے سب کو ''ذاتی وجہ'' کہہ کر ٹال دیا تھا۔ یہاں تک کہ گھر والوں کو بھی اس نے کوئی واضح جواب نہیں دیا تھا۔ ریحان بھائی نے تو اس معاملے میں زیادہ مداخلت نہیں کی تھی لیکن رعنا اور کاشان تو وقتاً فوقتاً اس سے بحث کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ ان کے مطابق اس نے ایک احمقانہ فیصلہ کیا تھا جسے اسے بدل دینا چاہیے تھا لیکن اس کو معلوم تھا کہ وہ اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔ اسے فیصلہ بدلنے کے بجائے اپنی زندگی بدلنی تھی اور اس کے سامنے سب سے اہم مسئلہ ذریعہ روزگار کا تھا جس کے لیے فوری طور پر ہاتھ پیر چلانے کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

''جاب اور تم کرو گے؟ کیوں مذاق کر رہے ہو یار؟'' وہ اس کے کالج کے زمانے کا ایک دوست تھا جس کے سامنے اس نے اپنا مسئلہ رکھا تھا اور ردعمل میں اس نے اسے یہ جواب دیا تھا۔

''اس میں مذاق کی کیا بات ہے؟ تمہیں معلوم ہو ہی چکا ہوگا کہ میں نے شوبز چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس کے بعد ظاہر ہے مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے تو ملازمت ہی سہی۔'' اس نے تحمل سے اپنے دوست کو جواب دیا۔ وہ اپنے فیصلے کے بعد سے مسلسل ایسی ہی باتیں سن رہا تھا اور خاصی حد تک ان کا جواب دینے کا عادی ہوگیا تھا۔

''ہاں نیوز تو ملی تھی مجھے لیکن میں نے سیریس نہیں لیا تھا۔ تم بتاؤ کیوں چھوڑ رہے ہو شوبز؟ میں نے تو سنا ہے کہ اس فیلڈ میں بڑا پیسا ہے۔'' پھر وہی سوالات تھے جن کے جوابات وہ حسبِ سابق دیتا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے یار! تمہاری مرضی۔ تم نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہوگا۔'' دوست جب اس سے کسی سوال کا اپنی منشا کے مطابق جواب نہ پا سکا تو ہتھیار ڈال دیے اور مشورہ دینے کے انداز میں بولا۔ ''میری بات کا برا نہیں ماننا یار لیکن تمہاری جو کوالیفکیشن ہے اس پر تمہیں کوئی اچھی ملازمت تو مل نہیں سکتی۔ بہتر ہے کہ تم اپنی سیونگ سے کوئی

کاروبار کرلو۔ وہ جو اپنے ساتھ اسد تھا اس کا پورا خاندان کاروباری لوگوں سے بھرا پڑا ہے۔ وہ خود بھی بڑا بزنس مائنڈڈ بندہ ہے اور ایک ساتھ کئی قسم کے کاروبار میں ہاتھ ڈال رکھا ہے۔ تم اس سے بات کرو۔ وہ تمہیں اپنا سرمایہ انویسٹ کرنے کے لیے اچھے مشورے دے سکتا ہے۔''

''میرے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہے۔ اسی لیے تو میں تم سے جاب کی بات کر رہا ہوں۔'' اس نے دوست کی پوری بات سننے کے بعد اطمینان سے کہا۔

''دیکھتا ہوں یار کہ تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں۔ میں خود جس جگہ جاب کرتا ہوں، وہاں تو بہت زیادہ کوالیفائڈ بندہ ڈیمانڈ کرتے ہیں۔ پیون بھی بی اے کیا ہوا ہے اور انگریزی سمجھتا ہے۔'' اس بار دوست کا انداز اسے ٹالنے والا تھا۔ شایان نے اب بھی تحمل کا مظاہرہ کیا اور دوست کے اتنے صاف جواب کا برا نہیں مانا۔ وہ جانتا تھا کہ حقیقت یہی ہے۔ بے روزگاری نے اچھے خاصے پڑھے لکھے جوانوں کو بھی معمولی ملازمتیں کرنے پر مجبور کردیا ہے۔ اس کا یہ دوست کلاس کا سب سے لائق لڑکا تھا جو تعلیم کے ساتھ ساتھ ہر وقت کوئی نہ کوئی ڈپلوما یا کورس کرتا رہتا تھا۔ بعد میں اس نے ایم بی اے بھی کیا تھا اس لیے اگر آج وہ کسی اچھی کمپنی میں اچھی جاب کررہا تھا تو یہ اس کا حق تھا اور وہ اپنے معمولی سے بی کام کے ساتھ اس پر یہ زور نہیں ڈال سکتا تھا کہ وہ اسے جاب دلوائے۔ اس کے لیے اگر جاب تھی بھی تو پیون کی اور وہ ایسی جاب کے لیے اپنے اندر فی الحال ہمت نہیں پا رہا تھا اس لیے خاموشی اختیار کرگیا۔

☆☆☆

یتیم خانے کے منتظم نے اس کا پیش کردہ چیک دیکھا اور اس کی حیرت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ پہلے وہ اس لیے حیران تھا کہ شایان صدیقی جیسے مشہور شخص نے اس عام سے یتیم خانے میں قدم رکھا ہے۔ شہر میں کام کرنے والے مشہور سماجی راہنماؤں کے یتیم خانوں اور شیلٹر ہوم وغیرہ کے مقابلے میں یہ یتیم خانہ بڑا گمنام سا تھا اسی وجہ سے نہ تو یہاں نامور شخصیات کے دورے ہوتے تھے اور نہ ہی بڑے ڈونیشنز ملتے تھے۔ یتیم خانے کے اخراجات پورے کرنے کے لیے بچوں کو ہاتھ میں چندے کا ڈبا اور رسید بک لے کر گلی گلی محلہ محلہ پھرنا پڑتا تھا اور اس ساری تگ و دو کے نتیجے میں مشکل سے اتنی رقم ملتی تھی کہ بچے دو وقت کی چٹنی روٹی کھا پاتے تھے اور ادارے کے دوسرے اہم اخراجات پورے کیے جاتے تھے۔ ایسے میں اگر وہ شخص شایان کی وہاں آمد پر حیران تھا تو کچھ غلط نہیں تھا پھر دوسری حیرت یہ تھی کہ اس کے ساتھ یا آگے پیچھے میڈیا کے افراد موجود نہیں تھے کہ گمان کیا جاتا، وہ شہرت کی خاطر وہاں آیا ہے اور اب اس نے اتنی کثیر رقم کا چیک بھی بلا تشہیر اسے تھما دیا تھا تو یہ حیرت ہی کی بات تھی۔

''میں چاہتا ہوں کہ اس رقم سے آپ اس یتیم خانے کی حالت سدھاریں۔ یہاں رہنے والے بچوں کی خوراک ولباس کے ساتھ ساتھ تعلیم و تربیت پر توجہ دیں۔ فی الحال میں آپ کو جو دے سکتا تھا وہ دے دیا ہے۔ مستقبل میں بھی اپنی سی کوشش کروں گا کہ ان یتیم بچوں کی بھلائی کے لیے کچھ کرسکوں۔ دوست احباب کی بھی اس طرف توجہ دلواؤں گا۔'' منتظم کی حیرت کو نظرانداز کرتے ہوئے اس نے اپنی بات کہی۔

''جی بالکل...... جیسا آپ نے کہا ویسا ہی ہوگا۔'' منتظم نے تابعداری کا مظاہرہ کیا۔

''میرا آپ کو مشورہ ہے کہ آپ ان بچوں سے یہاں چھوٹے پیمانے پر کوئی ایسا کام کروائیں جو ان کی آمدنی کا ذریعہ بن سکے اور انہیں گھر گھر جاکر چندہ نہ مانگنا پڑے۔ کئی گھریلو صنعتیں ایسی ہیں جو کم سرمائے سے لگائی جاسکتی ہیں۔ حکومت بھی یقیناً اس سلسلے میں آپ کو رعایت دے گی۔'' اس نے اپنے ذہن میں موجود تجویز منتظم کے سامنے پیش کی۔

''آپ نے بہت اچھا آئیڈیا دیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ ادارے کے کرتا دھرتا افراد کو اس سلسلے میں قائل کرسکوں۔'' اس نے شایان کی تجویز کو سراہا۔

''ٹھیک ہے مجھے اجازت دیجیے۔'' شایان اچانک ہی کھڑا ہوگیا۔

''ارے شایان صاحب! ایسے کیسے۔ ابھی تو میں نے آپ کے لیے چائے پانی کا بھی بندوبست نہیں کیا۔ اصل میں آپ کو اچانک سامنے پاکر اتنی حیرت اور خوشی ہوئی تھی کہ فوری طور پر اس طرف دھیان ہی نہیں جاسکا۔'' وہ شخص بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

''کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ بس مجھے اجازت دیجیے۔'' اس نے منتظم کو جواب دیا اور اس سے مصافحہ کرنے کے بعد وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اس یتیم خانے کے بارے میں اسے ایک دوست کے ذریعے علم ہوا تھا اور بالکل اچانک ہی اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس کے پاس جو رقم جمع ہے وہ اس یتیم خانے میں دے دے تاکہ برے حالات میں یہ رقم اس کے لیے آزمائش نہ بن سکے۔ رقم پاس ہوتی تو تنگی میں لامحالہ

اس کا ذہن اس رقم کی طرف جاتا اور وہ روحانہ کے ساتھ کیے گئے کسی بھی وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ رقم کا چیک یتیم خانے میں دینے کے بعد وہ خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا حالانکہ بے روزگاری کا عفریت اس کے آگے منہ پھاڑے کھڑا تھا اور اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ آئندہ وہ اپنے معاشی مسائل سے کس طرح نمٹے گا۔

”شایان! عثمان کی کال ہے، تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“ گھر پہنچ کر اس نے سیدھا اوپری پورشن کی طرف رخ کیا تو امی نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ اس نے آ کر ان کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔

”اور برخوردار کیا حال ہے۔ تمہارے بارے میں بڑی حیرت انگیز خبریں مل رہی ہیں۔ کیا سچ مچ تم شوبز چھوڑنے کا فیصلہ کر چکے ہو؟“ سلام دعا کے بعد عثمان نے اس سے دریافت کیا۔

”آپ نے بالکل صحیح سنا ہے۔ آپ سنائیں آپ کی طرف کا کیا حال احوال ہے؟“ اس نے مختصر جواب دے کر موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”سب اچھا ہے۔ سمیعہ تمہارے فیصلے کے بارے میں سن کر خوش ہے جبکہ بچے تھوڑے سے اداس ہو رہے ہیں۔“ عثمان نے بتایا تو وہ بس ذرا سا ہنس کر رہ گیا۔

”اچھا یار! مجھے تم سے ایک ضروری کام تھا۔ اصل میں میرے کچھ بہت اہم ڈاکیومینٹس عبدالجبار بھائی کے پاس رکھے ہوئے ہیں اور میں کوریئر کے ذریعے انہیں نہیں منگوانا چاہتا اگر تمہارا کوئی اعتماد کا بندہ دبئی آ رہا ہو تو مجھے اس کے ہاتھ سے وہ ڈاکیومینٹس پہنچانے کا انتظام کر دو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ نیکسٹ ویک یہاں کوئی شو ہونے والا ہے جس میں شرکت کے لیے پاکستان سے فنکار آ رہے ہیں۔“ عثمان بھی اس بار موضوع بدل کر اپنے مطلب کی بات پر آ گئے۔

”بالکل بھجوا سکتا ہوں عثمان بھائی۔ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔ حامد خان کے ساتھ اس کے بڑے اچھے تعلقات رہے تھے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ حامد بہت ذمے دار انسان ہے اس لیے اسے ذہن میں رکھتے ہوئے عثمان کو جواب دیا۔

”تو بس بچے تم ایسا کرو کہ ہماری بیگم کے میکے جا کر وہ ڈاکیومینٹس لے آؤ اور مجھے بھجوا دو۔“ عثمان اس کا جواب سن کر جو خوش ہوئے سو ہوئے لیکن اس کی اپنی خوشی بے اندازہ تھی۔ روحانہ نے پہلے مرحلے پر ہی اس پر پابندی لگا دی تھی کہ وہ اس سے ربط ضبط رکھنے کی کوشش نہیں کرے گا اس لیے وہ خود پر جبر کرنے پر مجبور ہو گیا تھا لیکن اب اسے کوچے کی طرف جانے کا ایک معقول بہانہ مل رہا تھا تو وہ اسے کیسے گنوا سکتا تھا چنانچہ بے حد فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

”آپ بالکل فکر نہ کریں بھائی، میں آج ہی جا کر آپ کے ڈاکیومینٹس لے آتا ہوں۔“

”تھینکس آلاٹ۔“ عثمان نے اس سے کہا اور دو چار مزید باتیں کر کے فون بند کر دیا۔

”شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا چاہیے بھائی صاحب۔“ وہ دل ہی دل میں کہتے ہوئے مسکرایا اور دوبارہ اوپر کی طرف رخ کیا۔ امی اسے ریسیور تھمانے کے بعد پہلے ہی وہاں سے جا چکی تھیں۔ انہوں نے اس کے گلوکاری چھوڑ دینے کے فیصلے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا اور نہایت خاموشی سے انتظار کر رہی تھیں کہ اس کے فیصلے کی وجہ کب سامنے آتی ہے۔ باقی گھر والوں نے بھی فی الحال اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا چنانچہ اب وہ کم از کم گھریلو دباؤ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اپنے کمرے میں آنے کے بعد اس نے وہاں زیادہ وقت نہیں گزارا اور تیار ہو کر پروفیسر عبدالجبار کے گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ روانگی سے قبل اس نے امی کو بتا دیا تھا کہ وہ عثمان بھائی کے کام سے جا رہا ہے۔ پروفیسر صاحب کے گھر وہ ایسے وقت پر پہنچا تھا کہ اسے ان کی گھر میں موجودگی کی کم ہی امید تھی لیکن اس کی یہ امید اس وقت غلط ثابت ہوئی جب ملازم نے سیدھا اسے پروفیسر صاحب کی اسٹڈی میں پہنچا دیا۔ وہ روحانہ سے ملاقات کا موقع نہ ملنے پر مایوس تو ہوا لیکن پروفیسر صاحب کے سامنے اپنا انداز نارمل رکھا۔

”تم سے دوبارہ مل کر خوشی ہو رہی ہے۔“ انہوں نے نہایت خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔

”جی بس عثمان بھائی کے کام سے آنا ہوا تھا۔“ اس نے قدرے تکلف اور جھجک سے کہا۔ وہ روحانہ کے والد تھے اور ساتھ اتنے بڑے اسکالر بھی...... تو اسے ان کے سامنے یوں ٹین ایجر لڑکوں کی طرح بہانے بنانا عجیب سا لگ رہا تھا حالانکہ انہیں تو علم بھی نہیں تھا کہ وہ اصل میں کس نیت سے یہاں آیا ہے۔

”ہاں۔ عثمان نے فون پر مجھے بتا دیا تھا اسی لیے میں انتظار میں گھر پر ہی رکا رہا۔“ انہوں نے اسے جواب دیا۔ اسی وقت فضا میں عصر کی اذان کی آواز گونجنے لگی۔ ”پہلے نماز پڑھ کر آ جاتے ہیں پھر گفتگو کریں گے۔“ انہوں نے خاموشی سے اذان سنی پھر اس سے بولے۔ وہ ان کے ساتھ جانے

کے لیے تیار ہوگیا۔ وہ بہت زیادہ پابندی سے نماز پڑھنے کا عادی نہیں تھا لیکن یہ بھی نہیں تھا کہ بالکل بے نمازی ہی ہو اس لیے ان کے ساتھ نماز کے لیے جاتے ہوئے اسے یہ احساس نہیں تھا کہ وہ صرف ان کے تکلف میں نماز پڑھنے جارہا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ عجیب واقعہ ہوا کہ ان کے شانے سے شانہ اور ٹخنے سے ٹخنہ جوڑ کر نماز پڑھتے ہوئے اس نے نماز کا جو لطف محسوس کیا، وہ اس سے قبل زندگی میں کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ شاید یہ نیک آدمی کی قربت تھی جس نے اپنا کمال دکھایا تھا اور وہ مسجد سے واپس آتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اب اسے ہمیشہ پابندی سے نماز ادا کرنی ہے۔ وہ پیدائشی مسلمان تھا اور جانتا تھا کہ نماز اللہ کی قربت عطا کرتی ہے اور روحانہ نے اس سے گلوکاری چھوڑنے کے لیے کہا تھا تو ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے اس فعل کو ایک لڑکی کی خواہش سے منسوب کرنے کے بجائے اللہ کی ذات، اس کی فرمانبرداری سے جوڑے تو یہ زیادہ بہتر ہوگا اور آج خودبخود ہی اسے اللہ کی قربت اور اس کی فرمانبرداری کی خواہش محسوس ہو رہی تھی۔ وہ لوگ نماز کے بعد واپس گھر پہنچے تو ملازمہ نے چائے پیش کردی۔ چائے بہت زیادہ لوازمات کے ساتھ پیش نہیں کی گئی تھی بس دو تین ہلکے پھلکے اسنیکس ہی تھے۔ چائے کے دوران پروفیسر صاحب اس سے گفتگو کرتے رہے۔ اس کے گلوکاری چھوڑ دینے کا موضوع بھی چھیڑا۔ یہ خبر اخباروں کی زینت بننے کی وجہ سے پروفیسر صاحب کے بھی علم میں تھی۔

"یقیناً تم نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہوگا اور اس فیصلے کے پیچھے کوئی محرک ہوگا۔ میں تم سے اس بارے میں دریافت نہیں کرنا چاہتا بس یہ خواہش کرتا ہوں کہ اس فیصلے کے پیچھے کوئی اچھا مقصد ہو اور اللہ تمہارے اس مقصد کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ تمہارے لیے آسانیاں بھی پیدا کرے۔ تم جیسے لوگ جب ایسا کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو ان کے لیے اپنے فیصلے پر قائم رہنا آسان نہیں ہوتا۔ میری اس بات سے یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں کسی غلط کیٹگری میں رکھ رہا ہوں۔ میرے کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ تمہارے حصے میں عام لوگوں کے مقابلے میں ذرا زیادہ آزمائشیں آئیں گی۔ ان آزمائشوں سے گھبرانا نہیں اور ان کے سامنے ڈٹے رہنا۔" انہوں نے اس کے سامنے کیوں اور کس لیے جیسے سوال نہیں اٹھائے اور بہت خلوص سے دعائیں اور مشورے دیتے چلے گئے۔

"اللہ نے چاہا تو میں ہمیشہ ثابت قدم رہوں گا۔ آپ بس مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔" گلوکاری چھوڑنے کے فیصلے کے بعد سے یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنے لہجے میں رقت محسوس کی تھی۔ اسے بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی بہت ہی قریبی عزیز کے سامنے بیٹھا ہو اور ان کے خلوص پر پورا اعتماد کرسکتا ہو۔

"یقیناً میں دعا کروں گا۔ جانتے ہو جب میں پہلی بار تم سے ملا تھا تو مجھے لگا تھا کہ اللہ تم پر خاص مہربان ہے۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جنہیں اتنی خوب صورت اور پرکشش شخصیت سے نوازا جائے کہ دیکھنے اور ملنے والوں کے دل خودبخود کھنچتے چلے جائیں۔ تمہیں خود اس بات کا اچھی طرح تجربہ ہوگا کہ لوگ تمہاری طرف والہانہ انداز میں بڑھتے ہیں۔ تمہاری اس خصوصیت کو دیکھ کر میرے دل سے خودبخود یہ دعا نکلی تھی کہ کاش یہ نوجوان کسی طرح دین کی خدمت کرنے والوں میں شامل ہوجائے تو صرف اس کی شخصی کشش کے کمال سے ہی بہت سے لوگوں کی زندگیاں سنور جائیں گی۔ تمہاری گلوکاری چھوڑ دینے کی خبر سنی تو مجھے لگا کہ اللہ نے میری بے ساختگی میں مانگی اس دعا کو قبول کرلیا ہے۔ اب تم بتاؤ کہ تم دین کی خدمت کرنے والے افراد کے ساتھ شامل ہونا پسند کرو گے یا نہیں؟" وہ جو سحر زدہ سا بیٹھا پروفیسر عبدالجبار کی باتیں سن رہا تھا ان کے سوال پر چونک گیا۔

"میں...... میں بھلا دین کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟ دین کے متعلق میرا علم نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں نے تو کبھی نماز، روزے کی بھی سختی سے پابندی نہیں کی۔ ایسے میں مجھ سے دین کی خدمت کی آپ کیسے امید رکھ سکتے ہیں؟" وہ پروفیسر صاحب کی خواہش پر حیران تھا۔

"مجھے امید تم سے نہیں اللہ کی رحمت سے ہے۔ اللہ چاہے تو تم یہ کام کرسکتے ہو اس کے لیے میں تمہارے سامنے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مثال پیش کرسکتا ہوں۔ آپؓ اسلام کے سخت دشمن اور مخالف تھے لیکن پیارے نبی ﷺ نے دین کی مضبوطی و مدد کے لیے جن دو افراد میں سے کسی ایک کے اسلام قبول کرلینے کی دعا کی وہ حضرت عمرؓ تھے اور وقت نے یہ ثابت کر دکھایا کہ دعائے نبی سے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والے عمرؓ اسلامی تاریخ میں اتنی ممتاز حیثیت حاصل کرگئے کہ ہیرو آف اسلامک ہسٹری کہلائے اور اپنے تو اپنے اغیار بھی ان کی اہمیت کو ماننے پر مجبور ہیں۔ مائیکل ہارٹ نامی ایک مصنف نے سو عظیم شخصیات کی تاریخ عالم پر اثر انگیزی کے حوالے سے ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب

میں وہ عیسائی ہوتے ہوئے جہاں نبیﷺ کو سب سے اہم اور عظیم انسان کی حیثیت سے پہلا نمبر دینے پر مجبور ہوا وہاں حضرت عمرؓ کو بھی سو عظیم انسانوں کی فہرست میں شامل کرنے سے خود کو نہ روک سکا...... تو تم یہ مت سوچو کہ آج تم کیا ہو۔ آنے والا وقت بہت کچھ بدل دیا کرتا ہے۔ تم بھی بدل سکتے ہو بس ایک بار نیت کر کے دیکھو۔'' پروفیسر صاحب نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کا تفصیلی جواب دیا۔

''میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میں اس بارے میں سوچوں گا۔'' اس نے الجھے ہوئے انداز میں ان سے کہا۔ روحانہ کی خواہش پر اس نے شوبزنس کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا تو اسے اندر ہی اندر اس بات کا احساس تھا کہ روحانہ نے اس سے کوئی غلط مطالبہ نہیں کیا ہے۔ ایک عام مسلمان کی حیثیت سے وہ دین میں گانے بجانے کی ممانعت سے واقف تھا لیکن اپنی فیلڈ کو چھوڑتے ہوئے اس کے ذہن میں یہ بات بالکل بھی نہیں تھی کہ وہ کوئی بہت دیندار یا دین کی خدمت کرنے والا انسان بننے جا رہا ہے۔ وہ تو آج کل روزگار کے لیے کوئی تدبیر، کوئی ذریعہ تلاش کرنے میں کوشاں تھا۔ اس کے پاس کہاں اتنی فرصت تھی کہ وہ دین کی خدمت جیسے کام سرانجام دے سکتا۔

''ضرور سوچنا۔ دو دن بعد میری اپنے چند ہم خیال دوستوں کے ساتھ ماہانہ میٹنگ ہونے والی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس میٹنگ میں شرکت کرو۔ اس شرکت کے بعد شاید تمہیں فیصلہ کرنے اور سنانے میں کوئی مدد مل سکے۔'' پروفیسر صاحب اس کی کیفیت سمجھ رہے تھے چنانچہ نرمی سے بولے اور ایک کاغذ پر میٹنگ کے مقام کا پتا اور وقت لکھ کر اسے دے دیا۔

''ٹھیک ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ وقت پر اس جگہ پہنچ سکوں۔ آپ پلیز مجھے عثمان بھائی کے ڈاکیومینٹس دے دیں تاکہ میں انہیں اس بندے تک پہنچا سکوں جو انہیں دبئی لے جانے والا ہے۔'' اس نے کاغذ بے پروائی سے اپنی جیب میں رکھ لیا اور ان سے بولا۔ ان کی خواہش نے اسے اس حد تک الجھا دیا تھا کہ اب وہ زیادہ دیر وہاں نہیں رکنا چاہتا تھا۔

''ڈاکیومینٹس تو یہ بالکل تمہارے سامنے رکھے ہیں۔'' انہوں نے میز پر رکھے ایک خاکی لفافے کی طرف اشارہ کیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''لیکن میں تمہیں کھانا کھائے بغیر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ مغرب کا وقت ہوا ہی چاہتا ہے۔ تمہاری آنٹی اور روحانہ رات کے کھانے کی تیاری کر رہی ہیں۔ مغرب کے بعد تم کھانا کھا کر ہی یہاں سے جانا۔'' ایک طرف ان کی پُرخلوص اور اپنایت بھری دعوت تھی تو دوسری طرف روحانہ کے ہاتھوں سے مہکتے کھانے کا تصور۔ یقیناً وہ جان گئی ہوگی کہ شایان آیا ہوا ہے اور بہت محبت سے اس کے لیے کھانا تیار کر رہی ہوگی تو وہ بغیر کھانا کھائے یہاں سے واپس جا کر کیسے اسے مایوس اور دکھی کر سکتا تھا۔ لامحالہ اسے بیٹھنا پڑا۔ شکر یہ ہوا کہ پروفیسر صاحب نے بھی دوبارہ اس موضوع پر گفتگو نہیں کی اور مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ ان کے ساتھ گفتگو کرتا ہوا وہ ان کی علمی وسعت سے متاثر ہوتا رہا۔ مغرب کی نماز کے بعد انہوں نے اکٹھے کھانا کھایا۔ اس موقع پر عادلہ نے آ کر اس سے رسمی علیک سلیک کرنے کے علاوہ کھانا اچھی طرح کھانے کی ہدایت کی البتہ روحانہ کی جھلک تک نظر نہ آئی۔ اس کے باوجود وہ بے مزہ نہ ہوا اور اس کے ہاتھوں سے بنے کھانے کی خوش ذائقگی میں ہی اس کی موجودگی کو محسوس کرتا رہا۔ وہ سامنے نہیں تھی پر اس کے آس پاس موجود ہونے کا احساس ہی بہت تھا۔

☆☆☆

''شایان بھائی! آپ کے دوست ملنے آئے ہیں۔ میرے خیال میں آپ کے کالج فیلو ہیں۔ اسد نام بتا رہے ہیں اپنا۔'' وہ لیپ ٹاپ کھولے اس پر اپنے لیے کسی مناسب جاب کی تلاش میں مصروف تھا کہ کاشان نے دروازے پر دستک دے کر اسے اطلاع دی جسے سن کر وہ تھوڑا سا حیران ہوا۔ اسد اس کا کالج فیلو تھا اور کالج لائف میں کبھی کبھی گھر بھی آ جایا کرتا تھا لیکن عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد کسی کے پاس ملنے جلنے کی فرصت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ ٹیلی فون پر بھی شاذ و نادر ہی رابطہ رہتا تھا اور اسد سے تو عرصے سے یہ رابطہ بھی نہیں تھا۔ اس بارے میں سوچتا ہوا وہ ڈرائنگ روم میں پہنچا جہاں کاشان نے اسد کو بٹھایا ہوا تھا۔ اسد جو پہلے کے مقابلے میں کچھ فربہ ہو گیا تھا، بہت خوش دلی اور جوش سے اس سے ملا۔ اس نے خود بھی اسی رویے کا مظاہرہ کیا۔ حیرت سے ہٹ کر اسے عرصے بعد اتنے پرانے دوست سے ملنا اچھا لگا تھا۔ کچھ دیر تو وہ آپس میں ایسے ہی خوش گپیاں کرتے اور ماضی کی خوشگوار باتوں کو دہراتے رہے پھر چائے پینے کے دوران اسد اصل موضوع پر آیا اور اس سے بولا۔

''میرے پاس اشرف کی کال آئی تھی۔ بتا رہا تھا کہ تم نے اس سے اپنے لیے کوئی جاب دیکھنے کا کہا تھا۔ اس

کے پاس کوئی جاب نہیں تھی اس لیے اس نے تمہیں مجھ سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اشرف کی کال کے بعد میں انتظار کرتا رہا لیکن تمہاری کال نہیں آئی۔ میرے پاس سے تمہارا نمبر مس ہوگیا تھا اس لیے خود کال نہیں کرسکا۔ اشرف سے نمبر لینے کا سوچا تو پتا چلا کہ وہ کمپنی کی طرف سے جاپان کے دورے پر گیا ہوا ہے۔ میں نے سوچا چلو گھر پر ہی چل کر تم سے ملاقات کرلیتے ہیں اس لیے یہاں آپہنچا۔''

''اچھا کیا۔ اس بہانے ملاقات ہی ہوگئی۔'' اس نے کوشش کی کہ اسد کو جواب دیتے ہوئے اس کے لہجے میں خوشگواری ہو ورنہ وہ یہ سوچ کر پژمردہ ہوگیا تھا کہ اسد اس کے پاس سرمائے کی امید رکھتے ہوئے کسی کاروبار کا آئیڈیا لے کر آیا ہوگا۔ اشرف نے اس کے بارے میں درست کہا تھا کہ وہ پکا کاروباری بندہ تھا۔

''اگر تم میری آفر پر ہاں کردو تو ہماری اکثر ملاقات ہوسکتی ہے۔'' اسد نے معنی خیزی سے اس کی طرف دیکھا۔

''اگر تم کسی بزنس پارٹنر شپ کا آئیڈیا لے کر آئے ہو تو میری طرف سے پیشگی معذرت۔ میرے پاس بزنس میں لگانے کے لیے کوئی سرمایہ نہیں ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے اسد کو بتادیا جس پر اسد ڈھیرے سے ہنسا اور بولا۔

''میں خاندانی بزنس مین ہوں اور پیسے کی خوشبو دور سے سونگھ لیتا ہوں۔ تم نے اشرف سے جاب کی بات کی اور بعد میں مجھ سے رابطہ بھی نہیں کیا تو میں سمجھ گیا کہ تمہارے پاس کوئی رقم نہیں ہے لیکن تمہارے پاس کچھ ایسا ہے جو میرے پاس پیسا ہوتے ہوئے بھی نہیں ہے اور میں اس چیز کو استعمال کرکے اپنے بینک بیلنس میں بھی اضافہ کرسکتا ہوں اور تمہیں بھی اتنی معقول پے منٹ دے سکتا ہوں جس کے بعد تمہیں کوئی جاب ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''میں تمہاری بات سمجھا نہیں۔'' اسد کے پہیلیاں بجھوانے پر وہ مزید الجھ گیا۔

''دیکھو یار! میں نے ایک ٹیکسٹائل مل میں اپنے شیئرز ڈالے ہیں۔ کوئی بہت نامور گروپ نہیں ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آنے والے سیزن میں جب ہم نئی لان لانچ کریں تو اس کے ساتھ کسی مشہور شخصیت کا نام منسوب ہو۔ وہ مشہور شخصیت مجھے تمہاری صورت میں مل گئی ہے۔ میں شایان صدیقی کے نام سے اپنی لان کو لانچ کروں گا تو مارکیٹ میں فوراً جگہ بنالے گی۔ بس تم یہ سمجھو کہ میں تم سے تمہارا نام خرید رہا ہوں۔ اگر تم راضی ہوجاتے ہو تو ہم اس سلسلے میں اپنے معاملات طے کرلیتے ہیں۔'' اس نے کھل کر اس کے سامنے اپنی آفر رکھی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''تم چاہو تو ایک آدھ دن سوچ لو۔ پھر فیصلہ سناؤ۔'' اسد نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔

''ٹھیک ہے، میں سوچوں گا۔'' اس نے اسد کو جواب دیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ اس معاملے پر غور کرتا رہا پھر اس نے محسوس کیا کہ یہ ایک اچھی آفر ہے۔ موجودہ حالات میں اس کے پاس اس سے بہتر چانس نہیں تھی۔ کوئی بہت عمدہ ملازمت حاصل کرنے کے لیے اس کے پاس اہلیت نہیں تھی اور عام سی نوکری کے لیے دل نہیں مانتا تھا اس لیے یہی بہتر تھا کہ وہ اسد کی پیشکش قبول کرلیتا۔ اس نے اسد کو فون کرکے اپنی رضامندی سے آگاہ کردیا۔ اسد اس کی طرف سے مثبت جواب پاکر خوش ہوگیا۔ اسد کی خوشی نے اسے پروفیسر عبدالجبار کی خواہش یاد دلائی۔ اسد کی طرح وہ بھی اسے اپنے ساتھ شامل کرنے کے خواہاں تھے لیکن کسی کاروباری فائدے کے لیے نہیں بلکہ دین کی خدمت کے لیے...... اسے یقین تھا کہ اگر وہ ان کی خواہش قبول کرلیتا ہے تو وہ اسد سے بھی زیادہ خوش ہوں گے لیکن دوسرے عام سے مسلمانوں کی طرح اسے بھی زیادہ دین دار لوگوں کی قربت عجیب سی لگتی تھی جیسے وہ کسی اجنبی دنیا کے لوگ ہوں۔ اس نے فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے طے کیا کہ پہلے وہ اس میٹنگ میں شرکت کرے گا جس کا پروفیسر صاحب نے اس سے ذکر کیا تھا۔ مقررہ دن وہ ٹھیک وقت پر طے شدہ مقام پر پہنچ گیا۔ باقی لوگ بھی ٹھیک وقت پر پہنچے تھے۔ اس کے سامنے میٹنگ کا آغاز سورۃ العصر کی تلاوت سے ہوا۔

''قسم ہے عصر کی۔ بے شک انسان خسارے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق بات کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔'' تلاوت کرنے والے نے آیات کا سادہ سا ترجمہ بھی پڑھا اور پھر میٹنگ کا آغاز ہوگیا۔ شایان کو اس میٹنگ میں سامع کے علاوہ کوئی کردار ادا نہیں کرنا تھا اس لیے وہ خاموشی سے ان کی گفتگو سنتا رہا اور سن کر حیران ہوتا رہا۔ وہ اس کے تصور میں بسے ہوئے عام مولویوں کی گفتگو نہیں تھی۔ اس گفتگو میں کسی عرس، کسی ختم، کسی حلقے وغیرہ کی پلاننگ نہیں کی جارہی تھی بلکہ پاکستانی بچوں کے مستقبل پر غور کیا جارہا تھا۔ اس میٹنگ سے ہی اسے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ این جی او کی طرز پر کام کررہے تھے اور ان کا مقصد بچوں کو اسلامی اقدار کے ساتھ ساتھ جدید علوم سے

روشناس کروانا تھا۔ میٹنگ کے دوران کچھ باتیں اسے سمجھ میں آئیں اور بہت سی بعداز میٹنگ پروفیسر صاحب نے اسے خود سمجھائیں۔ وہ اسے بتانے لگے۔

''ہم سب احباب بچوں کو اسلامی تعلیمات سے آشنا کرنے کے زبردست حامی ہیں لیکن ان افراد کی طرح نہیں جن کا دین حلیے، وظائف اور چند عبادات پر مکمل ہوجاتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے جان سکیں کہ اسلام کتنا جدید اور روشن خیال مذہب ہے اور چاہتا ہے کہ مسلمان فروعی مسائل میں الجھنے کے بجائے تسخیرِ کائنات کا کارنامہ انجام دے۔ حافظ، قاری، مفتی کی حیثیت سے انکار نہیں لیکن سائنس دان، ڈاکٹر اور انجینئر بھی تو ساتھ ساتھ بنا جاسکتا ہے۔ انسان اتنا کمزور تو نہیں کہ خود کو محدود کرلے۔ انسانی دماغ کو تو سپر کمپیوٹر سے بھی زیادہ سپر قرار دیا جاتا ہے بس بات اسے استعمال کرنے کی ہے تو ہم اپنے بچوں کو دماغ کا یہی استعمال سکھانے کی کوشش کررہے ہیں۔ اچھا مسلمان بننے کے لیے بالکل بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان دنیا کے دوسرے تمام علوم سے کنارہ کشی اختیار کرلے۔ حقیقتاً تو یہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ بنی نوع انسان کے فائدے کے لیے رائج علوم کو سیکھیں، ان سے استفادہ کریں اور دوسروں کو بھی ان سے مستفید کریں۔ ہم کوئی بہت امیر لوگ نہیں ہیں اس لیے ہر سطح پر کام نہیں کرسکتے۔ بس ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ بچے ہی ہمارا سب کچھ ہیں اس لیے ہم جتنے بچوں کی بہتر تربیت کرسکتے ہیں، کرنے کی کوشش کریں۔ غرباء کے علاقے میں یہ کام فلاحی اسکولوں کی صورت میں کیا جارہا ہے اور جہاں لوگ افورڈ کرسکتے ہیں، وہاں مہنگے اسکول یہی کام کررہے ہیں۔ ملنے والے ڈونیشنز کے علاوہ ان اسکولوں سے ہونے والی آمدنی کو بھی ہم اس مقصد کے لیے استعمال کررہے ہیں۔''

انہوں نے اسے اپنے پورے طریقہ کار سے آگاہ کیا۔ ''مجھے آپ کے کام نے متاثر کیا ہے لیکن میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟'' اس نے ان کی تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ ان سے سوال بھی کیا۔ حقیقتاً اسے یہاں اپنا کوئی کام نظر نہیں آرہا تھا۔ نہ تو وہ مالی طور پر ان لوگوں کو سپورٹ کرسکتا تھا اور نہ ہی کوئی دینی اسکالر یا ماہرِ تعلیم تھا کہ کسی قسم کے مشورے دے سکتا۔

''تم بہت مدد کرسکتے ہو۔ میں نے تم سے کہا تھا ناکہ اللہ نے تمہیں ایک پُرکشش شخصیت دی ہے۔ تمہاری یہ شخصیت ہی ہماری بہت مدد کرسکتی ہے۔ لوگ تم سے محبت کرتے ہیں۔ اگر تم ہمارے ساتھ موجود رہو گے تو صرف تمہاری محبت میں لوگ اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے لگیں گے۔ پاکستان کے اس سب سے بڑے شہر میں بھی بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں لوگ اپنے بچوں کو اسکول بھیجنا پسند نہیں کرتے۔ اگر تمہاری تھوڑی سی کوشش سے ان بچوں کے لیے اسکول کا راستہ کھل جائے گا تو کیا تمہیں خوشی نہیں ہوگی؟'' انہوں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے دریافت کیا تو وہ اثبات میں جواب دیے بغیر نہیں رہ سکا۔

''فی الحال تم اس حد تک ہماری مدد کرکے دین کی خدمت میں اپنا حصہ ڈال سکتے ہو۔ اس کے علاوہ بھی اگر تمہیں وقت ملے اور تمہارا دل چاہے تو تم عملی طور پر ہمارے ساتھ شامل ہوسکتے ہو۔ انسان کے اندر لگن ہو تو وہ سب کچھ سیکھ لیتا ہے۔ علم کے حصول کے لیے کوئی عمر مقرر نہیں۔ دینی اور دنیاوی علوم تم چاہو تو اب بھی سیکھ سکتے ہو۔'' وہ اس کے اندازے کے مطابق اس کا اثباتی جواب پاکر بہت خوش ہوئے اور پھر اس سے یہ سب کہا۔ اس نے فوری طور پر تو انہیں کوئی جواب نہیں دیا لیکن دل میں یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ ان کے کہے پر عمل کرکے دیکھے گا۔ اسے یاد تھا کہ پروفیسر صاحب کی اس دعوتِ خدمتِ دین سے قبل وہ روزگار کے سلسلے میں بہت پریشان تھا لیکن پھر اللہ نے اسد کو اس کے پاس بھیج دیا اور گھر بیٹھے ہی اس کے روزگار کا بندوبست ہوگیا۔ اسد سے اس کے جو معاملات طے ہوئے تھے، ان کے مطابق اسے زیادہ کچھ نہیں کرنا تھا بس وہ مختلف اوقات میں لان کو ڈیلے کرنے کی تقریبات میں شرکت کرنے کے لیے ملک کے مختلف شہروں میں اسد اور اس کی ٹیم کے ساتھ جاتا تاکہ لوگ اس کی موجودگی کا سن کر خوشی خوشی نمائش میں شرکت کے لیے آئیں اور خریداری کریں۔ یہ کوئی بہت زیادہ مصروفیت نہیں تھی اور وہ پروفیسر صاحب کے کام میں بہ آسانی شریک ہوسکتا تھا۔ آخر کار اس نے اپنے اس فیصلے پر عمل درآمد شروع کردیا۔ پہلی بار جب وہ غریبوں کی بستی میں قائم ایک اسکول میں گیا تو اسے اندازہ ہوا کہ لوگ اس سے کیسی والہانہ محبت کرتے ہیں۔ کنسرٹس میں ملنے والے فینز کے مقابلے میں یہ لوگ بہت مختلف تھے۔ یہاں شوخ اور بے باک اداؤں کے بجائے سادگی اور خلوص تھا۔ بچوں کی طرف سے پیش کیے جانے والے پھول اور معمولی تحائف اس نے نم آنکھوں کے ساتھ قبول کیے کہ اسے اندازہ تھا کہ یہ معمولی تحائف دینے کے لیے بھی انہوں نے بڑی جدوجہد کی ہوگی۔ وہ خود بھی اپنے ساتھ کچھ چیزیں لے

گیا تھا اور اس کے تحائف بھی بڑی عقیدت و محبت کے ساتھ قبول کیے گئے تھے۔ آخر میں اس نے سب کی بے حد فرمائش پر ایک نعت سنائی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ نعت پڑھ رہا تھا اور اسے احساس ہو رہا تھا کہ سادہ سی اس نعت خوانی میں جو لطف ہے، وہ اسے جدید موسیقی کے آلات کے ساتھ رنگ و بو کی دنیا میں اسٹیج پر اچھل اچھل کر گاتے ہوئے کبھی حاصل نہیں ہو سکا۔

''تم نعت خوانی کیا کرو۔ تمہاری آواز میں بڑی تاثیر ہے۔ اس آواز میں اگر اچھا نعتیہ کلام پڑھا گیا تو یہ بھی ایک نیکی ہوگی۔'' پروفیسر صاحب نے بھی اسے مشورہ دیا۔ اسے ان کا مشورہ اچھا لگا۔ حقیقت یہ تھی کہ اسے ان کی ہر بات ہی اچھی لگنے لگی تھی۔ وہ روحانہ کے والد تھے صرف اس لیے نہیں بلکہ ان میں دلوں کو موہ لینے کی صلاحیت بھی تھی اس لیے۔ ان کی شخصیت کے جادو نے ہی اسے ان کے کاز سے اس طرح جوڑ ڈالا کہ اسے کام کرنے میں مزہ آنے لگا اور وہ شوبز کی چکاچوند کر دینے والی روشنیوں کو بہت تیزی سے بھولتا چلا گیا۔ اس عرصے میں اس کے پاس بہت سی فون کالز آئیں۔ کئی لوگ گھر چل کر آئے جو اسے شوبز کی دنیا میں واپس لے جانا چاہتے تھے۔ اسے بڑی بڑی رقوم کے لالچ بھی دیے گئے لیکن وہ اپنے انکار پر قائم رہا۔ جو کام اس نے روحانہ کی خواہش پر چھوڑا تھا، اب اسے خود بھی اس میں دلچسپی نہیں رہی تھی اور وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ زندگی کا جو لطف اسے اب آرہا ہے، وہ پہلے نہیں آتا تھا۔

اس نے ایک کمپنی کے ساتھ مل کر اپنی نعتوں کا ایک البم بھی تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہر نعت بہت احتیاط کے ساتھ منتخب کی گئی تھی اور خیال رکھا گیا تھا کہ کہیں کوئی شرکیہ کلام شامل نہ ہونے پائے۔ کسی قسم کے میوزک کو شامل کرنے سے بھی اس نے سختی سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے گھر والے جو پہلے اس کے فیصلے سے ناخوش تھے، اب خاصے مطمئن ہو چلے تھے اور انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ اس نے اپنے لیے زیادہ بہتر راہ کا انتخاب کر لیا ہے۔ زندگی میں آنے والی اس طمانیت اور سکون کے بعد وہ روحانہ سے شادی کے بارے میں سوچنے لگا۔ گھر میں بھی اب اس سلسلے میں زور دیا جا رہا تھا۔ سب کے اصرار پر آخر اس نے روحانہ کا نام لے ڈالا۔ کسی کو اعتراض نہیں ہوا۔ اچھے خاندان کی اچھی لڑکی کو قبول کرنے پر بھلا کون اعتراض کر سکتا تھا۔ دوسری طرف سے بھی اس رشتے کو بہت آسانی سے قبول کر لیا گیا حالانکہ اسے ڈر تھا کہ شاید پروفیسر صاحب کو وہ اپنے معیار کے مطابق نہ لگے لیکن انہوں نے جس محبت سے اسے اپنے کام میں شامل کیا تھا، اس سے زیادہ خلوص کے ساتھ فرزندی میں قبول کیا۔ ان دنوں سمعیہ اور عثمان بھی بچوں سمیت پاکستان آئے ہوئے تھے۔ سمعیہ کے مشورے پر ہی طے پایا کہ منگنی کے بجائے نکاح کر لیا جائے اور رخصتی کچھ عرصے بعد روحانہ کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد کی جائے اور وہ دونوں جو بالکل اچانک ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا ہوئے تھے، یوں اپنے جملہ حقوق ایک دوسرے کے نام لکھوانے میں کامیاب ہو گئے کہ ان کے دامن پر ندامت کا ایک بھی چھینٹا نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی محبت کی راہ کو آسان بنانے اور منزل کو پانے کے لیے کہیں کسی معاشرتی اور مذہبی روایت کی خلاف ورزی نہیں کی تھی اور صرف اور صرف دعا کو اپنا ہتھیار بنا کر میدانِ محبت مار لیا تھا۔ اس کامیابی پر وہ خوش تھے۔ بے حد وحساب خوش......

☆☆☆

''مشہور بھارتی اداکارہ پونم کے اصرار پر شایان صدیقی کی ان کی فلم میں گانا گانے پر رضامندی۔'' اس اخباری سرخی نے روحانہ کو بری طرح چونکا دیا اور وہ بے قراری سے تفصیلی خبر پڑھنے لگی۔ خبر کے مطابق حسین وجمیل مشہور بھارتی اداکارہ نے اپنے ایک دوست پروڈیوسر کی فلم میں گلوکاری کے جوہر دکھانے کے لیے شایان صدیقی کو... بہ اصرار راضی کر لیا تھا۔ پونم شایان صدیقی کی زبردست پرستار ہونے کی دعوے دار تھی اور اس نازآفریں کی خواہش پر شایان صدیقی نے اپنے شوبز چھوڑنے کے فیصلے کے باوجود ہامی بھر لی تھی۔ ذرائع کا دعویٰ تھا کہ اس اقرار کے پیچھے پونم جیسی حسینہ کی خواہش کے علاوہ وہ بھاری معاوضہ بھی کارفرما تھا جس کی شایان صدیقی کو پیشکش کی گئی تھی۔

روحانہ نے خبر کو ایک بار پھر پڑھا لیکن یقین کرنا آسان نہیں تھا۔ اس کے علم میں تھا کہ شایان اس سے قبل کئی اچھی آفرز کو ٹھکرا چکا ہے۔ ایک مشروب بنانے والی کمپنی نے تو بلینک چیک تک اس کے سامنے رکھ کر اپنی پروڈکٹ کے لیے کمرشل میں کام کرنے کے لیے راضی کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اپنے انکار پر قائم رہا تھا۔ پھر یہ کیسے ہو گیا تھا کہ وہ بھارتی فلم کے لیے گانے گانے پر راضی ہو گیا تھا۔ کیا اس رضامندی کے پیچھے پونم کا بے تحاشا حسن تھا؟ یہ خیال دل میں آنے پر وہ تڑپ اٹھی اور فوراً ہی شایان کا نمبر ڈائل کیا۔ نکاح کے بعد وہ ایک دوسرے سے ٹیلی فونک گفتگو کرنے لگے تھے لیکن پچھلے تین دن سے ان

کی بات نہیں ہوئی تھی۔ روحانہ کے امتحانات ہونے والے تھے اور انہوں نے آپس میں طے کیا تھا کہ اس امتحان سے فارغ ہونے تک وہ آپس میں بات چیت نہیں کریں گے کیونکہ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو طول پکڑ جاتی تھی اور روحانہ اپنا وقت گنوا بیٹھتی تھی۔

''السلام علیکم بیگم صاحبہ۔ صبح صبح آپ نے یاد کیا۔ ہماری تو قسمت ہی جاگ گئی۔'' دوسری طرف سے فوراً کال ریسیو کی گئی اور اسے شایان کی شوخ آواز سنائی دی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس کے اندازِ تخاطب پر شرم سے سرخ پڑ جاتی لیکن ابھی تو دل کو الگ ہی بے قراری لگی ہوئی تھی اس لیے ذرا تیز لہجے میں بولی۔

''اخبار میں یہ خبر کیسی ہے شایان؟ کس نے یہ شوشا چھوڑا ہے کہ آپ بھارتی فلم کے لیے گانے گانے جا رہے ہیں۔''

''اچھا تم نے اخبار میں یہ خبر پڑھی۔ یہ تو لیٹ نائٹ ہی بریکنگ نیوز کے طور پر تمام ٹی وی چینلز پر آ گئی تھی لیکن تم ٹھہریں ارلی ٹو بیڈ اینڈ ارلی ٹو رائز پر عمل کرنے والی۔ تمہیں رات کو پتا نہیں چل سکا ہوگا۔'' شایان نے نہایت اطمینان سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''تو کیا یہ خبر صحیح ہے؟'' وہ اب بھی بے یقینی کا شکار تھی۔

''ہاں یار۔ بس ایک فلم کی بات ہے۔ پونم جی نے اتنا اصرار کیا کہ مجھے ماننی ہی پڑی۔''

''آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ میری کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔'' صدمے سے اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔

''اتنی ٹینشن کیوں لے رہی ہو یار! کہا ہے نا کہ صرف ایک فلم کی بات ہے۔'' شایان نے جیسے اس کی کیفیت کو سمجھ کر تسلی دینے کی کوشش کی لیکن وہ مزید کچھ نہیں سننا چاہتی تھی۔ اس سے سنا ہی نہیں جا رہا تھا اس لیے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا ہے۔ وہ تو خوش تھی کہ شایان اتنی آسانی سے اس کی بات مان کر شوبز کی چکا چوند کر دینے والی دنیا سے نکل آیا ہے لیکن یہ کیا ہوا تھا کہ وہ پھر واپس اسی دنیا کی طرف پلٹ گیا تھا۔ کیا اس کا وہ ترک صرف اسے پانے کے لیے تھا اور اب جبکہ وہ اسے نکاح کے بندھن میں باندھ چکا تھا تو اسے اپنا وعدہ توڑنے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ جتنا جتنا سوچ رہی تھی، اس کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ سر درد سے پھٹنے لگا تھا۔ اس کیفیت کے باعث وہ پورا دن اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ آج کل وہ یوں بھی سارا دن کمرا بند کر کے اپنی پڑھائی میں مصروف رہتی تھی اس لیے کوئی اسے دیکھنے بھی نہیں آیا۔ دیکھنے والا تھا بھی کون۔ ابا صبح ہی گھر سے نکل چکے تھے اور عادلہ سے اس کے تعلق میں ایک جھجک سی قائم تھی۔ انہوں نے کبھی بھی اس کے معمولات میں دخل اندازی کی کوشش نہیں کی تھی، شاید اپنے رشتے کی نزاکت کی وجہ سے احتیاط کرتی تھیں۔ سوتیلی ماں کا رشتہ نبھانا آسان نہیں تھا۔ ذہنی الجھن اور دکھ کے احساس سے شام تک اس کا جسم بخار سے تپنے لگا۔ عصر سے کچھ قبل گھریلو ملازمہ نے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر شایان کی آمد سے آگاہ کیا۔

''مجھے کیوں بتا رہی ہو۔ امی اور ابا کو بتاؤ۔'' نکاح ہو جانے کے باوجود وہ شایان سے صرف ٹیلی فونک رابطے تک ہی محدود تھی اور وہ دونوں اتفاقی سامنا ہو جانے کے علاوہ آپس میں بے حجابانہ ملاقات نہیں کرتے تھے اس لیے اس نے ملازمہ کو ڈپٹنے والے انداز میں جواب دیا۔

''وہ دونوں گھر پر نہیں ہیں جی اور شایان صاحب نے کہا ہے کہ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' ملازمہ نے دانت نکال کر اسے اطلاع دی۔

''ان سے کہہ دو کہ میری طبیعت خراب ہے۔'' اس نے نروٹھے پن سے جواب دے کر کروٹ بدل لی۔ وہ اس سے ملاقات کر بھی لیتی تو کیا ہوتا۔ وہ اسے اپنے فیصلے سے مطمئن کرنے کے لیے دلائل اور تسلیاں دیتا اور وہ ایسی کوئی بات نہیں سننا چاہتی تھی۔ آنکھوں سے مسلسل آنسو بہاتے ہوئے وہ کب غنودگی میں چلی گئی اسے علم نہیں ہو سکا۔ دوبارہ آنکھ کسی کے پکارنے پر کھلی۔ وہ ابا تھے جو اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھے اسے تشویش سے پکار رہے تھے۔ انہیں سامنے پا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''کیا بات ہے بیٹا! آپ نے اپنی کیا حالت بنا لی ہے۔ ملازمہ نے بتایا کہ آپ نے سارا دن سے کچھ کھایا پیا نہیں اور اپنے کمرے سے بھی باہر نہیں نکلیں تو میں آپ کو دیکھنے آیا تھا۔ آپ کو تو بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔'' ان کے لہجے میں محبت اور پریشانی دونوں کی جھلک تھی۔

''وہ مجھے اور آپ کو اتنا بڑا دھوکا کیسے دے سکتا ہے ابا! میں نے سوچا تھا کہ اب کبھی اس کے قدم نہیں بھٹکیں گے لیکن وہ تو اتنی جلدی ترغیب کا شکار ہو گیا۔'' اس نے شایان کا نام نہیں لیا تھا لیکن اس سے متعلق خبر سے واقف پروفیسر عبدالجبار نے اس کی بات سمجھ لی۔

''کسی بھی بات پر اتنی تیزی سے ردِعمل ظاہر نہیں کیا

کرتے بیٹا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ شایان یہاں آیا تھا لیکن آپ نے اس سے ملاقات کرنا گوارا نہیں کیا۔ آپ کو اس کی بات سننی چاہیے تھی۔“ وہ اسے سمجھانے لگے حالانکہ خود انہیں بھی اس خبر سے دکھ ہوا تھا لیکن انہوں نے روحانہ کی طرح فوری ردِ عمل دینے کے بجائے شایان کی وضاحت کا انتظار کرنا مناسب سمجھا تھا اور لاشعوری طور پر منتظر رہے تھے کہ وہ ان سے رابطہ کرے گا لیکن ان کا انتظار انتظار ہی رہا تھا البتہ گھر پر اس کی آمد کی اطلاع سن کر انہیں قدرے اطمینان ہوا تھا۔ اگر روحانہ اس سے ملاقات کر لیتی تو مزید تسلی ہو جاتی کہ شایان نے اچانک ایسا فیصلہ کیوں کر لیا۔

”اس کی بات سن کر بھی کیا حاصل ہوتا۔ وہ مجھے جھوٹے وعدے اور تسلیوں سے بہلانے کی کوشش کرتا کہ صرف ایک فلم کے بعد سب کچھ چھوڑ دے گا لیکن آپ بتائیں کہ جو شخص ایک بار اپنا عہد توڑ سکتا ہے کیا وہ دوبارہ ایسا نہیں کر سکتا؟“ وہ اندیشوں میں مبتلا تھی اور پروفیسر عبدالجبار کو اس کے یہ اندیشے غلط نہیں لگ رہے تھے۔

☆☆☆

وہ اچانک ہی بہت مصروف ہو گیا تھا۔ بھارتی فلم میں گانے کی آفر قبول کرتے ہی اسے ویزا مل گیا تھا اور عام پاکستانی شہریوں کی طرح اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ میڈیا میں خبر آنے کے صرف دو دن بعد اسے بھارت کے لیے روانہ ہونا تھا اور اسے اس مختصر عرصے میں بہت سے کام نمٹانے تھے۔ ایک کام روحانہ کو منانے کا بھی تھا لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ وہ اس سے ملاقات پر راضی نہیں ہوئی تھی اور فون پر وہ کھل کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ پروفیسر صاحب سے بھی اس نے فون پر ہی بات کی تھی اور ان سے بھی تقریباً وہی کچھ کہا تھا جو روحانہ سے کہہ چکا تھا۔ یہ سب کہنا اس کی مجبوری تھی کیونکہ اسی میں اس کے وطن کی بقا اور سلامتی تھی۔ وہ جو ایک عام سا پاکستانی شہری تھا، اچانک ہی اس پر ملکی سلامتی کے ایک راز کی ذمے داری آ گئی تھی۔ یہ سلسلہ کوئی ایک ڈیڑھ ماہ قبل شروع ہوا تھا۔ ڈیڑھ ماہ قبل پونم نے اس سے رابطہ کر کے اپنی بے حد پسندیدگی کے اظہار کے ساتھ اپنی آنے والی فلم میں پلے بیک سنگنگ کی فرمائش کی تھی جس پر اس نے فوری انکار کر دیا تھا۔ اس کے انکار کے باوجود پونم کا اصرار جاری رہا اور آخر ایک دن اس نے ہامی بھر لی لیکن اس ہامی کے پیچھے پونم کے اصرار کے بجائے کرنل باجوہ کی خواہش تھی۔ انہوں نے خفیہ طور پر اسے ہیڈ کوارٹر بلا کر ملاقات کی تھی اور اصرار کیا تھا کہ وہ پونم کی بات مان لے۔ ان کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق پونم بھارت کے ایک بڑے دفاعی افسر کی داشتہ تھی اور اس کے لیے اہم خدمات بھی انجام دیتی تھی۔ شایان کو پونم کے قریب رہ کر کچھ قیمتی راز حاصل کرنے تھے۔ پہلے تو اسے کرنل باجوہ کی بات سمجھ ہی نہیں آئی۔ بھلا وہ کیسے ایک جاسوس کا کردار ادا کر سکتا تھا لیکن انہوں نے اسے راضی کر لیا بلکہ انہوں نے بھی کیا راضی کیا، ان تعلیمات نے راضی کر لیا جو پروفیسر عبدالجبار کی قربت میں رہنے سے خود بخود ہی اس کے دل و دماغ میں اترتی جا رہی تھیں۔

پروفیسر صاحب علم کا خزانہ تھے اور چلتے پھرتے قرآنی واقعات اس انداز میں سناتے تھے کہ ان کی بات سننے والے کے دل میں اتر جاتی تھی۔ ان کی قربت میں رہنے کی وجہ سے اسے خود بخود قرآن سے دلچسپی پیدا ہونا شروع ہو گئی تھی اور اب وہ خود بھی پابندی سے ترجمے کے ساتھ قرآن پڑھنے لگا تھا۔ اس نے اسلامی تاریخ کا بھی مطالعہ کرنا شروع کر دیا تھا اور صحابہ کرامؓ کے کارنامے اور قربانیاں اسے متاثر کرتی تھیں۔ دل میں کہیں دبی دبی سی خواہش بھی تھی کہ وہ اپنے دین کی خدمت کر سکے۔ پونم کی آفر اور کرنل باجوہ کی فرمائش نے اس خواہش کو پورا کرنے کے اسباب پیدا کیے تو وہ زیادہ دیر خود کو روک نہیں سکا اور بھارت کے لیے رختِ سفر باندھا۔ فی الحال اس نے کسی قسم کا معاہدہ نہیں کیا تھا اور پونم کو بس اس حد تک مثبت جواب دیا تھا کہ اگر وہ فلم کے پروڈیوسر اور موسیقار وغیرہ سے مل کر مطمئن ہو گیا تو گانوں کی ریکارڈنگ کروا دے گا بصورتِ دیگر اس کی ایسے ہی واپسی ہو جائے گی۔

پونم اس کی اتنی رضامندی پر بھی خوش ہو گئی تھی۔ وہ حقیقتاً اس کی زبردست فین تھی اور آواز کے علاوہ اس کی شخصیت کے سحر میں بھی گرفتار تھی اس لیے چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طور اس کی قربت کے مواقع میسر آ جائیں۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کے قریب آئے گا تو وہ اسے زیر کر ہی لے گی اور اس کا انکار اقرار میں بدل جائے گا۔ ائرپورٹ پر وہ خود اسے لینے آئی تھی اور اس موقع پر بھارتی اور پاکستانی دونوں ذرائع ابلاغ کے نمائندے بھی موجود تھے۔ پونم کی طرف سے کیے جانے والے شایان کے والہانہ استقبال کے مناظر نے دونوں ممالک کے ذرائع ابلاغ میں نمایاں جگہ بنائی اور اس کے بعد بھی مسلسل ان دونوں سے متعلق خبریں، تصاویر اور ویڈیوز سامنے آتی رہیں۔ پونم نے شایان کو اپنے ذاتی مہمان کی حیثیت سے اپنی رہائش گاہ پر ہی ٹھہرایا تھا اور

میزبان کی حیثیت سے وہ ہر جگہ اس کے ساتھ ساتھ موجود رہتی تھی۔ فلمی شخصیات سے ملاقات سے لے کر ممبئی کی سیر تک اس نے ہر جگہ میزبانی کے فرائض انجام دیے اور اس حوالے سے سامنے آنے والی خبریں اور تصاویر وغیرہ روحانہ تک بھی پہنچتی رہیں۔ ہر نئی خبر اس کے لیے تیر کے مانند تھی اور یہ تیر اس کے دل کو چھلنی کر رہے تھے۔ شایان وہ شخص تھا جس کی محبت خود بخود ہی اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی اور اپنی اس محبت کو پانے کے لیے اس نے گھنٹوں اللہ کے حضور خاموش آنسو بہائے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا دل شایان کے معاملے میں کتنا بے اختیار تھا لیکن اپنی اس بے اختیاری کو اس نے کبھی خود پر اتنا حاوی نہیں ہونے دیا تھا کہ قدم بہک جائیں اور اس کی پاک بازی پر کوئی حرف آئے۔ اس نے خود کو پور پور اپنے جیون ساتھی کے لیے سنبھال کر رکھا تھا اور شایان سے نکاح ہونے پر سب سے زیادہ اس بات پر خوش تھی کہ بے اختیاری میں ہی سہی اس کا دل جس شخص کا اسیر ہوا تھا، وہ اسی کی ہونے جا رہی تھی اور اپنے جیون ساتھی سے کسی بھی قسم کی معمولی سی بھی بددیانتی کی مرتکب ہونے سے بچ گئی تھی لیکن اب جو کچھ شایان کر رہا تھا' وہ اس کے لیے تکلیف دہ تھا۔ وہ ایک فاحشہ عورت کے ساتھ دن رات پایا جا رہا تھا اور میڈیا ان کے حوالے سے طرح طرح کی خبریں لگا رہا تھا۔ ایک تو شایان کا پیسے کی لالچ میں انڈین فلم کے لیے گانے گانے پر راضی ہو جانا اور دوسرے پونم کے ساتھ اسکینڈل...... اس ساری صورتِ حال پر وہ سخت غمگین تھی اور دن بہ دن اس کی اعصابی کشیدگی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

شایان کو خود بھی اس ساری صورتِ حال کا ادراک تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس سے متعلق خبریں اس کے پیاروں خصوصاً روحانہ کو متاثر کر رہی ہوں گی لیکن وہ فی الحال کسی بھی غلط فہمی کو دور کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اتنی دور سے وہ روحانہ کو کوئی تسلی نہیں دے سکتا تھا۔ پاکستان میں رہتے ہوئے بھی اسے ٹیلی فونک گفتگو میں بے حد احتیاط برتنے کی ہدایت کی گئی تھی اور بھارت میں رہ کر تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنی صفائی میں ایک لفظ بھی کہہ پاتا چنانچہ دل پر جبر کیے پونم کی عنایتوں کو برداشت کرتا رہا۔ ان عنایتوں کی کوئی حد نہیں تھی اور اسے پونم کو حد میں رکھنے کے لیے طرح طرح کے بہانے بنانے پڑتے تھے۔ اس کی طرف سے مثبت ردِعمل ظاہر نہ ہونے پر پونم جھنجلا جاتی تھی لیکن پھر نئے سرے سے کمر کس کے اسے زیر کرنے کے لیے میدان میں اتر آتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو فوراً وہاں سے فرار ہو جاتا لیکن کرنل باجوہ کی طرف سے گرین سگنل ملے بغیر وہ یہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کرنل باجوہ پونم کے گھر میں رہتے ہوئے بھی مسلسل اس سے رابطے میں تھے۔ کبھی کسی فین کی آٹوگراف بک پر اسے اپنے لیے کوئی پیغام لکھا نظر آ جاتا، کبھی فریش جوس کے ڈبے کے نیچے کوئی چٹ چسپاں ہوتی۔ رابطے کے ان سارے طریقوں کے متعلق اسے پہلے ہی آگاہ کر دیا گیا تھا۔ اس لیے وہ اس سلسلے میں چوکنا رہا کرتا تھا۔ اسے کرنل باجوہ کی طرف سے ایک خاص پیغام کا انتظار تھا، وہ پیغام ملنے پر وہ اپنا کام کرتا اور یہاں سے روانہ ہو جاتا۔ گانے کے سلسلے میں اس کا فی الحال کسی سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ ایسا کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ ہر ملنے والی آفر کو وہ مختلف حیلے بہانوں سے ٹال رہا تھا اور بھارتی فلم انڈسٹری کے لوگ اب اس سے ناراض ہونے لگے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ یہی دیکھا تھا کہ پاکستانی اداکار و گلوکار بھارتی فلموں میں ایک موقع ملنے کے منتظر رہا کرتے تھے جبکہ ان کے برعکس شایان نخرے دکھا رہا تھا۔ وہ کسی سے کوئی معاہدہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسے تو بس کرنل صاحب کے پیغام کا انتظار تھا اور یہ انتظار اس روز ختم ہوا جب پونم کسی ذاتی کام کا کہہ کر گھر سے نکلی ہوئی تھی اور شام ڈھل کر رات میں تبدیل ہو جانے کے باوجود واپس نہیں آئی تھی۔

"سر! آپ کے لیے یہ بکے آیا ہے۔" گھریلو ملازم نے ایک چھوٹا سا بکے لا کر اسے پیش کیا تو وہ چونک گیا۔ ان کے درمیان طے شدہ پیغام رسانی کے طریقوں میں سے ایک یہ بھی تھا۔

"یہاں ٹیبل پر رکھ دو۔" اس نے اندر سے چونک جانے کے باوجود بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔

"آپ کہیں تو فلاور کو واز میں سیٹ کر دوں۔" تربیت یافتہ ملازم نے اسے پیشکش کی۔

"نو تھینکس۔ ایسے ہی رہنے دو۔" اس نے جواب دیا اور بے نیازی سے اس رسالے کی طرف متوجہ ہو گیا جس کی وہ ملازم کی آمد کے وقت ورق گردانی کر رہا تھا۔ ملازم واپس چلا گیا تو اس نے اٹھ کر احتیاط سے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور بکے کو کھولنے لگا۔ پھولوں کی ٹہنیاں الگ الگ ہو جانے پر اسے وہ موی کاغذ مل گیا جس کی اسے تلاش تھی اور اس پر موجود مختصر پیغام کو پڑھ کر اس کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس کی آزمائش کا دن آ گیا تھا۔ اس نے باقی کا سارا وقت شدید اندرونی اضطراب کے

ساتھ گزارا لیکن ظاہری طور پر خود کو نارمل رکھا کہ کہیں ملازمین میں سے کوئی اس کی غیر معمولی کیفیت کو بھانپ نہ لے۔ رات کے پُرتکلف کھانے اور اپنی فرمائشی کافی سے فارغ ہونے کے بعد بھی اسے بہت دیر تک پونم کے انتظار میں جاگنا پڑا۔ اس کی گاڑی نے بیرونی گیٹ پر ہارن دیا تو وہ چپکے سے اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ جذبات کو بھڑکانے والے لباس میں بنی سنوری پونم، چہرے سے قدرے تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔

''تم ابھی تک سوئے نہیں؟'' شایان کو سامنے پا کر اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں بس نیند نہیں آرہی تھی۔ شاید میں ہوم سک ہو رہا ہوں۔ لگتا ہے جلد واپسی کا ٹکٹ کٹوانا ہوگا۔'' شایان کے جواب نے اسے پریشان کر دیا۔

''ارے۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ابھی تو تمہارا یہاں کام بھی شروع نہیں ہوا ہے۔ یہاں آگئے ہو تو کچھ پا کر جاؤ نا۔'' وہ بے ساختہ ہی شایان کے ساتھ اس کے لیے مخصوص کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''چاہتا تو میں بھی یہی ہوں لیکن اپنے اسٹینڈرڈ سے نیچے آکر کام کرنا مجھے گوارا نہیں ہے اور میں یہاں تنہا اپنوں سے دور رہ کر بھی اچھا محسوس نہیں کر رہا ہوں۔'' وہ بہت سوچی سمجھی گفتگو کر رہا تھا۔

''تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے پہلی بار ملک سے باہر نکلے ہو۔ اس سے پہلے بھی تو تم کنسرٹ کرنے فارن کنٹریز کے ٹور کرتے ہی رہتے تھے۔'' پونم نے اعتراض کیا اور ایک ادا سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ شایان نے نوٹ کیا کہ اس نے اپنے ہینڈ پرس کو میز پر رکھنے کے بجائے ہاتھ میں ہی دبوچ رکھا تھا جیسے اس میں کوئی قیمتی شے موجود ہو اور وہ لاشعوری طور پر اس کی حفاظت کر رہی ہو۔

''تب کی بات الگ تھی۔ اب پاکستان میں میری ایک عدد منکوحہ بھی ہے اور اس کی یاد میرے دل کو بے چین کر رہی ہے۔'' شایان کے اس جواب پر پونم کے چہرے کا رنگ بدل گیا لیکن اس نے خود کو فوراً ہی سنبھال لیا اور شوخی سے بولی۔

''من کی بے چینی دور کرنے اور من کو بہلانے کے لیے تو یہاں بھی بہت کچھ ہے لیکن تم کہیں نظر ہی نہیں ڈالتے۔''

''اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔ مجھے بالکل دکھائی دے رہا ہے کہ تم کتنی خوب صورت لگ رہی ہو لیکن تم اتنی تھکی ہوئی نظر آرہی ہو کہ تم سے اپنا دل بہلانے کی فرمائش کرنا زیادتی لگ رہی ہے۔'' اس نے دل پر جبر کرتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا تو پونم چونک گئی۔ وہ سچ مچ شایان کی دیوانی تھی اور اتنے دنوں سے مسلسل اسے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی اب جب وہ مہربان نظر آرہا تھا تو وہ اس موقع کو کیسے جانے دیتی۔ فوراً ہی مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں کتنی بھی تھکی ہوئی ہوں، تمہیں نہیں ٹال سکتی۔ آخر کو تم میرے خاص مہمان ہو اور ہم مہمان کو بھگوان سمان سمجھتے ہیں۔ بس تم پانچ منٹ ویٹ کرو۔ میں ابھی فریش

ہو کر آتی ہوں۔" خوشی سے بولتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھنے لگی تو شایان نے اسے روک لیا۔

"فریش ہونے کے لیے کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ دو تین ڈرنک لے لو فریش ہو جاؤ گی۔" کہنے کے ساتھ ہی وہ کمرے کے گوشے میں بنے بار کی طرف بڑھ گیا۔ عمدہ شرابوں سے سجا یہ بار اس کی آمد کے بعد سے اب تک ویسا کا ویسا ہی تھا اور پہلی بار وہ یہاں سے کوئی ڈرنک تیار کر رہا تھا۔ پونم نے اس کے اس عمل کو دلچسپی سے دیکھا اور قطعی اندازہ نہیں لگا سکی کہ جام میں پہلے سے ہی کوئی بے رنگ سفوف موجود ہے۔ شایان نے احتیاطاً یہ کی تھی کہ اپنے لیے بھی ایک جام تیار کر لیا تھا۔ پونم کا جام اس کے حوالے کر کے اس نے اپنا جام میز پر رکھا تو وہ چونک گئی اور بولی۔

"میں تو سمجھی تھی کہ تم بالکل بھی نہیں پیتے۔"

"نہیں۔ کبھی کبھی پیتا ہوں لیکن کسی بہت خاص موقع پر۔" اس نے جواب دیا لیکن اس کا جام ہنوز میز پر رکھا رہا۔ پونم نے البتہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے شروع کر دیے تھے۔ وہ صرف شراب ہوتی تو اتنی تیزی سے اثر نہیں کرتی لیکن شایان کے ملائے سفوف نے اثر دکھایا اور چند گھونٹ پینے کے بعد ہی پونم کی کیفیت بدلنے لگی۔ جام ختم ہونے تک وہ بری طرح جھوم رہی تھی۔

"مجھے سہارا دو شا...... شا...... یان۔" اس نے بہکے ہوئے انداز میں پکارا تو شایان نے پہلے کمرے کا دروازہ بند کیا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بے حد نشے میں تھی۔ شایان نے اس سے سوال جواب شروع کر دیے جن سے اسے علم ہو گیا کہ اس کی مطلوبہ شے پونم کے پرس میں ہی موجود ہے۔ پونم کی فراہم کردہ معلومات کی مدد سے اس نے اس کے پرس کے خفیہ خانے میں موجود ایک چھوٹی سی ڈسک نکال لی اور پھر نشے میں دھت پونم کو اٹھا کر بیڈ پر لٹا دیا۔ اس کام کے بعد اس نے گلدان میں سجے پھول نکالے اور ان کے درمیان ڈسک کو چھپا کر پھولوں کو ایک پولی تھین کی تھیلی میں لپیٹ دیا۔ اب اسے صبح ہونے کا انتظار تھا۔ صبح کے وقت وہ تھیلی لے کر نکلا اور اسے ایک ملازم کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔

"اسے پھینک دو۔ ان پھولوں کی خوشبو بالکل بھی اچھی نہیں ہے۔" ملازم نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی۔ شایان نے یہاں رہ کر اس گھر کے معمولات کو بہت اچھی طرح نوٹ کیا تھا اور وہ جانتا تھا کہ صبح صبح کچرا اٹھانے والا کچرا لے جاتا ہے۔ یہ پھول بھی اس کچرے کے ساتھ چلے جاتے اور پھر انہیں حاصل کرنا کرنل باجوہ کے مقرر کردہ آدمی کا کام ہوتا۔ وہ اپنے حصے کا کام کر چکا تھا۔

اس نے ملازم سے اپنے لیے بلیک کافی منگوا کر پی اور پھر کمرے میں واپس آ گیا۔ پونم ابھی تک سو رہی تھی۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر اس کے جاگنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس انتظار کے دوران اس کا ذہن مختلف سوچوں میں گھرا ہوا تھا۔ جاگنے کے بعد بھی اسے پونم کو اپنے ساتھ مصروف رکھنے کی کوشش کرنا تھی تاکہ اس کا ذہن ڈسک کی طرف نہ جائے۔ چند گھنٹوں بعد اس کی واپسی کی فلائٹ میں بکنگ ہو چکی تھی۔ وہ چاہتا تو پونم کے سونے کے دوران بھی وہاں سے نکل جاتا لیکن وہ جاگتی اور اسے اس کی اس طرح روانگی کا علم ہوتا تو چونک جاتی اور وہ جن کے لیے کام کر رہی تھی، وہ اسے ائرپورٹ پر بھی روک سکتے تھے اس لیے بہتر یہی تھا کہ وہ اپنے لیے شک کے مواقع پیدا نہ ہونے دے اور یہیں رہ کر حالات کا سامنا کرے کیونکہ سامنے رہ کر بچاؤ کی تدبیر کی جا سکتی تھی۔ کچھ دیر مزید انتظار کرنے کے بعد بالآخر پونم جاگ گئی۔

"تم وہاں کیا کر رہے ہو شانی ڈارلنگ۔ اتنی جلدی اٹھ گئے۔" اس نے خمار آلود لہجے میں شایان کو مخاطب کیا۔

"میں جلدی نہیں اٹھا بلکہ تم کافی لیٹ ہو گئی ہو۔ رات تم نے بہت زیادہ ڈرنک کر لی تھی شاید اس لیے اتنی دیر سے آنکھ کھلی۔" شایان نے مسکرا کر اس کی بات کا جواب دیا۔

"اوہ تو...... ایسا کیسے ہو گیا۔" وہ بستر پر اٹھ بیٹھی تھی اور اب ہونٹ سکیڑے حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔

"یہ تو تمہیں معلوم ہو گا۔ میرے روکنے کے باوجود تم اتنی زیادہ پی گئیں کہ ہوش میں ہی نہیں رہیں اور میرا موڈ برباد کر دیا۔" اس نے ہلکی سی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے میز پر رکھی بوتل کی طرف اشارہ کیا۔ بوتل میں موجود شراب کا بیشتر حصہ اس نے بہا دیا تھا اور اب پونم کو یہ تاثر دے رہا تھا کہ یہ ساری شراب اس نے پی ہے۔

"مائی گاڈ! میں اتنی زیادہ پی گئی جب ہی تو میرا سر ابھی تک چکرا رہا ہے۔ میں ابھی شاور لیتی ہوں تاکہ طبیعت سنبھل جائے۔" وہ بستر سے اتر گئی اور ذرا سی لڑکھڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی۔ شایان کو اندازہ تھا کہ اس گیسٹ روم میں اس نے اپنی بہت راتیں گزاری ہوں گی اور گھریلو ملازمین کے لیے صبح اس کا وہاں سے برآمد ہونا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہو گی لیکن وہ کچھ نہ کرنے کے باوجود خجالت کا شکار

تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پونم کا اس کے کمرے سے ابتر حالت میں برآمد ہونا ملازمین کے لیے کیا معنی رکھتا ہوگا لیکن وہ یہ سب سہنے پر مجبور تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک ملازم اس کے لیے پونم کا پیغام لے کر آیا۔ وہ ڈائننگ روم میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ شایان وہاں پہنچا تو اسے بلیک کافی پیتے ہوئے دیکھا۔ نہانے سے اس کی حالت میں خاصا فرق پڑا تھا اور وہ تازہ دم لگ رہی تھی۔

"مجھے ابھی پتا چلا کہ تم نے میرے انتظار میں ناشتا نہیں کیا۔ آئی ایم ویری سوری۔ میں تمہارے لیے اچھی میزبان ثابت نہیں ہو پائی۔"

وہ یقیناً رات اپنے نشے سے سو جانے پر بھی معذرت کر رہی تھی البتہ شایان نے اس موضوع کو نہیں چھیڑا اور ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے اخلاق سے بولا۔ "کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھی انسان سے بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔ میں نے تمہارا انتظار کرنا اس لیے ضروری سمجھا کہ ہم ایک ساتھ بیٹھ کر یہ آخری بریک فاسٹ لے لیں۔ پھر مجھے ائرپورٹ کے لیے نکلنا ہے۔"

"واٹ ڈو یو مین؟" پونم چونکی۔

"میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ میں ہوم سک ہو رہا ہوں اس لیے میں نے واپس پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہاں تو ویسے بھی میری بات نہیں بن رہی ہے۔ پھر بھی کوئی اچھی آفر ملی تو چکر لگا لوں گا۔" اس نے بریڈ پر جیم لگاتے ہوئے بے نیازی سے بتایا تو پونم ہکا بکا رہ گئی۔ اس کے بعد وہ بہت دیر تک اسے قائل کرتی رہی کہ اس کا اس طرح لوٹ جانا اس کے کیریئر کے لیے اچھا نہیں ہوگا لیکن قائل وہ ہوتا ہے جو ہونا چاہے۔ اسے کب شوبز میں کیریئر بنانا تھا۔ وہ تو وطن کی خدمت کے جذبے کے تحت اس سارے چکر میں پھنس گیا تھا اور اب جلد از جلد یہاں سے نکل کر اپنے پیاروں کے درمیان پہنچنا چاہ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس بات پر بھی شکر کر رہا تھا کہ پونم کو ابھی تک اپنے پرس کا خیال نہیں آیا ہے اور وہ ابھی تک گیسٹ روم میں ہی میز پر پڑا ہوا ہے۔ جانے نہ جانے کی بحث میں ناشتے کے دوران خاصا وقت بیت گیا۔ ناکام ہونے پر پونم کا اصرار خفگی میں بدل گیا۔ شایان کو کیا پروا ہو سکتی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں واپس آکر سامان پیک کرنے لگا۔ کچھ چیزیں ایسی تھیں جو سمیٹنی تھیں، انہیں سمیٹنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔

وہ سامان گاڑی میں رکھوا رہا تھا جب پونم کو اپنے پرس کا خیال آیا۔ پکڑے جانے کے ڈر سے شایان کا دل دھڑکنے



لگا اور وہ عجلت میں پونم کو گڈ بائے کہہ کر روانہ ہو گیا۔ یہ اس کی غلطی تھی۔ اس کی عجلت نے پونم کو چونکایا چنانچہ جب اسے اپنے پرس کے خفیہ خانے سے ڈسک نہ ملی تو دو جمع دو چار کرنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ شایان صدیقی کی کتنی ہی دیوانی سہی، اس کی خاطر ان لوگوں کا عتاب نہیں سہہ سکتی تھی جن کے لیے اس نے یہ ڈسک حاصل کی تھی چنانچہ فوراً ہی اوپر اطلاع کر دی اور شایان صدیقی ائرپورٹ پہنچنے سے پہلے ہی راہ میں دھر لیا گیا۔

☆☆☆

"پاکستانی گلوکار شایان صدیقی کی بھارت میں پراسرار گمشدگی۔" یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی اور روحانہ تک بھی پہنچ گئی تھی۔ وہ شایان کے بھارت جانے اور وہاں سے آنے والی خبروں پر اس سے سخت خفا تھی۔ حقیقتاً شایان کی وعدہ خلافی نے ان کے رشتے پر ایک سوالیہ نشان لگا دیا تھا اور وہ خود سے یہ سوال کرنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ آیا مستقبل میں وہ اس رشتے کو قائم رکھنا چاہتی ہے یا نہیں۔ خود سے اس سوال کا جواب حاصل کرنا آسان نہیں تھا۔ اس کی روح کانٹوں پر آ گئی تھی۔ شایان وہ شخص تھا جو پہلی نظر میں اس کے دل کے گوشے گوشے میں بس گیا تھا اور دل نے بہت چپکے چپکے اللہ سے اسے مانگا تھا۔ اللہ نے بھی اسے خالی ہاتھ نہیں لوٹایا تھا اور وہ دونوں بغیر کسی جدوجہد کے نکاح جیسے مضبوط بندھن میں بندھ گئے تھے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ شایان کا نام جڑ جانے پر بے انتہا خوش تھی۔ ایسے میں اس بات پر غور کرنا کہ وہ شایان سے علیحدگی اختیار کر لے گی، سوہان روح نہیں ہوتا تو اور کیا ہوتا۔ شایان کے بھارت میں قیام کا ایک ایک پل وہ تڑپ تڑپ کر گزار رہی تھی لیکن جب اس کی گمشدگی کی خبر ملی تو اس نے حقیقتاً جانا کہ تکلیف کیا ہوتی ہے اور دل کیسے تڑپتا ہے۔ وہ اس سے اپنی ساری خفگی اور

ناراضگی بھول گئی اور کچھ یاد رہا تو صرف اللہ سے اس کی سلامتی کی دعائیں مانگنا۔ اس کے ساتھ کیا ہوا، وہ کہاں گیا اور کن لوگوں نے اسے غائب کیا؟ کچھ بھی تو معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی بھارتی میزبان پونم کے مطابق تو وہ اس سے رخصت ہو کر ائرپورٹ کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ ریکارڈ سے بھی پتا چلتا تھا کہ اس کی اس روز پاکستان آنے والی فلائٹ میں بکنگ تھی لیکن بھارتی پولیس، اسے ائرپورٹ لے جانے والے ڈرائیور کی لاش کے سوا کوئی کھوج نہیں لگا سکی تھی۔ پاکستان کی طرف سے اپنے شہری کی دستیابی کے لیے بھارت پر زور ڈالا جا رہا تھا۔ میڈیا نے بھی شور مچا رکھا تھا لیکن کوئی مثبت پیش رفت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ روحانہ کی دونوں ممالک کے ہی اقتدار کے ایوانوں تک کوئی پہنچ نہیں تھی اس لیے اس نے اپنا مقدمہ سب سے اونچی عدالت میں درج کروا دیا تھا اور دن رات اس عدالت کے دروازے کھٹکھٹا کر اس شایان صدیقی کی بازیابی کے لیے دہائیاں دے رہی تھی جو چاہے وعدہ خلاف تھا یا ہرجائی، اسے ہر حال میں عزیز تھا۔ وہ کسی اصولی اختلاف پر اسے تو چھوڑ سکتی تھی لیکن اس سے محبت کرنا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

☆☆☆

اس قید خانے میں اس کے کتنے شب و روز گزر گئے تھے، اس کے پاس کوئی حساب کتاب نہیں تھا۔ اس کے پاس گھڑی کی موجودگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ساتھ ہی وہ سورج کے نکلنے اور غروب ہونے سے بھی حساب کتاب لگانے سے قاصر تھا۔ اسے جس سیل میں رکھا گیا تھا، وہاں باہر کی روشنی کا گزر ہی نہیں تھا اور وہ روشنی کے لیے اس اکلوتے بلب کا محتاج ہوتا تھا جو اس کے صیاد اپنی مرضی سے روشن کرتے اور بجھاتے تھے۔ کبھی کبھی تو یہ بلب اتنے طویل عرصے کے لیے بند کر دیا جاتا تھا کہ اسے اپنے بصارت سے محروم ہو جانے کا گمان ہوتا تھا۔ کھانے پینے کا بھی یہی حساب تھا۔ کبھی تین وقت پابندی سے کھانا ملتا تھا اور کبھی وہ لوگ ایک بوند پانی اور ایک نوالے کے لیے بھی ترسا کر رکھ دیتے تھے۔ کبھی اسے لامتناہی مدت کے لیے نیند سے محروم کر دیا جاتا تھا اور معمولات کی اس شدید بے ترتیبی کی وجہ سے اس کی اندرونی حسیات بھی ڈسٹرب ہو گئی تھیں ورنہ سارے بیرونی ذرائع سے محروم ہونے کی صورت میں انسان کا اپنا فطری نظام بھی وقت کے حساب کتاب میں اس کی مدد کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی اسے گمان ہونے لگتا تھا کہ وہ اس دنیا کا فرد ہی نہیں ہے اور نہ ہی کبھی اب دوبارہ اپنی سابقہ زندگی کی طرف لوٹ سکتا ہے۔ اس قید خانے کی صعوبتیں سہتے ہوئے اسے شدت سے اپنے پیاروں کی یاد آتی تھی۔ امی، بہن، بھائی اور روحانہ کا تصور اسے بے چین کر دیتا تھا کہ کسی طرح وہ یہاں سے نکل کر ان کے درمیان پہنچ جائے۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ سب اس کی وجہ سے بہت دکھی ہوں گے اور دن رات اس کی واپسی کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ امی کی لامحدود محبت کی تو خیر کسی سے برابری ہی نہیں تھی، ساتھ ہی وہ روحانہ کے لیے بھی بے قرار رہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اسے ناراض اور پریشان چھوڑ کر بھارت آیا تھا۔ سوچا تھا کہ واپس جا کر اسے منا لے گا لیکن اب تو یہ امکان بھی معدوم ہوتا جا رہا تھا۔ روحانہ کو کبھی اس کے دورۂ بھارت کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکے گی اور وہ اسے غلط ہی سمجھتی رہے گی، یہ سوچ کر اس کا دل تڑپ جاتا تھا۔ روحانہ وہ لڑکی تھی جسے اس نے دل کی گہرائی سے چاہا تھا اور اس کے لیے دل میں پتا نہیں کیا کیا ارمان و خواہشات جمع تھیں۔ ابھی تو وہ اسے حکایت دل بھی پوری طرح نہیں سنا سکا تھا اور لگتا تھا کہ سنانے کی حسرت دل میں لیے ہی اس دنیا سے چلا جائے گا۔

''اٹھو! تمہیں سر نے یاد کیا ہے۔'' وہ اپنے خیالوں میں گم بیٹھا تھا کہ اسے سخت لہجے میں پکارا گیا۔ پھر پکارنے والا اپنے دوسرے ساتھی کے ساتھ اسے ہتھیاروں کی چھاؤں میں اس تاریک سیل سے نکال کر اوپر لے گیا۔ اوپر اس کا تفتیشی افسر موجود تھا لیکن وہ اس سے مخاطب نہیں ہوا اور شایان کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے منہ پر ایک سیاہ غلاف منڈھ دیا گیا۔ اب وہ کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ملنے والے احکامات کی تکمیل میں وہ قدم اٹھا کر آگے بڑھتے ہوئے اس خلافِ معمول صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا۔ ان لوگوں نے اسے ایک گاڑی میں بٹھایا تو اور بھی چونک گیا۔ گاڑی میں بٹھانے کا مطلب تھا کہ وہ اسے اس قید خانے سے باہر لے جا رہے ہیں۔ کہاں؟ اس بات کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ وہ خود ہی اندازے لگاتا رہا۔ شاید اسے کہیں اور منتقل کیا جا رہا تھا لیکن ایک دوسرا امکان یہ بھی تھا کہ وہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے نکلے ہوں۔ وہ اس سے کچھ بھی معلوم نہیں کر سکے تھے، حقیقتاً اس کے پاس انہیں بتانے کے لیے زیادہ کچھ تھا ہی نہیں۔ پونم سے حاصل کی گئی ڈسک اب کہاں ہوگی، وہ خود بھی نہیں جانتا تھا اور امکان تھا کہ اسے ناکارہ جان کر اس کی زندگی ختم

کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا ہو۔ زندہ تو وہ اسے چھوڑ نہیں سکتے تھے اور مسلسل غیاب بھارتی اداروں کی کارکردگی پر تنقید کا سبب بن جاتا۔ چنانچہ ان کے لیے بہترین حل یہی تھا کہ اس کی لاش دریافت کرڈالیں۔ باقی اسکرپٹ اور ڈراما تو وہ لوگ تیار کر ہی لیتے۔ گاڑی سفر کرتی ہوئی شہر کے ہنگاموں سے دور نکلی تو اس کا یہ اندیشہ قوی ہوتا چلا گیا۔ آخرکار ایک جگہ گاڑی روک کر اسے اترنے کا حکم دیا گیا۔ اس کے پاس تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا چنانچہ زیرلب کلمے کا ورد کرتے ہوئے نیچے اتر آیا۔

''تم ہمارے ساتھ کوآپریٹ کرتے تو تمہارے زندہ رہنے کی کوئی صورت نکل آتی لیکن اب ہمارے پاس تمہیں موت کے گھاٹ اتارنے کے سوا کوئی چوائس نہیں ہے۔'' سرد لہجے میں کہے اس جملے نے اس کے بدترین اندیشوں کی تصدیق کردی لیکن اس لمحے وہ خوف زدہ یا اداس نہیں ہوا اور اس نے اپنے اندر ایک عجب ہی توانائی اور ترنگ دوڑتی محسوس کی اور مضبوط لہجے میں بولا۔

''تمہارے ساتھ کوآپریٹ کرتا تو اپنے دین اور قوم کا مجرم ٹھہرتا۔ آج میں اپنی نظروں میں سرخرو ہوں کہ جام شہادت نوش کرنے جارہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا اور ایک بار پھر کلمے کا ورد کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر اب بھی سیاہ نقاب بندھا ہوا تھا اور وہ کچھ دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن اس نے کسی ہتھیار کا گھوڑا چڑھائے جانے کی آواز واضح طور پر سنی اور پھر فضا میں فائر کی آواز گونجی اور اس کے بعد پے درپے فائر ہوتے ہی چلے گئے۔

☆☆☆

''مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں مر کر دوبارہ زندہ ہوا ہوں اور جنت میں بیٹھا ہوں۔ کسی حور کے روبرو بیٹھ کر تو انسان یہی محسوس کرسکتا ہے نا۔'' اس کے لہجے کی شوخی نے روحانہ کے رخسار پر گلال بکھیر دیا اور وہ ذرا سا سر جھکا کر مسکرانے لگی۔

''فائر کی آواز سن کر مجھے ایسا لگا تھا کہ گولی مجھے ہی ماری گئی ہے لیکن وہ کرنل باجوہ کے آدمی تھے جو بروقت وہاں پہنچے تھے۔ میرے غیاب کے بعد سے وہ لوگ مسلسل میری بازیابی کے لیے کوششیں کررہے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے یونم پر بھی نظر رکھی ہوئی تھی اور اسی کی وجہ سے وہ مجھ تک پہنچ سکے تھے۔ یونم کو اغوا کرکے انہوں نے اس وزیر پر دباؤ ڈالا تھا جس کی وہ داشتہ تھی اور اس نے براہِ راست مدد کرنے کے بجائے صرف اتنا کلیو دے دیا تھا کہ مجھے کس وقت را کے کس ٹھکانے سے نکال کر قتل کرنے کے لیے لے جایا جارہا ہے۔ بس پھر وہ لوگ حرکت میں آگئے اور میں بچ گیا۔ آگے کی کہانی تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ کیسے پاکستانی سفارت خانے نے مجھے تحفظ دیا اور میں نے میڈیا کے سامنے یہ کہانی سنائی کہ مجھے تاوان کی غرض سے کچھ غنڈوں نے گرفتار کرلیا تھا جن کی گرفت سے میں موقع پاکر بھاگ نکلا اور سفارت خانے پہنچ گیا۔ بھارت کو بھی دنیا میں بدنامی سے بچنے کے لیے اس کہانی کو تسلیم کرنا پڑا۔''

''آپ کو چاہیے تھا کہ آپ میڈیا کو را کی بدمعاشی کے بارے میں بتادیتے۔''

''ایسا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس صورت میں وہ بھی کھل کر مجھ پر جاسوسی کا الزام لگاتے اور میرا بھارت سے نکلنا مشکل ہوجاتا۔ میرے کیس میں دونوں طرف کے لوگوں کو ہی کمپرومائز کرنا پڑا۔ نہ ہم کھل کر کہہ سکتے تھے کہ را نے کیوں مجھے اتنے دن اپنی کسٹڈی میں رکھ کر تشدد کا نشانہ بنایا اور نہ ہی وہ واویلا کرسکتے تھے کہ میں نے ان کا ایک اہم ڈاکیومنٹ غائب کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا ہے کیونکہ میرے پاس سے انہیں کچھ نہیں ملا تھا اور خود ان کی حیثیت بھی ایک طرح سے چور کی ہی تھی۔ انہوں نے یونم کی مدد سے ایک روسی سفارت کار کو پھانس کر روس کا کوئی راز حاصل کیا تھا جو اب پاکستان کی تحویل میں ہے یا پھر شاید چائنا کے حوالے کیا جاچکا ہوگا کیونکہ اس چیز کی پاکستان کو نہیں بلکہ پاکستان کے دوست چائنا کو ضرورت تھی۔'' اس نے روحانہ کو سمجھایا۔

''وہ راز کیا تھا؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔ اس طرح کی باتیں ہر ایک کو نہیں بتائی جاتیں۔ مجھے بھی بس میرے حصے کا کام بتایا گیا تھا۔ باقی سارے معاملات کیا تھے اور بیک گراؤنڈ میں کیا کچھ ہوتا رہا، اس سے مجھے نہ تو واقفیت ہے اور نہ ہی کوئی غرض۔ میں تو بس اس بات سے خوش ہوں کہ میں اپنے وطن کے کام آیا۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا تو روحانہ سر ہلانے لگی پھر ذرا چمک کر بولی۔

''وہ جو اتنے دن میری جان سولی پر لٹکی رہی اس کا کچھ احساس ہے آپ کو۔ یونم کے ساتھ آپ کی تصویریں دیکھ کر میرے دل پر کیا گزرتی تھی، آپ کیا جانیں۔''

''نہیں، کچھ کچھ تو میں جانتا اور سمجھتا ہوں اور پوری طرح تیار بھی تھا کہ واپس آنے کے بعد تمہاری کڑی تفتیش اور ناراضگی کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن شکر کہ تم نے لوٹنے

سے پہلے میری بات سننا گوارا کرلی اور مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع مل گیا۔"

"شاید ایسا ہی ہوتا جیسا آپ سوچ رہے تھے لیکن آپ کی گمشدگی کے عرصے میں، میں نے جو تکلیف اٹھائی اور جس طرح آپ کے لیے تڑپی، اس نے پہلی تکلیف کو بھلا دیا۔ آپ کے ملنے کی خبر ملی تو مجھے لگا کہ میں پھر سے جی اٹھی ہوں۔ اس کے باوجود اصولی معاملات پر یقیناً میری آپ کی کچھ بحث ہوتی لیکن ابا نے مجھے سمجھایا کہ پہلے میں آپ کی بات توجہ سے سنوں پھر کچھ کہوں۔ اصل میں ان کی زیرک نظروں نے بھانپ لیا تھا کہ بین السطور قصہ کوئی اور ہے اس لیے میں نے آپ کو بھرپور وضاحت کا موقع دیا اور آج میں بہت خوش ہوں کہ اللہ نے مجھے میرا وہی شایان لوٹا دیا ہے جو میں چاہتی تھی۔" یہ بچھڑ کر پھر ملنے کا جادو تھا کہ روحانہ آج اتنا کھل کر اپنے دل کا حال بیان کررہی تھی۔

"میں تم سے بھی زیادہ اللہ کا شکر گزار ہوں جس نے مجھے نئی زندگی، من پسند بیوی اور ساتھ ہی نیک و سمجھدار سسر صاحب عنایت کیے جن کی مدد سے میں نے بہت کچھ پایا اور زندگی گزارنے کے بہت سے سنہری اصول سیکھے۔ انسان پر اللہ کا یہ بھی بہت بڑا کرم ہوتا ہے کہ وہ اسے راہنمائی کرنے والے لوگوں سے ملا دیتا ہے اور یہ لوگ عمر کے ہر حصے میں مل سکتے ہیں۔ میں تمہیں بتاؤں کہ میری امی نے میری انکم کو دیکھتے ہوئے مجھے وراثت کے حق سے محروم کردیا تھا کہ مجھے تو ضرورت نہیں ہے لیکن جب میں نے اپنی زندگی کی راہ بدلی تو میں بالکل خالی ہاتھ ہوگیا۔ اس موقع پر شاید امی اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرلیتیں لیکن انہیں موقع ملنے سے پہلے ہی میں بھارت چلا گیا اور جب وہ میری واپسی کی دعائیں مانگتیں ہر اس جگہ جارہی تھیں جہاں ان کے خیال میں ان کی دعائیں زیادہ جلدی منظور ہوتیں، انہیں ایک محفلِ درس میں جانے کا موقع ملا۔ اس محفل میں دیے جانے والے درس سے انہیں علم ہوا کہ کسی بھی وجہ سے اپنی کسی بھی اولاد کو وراثت کے حق سے محروم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اللہ نے ہر وارث کے لیے ترکے میں حصہ مقرر کررکھا ہے اور اس کی تفصیل قرآن پاک کی سورۃ النساء میں درج ہے۔ اس مقررہ حصے میں کمی و بیشی کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے چنانچہ انہوں نے اللہ سے اپنے عمل کے لیے توبہ کی کہ وہ نادانستگی میں اللہ کے طے شدہ احکامات کی خلاف ورزی کرنے جارہی تھیں۔ میں نے امی سے کہا کہ وہ چاہیں تو میں اب بھی اپنے حصے سے دستبردار ہونے کو تیار ہوں لیکن انہوں نے منع کردیا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ میں اس رقم کو بھی اس یتیم خانے کو دے دوں جہاں اپنی پہلی سیونگ دی تھی۔ پہلے والی رقم تو ذرا مشکوک سی تھی لیکن اس خالصتاً حلال مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرکے میں دگنے تگنے اجر کی امید لگا سکتا ہوں۔ تمہیں میرے اس فیصلے پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے نا؟" اس نے اپنی بات کے اختتام پر روحانہ سے دریافت کیا جس پر اس نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی اور مضبوط لہجے میں بولی۔

"مجھے ہرگز بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ نے جو سوچا ہے بہت اچھا سوچا ہے۔"

"شکریہ روحانہ۔ تم نے مجھے ہر بوجھ سے آزاد کردیا۔ تمہاری جگہ کوئی عام لڑکی ہوتی تو کہتی کہ اس رقم سے ہم اپنے لیے بھی کچھ لے سکتے تھے۔" وہ اس کا جواب سن کر خوش ہوگیا۔

"دیکھا جائے تو اب بھی اس رقم سے ہم اپنے لیے ہی کچھ لینے کی کوشش کررہے ہیں۔ دنیا کی زندگی پر آخرت کا اجر بہت بھاری ہے۔ یہ عارضی زندگی تو کمی بیشی پر بھی گزر ہی جائے گی لیکن اس ابدی زندگی کے لیے تو ہمیں بہت کچھ حاصل کرنا ہے نا۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم جیسی شریک حیات کا ساتھ پاکر میں اس زندگی کے لیے بہت کچھ جمع کرلوں گا۔ امی سے بات کرتا ہوں کہ پروفیسر صاحب سے جلد از جلد رخصتی کی تاریخ لے لیں اب مزید دوری نہیں برداشت ہوگی۔" اس کے لہجے کی شوخی نے ایک بار پھر روحانہ کے چہرے کا رنگ بدلا اور وہ کچھ گھبرائی شرمائی سی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں جاکر دیکھتی ہوں۔ شاید ابا گھر واپس آگئے ہوں۔"

"میں تمہارے ابا جان کے سارے اوقات کار معلوم کرکے ہی یہاں آیا ہوں۔ مجھ سے بہانے نہ بناؤ۔" وہ ہنس کر بولا۔

"ابا کے اوقات کار معلوم کرنے کے بجائے اب رخصتی کی ڈیٹ فکس کروا کر ہی آیئے گا تاکہ میں بیچ بیچ بہانے نہ بنا سکوں۔" روحانہ نے بھی اس بار شوخی سے جواب دیا اور چھپاک سے دروازہ کھول کر منظر سے غائب ہوگئی۔ شایان اس کی اس ادا پر دل سے کھلکھلا کر ہنسا کہ اب تو اس کے اردگرد سارے ہی منظر ہنستے کھلکھلاتے ہوئے تھے۔



اسماء الحُسنیٰ۔ کامیابی کا راستہ

دینِ اسلام کی روشنی میں آپ کے مسائل کا مکمل حل

پیر شاہ محمد قادری

پیر شاہ محمد قادری ناجی ہاشمی گذشتہ 25 برسوں سے اسماء الحسنیٰ کے حوالے سے زندگی میں درپیش تمام مسائل اور پریشانیوں کے حل کے لئے اسماء الحسنیٰ کی تلقین کرتے ہیں اور آیات قرآنی کے ذریعے روحانی علاج کے حوالے سے دنیا بھر میں شہرت یافتہ ہیں۔ آپ کے پروگرام اسماء الحسنیٰ۔ کامیابی کا راستہ کروڑوں ناظرین دیکھتے رہتے ہیں۔ آپ اپنے مسائل اور پریشانیوں میں براہِ راست ان سے بذریعہ خط اور ملاقات راہ نمائی لے سکتے ہیں۔

حمیدہ نعمان۔ اسلام آباد

○ کبھی سوچا نہیں تھا کہ ایسی پریشانی سے دوچار ہو جاؤں گی کہ جس کے لئے مجھے اپنی عقل جواب دیتی محسوس ہوگی اس مرحلے پر آپ سے راہنمائی کی درخواست ہے مسئلہ کچھ یوں ہے کہ میرا نکاح آج سے چار سال قبل میرے ماموں زاد کے ساتھ ہوا تھا جو اسپین سے ڈیڑھ سال قبل وہ آئے اور رخصتی ہوگئی مگر وہ ازدواجی زندگی سے معذور تھے۔ بہرحال بہت مشکل وقت تھا..... میں نے ان کا پردہ رکھنا چاہا مگر شاید میں اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکتی ہوں مجھے ڈپریشن ہونے لگا ہے مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں اس صورت میں حال میں جدا نہیں ہوسکتے ان کی والدہ مجھ سے شدید محبت کرتی ہیں میں اپنے گھر میں ہی رہتی ہوں اور آہستہ آہستہ ڈپریشن کی مریض بنتی جارہی ہوں میں یہ چاہتی ہوں کہ یہ معاملہ خوش اسلوبی سے حل ہو جائے اور میں اس صورت حال سے نکل آؤں اس ضمن میں مجھے ذہنی سکون کے لئے کوئی اسم الٰہی بتائیں اور میرے لئے کوئی ایسی لوح تجویز کردیجئے کہ جس سے مجھے فیصلے کی قوت مل جائے آپ کا یہ مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔

☆ عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت اور استقامت دے آپ اپنی والدہ کو یہ ساری صورت حال بتا دیجئے اس قسم کی صورت حال درپیش آنے پر شریعت کچھ شرائط کے ساتھ خلع کا حق دیتی ہے۔ "یاکریم یاسلام" ہر نماز کے 135 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کیجئے اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔ ذہنی سکون اور ڈپریشن سے نجات کے لئے آپ کی فرمائش پر لوح اسم ذات ارسال کی جارہی ہے دعاؤں کا شکریہ۔

میمونہ شفیق۔ راولپنڈی

○ محترم اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے میں اپنی بیٹی کے مسئلے کے سلسلے میں حاضر ہوں میری بیٹی کی عمر 28 سال ہورہی ہے لیکن رشتے کا کوئی سبب نہیں بن رہا ہے بہت کوششیں کی ہیں لیکن کوئی بات نہیں بنتی ہے یہاں پر ایک مولوی صاحب سے پتا کرایا تو انہوں نے علاج تو کیا اور اس سے ایک دو رشتے آئے مگر بات نہیں بنی۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کوئی ایسی دعا یا لوح دیدیں کہ جس سے میری بیٹی کی شادی کا مسئلہ حل ہو جائے اور وہ اپنے گھر میں آباد ہو جائے اس سے چار سال چھوٹی بیٹی کی منگنی طے ہو چکی ہے لڑکے والے بار بار شادی کا تقاضا کرتے ہیں مگر بڑی کا کوئی بندوبست ہو تو چھوٹی کو رخصت کریں بہت پریشان ہوں کوئی راہنمائی کیجئے۔

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھئے وہ بڑا ہی مسبب الاسباب ہے انشاء اللہ اچھا رشتہ ملے گا "یاکریم یالطیف یافتاح" ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ بیٹی کی شادی کے لئے آپ کی فرمائش پر لوح تسخیر خاص ارسال کی جارہی ہے۔

گل رعنا۔ جرمنی

○ محترم! اس خط کی غرض و غایت یہ ہے کہ میری بہن کی شادی کو چار سال ہوگئے ہیں لیکن ابھی تک اولاد کی نعمت عطا نہیں ہوئی حالانکہ طبی اعتبار سے دونوں کو کوئی مسئلہ نہیں ہے مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ کی مصلحت کی وجہ سے یقیناً اس تاخیر کا کوئی بہتر سبب ہی ہوگا آپ سے اس ضمن میں روحانی علاج اور دعا کی درخواست ہے۔ جس طرح آپ نے میرے امیگریشن کے معاملے میں میری راہ نمائی کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس میں کامیابی عطا کی تھی اسی طرح

حصولِ دعا پھر حاضر ہیں۔ آپ کی محبت کرنے والی بیٹی۔

☆ عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ محبتوں کو قائم رکھے۔ اولاد کے لئے ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ "یاوارث یامصور یاخالق" پڑھ کر دعا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف آپ کی فرمائش پر اولاد کے لئے نقش علاج در عقیم ارسال کیا جارہا ہے۔

جبیں افضل۔ لندن یو کے

O محترم! اللہ تعالیٰ آپ کو عمر خضر عطا فرمائے آپ جس طرح لوگوں کی دینی راہ نمائی کر رہے ہیں اس کا اجر تو اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے، ہم سب تو بس آپ کو دعاؤں کے نذرانے ہی بھیج سکتے ہیں میری بیٹی کا معاملہ ہے اس کو یہاں پر کوئی لڑکا پسند ہی نہیں آتا بلکہ یوں کہئے کہ وہ شادی کے نام سے الرجک ہوگئی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک بار محبت میں ناکام ہو چکی ہے حالانکہ ہم نے اس کی مرضی پر سر جھکا دیا تھا مگر وہ لڑکا نہایت مطلب پرست نکلا۔ اس کا مقصد سوائے دولت کے کچھ نہیں تھا جب اس پر یہ حقیقت کھل گئی تو وہ اس سے متنفر ہوگئی اور اب اس نے سوچ لیا ہے کہ اب کبھی بھی شادی نہیں کرے گی۔ عمر بیتی جارہی ہے ہم اس کو سمجھا کر تھک چکے ہیں مگر وہ نہیں مانتی۔ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں بے راہ روی ایک عام بات ہے برے وقت سے ڈر لگتا ہے آپ سے درخواست ہے کہ آپ شادی کے لئے کوئی اسم اور لوح تجویز فرمادیجئے تا کہ وہ بخوشی راضی ہو جائے۔ یہ آپ کا ایک ماں پر بے حد احسان ہوگا۔ آپ کی بہن۔

☆ عزیز بہن! دعاؤں کا شکریہ، اللہ تعالیٰ ہر بیٹی کو برے تجربے سے محفوظ اور مامون رکھے۔ (آمین) ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ "یالطیف یارافع یاحمید" پڑھ کر دعا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف شادی کے لئے آپ کی فرمائش پر لوح زہرہ ارسال کی جارہی ہے۔

شگفتہ حیدر۔ لاڑکانہ

O محترم! میرے بیٹے کو بیرونِ ملک جانے کا بہت شوق ہے کئی بار متعدد جگہ اپلائی کر چکا ہے مگر بات نہیں بنتی ہے ذمے داریاں کافی ہیں اور اگر یہ کام ہو جائے گا تو ہمارے قرض بھی ادا ہو جائیں گے اور بچیوں کی شادی کے معاملات بھی بے حد آسان ہو جائیں گے۔ یہاں کل آمدنی آٹھ ہزار سے زائد نہیں باوجود محنت کے معاشی ترقی میسر نہیں آتی ہے اس لئے ہمیں یہی مناسب معلوم ہوا کہ اگر بیرونِ ملک ملازمت مل جائے تو ہمارے مسائل حل ہو جائیں گے آپ سے اس معاملے میں مدد اور راہ نمائی کی ضرورت ہے۔

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ ہم سب کی تمام نیک اور جائز خواہشات پوری فرمائے۔ اور اپنے خزانۂ رحمت سے وافر طیب رزق عطا فرمائے (آمین) آپ ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ "یارافع یاوہاب" پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 3 مرتبہ درود شریف۔ آپ کی فرمائش پر لوحِ تسخیر خاص برائے بیرونِ ملک سفر کے لئے ارسال کی جارہی ہے۔

سحرش بتول۔ ناروے

O محترم! اللہ تعالیٰ آپ کو ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ (آمین) میرے ہاں اللہ کی رحمت سے چار بیٹیاں ہیں ہم ایک اور بے بی پلان کرنا چاہ رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ وہ اس مرتبہ ہمیں اولادِ نرینہ سے نوازے۔ بہنوں کو بھی بھائی کا بہت شوق ہے اللہ تعالیٰ نے ہر نعمت نہایت فراوانی سے عطا کی ہے کمی تو بس یہی ہے۔ شاید اس لئے کہتے ہیں کہ انسان ناشکرا ہے طلب میں ہمیشہ ہاتھ بڑھائے رہتا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ ہماری آرزو کے لئے اللہ سے دعا کر دیجئے اور کوئی روحانی علاج بھی تجویز کر دیجئے آپ کے لئے دعا گو۔ آپ کی بہن۔

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ حکیم و دانا قادر مطلق سے التجا ہے کہ وہ ہر والدین کی بیٹے کی آرزو پوری فرمائے (آمین) در حقیقت یہ بھی نکتہ قابلِ غور ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کی کوئی حد نہیں ہے ہمیشہ اس کے آگے دستِ طلب دراز رکھیں۔ کیونکہ وہ مانگنے والوں کو پسند کرتا ہے اور شکر گزاروں کو زیادہ نوازتا ہے "یاوارث یاقوی یامصور" ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ اولادِ نرینہ کے لئے آپ کی فرمائش پر علاج در عقیم ارسال کیا جارہا ہے

یاسمین اسحاق۔ ٹھٹھہ سندھ

O محترم! میرے والد کے انتقال کے ساتھ مسائل شروع ہو گئے ہیں ہماری اچھی خاصی جائیداد اور زرعی رقبہ ہے اور اسی وجہ سے مصیبتوں میں پڑ گئے ہیں۔ سگے بھائیوں اور بہنوں میں آپس میں جائیداد کی تقسیم کے لئے جھگڑے پڑ گئے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ہم لوگ کیا کریں کس دعا سے اپنی محبتیں واپس لائیں اور سب دوبارہ سے ایک جیسے ہو جائیں آپ سے راہنمائی کی درخواست ہے۔

☆ عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ آپ سب کو محبت کی دولت عطا فرمائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ مال اور اولاد سے بندے کی آزمائش کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کے دلوں میں نرمی جگائے۔ (آمین) "یاسلام یاعزیز" ہر نماز کے بعد 131 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں اول آخر 3-3 مرتبہ درود شریف پڑھیں۔ خیر و برکت اور کامیابی کیلئے لوحِ تسخیر خاص ارسال ہے۔

راحیلہ منور۔ وہاڑی

O محترم! میری شادی کو چار سال ہو گئے ہیں مجھ سے دو سال پہلے میری بہن کی منگنی ہوئی تھی لڑکا باہر تھا اس لئے انہوں نے ٹائم دو سال کا لے لیا اسی دوران میرے لئے ایک مناسب رشتہ آ گیا اور یوں میری شادی میری باجی سے پہلے ہوگئی مگر اب چھ سال کا طویل عرصہ

گزر جانے کے باوجود وہ لوگ شادی میں ٹال مٹول کر رہے ہیں جبکہ لڑکا بھی واپس آ گیا ہے اور یہاں آ کر اس نے اپنا ایک بہت اچھا جنرل اسٹور کھول لیا ہے جس کی آمدنی بھی معقول ہے مگر اس کے باوجود وہ لوگ شادی کے معاملے میں نہ جانے کیوں دیر لگا رہے ہیں ایک مرتبہ ہم نے تنگ آ کر منگنی توڑنے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا مگر انہوں نے منت سماجت کر کے ابو کو منا لیا مگر اب پھر ایک سال گزر گیا ہے ان کی طرف سے خاموشی ہے ہمیں بتایئے کہ ہم کیا کریں باجی کہتی ہیں کہ وہ بدل گیا ہے نصیب ہے اب پھر ہو یا نہ ہو شادی یہیں ہونے دو۔ لوگ کیا کہیں گے؟ ہم لوگ سخت پریشانی میں مبتلا ہیں کہ کیا کریں آپ سے درخواست ہے کہ اس مسئلے کا روحانی حل بتائیں ہمیں بتائیں وظیفہ یا نقش جو بھی آپ مناسب سمجھیں عطا کر دیجیے تاکہ یہ مسئلہ بخیر و خوبی حل ہو جائے۔ اس کی وجہ سے باجی کی صحت بھی بہت گر گئی ہے والدین علیحدہ پریشان ہیں۔

☆ عزیز بہنی! اللہ تعالیٰ رشتوں کو قائم رکھنے والا اور گھر آباد کرنے والا ہے آپ کی باجی کا گھر بھی انشاء اللہ ضرور بنے گا۔ ہر نماز کے بعد 124 مرتبہ "یالطیف یا جامع یا فتاح" پڑھ کر دعا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ شادی کے لیے لوح زہرہ ارسال کی جا رہی ہے حسب توفیق بروز جمعہ صدقہ دیا کیجیے۔ سسپنس کو پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔

اقدس جبار۔ پشاور

○ محترم! میرے شوہر بات بات پر ناراض ہوتے ہیں گھر والوں سے ملنے نہیں دیتے اور بعض اوقات میرے والدین اور گھر والوں کے لیے اس قدر نازیبا گفتگو کرتے ہیں کہ بس کیا بتاؤں حالانکہ ان کی۔۔۔ ہر طرح سے خدمت کرتی ہوں۔ تمام سسرال والوں کا خیال رکھتی ہوں صبح نماز فجر سے اٹھتی ہوں تو بارہ بجے سے پہلے لیٹنا نصیب نہیں ہوتا سب کی خدمات کے باوجود کوئی خوش نہیں ہے ان کی بہنیں ایک، ایک ہفتہ آ کر رہتی ہیں لیکن بہو کو اپنے گھر جانے کی اجازت نہیں ہے سوائے عید بقرعید کے دو چار گھنٹوں کے سوا سارا سال والدین سے ملاقات نہیں ہوتی کیا اس معاشرے میں بہوؤں کے کوئی حقوق نہیں؟ میرے شوہر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں مگر شاید ان کے دل میں بیوی کے بجائے ایک نوکرانی جیسی عزت اور احترام کی بھی مستحق نہیں؟ ملازمہ کو کم از کم ہفتے میں ایک چھٹی تو مل جاتی ہے اس کے لیے کوئی ایسا حل بتایئے کہ میری مشقتوں میں کمی آ جائے اور سسرال والے مجھے ایک بہو کا مرتبہ دیں شاید میرا خط بہت سی بہوؤں کے لیے راہ نمائی کا باعث بن جائے آپ کی دعاؤں کی منتظر۔

☆ پیاری بہن! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت، استقامت بخشے اور ہر بیٹی کو اچھی بہو بننے کا حوصلہ اور ہنر بخشے۔ (آمین) آپ ہر نماز کے بعد "یارافع یا حمید" ایک تسبیح پڑھ لیا کریں اول آخر 3 مرتبہ درود شریف خیر و برکت اور بہتری کے لیے لوح تسخیر خاص ارسال کی جا رہی ہے۔

میمونہ اکرم۔ آزاد کشمیر

○ محترم! میری بیٹی کو عرصہ 2 سال سے بخار ہے ہر طرح کا علاج کروا چکے ہیں لیکن کوئی افاقہ نہیں ہو رہا یہاں پر ایک صاحب کو دکھایا تو انہوں نے آسیب کا چکر بتایا ہے۔ ڈاکٹر بھی کہتے ہیں کہ اس پر کوئی میڈیسن اثر نہیں کر رہی ہیں۔ آپ میری بیٹی کے متعلق استخارہ کر کے بتائیں کہ کیا مسئلہ ہے۔

☆ عزیز بہن! آپ کی بیٹی کو معدے کا انفیکشن ہے جس کی وجہ سے بخار نہیں ٹوٹ رہا۔ اس کا علاج کروایئے۔ لوح شفا ارسال ہے۔

شہناز عبدالغفور۔ ملتان

○ میں فرسٹ ائیر کی طالبہ ہوں ہم چھ بہن بھائی ہیں پانچ بہنیں ایک بھائی ہے میرا تعلق غریب گھرانے سے ہے ہمارے والدین نے غربی کے باعث ہمیں میٹرک تک تعلیم دلوائی ہم دو بہنیں ایک اسپتال میں جاب کرتی ہیں بھائی ہمارا مزدوری کرتا ہے اور ابو ضعیف ہیں محترم ایک تو ہمارا کاروبار صحیح نہیں چل رہا دوسرے میری بہنوں کی شادی میں رکاوٹ ہے کوئی رشتہ آتا ہے ایک بار ہو کر جاتے ہیں دوبارہ نہیں آتے گھر کے حالات بہت زیادہ خراب ہیں ان حالات کی وجہ سے ہر وقت گھر میں جھگڑا رہتا ہے ہم بہنیں کما کر والدین اور اپنا پیٹ پال رہی ہیں بھائی کوئی مدد نہیں کرتا...... بلکہ...... وہ ہر وقت لڑتا رہتا ہے ان حالات کی وجہ سے امی ہر وقت بیمار رہتی ہیں ہم دونوں بہنیں ہاتھ پاؤں بہت مارتی ہیں لیکن پھر بھی کچھ نہیں بنتا محترم آپ ہمیں کوئی ایسا وظیفہ یا لوح بتائیں جس سے ہمارا کاروبار صحیح ہو جائے اور بہنوں کی شادی کا بھی مسئلہ حل ہو جائے آپ کی مہربانی ہوگی۔

☆ اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات پر مکمل بھروسا رکھیں اس کی ذات مسبب الاسباب ہے انشاء اللہ آپ کے حالات پر ضرور رحم فرمائیں گے۔ آپ سب نماز باقاعدگی سے ادا کریں۔ ہر نماز کے بعد "یاوہاب" بکثرت

پڑھیں۔ لوح سبع ستارگان ارسال ہے۔

عندلیب۔ ملتان

○ محترم! ہمارا جوتوں کا کارخانہ ہے الحمدللہ بہت اچھا چلتا رہا ہے لیکن آٹھ دس ماہ سے یوں لگ رہا ہے کہ جیسے ہر چیز الٹی ہو رہی ہے کاریگر بھاگ رہے ہیں آرڈر کینسل ہو رہے ہیں پے منٹس پھنس رہی ہیں خود میرے میاں کہتے ہیں کہ کام پر جانے کو دل ہی نہیں چاہتا ہے بخار علیحدہ رہنے لگا ہے۔ ہمیں تو لوگ یہ بتاتے ہیں کہ کسی حاسد نے ہم پر جادو کروا دیا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس صورت حال سے نکالنے کے لئے ہمیں کوئی اسم الٰہی تلقین کریں اور کوئی روحانی تحفہ عنایت کیجئے ہم بہت پریشان ہیں گیارہویں شریف میں شرکت کے لئے پانچ سو روپے کا منی آرڈر ارسال کر رہی ہوں ہمارے لئے دعا بھی کیجئے گا گیارہویں شریف کے لئے ہماری جانب سے سوا لاکھ مرتبہ کلمہ طیبہ بھی شامل فرما لیجئے گا۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔

☆ عزیز بہن مصائب اور مشکلات سے گھبراتے نہیں جب جادو حسد کا شبہ ہونے لگے تو بکثرت آیت الکرسی اور معوذتین پڑھا کریں اللہ تعالیٰ اپنے کلام کی برکت سے ہر مسلمان کو بچانے والا ہے آپ ہر نماز کے بعد "یا سلام یا حفیظ یا فتاح یا وہاب" 140 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔ کاروباری خیر و برکت اور ترقی کے لئے لوح مشتری ارسال کی جارہی ہے حسب توفیق صدقہ دیا کیجئے گیارہویں شریف میں شرکت کا شکریہ اللہ تعالیٰ آپ سب پر اپنا فضل و کرم فرمائے۔ (آمین)

بینا اکرم۔ کراچی

○ محترم بھائی جان! آپ کا کالم پڑھ کر بے حد سہارا ملتا ہے میں بھی آج حاضر ہو گئی ہوں میرے شوہر کو ان کے کاروباری حریف نے ایک جھوٹے مقدمے میں پھنسا دیا ہے اللہ کا شکر ہے کہ میرے شوہر نے کبھی بددیانتی نہیں کی مگر اس نے ایسا ہیر پھیر سے کام لیا کہ ہمارا ایک ملازم اس سے مل گیا اور اس نے ہمیں شدید نقصان پہنچایا ہے۔ آپ ہمیں کوئی ایسی تعلیم دیں کہ جس سے اس جھوٹے مقدمے سے جان بھی چھوٹ جائے اور اس کے ساتھ ساتھ کاروباری نقصانات بھی نہ ہوں۔ میرے میاں ان حالات سے اس قدر بددل ہو گئے ہیں کہ کہتے ہیں کہ جونہی مقدمات سے جان چھوٹی وہ ملک سے باہر جا کر قسمت آزمائی کریں گے۔ بہت پریشانی ہے کوئی حل عنایت کریں۔

☆ عزیز بہن اللہ تعالیٰ آپ سب کو استقامت عطا فرمائے (آمین) "یا رحمٰن یا سلام یا حسیب یا فتاح" ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف، مقدمات کے جلد فیصلے اور خیر و برکت کیلئے نقش نامہ ارسال کیا جارہا ہے حسب توفیق صدقہ دیجئے گا۔